دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

مئی 2012

نگران اعلیٰ
معراج رسول

جلد42 • شمارہ05 • مئی 2012 • زرِسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

مئی 2012ء کا پانچواں شمارہ آپ کے ذوق نذر ہے۔

عام فہم بات ہے... ایک وقت تھا کہ پڑھے لکھے گھروں میں باقاعدگی سے اخبارات و رسائل آتے تھے مگر اب جس گھر پر معاشی بدحالی آتی ہے... وہ سب سے پہلی فضول خرچی، اخبار اور رسالوں کو قرار دے کر، گھر میں ان کا داخلہ بند کرتا ہے۔ یہ ایک گھر کی بات ہے لیکن مجموعی طور پر اس کا اطلاق پورے معاشرے پر ہوتا ہے۔ یہ مثال ایسی ہے جیسے چاول کے ایک دانے سے بریانی کی پوری دیگ کے پک جانے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جب گھروں میں اخبار اور رسالے کو فضول خرچی قرار دے کر بند کر دیا جائے تو جان لیں کہ مڈل کلاس کا وہ خاندان غربت کی لکیر سے نیچے کی طرف سفر شروع کر چکا ہے۔ اس وقت ترقیِ معکوس کے اس سفر پر پاکستان کے تقریباً تمام تر مڈل کلاس گھرانے تیزی سے جادۂ پیما ہیں۔ ماہرینِ معیشت غربت کے تعین کے لیے 'مڈل کلاس' کو بطور پیمانہ استعمال کرتے ہیں۔ اس فارمولے کے تحت کسی بھی ترقی پذیر ریاست میں جتنی تیزی سے 'مڈل کلاس' میں اضافہ ہوگا، وہاں ترقی کی رفتار اتنی ہی تیز بھی ہوتی ہے۔ اس فارمولے کو پلٹ کر دیکھیں۔ جتنی تیزی سے مڈل کلاس کم ہوگی، وہ ملک اتنی ہی تیزی سے پسماندگی کی دلدل میں گرتا چلا جائے گا۔ یہ پسماندگی صرف معاشی یا سماجی نہیں ہوتی، زندگی کا ہر شعبہ اس کی زد میں آتا ہے... معیارِ رہائش گرتا جاتا ہے، صحت کی سہولیات تک رسائی مسدود ہونے لگتی ہے، تعلیم مہنگا اور مشکل مشغلہ بن جاتا ہے۔ لوگ خود اس سے اپنے بچوں کا دامن چھڑانے لگتے ہیں... جب یہ سب کچھ ہو تو پھر... کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں... تقریباً ہر دوسرا شخص اس زوال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اسٹریٹ کرائم کی لہر کا متاثر ملے گا... کیم مئی 'عالمی یومِ مزدور' ہے۔ کچھ کرنے والو! ذرا سوچو کہ مزدور کی زندگی کب تک پسماندگی کے اندھے کنوئیں میں غوطے کھاتی رہے گی۔ آپ بھی سوچیے...

چلیے آپ کی ہمراہی میں بڑھتے ہیں آپ ہی کی بزم نامہ میں، جہاں نامے منتظر ہیں اظہار کے!

حافظ آباد سے ماہا ایمان کے تابڑ توڑ حملے ''اپریل کا شمارہ ہمارے دستِ مبارک میں آنے پر نازاں ہے۔ سرورق دیکھا تو لگا جیسے کانوں میں گلاب کا پھول اُگا ہو۔ ایک تصویر میں کتنے ہی مختلف خوش رنگ تاثرات اور بھیانک تاثرات سے واسطہ پڑا۔ مس سرورق کے پیا شاید گئے ہیں رنگون اور وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون۔ اسی لیے تو محترمہ اتنی دلفریب نظر آ رہی ہیں۔ پیچھے ایک مکار اور بدطینت آدمی اپنی آنکھوں کو کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز کیے بغیر نال کی پستول سے دوسرے کسی قدر... گوارا آدمی کی روشن مسکراہٹ بجھانے کے لیے کوشاں ہے۔ اشتہارات اور فہرست کو نظر انداز کرتے ہوئے جب آدھا بیچ چینی اور ایک پاؤ نکتہ چینی میں پہنچی تو آمنہ صداقت کو مفصل خرنامے کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ آمنہ ڈیئر! اتبرولا جواب تھا اور آپ کا شکریہ کہ آپ نے اوّل آ کر حسیناؤں کو مزید شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ محمد کبیر عباسی، ہمایوں سعید اپنی صنف کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ صنفِ نازک کو متاثر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جیسے اس وقت آپ خوش فہمیوں کے نازک ہنڈولوں میں جھول رہے ہیں، ویسے آپ کا دوسرا اندازہ درست ہے۔ آمنہ سویٹ ہارٹ! تم میری بہن بن جاؤ نا کیونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے اور پچھلے چند ماہ سیاں جی کی خاطر مدارت میں گزرے ہیں اس لیے محفل میں حاضری نہ لگ پائی۔ ک ک کرن! تمہاری اور علی آتش کی آمد اور الفاظ نے تو ماہا ایمان کے مخالفوں کے غبارے سے ہوا ہی نکال دی اور اب تفسیر عباس بابر انکل پنچر والے کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ محسن علی سوم جائے اناڑی، کھلاڑیوں کو مات دیتے ہوئے ابھی تک تو ہمیں دکھائی نہیں دیے۔ بہرحال، کوششیں جاری رکھو۔ علی آتش بھائی، تفسیر عباس منہ نہیں آج کل اپنی بتیسی چھپانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ مہر اے ڈی سیال سوری اللہ دتہ سیال صاحب آپ تو کچھ زیادہ ہی چیں بہ جبیں ہو گئے کہیں میں نے آپ کی دُم پر پاؤں تو نہیں رکھ دیا؟ سمیرا اقبال ہمایوں کو بھیا مت کہو، بے چارہ کتنی بار اپنا دل مرمت کروائے گا۔ ہاں جسمانی مرمت کروانے میں تو موصوف اب بہت ایکسپرٹ ہو گئے ہیں۔ مقصود الحسن طاہر بھیا آپ کو ہماری بھابی مبارک ہو۔ محمد بلال حیدر! اکثر جاہلوں کو عزت راس نہیں آتی، تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تفسیر انکل آج کتنا کڑوا ہوتا ہے، مجھے آج پتا چلا۔ آپ کا سگرٹ تو سلگ اٹھا [illegible] سگرٹ کو سگریٹ بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے اور آگ لگے گی تو دھواں تو اٹھے گا ہی۔ ویسے آپ ہیں خود میاں فصیحت دوسروں کو نصیحت۔ اب ہم بھی آپ کو کچھ ایسا ویسا کہیں تو پھر آپ میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا۔ کہانیوں میں ہر دفعہ کی طرح تجسس، سسپنس، ایکشن، تھرل بدست و گریباں نظر آئے۔ پہلی تحریر کاشف زبیر صاحب کی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے منہ میں پانی آ گیا پھر تو آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ بلکہ اتنے عظیم مصنف سے [illegible] کا اعتراف تھا جو کم از کم میں نہیں کر سکتی۔ جوش و جذبہ ہمیشہ سے کامرانی کی سیڑھی رہا ہے لیکن یہی جوش جب جنون میں ڈھلتا ہے تو تباہی کا پیغام [illegible] اس تحریر کا حاصل مطالعہ ٹھہرا۔ خالد احمد جیسے صحافی کی زیرک نگاہی کی داد دینی ضروری ہے۔ مجموعی طور پر تحریر و تجسس سے بھرپور یہ ایک [illegible] میں تابی کو اپنی ماں کے ایک قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا موقع ملا۔ گرداب میں بہت بُرا ہوا جو ماہا نو کی شادی ہوئی البتہ اسے [illegible] نے ہمیں خوشی دی۔ ماریا بلکہ کلارا کے انجام نے دل خوش کر دیا اور کرنل توحید کی ثابت قدمی نے حیران۔ یقیناً پاکستان ایسے ہی [illegible] لوگوں کے دم سے قائم ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔ سرورق کے رنگوں میں احمد اقبال چھا گئے۔ سچ ہے کہ دیوانگی کا سودا سر میں سمائے پھرتے

رہتا منفعت کا سودا نہیں ہوش مندوں کے نزدیک دنیا میں دیوانگی خلل ہے۔ پہلا رنگ سرور اکرام کی کہانی درکہانی ورگ زار ستم پہ چلتے چلتے تھک جانے والے مسافر کی داستان تھی جسے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مختصر تحریروں میں تیجلے شکار نے اپنی طرف متوجہ کیا جو حسبِ معمول مغربی دنیا کی ایک بے وفا بیوی کے بارے میں تھی۔ تنویر ریاض کی محبت کی خاطر میں موصوف بیک وقت غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے نبرد آزما رہے۔ بہت ہی دل گداز تحریر رہی۔ بابر نعیم کی ذہانت کے انجام نے ہمیں چونکا ڈالا۔ مریم کے خان کی زیرِ زمین اس ماہ سب سے بہترین مختصر تحریر ٹھہری۔ کاشف زبیر اور مریم کے خان ہمیشہ خاصے کی چیز لے کے آتے ہیں۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل بقول شاعر عرض کیا ہے "ماہ اپریل کا شمارہ کافی انتظار کے بعد ملا۔ جاسوسی کی محبت نے دیوانہ کیا ہوا ہے۔ سرورق پر موجود چنداسی لڑکی فون کا ریسیور کان سے لگائے شاید کسی عاشق نامراد کا دل لبھانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ بہرحال آنکھیں بتا رہی تھیں دل میں بھی کچھ ہے۔ (شکر ہے آپ کو کچھ سچ تو نظر آیا۔ ورنہ آپ محض دل لگی سمجھتے) پستول بردار کے سامنے مسکراتے ہوئے بندے کی عقل پر شبہ ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں پر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی آمنہ صداقت اپنے مفصل خبرنامے کے ساتھ موجود تھیں۔ مبارک باد کہتے ہیں۔ تفسیر بھائی کے بارے میں آپ کے خیالات پڑھ کر جیو اور جینے دو کی آفر پیش کرتا ہوں۔ محمد کبیر عباسی کی آمد اور ان کا ہمایوں سعید کو دیا گیا مشورہ فٹ لگا۔ آمنہ پٹھانی بھی جلتے ہوئے نہ جانے حاسدین کو کس آگ میں جلانے کی بات کررہی ہیں۔ یاحیرت! محسن علی موم اور اس کے بالکل پیچھے علی آتش۔ موم اور آتش کا فطری جوڑ محفل میں خوشی کا باعث بنا۔ اب لائٹ کا مسئلہ حل ہوا۔ علی آتش صاحب! آپ کے تفسیر بھائی کے بارے میں لکھے گئے الفاظ بالکل پسند نہ آئے۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔ علی پور سے محمد جاوید کا لاجواب تبصرہ پسند آیا۔ منصور الحسن طاہر کو شادی کی مبارک باد۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے ابتدائی صفحات پر موجود جنون پڑھی۔ یہ دولت کی خاطر دشتِ جنوں میں سفر کرنے والے کرداروں کے گرد گھومتی داستان بے مثل ہے۔ دولت کی ہوس نے انسان سے اس کی عقلِ سلیم چھین لی ہے۔ وہ بصارت و بصیرت دونوں سے محروم ہوگیا ہے۔ بشریٰ اور روشن کا جنون بھی انہیں انجام سے دوچار کرگیا۔ للکار ایک داستان لازوال۔ کافی تجسس آمیز رہی۔ تابش اور ثروت کا یوں مل جانا حیرت کی بات ہے لیکن مل کے بچھڑ جانا بچھڑ کے نہ ملنے کے لیے ملنا دل کی تکلیف کا سبب بنتا ہے۔ گرداب، اسما قادری کے قلم کا منہ بولتا جادو۔ ماہ بانو نے انتہائی سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت کے مجبور ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ ماریا بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ شہریار کے دل کی کیفیت ایک شاعر کی حیثیت سے بخوبی جان سکتے ہیں۔ سرور اکرام کے قلم سے لکھی گئی کہانی درکہانی زبردست اسٹوری تھی۔ یہ سچ ہے کہ حصولِ زر کی طلب نے انسان کو اس حد تک اندھا کردیا ہے۔ وہ اپنے راستے میں آنے والی کھائی بھی دیکھنے سے قاصر ہے۔ ایسا ہی معاملہ منصور کے ساتھ پیش آیا۔ احمد اقبال کی انتہائی سنجیدگی سے لکھی ہوئی کہانی، دیوانگی پسند آئی۔ بلاشبہ اصل میں نفرت ہی محبت کی بنیاد ہوتی ہے کے مصداق انعام الحق کی دیوانگی اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب رہی جبکہ کامران، وحشت دیوانگی میں ریت ہوا۔ مختصر کہانیوں میں کالی بھیڑ، منزلِ عشق، شکار، محبت کی خاطر لازوال تحریریں تھیں۔"

مصدق محمود دانش کی گاؤں کنگ سہالی ضلع گجرات سے "پُرتشدد آمد" جاسوسی ڈائجسٹ میں مدت بعد واپسی۔ (خوش آمدید) ماہ اپریل کا جاسوسی ڈائجسٹ بڑے انتظار کے بعد 6 اپریل کو حاصل کیا۔ گھر جا کے دھیان سے سرورق دیکھا تو ایک جاپانی دوشیزہ اپنے نرم و گرم بستر پر لیٹے پرانے ماڈل کا ریسیور تھامے "کسی خاص" سے کوئی "خاص" گفتگو کررہی تھی، شاہ کرکے۔ سرورق پر ایک ہیرو نما شخص کوئی خاص چیز دیکھ کے ہنس رہا تھا جبکہ ایک ولن ٹائپ شخص سے اس کی ہنسی شاید برداشت نہیں ہورہی تھی تو وہ ریوالور سے اس کی آنکھ میں نشانہ لگا رہا تھا، شاہ کرکے۔ یہ تھا مختصر سا پوسٹ مارٹم سرورق کا۔ اب ورق الٹا اور دھڑام سے چینی نکتہ چینی یعنی چینی کم اور مرچ مسالے زیادہ والی دیگ میں گر پڑے۔ ہائے اوئے۔ ٹاپ نمبر پر آمنہ صداقت، صداقت بھری خبروں کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان تھیں، مبارکاں۔ خبرنامہ بڑا جامع اور مزاح کا عنصر لیے ہوئے تھا، پسند آیا۔ واقعی کرسیِ صدارت کی حق دار تھیں۔ ٹاپ 2 پر محمد کبیر کی آمد بھی خوب تھی اور نمبر 3 پر آمنہ پٹھانی کا عذر بھی ہم نے دل سے قبول کیا۔ نازک مزاج کرن صاحبہ خوش آمدید۔ باقی تبصرہ جات میں صحرائے ڈی سیال کی وضاحت، مونا گل آف بنوں کی رائے، کبیرا اقبال کی شمولیت، ماہ تاب گل رانا کی فکر انگیزی، ماہا ایمان کی ادھوری خواہش اور تفسیر عباس کے خوب صورت الفاظ پسند آئے۔ اور جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے وہ دل چھوٹا نہ کریں۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اسما قادری کی گرداب پڑھی۔ ماہ بانو کی شادی اسلم سے ہو ہی گئی۔ شہریار کی حالت ہم نے اپنے دل میں محسوس کی، شاہ کرکے۔ للکار میں عمران کے ہنگامے زور و شور سے جاری ہیں مگر اس میں فرضی پن نمایاں ہے۔ جاسوسی کی پہلی کہانی کاشف زبیر کی جنون بس گزارے لائق تھی مگر اس میں حد سے زیادہ فرضیات کا عمل دخل تھا مگر بے اختیار خالد کی عظمت کو سلام کرنا چاہا، اس کا کردار بہت زبردست تھا۔ اس کے بعد ہم نے سرورق کے شوخ رنگوں میں خود کو رنگنا چاہا، شاہ کرکے۔ اور پہلا رنگ ہی ہم کو دونوں آنکھوں نہ بھایا۔ کہانی در کہانی میں جھوٹ کا پلندا نمایاں تھا۔ سرور اکرام صاحب نے بے شک بڑی محنت کی ہوگی۔ دوسرا رنگ دیوانگی اچھا رہا۔ شائلہ اور اکرام کے کردار اچھے لگے اور کامران انجامِ بد سے دوچار ہوا، شاہ کرکے۔ چھوٹی کہانیوں میں منزلِ عشق، محبت کی خاطر اور زیرِ زمین زبردست لگیں۔ اور آل جاسوسی مزے دار تھا، شاہ کرکے۔"

راجن پور سے ماہ تاب گل کی "کامیابی" جاسوسی سات تاریخ کو علاوہ بھی ریکارڈ چکر لگانے کے بعد۔ انکل جی جی جی! کہاں گیا آپ کا جاسوسی کو ہم تک جلد پہنچانے کا وعدہ؟ (ہم بھی آپ سب کی طرح ہڑتالوں، احتجاج اور لوڈشیڈنگ کے مارے ہیں، تاہم تاخیر پر آپ سب سے معذرت) سرورق حسینہ تبصرہ نگار برادران کی بے تابیوں کو نظر انداز کرکے بڑی فرصت میں فون پر لگی ہوئی تھی۔ نیچے ایک صاحب ایسے منہ لٹکائے ٹھہرے تھے جیسے کسی نے زبردستی ان کے ہاتھ میں پستول تھما دیا ہو۔ خیر، اس مرتبہ بس غصے میں ہوں۔ (وہ کس خوشی میں؟) اس لیے سرورق پر نو تبصرہ۔ آج کی تازہ خبر

جنتیاں سے آمنہ صداقت نے کرسیِ صدارت کے سب امیدواروں کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے اپنے زبردست خبرنامے کے ساتھ نمبر ون کا خطاب حاصل کرلیا۔ کرسیِ صدارت پر ان کی موجودگی کی وجہ ان کا خبرنامہ ہے یا انکل جی کے لیے لایا گیا گلاب جامنوں کا ڈبا۔ اس بات کی تحقیق جاری ہے۔ (اچھا... ہم تک تو نہیں پہنچا... پتا چل جائے تو ہمیں مطلع ضرور کیجیے گا) خیر، ہماری طرف سے مبارک باد کیونکہ رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔ ارے یاد آیا آپ سب کے لیے ایک نیوز، اب یہ آپ لوگوں کی مرضی ہے گڈ نیوز کہیں یا بیڈ تو بات یہ ہے کہ آپ کی بہن ماہ تاب نے اپنے مقامی ریڈیو چینل FM-104 کو جوائن کرلیا ہے۔ جی ہاں گیارہ مارچ کو میں آڈیشن دینے گئی اور 17 مارچ کو میرا پہلا پروگرام آن ایئر ہوا۔ (بہت بہت مبارک ہو۔ اب مصروفیت کا بہانہ بنا کر غائب نہیں ہوجایئے گا) تحریروں میں سب سے پہلے سردار کہانی للکار کو پڑھا اور ہمیشہ کی طرح مزہ ہی آگیا۔ تقریباً سب کردار مل گئے ہیں۔ تحریر اپنی اینڈنگ کی طرف جارہی ہے۔ گرداب میں ماریا کے انجام پر خوشی ہوئی بس جلدی سے چودھری کے کالے کرتوت بھی سامنے آجائیں تو مزہ آجائے۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر نے کافی عرصے کے بعد تہلکہ مچا دیا۔ جنون زبردست تحریر رہی۔ معاشرے میں اتنے گندے کردار بھی پائے جاتے ہیں۔ عورتوں سے نفرت اپنی جگہ لیکن جسے رشتوں کا پاس ہی نہ ہو، کوئی بھلا اپنی بیٹی کے ساتھ... اف خدایا، یہ سب پڑھ کے تو دماغ چکرا گیا۔ بہرحال، یہ تحریر اسٹوری آف دی منتھ قرار پائی۔ زیرِ زمین مریم کے خان کی اچھی چوائس تھی۔ انسانی دماغ کی رسائی کہاں کہاں تک پہنچی ہوئی ہے؟"

ناصر آسی کی میل "پہلی بار آپ کو میل کررہا ہوں۔ جاسوسی کے برسوں سے پرستار ہیں۔ اپریل کا جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ ہمیشہ کی طرح طاہر جاوید مغل کی للکار پڑھی۔ بہت شان دار تحریر ہے۔ سلیم انور کی شکاری اور احمد اقبال کی دیوانگی پسند آئی۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

صبا گل فرام مالاکنڈ ڈویژن کی چنگاریاں "آمنہ صداقت بہترین خط پر مبارک باد۔ آمنہ بہن! قصوروار ہم سب ہیں۔ کون کس سے کیا گلہ کرے؟ محسن علی! تم کیوں ٹھمن لگا رہے ہو انکل کو؟ تم ایسے پہنے خان آگئے کہ تمہیں صفحات کم پڑنے کا غم ہے۔ مارچ کے خط کے علاوہ میرے کون سے خط میں کہانیوں پر تبصرہ نہیں؟ مارچ کا خط میں نے اپنے خطوط میں شمار کیا ہی نہیں ہے۔ فضول اور بے جا چاپلوسی مت کرو، سمجھے؟ کبیرا اقبال! آمین میری بہن، تیمر مبارک۔ للکار کی یہ قسط بڑی ہی سنسنی خیز تھی۔ بے چاری ثروت کی بے بسی اور کسمپرسی نے دل بڑا دکھی کردیا۔ ہمارا معاشرہ یوسف جیسے بدطینت لوگوں سے بھرا پڑا ہے اور ثروت جیسی معصوم پریاں ان کے بیچ میں پستی جارہی ہیں۔ یہ قسط اپنے انداز میں جتنی اداسیوں بھری تھی، اتنا ہی عمران کی فائیو اسٹار باتوں نے اداسی کا عنصر کافی حد تک زائل کردیا تھا۔ اب شدت سے انتظار ہے کہ نصرت، تابش کو کیا خاص بات کہنے والی ہے۔ ابتدائی صفحات والی جنون، کاشف زبیر کی ایک اچھی اور پُرتجسس تحریر تھی۔ گرداب میں بھی خوب وحشتِ عشق ہورہی ہے۔ آرمی انٹیلی جنس والوں کا دشمن کے دانت کھٹے کرنا بہت بھلا لگا۔ کاش، حقیقت میں بھی یہ لوگ ایسے ہی رنگ و روپ اختیار کریں اور دشمن کو نیست و نابود کریں۔ آستین کا سانپ ماریا کی بے بسی کی موت پر جتنی خوش گوار خوشی ہوئی اتنی ہی اسلم، ماہ بانو کی شادی پر مایوسی ہوئی۔ اسما جی! یہ آپ نے کیا کردیا؟" (اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا... زندگی میں بہت کچھ مرضی کے مطابق نہیں ہوتا... یہ تو صرف ایک خط کی بات ہے... آپ کا حکم سرآنکھوں پر... یعنی مکمل رعایت کی حق دار آپ)

تلہ گنگ سے محمد وقار اعظم دھولر کی تجاویز اور خواہش "مدیر اعلیٰ کا اداریہ پڑھ کر دل میں وقت کے قیمتی ہونے کا احساس جاگزیں ہوگیا۔ کلیوں کی طرح مہکتے ساتھیوں کے تبصرے، ان کی آپس کی نوک جھوک اور گلے شکوے محفل کی زیب و زینت کا باعث رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے حسبِ معمول اپنے محبوب مصنف طاہر جاوید صاحب کے شاہکار کو پڑھا۔ الفاظ کا چناؤ، بیان کا تسلسل اور روانی، جذبات کا تلاطم اور لطیف احساسات کی ترجمانی غرض یہ کہ ہر معیار پر یہ کہانی پوری اترتی ہے۔ اس قدر جان دار منظر کشی کہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہو گویا ہم اسی ماحول میں موجود ہیں اور یہی بات للکار کو دوسری کہانیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسری سلسلے وار کہانی گرداب میں بھی یقیناً تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے، اچھا ہے۔ مختصر اور مغربی کہانیوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اگرچہ ایک کو ختم کرکے ان کی جگہ پر گوشۂ خاص کو دوبارہ شروع کردیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جس طرح پچھلے ماہ کاشف زبیر کی تحریر الجھاوا شمارے میں شامل کی گئی، ہر ماہ ایسی کہانیوں کو ضرور جگہ دینی چاہیے۔ سرورق کا ایک رنگ اگر مستقل طور پر احمد اقبال صاحب سے ان کے مخصوص پُرمزاح انداز میں لکھوایا جائے تو یقیناً شمارے کو چار کیا آٹھ چاند لگ سکتے ہیں۔ آخر میں پُرزور سفارش خط کو شامل کرنے کی نہیں، بلکہ علیم الحق حقی کی اگر کوئی تازہ کہانی نہ مل سکے تو کم از کم کسی پرانی کہانی کو ہی شمارے کی زینت بنایا جائے۔ ان گزارشات کے ساتھ ہی محبتوں، چاہتوں، عنایتوں اور شکایتوں کے اس صحرا سے پرخدا حافظ۔"

علی رضا آتش کی الٰہ آباد ضلع قصور سے بیزاری "اپریل کا جاسوسی 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق دیکھا تو محترمہ سرورق اتنے دن جاسوسی سے بے اعتنائی برتنے پر ہماری شکایت شاید آپ سے کررہی تھی۔ اس دفعہ سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ اس کے بعد اپنی محفل میں پہنچے۔ کرسیِ صدارت پر آمنہ صداقت لمبے تبصرے کے ساتھ براجمان تھیں۔ تبصرہ کچھ خاص نہیں تھا۔ خیر، مبارک باد رسمِ محفل ہی سہی۔ لاہور سے کرن جی آپ کی ساری صنف ہی صنفِ نازک کہلواتی ہے۔ اکیلی آپ ہی نازک نہیں ہیں۔ کبیرا اقبال صاحب، ہمایوں سعید راج اپنے نام کے ساتھ راج اس لیے لگاتے ہیں کہ وہ فلرٹ کے بعد باقی بچنے والے ٹائم میں راج گیری (مستری) کرکے گزارہ کرتے ہیں۔ ارے، یہ کیا؟ ہمارے تفسیر عباس بھائی کو کیا ہوگیا؟ یہ تو فلمی کی زبان بولنے لگے۔ اب محفل کا کیا بنے گا؟ ماہا ایمان! لگتا ہے کسی دکھ کی حالت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ خیر کرے۔ پہلے تبصرے کے علاوہ سارے تبصرے اچھے تھے۔ اس کے بعد اسٹوریز میں سب سے پہلے اپنی موسٹ فیورٹ للکار پڑھی۔ ان کی اکثر اسٹوریز کی طرح خاص تو نہیں تھی لیکن ٹھیک ہی تھی۔ اس کے بعد دوسرا رنگ احمد اقبال کے قلم سے دیوانگی پڑھی۔ رائٹر انکل نے ہیرو والی خصوصیات ولن میں اور ولن والی خصوصیات ہیرو میں ڈال دی تھیں۔

اسٹوری اچھی لگی۔ اس کے بعد سرورق کا پہلا رنگ سرورا کرام کی تحریر کہانی در کہانی بس ٹائم پاس اسٹوری تھی، بالکل اناڑی تحریر تھی۔ باقی چھوٹی اسٹوریز ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔" (ہمیں افسوس ہے... کچھ بھی آپ کو پسند نہ آسکا)

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاول پور کا یارانہ "اپریل 2012ء کا شمارہ مارکیٹ میں آتے ہی حیرت ناک واقعہ ہوا۔ آپ بھی سن لیجیے! (سنائیے) آگیا اور چھا گیا، والی بات ہوگئی۔ دو دن میں جاسوسی کے تمام شمارے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ یعنی بک گئے۔ میں جب شاہی بازار میں موجود بک اسٹال پر گیا تو سات بھائیوں کے مہینے نمبر والے بھائی نے جھنڈی دکھادی۔ انکل... سوری، آپ لیٹ آئے ہیں جو پہلے آئے گا، پہلے پائے گا کے اصولوں پر پابندی کیا کریں۔ میں نے اسے کہا بھئی، یہ ظلم نہ کرو۔ ظالماں دے ظلم دی آخیر ہوئی... شاہ... ملے کا ظلم دا بدلا۔ اس نے شیلف میں لگے ہوئے دوسرے شماروں کو الٹ پلٹ کیا تو جاسوسی کے چار شمارے نکل آئے۔ وہ بولا۔ میں تو سمجھا تھا تمام فروخت ہوگئے۔ ایک شمارہ اس نے مجھے دیا۔ گرداب کی قسط نمبر 34 نے ولولہ انگیز تیزی دکھائی۔ گرفت میں لے لیا۔ کاشف زبیر کی پہلی کہانی جنون سطر سطر ہنگامہ خیز رہی۔ سرورق کی کہانیوں کا مطالعہ جاری ہے۔ پھر مغربی کہانیوں کی باری ہے۔ خط ضرور شائع کریں۔ اپنی جاسوسی سے پرانی یاری ہے۔"

مری سے کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار "ماہ اپریل 2012ء کے شمارے میں خوش آمدید۔ اشتہارات سے چھلانگ لگا کر مین مینیو پر پہنچے جہاں اولین صفحات پر کاشف زبیر اور رنگوں میں احمد اقبال کو دیکھ کر پسندیدگی سے سر ہلا دیا اور جلدی سے محفل کی طرف بڑھ گئے۔ اداریے میں مدیرِ اعلیٰ کی دعا پر آمین کہا۔ ہم نے ایک دفعہ ڈاکٹر یونس بٹ کی کتابوں سے بہت سے اقتباسات آپ کو بھیجے تھے مگر ہمارا تبصرہ تو شائع ہوگیا تھا مگر اقتباسات نہ ہی شائع ہوئے تھے نہ ان کا کوئی ذکر کیا آپ نے۔ (آپ کا بھیجا ہوا مواد وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا رہے گا) آصفہ صداقت کا تبصرہ بہت زبردست اور منفرد تھا۔ آمنہ پٹھانی! اَسّی آپ خود کرتی ہیں اور الزام محکمۂ ڈاک پر؟ وہ ہمارے علاقے کا ایک محاورہ ہے کہ اپنی لسی کو کھٹا کون کہتا ہے تو وہ والی بات آپ کی ہے۔ محمد جاوید کا کہانیوں پر تو تبصرہ اچھا تھا مگر تبصروں پر کمنٹ کرتے ہوئے یہ کافی سیریس ہوگئے۔ بھائی میرے، یہاں ہم کسی پر اگر کوئی طنز کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف شغل میلہ ہوتا ہے نہ کہ کسی کو نیچا دکھانا۔ امید ہے باقی لوگ بھی میری اس بات سے متفق ہوں گے۔ (جی بالکل، اس محفل کے تمام ساتھی شیروشکر کی طرح ہیں) مقصود الحسن آپ کہیں تو اپنی عرفیت شہزادہ کوہسار سے شہزادہ محفل رکھ لوں؟ تفسیر عباس آپ نے تو جواب درست مان لیا مگر ماہا ایمان نے تو چپ ہی سادھ لی۔ ہاں یاد آیا، خاموشی نیم رضامندی ہی ہوتی ہے۔ غیر حاضر دوستوں سے درخواست ہے اپنی حاضری یقینی بنائیں ورنہ محفل سے نام کاٹ دیا جائے گا۔ گرداب کا اینڈ پڑھ کر تو سانس رک گیا۔ کوکہ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اتنی دیر میں شہریار کسی وجہ سے گاڑی سے نکل گیا ہوگا مگر اسما قادری جتنا حقیقت کے قریب لکھ رہی ہیں، ان سے کوئی بعید نہیں کہ شہریار کو مروا ہی نہ دیں۔ گرداب کی اس قسط کو ہم نوے نمبر دیتے ہیں۔ للکار میں عمران کی مزاحیہ گفتگو، خوب صورت منظر نگاری، کردار نگاری اور خوب صورت الفاظ کے چناؤ کی وجہ سے ہم اس قسط کو ستر نمبر دیتے ہیں۔ کاشف زبیر کی جنون اچھی کہانی تھی۔ کہانی کی اٹھان تو بہت زبردست تھی۔ لگتا تھا یہ بہت سے کرداروں پر مشتمل ایک پُرپیچ داستان ہوگی مگر ایسا نہ ہوا۔ کہانی میں کچھ جھول بھی دیکھنے کو ملے۔ بہرحال، ہم اس تحریر کو ساٹھ نمبر دے کر فرسٹ ڈویژن میں پھر بھی پاس کر دیتے ہیں۔ احمد اقبال کی دیوانگی نے بہت مایوس کیا۔ ان کی تحریر کو ہم نے چالیس نمبر دے کر بمشکل پاس کیا۔ سرورا کرام کی کہانی در کہانی وقت گزاری کے لیے ٹھیک تھی۔ ان کے اندازِ تحریر میں سسپنس تو بہت ہوتا ہے مگر ایک جیسے جملوں کی بار بار تکرار کی وجہ سے کافی بوریت ہو جاتی ہے۔ ان کی تحریر کو ہم نے پچاس نمبر دیے۔ صنوبر ریاض کی محبت کی خاطر ایک اداس کر دینے والی تحریر تھی۔ پسند آئی اور پینسٹھ نمبر لینے میں کامیاب رہی۔ شکار میں ہمیں اینڈ کا پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ اس تحریر نے پچپن نمبر حاصل کیے۔ ذہانت سراغ رسی کا شاہکار ثابت ہوئی۔ اس تحریر کو ہم نے اسّی نمبر دیے۔ مریم کے خان کی زیرِ زمین بھی زبردست رہی گو کہ اس کا پلاٹ پرانا تھا۔ بہرحال، یہ تحریر بھی اسّی نمبر لینے میں کامیاب ہوگئی۔ جمال وتی کی بندوبست بھی ایک خوب صورت تحریر ثابت ہوئی۔ یہ تحریر پچھتر نمبر لینے میں کامیاب رہی۔ کترنیں چالیس نمبر لے سکیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جاسوسی قسط وار اور مختصر تحریروں کے حوالے سے کامیاب جا رہا ہے مگر اولین تحریر اور رنگوں میں جاسوسی کا وہ والا معیار نہیں رہا جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے ہوتا تھا۔ وجہ نئے مصنفین کا نہ ہونا ہے۔ پرانے مصنفین اب اتنے کمرشل ہو گئے ہیں کہ وہ کہانی پر اتنی توجہ نہیں دیتے جتنی توجہ کی وہ متقاضی ہوتی ہے۔ یہ تھا ہمارا تجزیہ، پتا نہیں آپ اس سے متفق ہوتے ہیں یا نہیں۔ بہرحال، ہم نے اپنی رائے آپ تک پہنچادی۔ اور ہاں، مجموعی طور پر جاسوسی ساٹھ نمبر لینے میں کامیاب رہا۔ ٹائٹل اور سرورق کی کہانیوں کی وجہ سے زیادہ نمبر کاٹے گئے۔" (بہت بہت شکریہ ماشر صاحب)

مشائم صوابی سے لکھتی ہیں "اپریل کا شمارہ خلافِ معمول 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کچھ معمول سے ہٹ کر تھا۔ تاہم پسند آیا۔ چپٹی ناک والی حسینہ رات گئے نہ جانے کس سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے میں معروف تھی۔ اس سارے قصے سے بے نیاز پیچھے بندہ بندر نما مخلوق پر پستول تانے کھڑا تھا اور وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے مسکراہٹ پاس کر رہا تھا۔ سرورق کے پوسٹ مارٹم سے فارغ ہونے کے بعد اشتہارات کو پھلانگتے اپنی محفل چینی، نکتہ چینی میں پہنچے جس میں چینی کے بحران کے باوجود چینی زیادہ تھی۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا جس میں انکل جی بہار میں خزاں کے نوحے پر کچھ غمگین تھے۔ ہم بھی خاصے اداس ہوگئے۔ کراچی سمیت ملک کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ محفل میں فرنٹ سیٹ پر آصفہ صداقت مائیک پکڑے مزے دار چٹ پٹی خبروں کے ساتھ حاضر تھیں۔ تبصرہ واقعی شان دار تھا، مبارکاں جی۔ باقی دوستوں میں تفسیر عباس، ماہا ایمان، علی آتش، آمنہ پٹھانی سمیت دوسرے دوستوں کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ پرانے دوستوں میں ہمایوں سعید، ام ثمامہ، جہانگیر کوندل اور نعمان پیارے غائب تھے۔ راج صاحب تو بلیک لسٹ میں آرام فرمارہے تھے۔ ماہا ایمان! ہم بھی شہزادہ صاحب سے متفق ہیں کہ یا تو آپ نوشی چودھری ہو یا روشانے صنم۔ اب آتے ہیں

کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے مغل انکل کی شان دار تحریر للکار پڑھی۔ انکل اتنی خوب صورت تحریر لکھنے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ گرداب میں بھی تیزی آگئی ہے۔ ماہ بانو کی اسلم سے شادی بالکل اچھی نہیں لگی۔ کاشف زبیر کی جنون جاسوسی کے معیار کے مطابق ایک شان دار تحریر تھی۔" (اللہ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیابی عطا کرے آمین)

کبیر والے اختر عباس تھراج، ظفر اقبال کی شمولیت "اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ سات تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے معذرت کے ساتھ دو سال سے محفل میں شرکت نہ کر سکے کیونکہ تعلیمی معروفیات ہی کچھ اس طرح سے تھیں۔ بہرحال جاسوسی کو پڑھنا کبھی نہ چھوڑا تھا اور نہ ہی چھوڑیں گے۔ ٹائٹل کو پھلانگتے ہوئے فوراً چینی، نکتہ چینی کی طرف بڑھے کیونکہ خدشہ یہی تھا کہ ٹائٹل پر ماہا ایمان، تفسیر عباس بابر کو فون کال کے ذریعے غصے کے ملے جلے تاثرات سے کچھ سمجھانے میں معروف ہیں اس لیے ہم تو بھئی بھاگ کر دوستوں کی محفل میں آئے۔ آصفہ صداقت سرِ فہرست نظر آئیں مگر ان کا خبرنامہ پسند نہیں آیا کیونکہ اس میں جاسوسی ڈائجسٹ کے موسم کا حال تو بتایا نہیں انھوں نے۔ کبیر عرف شہزادہ جی! ہمایوں سعید صنفِ نازک کے ہاتھوں بک چکے ہیں اور ان کی تعریفیں کرتے رہیں گے۔ فتح پور لیہ سے آمنہ پٹھانی جی! آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ چمن شاہ سے آگے لیہ کتنی دور ہے؟ کیونکہ ہم چمن شاہ بھی آتے رہتے ہیں۔ پلیز، اس کی وضاحت کرنا، نوازش ہوگی۔ علی آتش! یار آپ اپنے آپ کو پہچاننے سے کیوں انکار کر رہے ہو؟ پچھلے جاسوسی کے سرورق پر آپ ڈھانچا بنے جاسوسی پکڑے ہوئے تھے مگر نام تفسیر عباس کا جڑ دیا، ہاہاہا۔ بہرا ئے ڈی سیال صاحب! آپ نے یاد کیا ہم آگئے۔ آپ کی مہربانی آپ نے اتنا عرصہ یاد رکھا۔ ماہا ایمان صاحبہ! لگتا ہے تفسیر بھائی نے آپ کی بولتی بند کردی ہے۔ اس دفعہ آپ نے پورا تبصرہ اسٹوریز پر کیا۔ اس لیے میں کہتا ہوں تفسیر بھائی سے پنگا از ناٹ چنگا۔ سمجھ گئیں نا آپ...؟ تفسیر عباس آئی لائک یو ویری مچ۔ اگر تبصروں پر میں، مارکس دیتا تو آپ کا تبصرہ پہلے نمبر پر ہوتا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے للکار پڑھی، مزہ آگیا کیونکہ عمران کی شاہین سے ملاقات جو ہوگئی۔ اتنے عرصے بعد، تابی کو اپنی منگیتر کا شادی شدہ ہونا ایک شاک محسوس ہوا مگر یہ قسط بہت ہی اچھی تھی۔ گرداب کو پڑھا تو اسما جی کی تعریف کرنا پڑے گی۔ کہانی ٹھیک جا رہی ہے۔ احمد اقبال کا لاسٹ رنگ دیوانگی بہت اچھا لگا مگر اس کا اینڈ ٹھیک نہیں تھا کیونکہ کامران جو اچھا نظر آتا تھا، اس کو قتل کرنا بالکل ٹھیک نہیں لگا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

جلال پور بھٹیاں سے ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل کا انداز "یقین جانیے اتنا خوش میں ایم اے اسلامک ہسٹری اور ایم ایڈ (S.T.E) کی اسناد وصول کرتے وقت نہیں ہوا تھا جتنا اپنا تذکرہ پیارے جاسوسی میں دیکھ کر ہوا۔ جن سے پیار ہوتا ہے اور جو اپنے ہوتے ہیں، نوک جھوک بھی ان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ اپنائیت کی علامت ہے۔ ہم تمام قارئین اور نکتہ چینی جو کہ جاسوسی کو اپنا محبوب اور مرکز مانے ہوئے ہیں، ایک خاندان کی طرح ہیں۔ ایک گھر میں رکھے برتن بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں اگر کسی پر تنقید کی جائے تو خود بھی اس کو سننے کے لیے بڑے دماغ اور کھلے دل کے ساتھ تیار رہنا چاہیے۔ کاشف زبیر نے کمال کا جنون دکھایا۔ قاتل روزین کو مجنوں کی نہیں بلکہ خالد کی لیلیٰ نے واصلِ جہنم کیا۔ للکار مغلیہ سے ارض جاسوسی بھی کانپ اٹھی۔ اپنی آن، بان اور شان کے ساتھ عمران نے نیاز محمد کو معاف کیا۔ تھانوی صاحب نے عمران کو بارش میں بھگو کر طبِ روحانیت کو جلا بخشی۔ تابی کو ثروت بھی اگلی چند اقساط تک ملنے کی توقع ہے۔ گرداب حسبِ معمول شان دار تھی۔ سرورق پر ڈاکٹر انکل نے خوب محنت کی۔"

چکوال سے انفال مرزا، صبا مرزا کا عذر "ہمارا دوست جاسوسی بڑے انتظار اور مشکل سے سات اپریل کی رات کو ملا۔ ڈاکٹر انکل! اس دفعہ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا، بس ٹائٹل گرل کی آنکھیں اور بالوں کا کلر پیارا تھا۔ باقی کلر گزارہ ہی تھے۔ اپنی بزم میں قدم رکھا جہاں پر آصفہ صداقت کھٹی میٹھی خبروں کے ساتھ صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے تھیں۔ آپ کے تبصرے سے ہمارا موڈ قدرے بہتر ہوگیا۔ اسی بات پر آپ ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد کے گلدستے قبول کریں۔ ویسے کیا آپ ہیرو بھائی کی شاگردی میں ہیں۔ کرن آپ کو ویلکم کہتے ہیں، بس اپنی کرنوں کے ساتھ اس محفل میں آتی رہیے گا۔ ماہ تاب گل رانا آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل خوش آمدید۔ اب کچھ بات کرتے ہیں کہانیوں کی۔ دیوانگی اچھی اسٹوری تھی۔ شائلہ کے فیصلے سے ہمیں دیوانگی نظر آئی۔ کہانی در کہانی اپنے نام کی طرح تھی اس لیے کہ شروع سے لے کر اینڈ تک یہی محسوس ہوتا رہا کہ پہلے بھی نظروں سے گزر چکی ہے۔ جنون کہانی ذرا ہٹ کے تھی۔ کہانی میں زیادہ اہم کردار کمپیوٹر کا تھا۔ للکار ابھی پڑھی نہیں البتہ انفال نے اتنا بتایا ہے کہ مغل انکل نے ثروت کی دوبارہ انٹری کردی ہے کہانی میں۔ باقی گرداب میں پھنسنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں اور بھی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی واپسی

"دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اسی لیے کچھ عرصہ ہم غمِ روزگار کی وجہ سے اپنی محبوب محفل سے دور ہو گئے مگر اتنی دور نہیں کہ یہاں کی سرگرمیوں کی کوئی خیر خبر نہ ہو، ہم نے کوئی مراسلہ بے شک نہیں بھیجا مگر پڑھے سب کے تھے۔ سب کا ہمیں جلدی فراموش کر دینا غیر متوقع نہیں تھا۔ اس دفعہ ارادہ ہے چند معزز افراد سے بطور قرض کچھ رقم لے جاؤں تا کہ وہ میرے ذکر سے غافل نہ رہیں۔ (اچھی ترکیب ہے...) جاسوسی حسبِ عادت 4 تاریخ کو قریبی بک اسٹال سے لیا۔ سرورق والی قدیم طرز کا ہے کیونکہ خاتون کا موبائل کے بجائے تار والے فون کے ساتھ بستر میں لیٹ کر بات کرنا آج کے دور کی عکاسی بالکل نہیں۔ شاید ڈاکٹر انکل نے اپنی جوانی کی کوئی یاد تازہ کی ہے۔ باقی صنفِ وجاہت کو ہمیشہ کی طرح غیر جمالیاتی انداز میں پیش کیا گیا۔ محفل میں وارد ہوئے تو مدیرِ اعلیٰ کا مہنگائی کی تم گری پر نوحہ کناں پایا۔ کوئی پاکستانی ہی ہوگا جو ان حالات میں مطمئن ہو اپنے اردگرد سے۔ آصفہ صداقت کا خبرنامہ بہت اچھا تھا اس لیے دوستوں کے لیے موزوں خبریں، دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ امید کرتا ہوں تفسیر بابر عباس اور ہمایوں سعید ضرور خوش آمدید کہیں گے۔ باقی کسی

تبصرے پر کوئی تبصرہ نہیں، میں تنقید نہیں کرسکتا کیونکہ میں ابھی خود بے ترتیب عبارات لکھتا ہوں، تعریف ہی کرتا ہوں سب کی جو خوشامد اور تکمن بن جاتی ہے دوسروں کی نظر میں۔ کہانیوں کا رخ کیا تو للکار بلا مقابلہ سبقت لے گئی۔ للکار میں ثروت کی واپسی خوش آئند ہے۔ عمران کی سوچ بالکل درست ہے۔ دیوداس بننے سے کبھی کچھ نہیں ہوتا، ہر انسان جس کو گمان ہو کہ وہ کسی کے لیے لازم ہے، اس کا ابہام دور کردینا بہت بہتر ہوتا ہے۔ گرداب میں ماریا کا انجام حسبِ توقع ہوا۔ امید ہے چودھری کے کرتوت بھی جلد کھل کر سامنے آجائیں گے۔ ماہ بانو کی شادی ہوگئی مگر مجھے لگتا ہے اسامہ اس کا گھر بسنے نہیں دیں گی۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر کی جنون کا مطالعہ کیا۔ یہ ایک عمدہ سراغ رسانی کی کہانی تھی۔ مغرب میں مشرق سے زیادہ انتہا پسند موجود ہیں مگر بین الاقوامی میڈیا صرف مسلمانوں اور بالخصوص پاکستان کے خلاف اپنا زہر اگلنے میں لگا ہوا ہے۔ سرورق کے رنگوں میں سرور اکرام کا پہلا رنگ کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکا۔ بس انجام غیر متوقع تھا۔ سرورق کے دوسرے رنگ میں احمد اقبال کے قلم کا جادو سرچڑھ کے بولا گر کہانی ختم کرتے کرتے ہم خود الجھ گئے۔ شائلہ نے آخر میں بہت الوکھا اور فیصلہ کن انتخاب کیا۔ مریم کے خان کی زیرِ زمین میں جو زیرِ زمین آبادی کا نقشہ پیش کیا گیا، وہ ہالی ووڈ کے سپر اسٹار سلویسٹر اسٹالون کی ایک فلم "ڈیمولیشن مین" سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ ایک شادی میں مصروفیات کی وجہ سے مکمل رسالے کا مطالعہ نہیں کرسکا۔ اس لیے مختصر کہانیوں پر تبصرہ آئندہ کے لیے محفوظ رکھتا ہوں۔" (ضرور)

سید عبادت علی کی ڈی آئی خان سے خیرنال آمد "سخت گرمی کے موسم میں جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ تبصروں کی محفل میں آصفہ صاحبہ پوری کی پوری جیو نیوز بنی ہوئی تھیں۔ لگتا ہے انہوں نے ماہا ایمان کی جگہ لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تفسیر عباس جی تسی گریٹ ہو خیرنال آپ کے تبصرے کو پڑھ کر قسم سے صنفِ نازک کو پسینا آگیا ہوگا۔ (اور آپ کو نہانا...) کرن فرام لاہور اینڈ فرید فرام لکی مروت ویلکم جی خیرنال۔ آمنہ پٹھانی کیسی ہوگی آپ۔ دلنشین بلوچ اور ہمایوں کہاں غائب ہو؟ بلال کا تبصرہ بھی جان دار تھا خیرنال۔ جلدی جلدی کہانیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی اور جھٹکے پہ جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔ (آرام سے...) ماریا کی موت سے بہت خوشی ہوئی۔ ماہ بانو اور اسلم کی شادی ہو ہی گئی خیرنال۔ اور اسامہ یہ گاڑی میں شہریار تھا نہ تو کیا وہ بھی مرگیا خیرنال۔ آپ کی اسٹوری میں بہت مر رہے ہیں۔ طاہر مغل جی کے کیا کہنے، ثروت کو ملا ہی دیا، آخرکار تابش سے لیکن وہ شادی شدہ ہے خیرنال۔ کاشف زبیر کی مغربی طرز پر لکھی گئی کہانی زبردست تھی۔ رنگ دونوں بہترین تھے لیکن سرور اکرام نے بے چارے ریحان کے ساتھ اچھا نہیں کیا اور آخر میں یہ کہوں گا کہ میرا خط ضرور شامل کیجیے گا۔"

طاہر وگلزار کی آمد پشاور سے "چینی بکنے چینی کے کھٹے میٹھے دوستو! آصفہ صداقت کا خبرنامے کے انداز میں کیا گیا تبصرہ کچھ خاص نہیں تھا لیکن اس کوشش کو مان لیتے ہیں مبارک ہو (مبارک شہ) قصور سے علی آتش صاحب! یہ آپ آگ بگولہ کیوں ہورہے ہیں۔ او ہو محمد جاوید بلوچ صاحب اپنے اوپر کتنا غرور۔ اور یہ لڑکیاں آپ کو کب سے پسند کرنے لگی ہیں جی، نہ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت... مقصود الحسن طاہر بھائی! آپ خود بہت اچھے ہیں۔ میری دعائیں تو سب دوستوں اور خاص کر بھائیوں کے لیے تو ہر وقت ہیں۔ آپ، تفسیر عباس، بابر عباس، آغا فرید خان اور عمیر تو میرے بہت پیارے بھائی ہیں اور عرفان آف کوئٹہ اور نعمان بیچارے تو میرے بیٹے بنے ہوئے ہیں، بہت اچھے ہیں دونوں۔ کیوں تفسیر بھائی ماہا کے انکل کہنے سے آپ کو اتنا غصہ کیوں آرہا ہے؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے اس کا کوئی انکل آپ جیسا ہو۔ حسنین بلوچ صاحب! اب تو آپ غائب ہی رہنے لگے ہیں۔ جی ہمایوں سعید راج صاحب! یہ آپ کس غرض سے لڑکیوں کی تعریف کے پل باندھ رہے ہیں۔ بقول آپ مردوں کے، عورت کے پاس دماغ ہے لیکن عقل نہیں لیکن کم از کم اتنی ضرور ہوگی کہ وہ آپ سے دور، دور رہتی ہیں۔ اب کہانیوں پر تبصرہ۔ پہلا رنگ کہانی در کہانی سچ کہا ہے کہ مجرم کچھ بھی کرے لیکن قانون کے ہاتھوں سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ دوسرا رنگ دیوانگی پڑھی۔ احمد اقبال لکھیں اور ان کے الفاظ اپنا اثر نہ چھوڑیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ واقعی اس کہانی میں ہر کردار دیوانگی کی حد پار کررہا تھا۔ لیکن جیت ہمیشہ سچ اور سچی محبت کی ہوتی ہے۔ کالی بھیڑ مختصر سی کہانی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے ہمارے قانون اور پولیس کے اندر کی کالی بھیڑ کی نشاندہی کی۔ للکار آدھی پڑھی ہے کیونکہ میری طبیعت خراب ہے جس کی وجہ سے میں کچھ زیادہ نہ پڑھ سکی۔" (اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یاب کرے...)

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے رانا حبیب الرحمٰن کی آہ و زاریاں "اس دفعہ طویل انتظار کی گھڑیاں، سولی پر لٹکتے ہوئے آخر 7 تاریخ کو جاسوسی کے دیدار ہوئے تو کچھ سکون ہوا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو سوچا واقعی بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مصیبت میں مسکرانا چاہیے یا مصیبت یا پریشانی ہنس کر جھیلنی چاہیے۔ زیرِ نظر تصویر میں آدھے ماتھے کا اوپری حصہ خالی ہونے کے اور ریوالور اپنے اوپر تنے ہونے کے باوجود مسکرا رہا تھا۔ اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے محفل میں جا پہنچے۔ دیکھا تو چشتیاں سے ایک صنفِ نازک آصفہ صداقت کرسیِ صدارت، میرا اصل مطلب کسی نیوز اسٹوڈیو کی کرسی پر بیٹھ کر خبریں پیش کررہی تھیں۔ آصفہ صاحبہ کہیں آپ نیوز کاسٹر تو نہیں رہ چکیں جو اتنی تفصیل سے خبریں بتا رہی تھیں۔ آپ کا تبصرہ بہترین، مزے دار اور کرسی یا ترقی کے لائق تھا۔ تیسرے نمبر پر آمنہ پٹھانی صاحبہ قسمت کے کھیل ہمیشہ نرالے ہی ہوتے ہیں آپ کے خطوط شائع نہ ہونے والی ہم نہیں مانتے کیونکہ اگر آپ جنوری 2012ء سے لے کر اپریل 2012ء تک دیکھیں گی تو ہر ماہانہ ڈائجسٹ میں میرا نام صرف اور صرف بلیک لسٹ میں ہوگا۔ لاہور سے کرن صاحبہ اتنی نازک اندام نکلیں کہ آتے ہی چھا گئیں، شکر کرے۔ جیسے آج کل کی ماڈل گرلز چھا جاتی ہیں زمانے پر... خوش آمدید کرن صاحبہ اور مبارک ہو۔ اب چلتے ہیں ان 28 دوستوں کی طرف جو بلیک لسٹ میں شامل ہیں۔ بھئی دوستو! گھبرانا نہیں۔ مصیبت میں گھبرانا نہیں چاہیے۔ میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔ آپ جب بھی محفل میں پریشان ہو تو آجانا اپنے دوست کی طرف پھر مل کے کریں گے آہ و زاریاں اور رونق دوبالا ہوجائے گی۔ اس کے بعد آتے ہیں کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے للکار پڑھی جہاں آخرکار تابی کو اس کی ساجدہ مکمل مل ہی گئی۔ اب دیکھتے ہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے تابی اور

عمران کو کیا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے یہ قسط پڑھتے وقت رونا آگیا تھا اتنی دکھی لگی بس کیا بتاؤں... اتنا دکھ اس کے اوپر دوسرا دکھ رسالہ لیٹ ملنے کا اور اس کے اوپر تیسرا دکھ اپنا نام مسلسل بلیک لسٹ میں تقریباً 6 ماہ سے دیکھ کر اور سب سے بڑھ کر جو دکھ ہے، وہ ہے جیل میں رہائشی کال کوٹھری۔ اتنے دکھ ایک ساتھ ہونے پر اتنا دکھی ہوں کہ کچھ دماغ کام نہیں کررہا اس لیے کہانیوں کے بارے میں تبصرہ نہ کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔" (بھئی اتنا دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنے دوستوں کے خط پڑھ کر خوش ہوجایا کریں... آپ نہ سہی وہ سہی... لیکن اب دوست خوش ہوں گے آپ کا خط شامل پا کے)

محسن علی موم بالاکوٹ سے لکھتے ہیں "اس ماہ جاسوسی اس وقت ملا جب ہم اس کی آمد سے تقریباً مایوس ہی ہوچکے تھے۔ اس لیے جب جاسوسی اچانک ہی اسٹال پر لگا نظر آیا تو ہم نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جس کا جاسوسی اور اسٹال والے نے بُرا منایا۔ ٹائٹل پر موجود لڑکی نما عورت نہ جانے کس سے محو گفتگو تھی کہ اس نے ہم پر نگاہِ غلط بھی ڈالنا گوارا نہ کیا۔ محفلِ یاراں میں کرسیِ صدارت کی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی۔ بھائی ظاہر ہے جب عقل مندوں کی کرسی پر عقل سے پیدل صنف ہو تو کرسی کیسے خوشی محسوس کرسکتی ہے؟ آصفہ صداقت آپ کی صداقت کے تو کیا ہی کہنے۔ بہرحال مبارک باد قبول کیجیے۔ مونا گل آف بنوں! شکر کریں کہ اپنے ہمایوں صاحب کسی چیز میں تو سرِفہرست ہیں۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان نے چونکا دینے والا انکشاف کیا کہ خوشی ابھی ادھوری ہے۔ تفسیر عباس کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شان دار تھا۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ ان کی شاگردی میں چلے جائیں تاکہ تھوڑے بہت ہم بھی لفاظی میں طاق ہوسکیں۔ (اچھا خیال ہے فوراً عمل پیرا ہوجائیں) دلنشین ہمیشہ کی طرح پردۂ اسکرین سے آؤٹ ہیں۔ کہاں ہیں جی، محفل میں حاضری دیں ورنہ انکل سرچ وارنٹ جاری کردیں گے۔ اور آخر میں سب دوستوں کو کھلے دل سے دعوت ہے اگر کوئی ناران، کاغان، شوگران دیکھنا چاہے تو ہمیں اس کی خدمت کرکے خوشی محسوس ہوگی۔ کہانیوں میں حسبِ سابق سب سے پہلے للکار کو کھنگالا جہاں ہمیشہ کی طرح ہیروئن شادی شدہ نکلی۔ اب اپنے تابی صاحب علیزے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائیں گے۔ گرداب میں اسلم اور ماہ بانو کی شادی نے ہمیں تھوڑا افسردہ اور غم زدہ کیا لیکن پھر اے بی صاحب کی طرح ہم بھی تقدیر پر شاکر ہوگئے۔ کشور اور آفتاب ایک بار پھر منظر سے غائب ہیں۔ کہانی اب ٹھیک جارہی ہے۔ (شکریہ) سرورق کی پہلی کہانی دلچسپ رہی۔ دیوانگی میں انعام کا کردار خوب رہا اور کامران اپنی منفی اہمیت کی وجہ سے اپنے بُرے انجام کو پہنچا۔ پہلے صفحات پر جنون اچھی تحریر تھی۔ خالد نے اپنی ذہانت سے تیس سال پہلے دفن شدہ کیس میں جان ڈال دی۔"

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی تھکان "جاسوسی اس دفعہ لیٹ ملا۔ اس دفعہ پھر جاسوسی کا ٹائٹل ذرا اچھا نہیں لگا۔ سوائے ریسیور کے۔ اس کے بعد ہمیشہ کی طرح اشتہارات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے اپنے دوستوں کی محفل میں آگئے جہاں صدارت کی کرسی پر آصفہ صداقت براجمان تھیں، بہت بہت مبارک۔ دوسرے نمبر پر محمد کبیر عرف شہزادہ موجود تھے۔ کبیر صاحب میں آپ سے تو یقیناً کم ہی ویلی ہوں۔ آمنہ پٹھانی بہن، آپ کا حکم سر آنکھوں پر، کیا کریں فی الحال حاسدین پہلے ہی جلے بیٹھے ہیں، انہیں اور کیا جلاؤں۔ کرن! خوش آمدید۔ محسن علی موم، صبا گل کو جو مشورہ دیا ہے اس پر اگر آپ خود بھی عمل کرلیں تو بہتر ہوگا۔ علی آتش کیا پتا سرورق کی حسینہ کی شکل آپ سے ملتی جلتی ہو۔ غور کرنا تھا۔ مہر اے ڈی سیال، آپ تو اپنے نام کی تاریخ بتاتے ہی بیٹھ گئے۔ مونا گل محفل میں موجود ہر شخص کی ٹانگ کھینچنے کا الگ مزہ ہے۔ کہانیاں تو تمام پڑھتے ہیں اور زیادہ تر انہی پر تبصرہ کرتے ہیں۔ دوستوں سے ملنے کے لیے مہینے میں ایک ہی دن آتا ہے نا۔ ویسے آپ کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ فرید اللہ معصوم خوش آمدید۔ محمد جاوید ایسا لکھتے کیوں ہیں جس کے نہ چھپنے پر بعد میں شکوہ ادا کرنا پڑے۔ ویسے آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ مقصود الحسن غور سے دیکھنا تھا۔ ماہا ایمان، اس دفعہ اتنی جلدی میں کیوں تھیں؟ تفسیر عباس بھائی، آپ کے یہ الفاظ تو میرے لیے انمول ہیں جو خود اتنا اچھا تبصرہ لکھتے ہوں ان کی تعریف تو میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ بلیک لسٹ میں ہمایوں سعید راج کو دیکھ کر دلی اطمینان ہوا۔ اللہ کرے کہ ان کا تبصرہ کم کم ہی شائع ہو، آمین۔ محمد بلال حیدر، سمیرا اقبال اور عمیر شہزاد انجینئر کے خطوط بھی شان دار تھے۔ گرداب اس دفعہ بہت بہت اچھی رہی۔ للکار میں آخرکار تابش کو ثروت مل ہی گئی۔ 29 مارچ کو میری سسٹر کی شادی تھی جو بہت اچھی رہی لیکن ساتھ ہی بہت تھکن بھی ہوئی۔ ابھی تک تھکان نہیں اتری۔ لیکن جاسوسی کو بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا، جلدی جلدی خط تحریر کیا ہے۔ غلطی کے لیے معذرت اور مزید کہانیوں پر تبصرہ نہ کرسکنے کے لیے بھی کیونکہ ابھی تک ان کا مطالعہ نہیں کیا۔"

لاہور سے فاروق انجم ساحلی کی شکایت "امید ہے آپ اور دیگر اہلِ خانہ و ادارے کے سب احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ کراچی کے بگڑتے حالات پر بعض اوقات تشویش لاحق ہوجاتی ہے۔ میرے خاندان کے تقریباً کافی لوگ لکھنے والے ہیں۔ والد سعید ساحلی کے نام سے 80 کے قریب فلمیں لکھ کر ڈینگی وائرس کے حملے سے گزشتہ برس وفات پاگئے۔ ڈاکٹر وحید عشرت ان کے چھوٹے بھائی اور ہمارے چچا تھے جو ایوانِ اقبال سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریٹائرڈ ہوئے۔ انہوں نے فلسفہ اور اقبالیات پر کتابیں لکھیں۔ ان کی آخری کتاب روح کا سفر سنگِ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوئی۔ اب جاسوسی ڈائجسٹ نسبتاً بہتر معلوم ہورہا ہے۔ اس مرتبہ تصاویر اچھی معلوم ہوئیں۔ آخری دو رنگوں کی تصاویر کو بھی جدت کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ترجمہ کہانیوں کے علاوہ انعامی مقابلے کے لیے اوپر لکھ کر فولادی لڑکی، انتقام، منصوبہ اور سسپنس کے لیے فیصلے روانہ کی گئی تھیں۔ (ہمیں مل گئی ہیں) آپ کی [illegible] کا انتظار کرتے کرتے اب تو اپنا نام بھی محمد انتظار معلوم ہونے لگا ہے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

ناصر محمود، کوہستان ہزارہ۔ محمد اقبال، کراچی۔ حرا مختار، کراچی۔ جمیل الرحمان، گوجرانوالہ۔ عذرا منیر، ٹنڈو آدم۔ طارق عزیز، کوٹری۔ [illegible]، خاص۔ احمد یٰسین، منڈی بہاؤالدین۔ محمد عثمان، کراچی۔ محمد [illegible]، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ عدنان، سکھر۔ عفان افضل، کراچی۔ [illegible]، کراچی۔

رنگ و سنگ

سمارا شاہد

فاصلوں کی دُھند ماضی کے تمام
نقوش پرافشاں بکھیر دیتی ہے... نشیب و
فراز... اپنی نارسائیاں... ناتجربہ کاریاں
... غلطیاں... فتح مندیاں... بُرا بھلا سب اچھا
لگنے لگتا ہے... وقت کی نذر ہو جانے والے یہ گمشدہ
اوراق زندگی کا حاصل معلوم ہونے لگتے ہیں... شوبز کے
کینوس پر بکھرے رنگوں کی سمتوں کا تعین کرتی ماضی کی
یادوں سے گزرتے گزرتے لہو رنگ فسانوں کی سنسنی خیز کہانی
... ایسی دنیا جہاں طاقتور دوسروں کی کمزوری کو اپنی شہ زوری
بنا لیتا ہے... اس کے احساسات و جذبات کا استحصال کرکے اپنی نفسانی
خواہشات کے جھنڈے گاڑ کر اپنے زعم میں فتح گر بن جاتا ہے... احساسِ
شکستگی... واحساس ندامت سے مبرا ایسے ہی کج ادا نفوس کی اجارہ داریاں...

فیصلے کی سوئی پر لٹکے دو متوالوں کے خون آشام فرار در فرار کی سنسنی خیز روداد

میرے بیڈ کے سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ گہری نیند کے عالم میں مجھے یہ آواز بھی اس خواب کا حصہ محسوس ہوئی جو میں اس وقت .... دیکھ رہا تھا۔ خواب کے عالم میں، میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا... مگر باوجود کان سے لگانے اور ہیلو، ہیلو کرنے کے، گھنٹی کی آواز بدستور میرے دماغ پر گویا ہتھوڑے برساتی رہی۔

میں نے جلدی سے گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا، دو بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ میرا پارا ایک دم ہائی ہوگیا... اس رات میں ویسے بھی خاصا پریشان تھا اور بڑی مشکل سے سونے میں کامیاب ہو پایا تھا۔

''کون نامعقول ہے؟'' ریسیور اٹھاتے ہی میں ماؤتھ پیس میں دہاڑا۔ ''بھلا یہ کوئی وقت ہے شریفوں کو تنگ کرنے کا؟''

''کامران... یہ تم ہی ہونا، کامران؟'' دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز نے کہا، انداز میں خاصی گھبراہٹ تھی۔

''آپ کون ہیں؟'' میں نے سنبھل کر پوچھا۔ رات کے تقریباً ڈھائی بجے، غیر متوقع طور پر ایسی آواز سنتے ہی میری نیند کافور ہونا لازمی تھا...

''آپ... آپ کامران صدیقی ہی ہیں نا؟'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

''ہاں... لیکن آپ کون ہیں اور اس وقت...''

''میں نیناں ہوں کامران...'' اس نے جلدی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند یکلخت دور ہوگئی اور میں سیدھا بیٹھ گیا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی نیناں کی آواز فون پر نہیں سنی تھی... مگر یہ جانتے ہی کہ وہ نیناں ہے، مجھے گویا ایک شاک سا لگا۔ کم از کم میرے لیے وہ کسی اور ہی دنیا کی باسی تھی۔ میں اسے پانے کی صرف تمنا ہی کرسکتا تھا... ورنہ حقیقتاً وہ میری رسائی سے خاصی دور تھی!

''کیا تم واقعی نیناں ہو؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''یاد ہے، تقریباً چار ماہ پہلے جب ہوٹل بلیو مون میں ایک پارٹی کے موقع پر ہم ملے تھے... اور تم نے مجھے اپنا فون نمبر دیا تھا؟'' اس نے مجھے یاد دلانے کی کوشش کی تاکہ میں اس کے نیناں ہونے پر یقین لے آؤں۔

''ک... کیسی ہو تم؟'' جوشِ مسرت کے باعث میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری آواز سن کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے... میں بتا نہیں سکتا۔''

''کامی...!'' اس نے بے حد اپنایت کے ساتھ مجھے میری عرفیت سے پکارا۔ ''میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔''

نیناں نے اس سے پہلے کبھی مجھ سے اس قدر بے تکلفی اور اپنایت کے ساتھ گفتگو نہیں کی تھی۔ اس کے اس انداز نے مجھے گویا بالکل ریشہ خطمی کردیا۔

''کیا مسئلہ ہے نیناں؟'' میں نے حقیقتاً تشویش محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آخر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''میں تمہیں فون پر نہیں بتا سکتی... کیا تم اسی وقت میرے گھر آسکتے ہو؟''

''لیکن تمہیں میری ضرورت کیوں پیش آگئی؟'' میں نے کچھ تعجب سے کہا۔ ''تمہارے دوستوں کا حلقہ تو بہت وسیع ہے۔''

''کامران... پلیز!'' وہ چلائی۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو... میں اس وقت سخت مصیبت میں ہوں۔ مجھے صرف یہ بتادو کہ تم میرے پاس آرہے ہو یا نہیں؟''

''مم... میں آرہا ہوں۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''تمہیں میرا پتا یاد ہے؟'' نیناں نے پوچھا۔

''یاد ہے... میں بس تقریباً بیس منٹ میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔'' اس کے انداز سے مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ معاملہ سنگین ہے۔

ریسیور رکھ کر میں جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگا۔

☆☆☆

نیناں کا شاندار گھر، ممبئی کے اس پوش علاقے میں واقع تھا جہاں بیشتر فلم اسٹارز اور شوبزنس سے تعلق رکھنے والے افراد رہائش پذیر تھے جبکہ میرا ایک بیڈروم پر مشتمل، اسٹوڈیو اپارٹمنٹ قدرے الگ تھلگ اور نسبتاً کم تر علاقے میں تھا۔

میں جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر اپنی پرانی کار میں بیٹھا اور تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت ٹریفک بہت کم تھا۔

نیناں کا تعلق شوبز کی دنیا سے تھا۔ اس نے ماڈلنگ کے ذریعے اس جادو نگری میں قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد اسے فلموں میں چانس مل گیا تھا۔ گو کہ اس نے کئی اچھے رول بھی کیے تھے تاہم اس کا شمار بڑی اداکاراؤں میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ فلمی دنیا کے افق پر چمکنے والا، گویا کوئی ننھا منا ستارہ ہی تھی۔

دو سال قبل، میں پہلی بار نیناں سے اس وقت ملا تھا جب ہم دونوں کو ایک ٹی وی چینل پر چلنے والے ایک سوپ

سیریل میں کام ملا تھا۔ نیناں کی طرح میں بھی اس میدان میں نووارد تھا اور اپنی جگہ بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے شہر سے اپنی قسمت آزمانے ممبئی آئی تھی۔

وہی پرانی کہانی تھی... یہاں ممبئی میں اس جیسی ہزاروں لڑکیاں موجود تھیں جو انڈیا کے نہ جانے کن کن شہروں اور قصبوں سے بڑی بڑی خواہشات اور امنگیں دل میں لیے یہاں پہنچتی تھیں۔ ان میں اور نیناں میں اگر کوئی فرق تھا تو یہ کہ وہ اتنی سی عمر میں ہی بہت حقیقت پسند اور میچورڈ قسم کی لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں مقابلہ بہت سخت ہے... کوئی مقام بنانے کے لیے اسے سخت محنت اور صبر سے کام لینا ہوگا۔ شارٹ کٹ اختیار کرنے کی وہ قائل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت نیچے سے کام شروع کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ سب سے پہلے اسے جو کام ملا تھا، وہ ایک بوتیک شاپ میں پارٹ ٹائم ماڈلنگ کا تھا۔

میرے اور اس کے درمیان تعلق کی نوعیت کچھ عجیب سی تھی... اور یہ تعلق بھی شاید یک طرفہ ہی تھا۔ بظاہر اس کا رویّہ دوستانہ تھا۔ کام کے دوران آنے والے وقفوں میں وہ مجھ سے بات چیت بھی کرتی تھی مگر اس کا انداز بڑا لیا دیا سا ہوتا تھا۔ اس لیے باوجود چاہنے کے میں کبھی کھل کر اس سے بات نہیں کر پایا... اور قریب آنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا... مگر پھر یہ دیکھ کر میں اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتا تھا کہ اس کا رویّہ تمام کام کرنے والوں کے ساتھ ایک جیسا تھا۔

ان دو سالوں میں، میں اپنے آپ کو ایک ٹی وی اسٹار کے طور پر منوانے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے اچھے کمرشلز بھی ملتے رہے تھے اور اب فلم ڈائریکٹرز بھی میری طرف متوجہ ہوچکے تھے۔ مجھے کام تو مل رہا تھا لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ یہ میری منزل نہیں... مجھے ابھی اور آگے جانا تھا۔

کیریئر کے لحاظ سے میں اور نیناں، تقریباً ایک ہی مقام پر تھے... بلکہ دیکھا جاتا تو وہ مجھ سے تھوڑا سا پیچھے ہی تھی۔ اس کی مالی حالت بھی کمزور تھی۔ وہ ایک معمولی سی بلڈنگ کے ایک کمرے میں کرائے پر رہتی تھی اور اس کمرے کو وہ ایک نئی آرٹسٹ کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔

پھر اچانک... راتوں رات وہ اس معمولی سے کمرے سے ممبئی کے اس مہنگے ترین علاقے میں پہنچ گئی۔ اس علاقے میں، رہائش اختیار کرنا صرف سپر اسٹارز یا پھر امیر کبیر لوگوں کا ہی کام ہو سکتا تھا۔ [illegible] رکھے تھے مگر اب نیناں بھی گویا ان کے حلقے میں شامل ہوچکی تھی...

میری ملاقات اب اس سے کم ہی ہوتی تھی اور یہ ملاقات بھی رسمی ہیلو ہائے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی... لیکن میں اب بھی اس کے خیال کو دل سے نکال نہیں پایا تھا، لہٰذا اس کے بارے میں تجسس رہتا تھا۔ ہر وقت اپنے کان کھلے رکھتا تھا... اس کے بارے میں گردش کرنے والی ہر خبر، ہر افواہ کو غور سے سنتا کہ شاید کہیں سے حقیقتِ حال علم میں آجائے۔

جتنے منہ اتنی باتیں... مگر ایک بات پر سب متفق تھے کہ نیناں عام فلمی لڑکیوں کی طرح ہلکے کردار کی مالک نہیں تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں تھی جو محض ایک رول حاصل کرنے کی خاطر کسی بھی حد تک جاسکتی تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ بہت طاقتور اور بااثر لوگوں کے حلقے میں شامل ہوگئی ہے... وہ اب پہلے جیسی نیناں نہیں رہی تھی، بدل گئی تھی۔

مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ میں انہیں حاسدوں کی اڑائی ہوئی افواہیں گردانتا تھا۔ میں بہرحال، نیناں کی وہی تصویر اپنے ذہن میں قائم رکھنا چاہتا تھا جو روزِ اوّل کی تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں مجھے کوئی تبدیلی یا یوں کہیے کہ عامیانہ پن محسوس نہیں ہوا تھا۔ موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس کے بارے میں، میں اگر کوئی سمجھوتا کرسکتا تھا تو صرف یہ کہ وہ کسی ایک شخص سے وابستہ ہوگئی تھی... اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

جو کچھ بھی تھا... وہ نیناں کی اپنی زندگی تھی اور اس میں بہرحال میری کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں کوشش کررہا تھا کہ اسے بھلا سکوں یا کم از کم اس کی یاد کی شدت میں ہی کچھ کمی واقع ہوسکے۔ میں نے اپنے آپ کو کام میں مصروف کرلیا تھا۔

... اور تب ہی مجھے نیناں کی وہ کال موصول ہوئی۔

میں تیز رفتاری سے اپنی کار دوڑاتا ہوا نیناں کے گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ تقریباً دو ڈھائی کلومیٹر طے کرنے کے بعد مجھے نسبتاً ایک تنگ سڑک پر مڑنا تھا... اس موڑ پر تیز رفتاری سے زیادہ میں اپنی منتشر خیالی کے باعث، گاڑی پر کنٹرول تقریباً کھو بیٹھا تھا... مگر شکر ہے کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

لیکن تمام وقت سوچتے رہنے کے باوجود کوئی ایک وجہ بھی میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ صبح کے تین بجے، نیناں کو میری مدد کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی تھی؟

انہی خیالوں سے الجھتا ہوا بالآخر میں نیناں کے گھر تک پہنچ گیا۔ اپنی گاڑی سائڈ میں پارک کرکے میں گیٹ پر پہنچا۔ گیٹ صرف بھڑا ہوا تھا مگر وہاں کوئی لائٹ نہیں تھی۔ میں

گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوا اور پھر اسے اندر سے بند کر دیا۔ ملگجی سی روشنی میں، میں نے کارپورچ میں دو گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ اندر والی گاڑی کو میں ایک نظر میں پہچان گیا وہ نیناں کی تھی... مگر وہ دوسری گاڑی نہ جانے کس کی تھی؟

میری الجھن کچھ اور بڑھ گئی۔ بہرطور میں پختہ روش پر چلتا ہوا دروازے تک پہنچا اور دستک دی۔ میری دستک کے جواب میں فوراً ہی دروازہ کھلا، اس میں سے ایک ہاتھ برآمد ہوا... اور اس نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اندر کھینچ لیا۔

میں نے شدید حیرت اور سراسیمگی کے عالم میں اپنے سامنے موجود ہستی پر نظر ڈالی اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا... وہ نیناں تھی۔ کمرے میں پھیلی انتہائی مدھم روشنی میں وہ مجھے کچھ زرد زرد اور بیمار سی دکھائی دی۔ وہ اس وقت ایک نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔

اس نے مجھ سے کوئی بات کیے بغیر قریبی میز پر رکھا ہوا ایک گلاس اٹھایا اور اس سے ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر میری جانب دیکھنے لگی... جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔

"تم ٹھیک تو ہو، نیناں؟" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہوں..." اس نے گویا کچھ غائب دماغی سے جواب دیا۔

"تم اس وقت اکیلی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شاید... پتا نہیں!" اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور پھر ہنسی۔ اس کی وہ ہنسی بھی خوش گوار نہیں تھی۔

"اپنے آپ کو سنبھالو... اور مجھے بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے۔"

اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے کا جائزہ لیا... پردوں کو ٹھیک کیا اور پھر میری جانب مڑی۔ ایک لمحے تک میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد یکایک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں۔ اس سے پہلے اس نے کبھی مجھے نہیں چھوا تھا... اور نہ ہی کبھی میرے اس قدر نزدیک کھڑی ہوئی تھی کہ میں اس کے وجود کی خوشبو تک کو محسوس کر سکتا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، کامران!" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے تمہاری مدد چاہیے..." اس کے انداز میں عجیب سی بے چارگی تھی۔

"ہاں، ہاں... اسی لیے تو میں یہاں آیا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مگر خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو سہی کہ بات کیا ہے؟"

"آؤ... میں تمہیں دکھاتی ہوں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اس بڑے سے کمرے کے ایک گوشے کی جانب بڑھی۔ اس جانب تقریباً اندھیرا تھا۔ کمرے میں روشن، واحد چھوٹا سا بلب... کمرے کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام تھا اور اس کے زیادہ تر حصے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"وہ... اس طرف دیکھو۔" اس نے کپکپاتی ہوئی سی آواز میں کہا اور دائیں جانب نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

وہاں ایک صوفے کے آگے ایک آدمی کی لاش پڑی تھی... میرے پیروں کے عین نزدیک۔

میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جانب دیکھا... اور کافی دیر تک اس کی سفید شرٹ پر پھیلتے ہوئے خون کے سرخ سرخ داغ کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

چند لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں روشنی اس قدر ناکافی تھی کہ کچھ بھی ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سوئچ بورڈ کی تلاش میں، میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں... اور پھر آگے بڑھ کر کمرے کی ساری لائٹس آن کر دیں۔

نیناں نے... "اوہ نو!" کہہ کر ایک دم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

وہ تقریباً چھ فٹ قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اس نے ڈارک براؤن پینٹ اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سینے کے مقام پر نظر آنے والا خون کا داغ بالکل تازہ نہیں تھا بلکہ خشک ہوتا جا رہا تھا اور زخم سے بہنے والا خون اس کے اردگرد جمع ہو چکا تھا۔

دفعتاً مجھے اپنے معدے میں کچھ گرہیں سی پڑتی محسوس ہوئیں... اور مجھے زور کا چکر آیا۔ میں نے جلدی سے صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بند کر لیں۔

وہاں نیناں کی خوف زدہ سی سانسوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہیں تھی۔ میں نے ہمت کر کے اپنی آنکھیں کھولیں اور لاش کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں...

میں نے اس کی شرٹ کا بٹن کھول کر زخم کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ خون جمنے کے باعث سینے کے بال چپک گئے تھے لہٰذا مجھے مشکل تو پیش آئی لیکن میں اس کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

بظاہر وہ ایک چھوٹا سا زخم تھا لیکن درحقیقت بہت گہرا

تھا۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ گولی کے بجائے چاقو کا زخم تھا۔

میں نیناں کی جانب مڑا۔ "اسے تم نے قتل کیا ہے؟"

وہ خاموش رہی... اس کا بدن ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ اس وقت وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح سہمی ہوئی کھڑی تھی جیسے اس کی کسی شرارت پر سزا سنائی جانے والی ہو۔

"نیناں... اسے تم نے مارا ہے؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

اس نے بمشکل تمام اثبات میں گردن ہلائی۔

"میں نے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے... کون ہے یہ؟" میں نے کہا۔

اس نے پیشانی پر آئے ہوئے بال پیچھے ہٹائے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "شش... شیراز علی!" اور یہ کہتے ہی وہ بری طرح سسکنے لگی۔ اس کا پورا وجود کپکپا رہا تھا۔

"یہ وہی شیراز علی ہے نا جس نے کئی فلموں میں نیگیٹو رول کیے اور دو ایک بی کلاس فلموں میں ہیرو بھی آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... یہ وہی ہے۔" نیناں نے آہستگی سے کہا۔ اس کے بعد وہ ایک بار پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

میں نے اسے شانوں سے تھام کر ایک صوفے پر بٹھایا۔ اس مرتبہ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی... تاکہ ایک مرتبہ اس کے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکل جائے اور وہ کچھ پُرسکون ہو سکے۔

میں نے تمام تیز روشنیاں گل کر دیں... صرف ہلکی سی نیلگوں روشنی والا ایک بلب جلتا رہنے دیا۔ اس کے بعد میں متلاشی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک تپائی پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا نظر آیا تو میں نے گلاس میں پانی انڈیلا اور نیناں کو پیش کیا۔

پانی پینے کے بعد وہ نسبتاً پُرسکون نظر آنے لگی۔ اس کی سسکیاں اب تھم چکی تھیں۔ میں ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا... "مجھے کچھ بتاؤ تو سہی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔ "یہ وقت ان سب باتوں کا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کہاں سے شروع کروں... کوئی کہتا ہے کہ فلمی دنیا کانٹوں کی سیج ہے، کسی کا کہنا ہے کہ یہ ایک دلدل ہے... بہرحال، میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ میں ہر بُرائی سے اپنے آپ کو بچائے رکھوں... مگر یہاں کوئی یہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں کہ فلمی دنیا میں قدم رکھنے والی کوئی لڑکی پارسا ہو سکتی ہے۔"

میں اس کی بات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مختلف ٹائپ کی لڑکی تھی۔ اس جیسی لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں... خاص طور سے فلمی دنیا میں۔ یہاں آنے والی ہر لڑکی کو مختلف حربوں سے ٹریپ کیا جاتا ہے۔ ہر مرد یہی چاہتا ہے کہ کوئی لڑکی اس کی دسترس سے بچنے نہ پائے۔ خصوصاً نیناں جیسی لڑکی تو گویا ان کی مردانگی کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہے۔

"کہتی رہو... خاموش کیوں ہو گئیں؟" میں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"کامران پلیز!" اس نے احتجاج کے انداز میں کہا۔ "یہ وقت ان باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں۔ ہر گزرتا لمحہ..."

"نیناں!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم آدھی رات کو فون کر کے مجھے بلاتی ہو کہ اچانک اتنے عرصے کے بعد تمہیں میری مدد کی ضرورت پیش آ گئی ہے... اور مدد بھی ایسی کہ مجھے ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کا کام انجام دینا ہے۔ ایک ایسا قتل جو ملک کے تمام اخبارات کی چیختی چنگھاڑتی سرخی بن سکتا ہے... تو اس کے لیے مجھے کچھ معلومات کرنے کا حق تو حاصل ہے... ورنہ میں تمہیں صرف یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ سیدھی پولیس کے پاس چلی جاؤ اور اپنے حق میں ایک ہی دعا کر سکتا ہوں کہ میرے یہاں آنے کی کسی کو خبر نہ ہو۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "اس وقت تو بس اتنا جان لو کہ شیراز علی ایک انتہائی کمینہ اور بدخصلت انسان تھا... بلکہ وہ انسان نہیں جانور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کس ٹائپ کی لڑکی ہوں مگر اس کی یہی کوشش تھی کہ مجھے اس گندگی میں گھسیٹ لے جس سے میں اب تک بچتی چلی آئی ہوں۔ آج وہ شراب کے نشے میں دھت یہاں آ پہنچا اور دست درازی شروع کر دی۔"

"تو پھر یہ تو سیدھا سادہ سیلف ڈیفنس کا کیس ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں تمہارے ہاتھوں وہ قتل ہو گیا۔ اس صورت میں تم پولیس کو کال کر سکتی ہو۔"

"کامران... ابھی تم نے خود کہا تھا کہ یہ قتل ملک کے تمام اخبارات کی چیختی چنگھاڑتی سرخی بن سکتا ہے۔" اس نے

جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اس طرح میں سخت مشکل میں پھنس جاؤں گی۔ مقدمہ چلے گا، طرح طرح کے الزامات لگیں گے، باتیں بنائی جائیں گی۔ رپورٹرز میرا جینا دشوار کر دیں گے... نہ جانے کیسی کیسی خبریں لگائی جائیں گی میرے خلاف... میں یہ سب برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“

”نیناں! میری سمجھ میں تو اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں کہ تم سچائی کا اقرار کر لو...“ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ اس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ اس کے بعد کیسے کیسے مسائل سامنے آئیں گے... نہ جانے کیسے کیسے گھناؤنے معاملات میں ملوث ہونے پر مجھے مجبور کیا جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا کامران... سب کچھ... اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں۔ یہ میرے لیے زیادہ آسان ہوگا۔“

مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی...

”وہ کون سے معاملات ہیں جن میں ملوث ہونے پر تمہیں مجبور کیا جا سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ میں نے تمہیں بہت بڑی مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔“ نیناں نے جلدی سے کہا۔ ”اور میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی لیکن یہ بہت لمبی کہانی ہے اور بہت الجھی ہوئی بھی... ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ باتیں میں تمہیں بعد میں بھی بتا سکتی ہوں۔ اس وقت ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ نیناں نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

نیناں کا انداز مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ انتہائی سنگین معاملے سے دوچار ہو چکی ہے۔

”نیناں! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے ٹھیک سے بتاؤ کہ آج رات... کیا ہوا تھا؟“

”ٹھیک ہے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کمزوری آواز میں کہا۔ ”اس کے بعد تم میری مدد کرو گے نا؟“

”تم مجھے سچائی سے آگاہ کر دو... اس کے بعد میں تمہاری مدد بہتر طور سے کر پاؤں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس مدھم نیلگوں روشنی میں گویا ہلکورے لیتی اس کیبنٹ کے پاس گئی جہاں شاید، دنیا کی اعلیٰ ترین شرابیں سجی ہوئی تھیں۔ اپنے لیے ایک ڈرنک تیار کرنے کے بعد وہ گلاس ہاتھ میں لیے میری جانب پلٹ آئی۔

”میں عام طور سے ڈرنک نہیں کرتی۔“ نیناں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس وقت...“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گھونٹ بھرا اور اپنے پیروں پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”میں شیراز علی سے خاصی اچھی طرح واقف تھی۔ ان دنوں وہ ایک ایکشن فلم میں کام کر رہا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ ”گوا“ میں ہو رہی ہے۔ شیراز اپنے حصے کا کام ختم کروا کر واپس آ گیا تھا مگر اس کے کچھ ری ٹیکس کی ضرورت آن پڑی تو ڈائریکٹر نے اسے دوبارہ وہاں بلایا... آج رات اسے وہاں پہنچنا تھا۔ مگر اس نے حد سے زیادہ شراب پی لی اور اپنی ترنگ میں یہاں میرے پاس چلا آیا تاکہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر سکے۔

”رات کے تقریباً دو بج چکے تھے لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی لہٰذا میں لیٹ کر ایک کتاب پڑھنے لگی۔ اچانک کال بیل کی آواز سن کر میں دروازے پر پہنچی... دوسری جانب شیراز تھا، اس نے کہا کہ وہ مجھے اسکرپٹ دینے آیا ہے۔ میں نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے دروازہ کھولا تو وہ ایک دم مجھے دھکیل کر اندر گھس آیا۔“

”اتنے بڑے گھر میں تم بالکل اکیلی رہتی ہو؟“ وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے سوال کیا۔ ”تمہارے نوکر وغیرہ...“

”مجھے گھر کے اندر نوکروں کا رش بالکل پسند نہیں... کام ختم ہوتے ہی سب اپنے اپنے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ رات کو صرف ایک ملازمہ اور ایک چوکیدار یہاں ہوتا ہے... لیکن ملازمہ چھٹی لے کر اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے اور چوکیدار اچانک بیمار ہو کر اسپتال جا پہنچا ہے۔“ نیناں نے جواب دیا۔

مجھے اس کا جواب سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ باکردار ہونے کے علاوہ خاصی دلیر بھی واقع ہوئی تھی... چھوٹی موٹی مشکلات کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی لیکن اس مرتبہ لگتا تھا کہ معاملہ اس کی توقع سے بھی زیادہ سنگین تھا، تب ہی وہ مدد کے لیے مجھے پکار بیٹھی۔

”خیر... میں تمہیں بتا رہی تھی کہ وہ مجھے دھکیل کر زبردستی اندر گھس آیا...“ نیناں نے گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”اندر آنے کے بعد اس نے نشے کے عالم میں دو چار نازیبا جملے کہے اور پھر اصرار کرنے لگا کہ میں اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ لوکیشن تک چلوں... کیونکہ وہ اکیلا اتنی لمبی ڈرائیو پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ راستے میں اگر وہ تھک گیا تو ہم کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے... اس کے بے ہودہ انداز نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ میں نے اسے ٹوپ کھری کھری سنائیں اور فوراً گھر سے باہر نکل جانے کو کہا...

”اس نے آگے بڑھ کر مجھے دبوچ لیا اور کہنے لگا کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت بالکل اکیلی ہو اور مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگی... وہ مجھے گھسیٹ کر بیڈ روم کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک میں اس کی گرفت سے نکل بھاگی... وہ میرے پیچھے بھاگا۔

”میں تیزی سے کچن میں داخل ہوئی اور کاؤنٹر پر رکھی ہوئی گوشت کاٹنے والی تیز دھار چھری اٹھا کر لیونگ روم میں بھاگ آئی... وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔

”یہ چھری تو میں تم سے ایک جھٹکے میں چھین سکتا ہوں... بہتر ہوگا کہ تم خود ہی اسے ایک طرف رکھ دو۔ یہ کہہ کر وہ میرے اوپر جھکا، میں نے اسے دھوکا دینے کے لیے چھری والا ہاتھ نیچے کیا اور جب وہ عین میرے نزدیک آیا تو میں نے ایک دم چھری والا ہاتھ اوپر کیا اور چھری اس کے سینے میں گھونپ دی... اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ لیا... مگر پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ نیچے فرش پر گر پڑا۔“

اپنی بات کے اختتام پر نیناں نے ایک طویل سانس لی اور تھکے تھکے سے انداز میں صوفے کی پشت سے یوں ٹیک لگائی جیسے وہ ابھی ابھی کسی پُرمشقت کام سے فارغ ہوئی ہو۔

اس کی تمام روداد نے چند لمحوں کے لیے مجھے گم صم کر دیا... پھر میں اٹھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور دونوں بازو اس کے گرد حمائل کر دیے... اس نے میرا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے وجود سے پھوٹتی خوشبو میری سانسوں میں اترنے لگی۔ دو سال سے میری حالت ایسے بچے کی طرح تھی جو چاند کو دیکھ کر اسے چھونے کے لیے ہمکتا ہے... اس لمحے بھی اس کا قرب مجھے ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا... جیسے ابھی میری آنکھ کھلے گی اور یہ سپنا ٹوٹ جائے گا۔

میں نے پیچھے ہٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ ”اب اس معاملے میں تم مجھ سے کیا چاہتی ہو... مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔

نیناں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کسی طرح اس لاش کو ایسے ٹھکانے لگاؤ کہ پولیس کو یا کسی اور کو اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکے... اور مجھے کوئی ڈر نہ

حائل ہو... اس کے بعد میں بھی اس جرم کا ایک حصہ بن جاؤں گا؟“ میں نے کہا۔

”جانتی ہوں۔“

”اور اس کے بعد میرے اور تمہارے دکھ سکھ الگ الگ نہیں رہیں گے... میں خود بہ خود تمہاری ذات کا حصہ بن جاؤں گا۔ گویا یہ ایک ایسا تعلق ہوگا جسے ہم دونوں میں سے کوئی نہیں توڑ پائے گا۔“ میں نے بہ غور اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”ہاں، ہاں... اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے سوا میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی۔“

... اور میں ایک ٹک اس کی دل میں اتر جانے والی صورت کو تکتا رہ گیا۔

☆☆☆

”چار بجنے والے ہیں... اب ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔“ میں نے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کہا۔ نیناں مضطرب سی، صوفے کے کنارے پر ٹکی ہوئی تھی۔

”ہمیں لاش کے ساتھ اس کی کار سے بھی نجات حاصل کرنی ہوگی۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ اس کا نام و نشان ہی مٹ جائے... جب پولیس کو کوئی سراغ نہیں ملے گا تو وہ تھک ہار کر بالآخر اس کی تلاش ترک کر دے گی اور یوں یہ معاملہ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دب جائے گا... لیکن اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا کسی کو اس کے یہاں آنے کا علم ہے؟“

”نہیں۔“ نیناں کے لہجے میں تیقن تھا۔

”تم اس قدر یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟“

نیناں نے بے چینی کے ساتھ پہلو بدلا۔ ”بات زیادہ بگڑنے سے پہلے شیراز سے میری تھوڑی بہت بات چیت ہوئی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں آنے سے کچھ دیر پہلے وہ کرن ورما کے گھر گیا تھا اور...“

”کرن ورما... فلم پروڈیوسر؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں تک مجھے معلوم ہے، فلم بنانا محض اس کا مشغلہ نہیں... وہ بہت سنجیدگی سے یہ کام کرتا ہے۔ اس کام میں اس نے بہت روپیا لگایا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب وہ خالی ہو جاتا ہے تو دولت حاصل کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے۔“ نیناں نے کہا۔

”اور وہ ناجائز ذرائع کون سے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے شکایتی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت مزید پھیکی پڑ گئی تھی۔ ”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ابھی اس معاملے کو زیادہ نہیں کریدو گے۔“

”چلو، ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر اس واقعے کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں کرن ورما بھی موجود ہے... یہ بتاؤ کہ اس کا کردار کہاں فٹ ہوتا ہے اور وہ کیا غیر قانونی کام کرتا ہے؟“

”وہ لوگوں کو نچوڑتا ہے... بڑی بیدردی کے ساتھ۔“ نیناں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”وہ لوگوں کو ترغیب دے کر اپنے جال میں قید کر لیتا ہے اور پھر وہ اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ کم حیثیت لوگ اس کی چاکری اور غلامی کرتے ہیں جبکہ دولت مند افراد اسے رقم ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔“

”تمہاری یہ ذومعنی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں، نیناں!“ میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میری سمجھ سے بھی باہر ہیں۔“ نیناں نے کہا۔ ”لیکن ایک بات طے ہے کہ کرن اس ریکٹ کا کرتا دھرتا اور فرنٹ مین ہے۔ اس کا پورا ایک نیٹ ورک ہے جسے اس کے پالتو غنڈے چلاتے ہیں اور وہ... وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں... کچھ بھی... مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے اپنی زبان کھولی تو میں ماری جاؤں گی۔“ اس کے لہجے میں اچانک شدید خوف در آیا تھا۔

”اور آج رات یہاں جو کچھ ہوا ہے، اس سلسلے میں بھی تم جان سے جا سکتی ہو۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”تمہیں سزا ہو سکتی ہے۔“

”یہی تو بات ہے۔“ وہ کراہی۔ ”اسی وجہ سے تو میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔“

”تم نے مجھے ایک بات بھی ٹھیک سے نہیں بتائی ہے... بہرحال، تمہاری یہ بات درست ہے کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ بالآخر میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں اس بات پر توجہ دینی ہے کہ کسی کو شیراز کے یہاں آنے کے بارے میں علم تھا یا نہیں... تم نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ کرن ورما کے گھر گیا تھا، رائٹ؟“

”ہاں، ان دونوں کی میٹنگ طے تھی۔ کرن ورما چاہتا تھا کہ شیراز صبح کو اپنے ریٹیکس کروانے فلم کی لوکیشن پر پہنچ جائے۔ ان کے درمیان صرف کام کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ شیراز نے کرن کو میرے پاس آنے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ اس وقت اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں آئے گا... اس نے بہت زیادہ ڈرنک کی ہوئی تھی، گھر جا کر وہ مزید پیتا رہا... اس نے بتایا تھا کہ اس کا بستر پر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا... اچانک اسے میرا خیال آیا اور وہ اپنے ذہن میں ایک پلان بنا کر یہاں چلا آیا کہ میں اس کے ساتھ گوا تک جاؤں اور پھر بائی ائیر واپس آ جاؤں۔“

”یہ بات تو ہمارے حق میں جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر کوئی کبھی یہ دعویٰ کرے کہ وہ شیراز کے یہاں آنے کے بارے میں جانتا تھا تو تم جواب میں یہ کہنا کہ آنے سے پہلے اس نے فون کیا تھا... تم سو چکی تھیں لہٰذا رات گئے اس کے فون کرنے پر بہت ناراض ہوئیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ہرگز یہاں نہیں آئے... سمجھ گئیں؟“

”سمجھ گئی۔“ اس نے سعادت مندی سے گردن ہلائی۔

دفعتاً میری نظر شیراز کی لاش کی طرف اٹھ گئی... اور میں یہ سوچ کر کپکپا اٹھا کہ ہم ایک ایسے مردہ شخص کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو محض چند فٹ کے فاصلے پر اپنے ہی خون میں نہایا پڑا تھا۔ میں نے فوراً اس سوچ کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور اپنے خوف سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو گیا۔

”ہم اس کی لاش کا کیا کریں گے، کامران؟“ اچانک نیناں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔ ”اسے سمندر میں پھینکیں یا پھر کسی ڈمپنگ گراؤنڈ میں؟“

”نہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس میں بہت خطرہ ہے۔ میں اخباروں میں اکثر ایسی خبریں پڑھتا رہتا ہوں کہ فلاں جگہ سے ایک شخص کی لاش برآمد کرلی گئی... یا اس کے بارے میں کسی نے اطلاع دی... اس کے علاوہ لاش کو کہیں لے جانے میں بھی بہت رسک ہے۔ لاش کسی ایسی جگہ پر ہونی چاہیے جہاں ہم اس پر مسلسل نظر رکھ سکیں۔“

”کک... کیا مطلب؟“ نیناں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”میں تمہارا ڈر اور خوف سمجھ سکتا ہوں لیکن ہمیں اس بارے میں بات کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟“ میں نے رسانیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہمیں لاش کو کسی ایسی جگہ دفن کرنا ہوگا جہاں لوگوں کا قطعی گزر نہ ہو۔“

”کامران... تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ...“ نیناں جملہ ادھورا چھوڑ کر دہشت زدہ سی نظروں سے میری جانب تکنے لگی۔

”تم بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اسے تمہارے مکان کے احاطے کے اندر ہی دفن کرنا ہوگا۔“

”نہیں!“ نیناں دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ایک بار پھر سسکنے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں شانوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو نیناں... میری بات سنو، ہمیں اپنی ہر غلطی کی کوئی نہ کوئی قیمت چکانی پڑتی ہے، تب ہی اس کی تلافی ممکن ہوتی ہے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں... یا پھر تم پولیس کے پاس جانے کا حوصلہ پیدا کرو۔“

”ہرگز نہیں... پولیس کے پاس تو میں کبھی نہیں جاؤں گی۔“ نیناں نے بے چینی سے اپنے ہاتھ مروڑتے ہوئے کہا۔ ”میری مجبوری ہے کہ چاہوں بھی تو کسی کے سامنے سچائی بیان نہیں کر سکتی... حالانکہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث تمام افراد کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کر دوں لیکن... اس طرح میں خود بھی اس قدر بدنام و رسوا ہو جاؤں گی کہ عمر بھر لوگوں کا سامنا نہیں کر پاؤں گی بلکہ اپنے آپ سے بھی آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہوں گی... یہاں تک کہ بالآخر ایک روز خودکشی کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہے گا۔“

”تب پھر... میری تجویز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے اپنی آنکھوں کو پونچھا اور ایک دم تن کر بیٹھ گئی۔ اس لمحے اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے گویا وہ اس کام کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کر چکی ہو۔

”مکان کے دونوں جانب خاصا طویل و عریض احاطہ ہے جس کے گرد باڑھ لگی ہوئی ہے۔“ بالآخر نیناں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ پچھلی جانب کا احاطہ مناسب رہے گا۔“ میں نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک کھڑکی کی جانب بڑھی۔ میں اس کے پیچھے تھا... نیناں نے کھڑکی کھولی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”وہ دیکھو... کیا تم وہ درخت دیکھ رہے ہو؟“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

میں نے آگے بڑھ کر باہر جھانکا۔ ملگجی سی چاندنی میں [illegible] فاصلے پر مجھے ایک درخت دکھائی دیا۔ اس اکلوتے [illegible] کے آگے مٹی اور پتوں وغیرہ کا ایک ڈھیر سا دکھائی [illegible] رہا تھا۔ وہ نیناں کے مکان کا پچھلا احاطہ تھا اور شاید بے [illegible] کے باعث یونہی اجڑا ہوا سا پڑا تھا۔

”یہ جگہ بالکل ٹھیک رہے گی۔“ میں نے دھیمی مگر پُرجوش آواز میں کہا۔ ”کاش، یہ زمین نرم ہوتا کہ مجھے کھدائی کرنے میں آسانی رہے... تمہارے پاس کوئی کدال اور پھاوڑا وغیرہ ہوگا؟“ میں نے نیناں کی طرف دیکھا۔

”نہیں بھئی۔“ اس نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”اوہ... اس کے بغیر کام کیسے ہوگا؟“ میں نے تشویش کے عالم میں کہا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے کچھ یاد آیا۔ ”ارے ہاں... میری اپارٹمنٹ بلڈنگ کے پچھلے حصے میں ایک پھاوڑا بیکار پڑا ہے اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اسے ساتھ...“

یکایک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا تو میں فوراً خاموش ہو گیا اور قریب تھا کہ اس بات پر نیناں اور میں دونوں ہنس پڑتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ حالات کی سنگینی نے ہمیں سنجیدہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔“ چند لمحوں کے توقف سے میں نیناں سے مخاطب ہوا۔ ”ہمیں فوراً شیراز کی کار یہاں سے ہٹانی ہوگی۔ وہ کار میں ڈرائیو کروں گا، تم اپنی کار لے کر چلنا۔ اپنی کار میں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ دو روز سے پہلے شیراز کی تلاش شروع نہیں ہوگی۔ تب تک میں اس کی کار پر نیا پینٹ کروا دوں گا اور اس پر جعلی نمبر پلیٹ لگا دوں گا۔ فی الحال ہم اس کی کار کسی چارجڈ پارکنگ لاٹ میں کھڑی کریں گے اور پھاوڑا اور کدال لے کر لوٹ جائیں گے۔“

نیناں جلدی سے اپنے بیڈ روم میں گھس گئی اور چند ہی منٹ میں شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے واپس آ گئی جبکہ اس کے آنے سے پہلے پہلے میں شیراز کی جیبیں ٹٹول کر اس کی کار کی چابیاں تلاش کرنے کا ناگوار فریضہ سرانجام دے چکا تھا۔

باہر آنے کے بعد میں نے شیراز کی کار کا معائنہ کیا۔ اس میں ایک سوٹ کیس موجود تھا جسے میں نے گھر کے اندر لا کر رکھ دیا۔ راستے میں، میں نے گلوو کمپارٹمنٹ دیکھا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس میں ایک بھری ہوئی گن رکھی تھی۔ گن کو اٹھا کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ نیناں اپنی کار میں میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

صبح کے تقریباً ساڑھے چار بجے ہم نے شیراز کی کار کو ایک پارکنگ لاٹ میں کھڑا کیا اور پھر خاموشی کے ساتھ پھاوڑا اور کدال لے کر واپس نیناں کے گھر آ گئے۔

☆☆☆

”نیناں!“ میں نے کہا۔ ”تم اس کے پیر پکڑو اور میں اس کا دھڑ سنبھالتا ہوں۔“

نیچے جھکنے سے پہلے نیناں نے اپنی آنکھیں ایک بار زور

سے بھینچیں مگر اس کا چہرہ اس وقت بالکل سپاٹ تھا۔ میری گاڑی میں نہ جانے کب کا ایک رین کوٹ پڑا تھا۔ میں نے وہ رین کوٹ لا کر شیراز کی لاش کے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا تھا تا کہ اس کا خون چاروں طرف نہ پھیلے۔

ہم اسے اٹھائے ہوئے سائڈ والے دروازے سے باہر نکلے۔ اس کا بے جان سر پیچھے لٹکا ہوا تھا اور ہماری ہر حرکت کے ساتھ اِدھر اُدھر جھول رہا تھا... یہ منظر مجھے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا اور میں بمشکل اپنے ذہن کو حاضر رکھے ہوئے تھا۔

لاش کو ایک جانب رکھ کر میں نے کھدائی شروع کی۔ زمین نرم تھی لیکن مجھے اندر سے نکلنے والے چھوٹے بڑے پتھر اور خودرو پودوں کی جڑیں بھی نکالنی پڑ رہی تھیں۔ میں دیوانہ وار کھدائی کرتا رہا، یہاں تک کہ مجھے آسمان پر صبح صادق کے آثار نمودار ہوتے دکھائی دیے اور میں نے اپنا ہاتھ روک دیا۔ قبر تیار ہو چکی تھی۔

زمین کو اچھی طرح ہموار کرنے کے بعد اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے شیراز کی جیبوں کی تلاشی کے دوران کار کی چابیوں کے علاوہ کسی اور چیز پر تو دھیان ہی نہیں دیا۔ مثلاً اس کا پرس... کوئی اہم کاغذ یا خط وغیرہ... یا پھر رقم... مگر خیر، اب کیا فرق پڑتا تھا؟ نیناں نے اندر سے اس کا سوٹ کیس بھی لا کر دے دیا تھا، اسے بھی ہم نے کھول کر دیکھے بغیر ہی لاش کے ساتھ دفن کر دیا۔

نیناں نے اس دوران لیونگ روم کا فرش اچھی طرح صاف کر دیا اور خون کے داغ مٹا دیے۔ ہم نے گھوم پھر کر کمرے کا جائزہ لیا... اب وہ پہلے جیسی حالت میں آچکا تھا۔ شیراز سے متعلق سارے آثار مٹ چکے تھے... اب محض فلم کے فیتوں پر اس کی شبیہیں باقی رہ گئی تھیں۔ شیراز کو اب کوئی جیتا جاگتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں اور نیناں ایک بار پھر مقابل کھڑے خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"تم نے چھری کا کیا کیا؟" معاً میں نے دریافت کیا۔

"اسے اچھی طرح دھو کر میں نے دراز میں اس کی جگہ پر رکھ دیا۔" نیناں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

ہم لیونگ روم کی کھڑکی میں کھڑے، طلوع ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہے تھے۔ یہ وہی کھڑکی تھی جس سے نیناں کے گھر کا پچھلا احاطہ اور وہ درخت دکھائی دیتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اب نیناں کبھی اس کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر کا نظارہ نہ کر پائے...

نیناں کی نظریں گویا زمین کے اس قطعے پر چپک کر رہ گئی تھیں جس کے نیچے شیراز کی لاش مدفون تھی... اس لمحے نیناں کے چہرے پر عجیب سے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

"شاید تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے... مگر ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب میں اس کی محبت میں مبتلا تھی... یا شاید وہ میرا گمان تھا۔" اس نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

ایک لمحے کو جیسے میرے اندر کوئی چیز چھن سے ٹوٹی...

"نیناں!" میں نے اس کے دھواں دھواں چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے تعجب سے کہا۔ "اگر تم اس کی محبت میں مبتلا تھیں تو پھر اسے تمہارے ساتھ زبردستی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا وہ تمہاری محبت سے واقف نہیں تھا؟"

"کیونکہ اب میں اس کی محبت کے سحر سے نکل آئی تھی... اور وہ بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ اب میں اس سے محبت نہیں بلکہ نفرت کرتی ہوں۔" نیناں نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔

اس کے بعد ہم کافی دیر تک خاموش رہے بالآخر نیناں نے اس خاموشی کو توڑا۔ "کوئی بات کرو کامران! اس خاموشی سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

مگر اس وقت میرے لیے ایک لفظ بھی کہنا محال تھا... کہ نہ جانے کیسی متضاد کیفیات نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ "کیا بولوں؟" میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ جو کچھ بھی ہوا، اس کی ذمے دار میں ہوں... تم نہیں۔"

میں خاموش رہا۔ یہ درست تھا کہ اس سانحے کی ذمے دار وہی تھی لیکن اب میں بھی پوری طرح اس کا شریکِ جرم تھا۔

یکایک نیناں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے خالی گلاس کو دیوار پر دے مارا۔ گلاس ایک چھناکے سے ٹوٹا اور اس کی کرچیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ وہ دیوانوں کے سے انداز میں ہنسی۔

"میں نے زندگی میں پوری سچائی کے ساتھ صرف ایک شخص سے محبت کی... اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا لیکن... لیکن وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔" اس کے لہجے اور اس کی آواز سے شدید کرب جھلک رہا تھا۔ یکایک اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ "لیکن تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو کامران؟"

"ہاں۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "میں...

میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں نیناں!"

"بالکل سچی؟" وہ کھسک کر میرے بازو سے آن لگی۔

"ہاں، بالکل سچی اور بے ریا۔"

"اوہ!" اس نے خوشی اور طمانیت کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میں یوں چونک کر جاگا گویا مجھے بجلی کا شاک لگا ہو... میں نے دیکھا، نیناں کا سر ابھی تک میرے بازو کے حلقے میں تھا اور نیند کے عالم میں ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے ریشمی بال بے ترتیبی کے ساتھ اس کے چہرے اور گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس لمحے اس کے چہرے پر اس قدر معصومیت تھی جیسے دن بھر کے کھیل کود کے بعد کوئی بچی تھک ہار کر گہری نیند میں ڈوب گئی ہو۔

ہم دونوں ہی رات بھر کی ذہنی اور جسمانی مشقت کے بعد بے حد تھکے ہوئے تھے۔ اس پر نیناں نے پینے پلانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا... لہٰذا اس کا یہ نتیجہ تو ہونا ہی تھا... نہ جانے کب ہم باتیں کرتے کرتے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

میں نے بمشکل تمام اس کے چہرے پر سے اپنی نظریں ہٹائیں... دن کی روشنی کھڑکیوں پر پڑے پردوں کے پیچھے سے جھانکتی، صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ رات کو شروع ہونے والی بوندا باندی، تیز بارش میں تبدیل ہونے سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، پونے دس بج رہے تھے۔

"نیناں... نیناں!" میں نے آہستہ سے اسے ہلایا۔ اس نے کاہلی سے آنکھیں کھولیں، مجھ پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ مسکرائی... مگر دوسرے ہی لمحے اس کی وہ مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ دراصل کن حالات کا شکار تھی۔

"کیا ہوا... کیا ہوا؟" وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"کچھ نہیں ہوا... ہم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے کرتے کچھ دیر کے لیے اس دنیا سے غافل ہو گئے تھے مگر ہمیں بہرحال، اسی دنیا کا سامنا کرنا ہے... اس لیے اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔ ابھی ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں... یاد ہے؟" میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا... جو پریشانی کے باعث اس وقت مزید کشادہ دکھائی دے رہی تھیں۔

"ہاں ہاں... یاد ہے، یاد ہے۔" اس نے جلدی جلدی [illegible] ہوئے کہا۔

☆☆☆

اداکار شیراز علی کی پراسرار گمشدگی کی خبر، تین روز کے بعد اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس خبر کا ایک پہلو ایسا تھا جو میرے لیے بھی واقعی ایک خبر تھا... اور یہ خبر میرے لیے خاصی چونکا دینے والی بلکہ پریشان کن تھی۔

ان تین دنوں کے دوران میں نے یہ کام انجام دیا تھا کہ اپنی بلڈنگ کی پارکنگ میں کافی عرصے سے لاوارث کھڑی، ایک تباہ حال گاڑی کی نمبر پلیٹیں چپکے سے اتاریں اور شیراز کی گاڑی کی نمبر پلیٹس کو ان سے تبدیل کر دیا۔ گاڑی کا رنگ بھی میں نے تبدیل کروا دیا تھا۔ اس کام کے لیے میں نے اپنے پرانے جاننے والے مکینک کے گیراج کا انتخاب کیا تھا۔ یہ مکینک جس کا نام راج کمار تھا، تقریباً میرا ہم عمر تھا اور لڑکپن کے زمانے سے میں اسے جانتا تھا۔ ڈیڈی اپنی گاڑی جس سروس اسٹیشن پر لے جاتے تھے، راج کمار وہاں ان دنوں کام سیکھ رہا تھا۔ میں اکثر ڈیڈی کے ساتھ ہی ہوتا تھا اور راج کمار کو پھرتی کے ساتھ اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ وہاں سب اسے "چھوٹا استاد" کہہ کر پکارتے تھے۔ آج بھی شاید اسے میرے سوا کوئی اس کے اصل نام سے نہیں پکارتا تھا۔

جب میں شیراز کی کار لے کر اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اس کار پر سیاہ پینٹ کرنا ہے تو اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا کہ میں ایک تقریباً نئی گاڑی کا رنگ کیوں تبدیل کروانا چاہتا ہوں... یا یہ گاڑی کس کی ہے؟

میرے کہنے پر اس نے کام کے لیے گیراج کے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کیا جہاں عام لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ پھر اس نے خاموشی کے ساتھ نمبر پلیٹس بدلنے میں میری مدد کی اور اس پر سیاہ پینٹ کر دیا۔ اس دوران میں بھی اس کی تھوڑی بہت مدد کرتا رہا۔ میں نے گاڑی کے اندر، انگلیوں کے نشانات بھی حتی الامکان صاف کر دیے تھے۔ پھر اس کے بعد میں نے راج کمار سے درخواست کی کہ پینٹ وغیرہ چیک کرنے کے بعد وہ اس گاڑی کو کور کر کے کچھ روز اپنے گیراج میں ہی رکھے۔

"یار کوئی لفڑا تو نہیں ہے؟" میری درخواست پر اس نے پہلی بار زبان کھولی۔

"تسلی رکھ... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر کوئی تجھ سے پوچھے تو اسے میرا نام بتا دینا۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک نمبر آدمی ہے، دو نمبر نہیں... میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ کہیں تو نے کوئی

پرایا لفڑا اپنے سر تو نہیں لے لیا؟'' وہ بولا تو میں اس کی قیافہ شناسی پر حیران رہ گیا۔

''میں بعد میں تجھے ساری تفصیل بتاؤں گا۔ ابھی تُو خاموشی سے کچھ روز اسے یہاں رکھ لے۔ میں جلد ہی اسے واپس لے جاؤں گا اور اگر اس دوران ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو تُو صاف میرا نام لے دینا۔'' میں نے کہا۔

''اپن کسی سے ڈرتا ہے کیا؟'' راج کمار نے اپنا سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ''آنے دے جو آتا ہے... اپن ایک ایک کو دیکھ لے گا۔'' اس نے فلمی بدمعاشوں کے سے انداز میں بڑک لگائی۔

''ابے سیدھا کھڑا رہ۔'' میں نے اس کی پشت پر ایک دھول جماتے ہوئے کہا۔ ''ایک آدھ ہڈی پسلی تڑخ جائے گی۔''

وہ کھانستا ہوا سیدھا ہوا اور پشت کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جو ہوتا ہے، وہ دکھتا نہیں... اور جو دکھتا ہے، وہ ہوتا نہیں۔ اس لیے اس دل کو دیکھو، اس دل میں چھپی ہمت اور حوصلے کو دیکھو ٹھاکر صاب!'' اس نے ایک اور ڈائیلاگ مارا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ انتہائی کالی رنگت اور ناتواں سے تن و توش کا حامل ہونے کے باوجود، ہر بھارتی نوجوان کی طرح راج کمار کو بھی ایکٹنگ کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق کا اظہار وہ گاہے بگاہے اسی طرح کیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر میری کسی فلم میں موٹر مکینک کا رول ہوا تو میں اپنے ڈائریکٹر سے کہہ کر وہ رول اسے دلوا دوں گا۔

یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد میں نے سکون کی سانس لی۔ پھاوڑے اور کدال کو میں نے خاموشی کے ساتھ لا کر اس کی جگہ پر واپس رکھ دیا تھا۔ شیراز کی گن میں نے اپنے اپارٹمنٹ میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا دی تھی۔ جب میں نے نیناں کو اس گن کے بارے میں بتایا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شیراز نے کار میں گن کیوں رکھی ہوئی تھی۔

بہر حال، ان مسئلوں کا مجھے کوئی اور حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رہی نیناں، تو وہ بے چاری ان حالات میں کوئی مشورہ دینے کے قابل ہی نہیں تھی۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں نیناں سے دور دور ہی رہا... کیونکہ کچھ روز دور رہنے ہی میں عافیت تھی۔ میں فون پر اس سے رابطے میں تھا لیکن وہ بھی کم کم...

لیکن تیسری صبح، اخبار پڑھنے کے بعد میرا رہا سہا سکون اور اطمینان بھی غارت ہو گیا۔ اخبار میں جو خبر شائع ہوئی تھی اس کی تفصیل کے مطابق... فلم پروڈیوسر، کرن ورما نے بتایا تھا کہ شیراز علی بذریعہ کار، ورما پروڈکشن کے تحت بنائی جانے والی فلم لوکیشن کی طرف ''گوا'' روانہ ہوا تھا مگر جب وہ شیڈول کے مطابق وہاں نہیں پہنچا تو یہ تصور کیا گیا کہ شاید وہ راستے میں اپنے دوستوں کے پاس رک گیا ہوگا۔ اس خیال کے تحت کرن ورما نے جہاں جہاں شیراز علی کی موجودگی کے امکانات تھے... وہاں اسے چیک کیا مگر وہ کہیں نہ ملا... کرن ورما نے اپنی تلاش جاری رکھی لیکن دو روز بعد بھی جب اس کا کوئی پتا نہیں چلا، تب پولیس کو اس معاملے کی رپورٹ کی گئی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا... لیکن اس خبر کا چونکا دینے والا پہلو یہ تھا کہ شیراز علی کے پاس ایک بڑی رقم تھی۔ یہ رقم اسے لوکیشن پر پہنچ کر فلم ڈائریکٹر کے حوالے کرنی تھی۔ ڈائریکٹر کو اخراجات اور ادائیگیوں کی مد میں رقم کی فوری ضرورت تھی لہٰذا کرن ورما نے وہ رقم شیراز علی کے حوالے کر دی۔ کرن ورما کا کہنا تھا کہ یہ رقم وہ بینک کے ذریعے بھی بھیج سکتا تھا مگر چونکہ فلم لوکیشن، شہر سے دور ایک مضافاتی علاقے میں تھی اس لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ شیراز کے ہاتھ براہِ راست، فلم ڈائریکٹر کو رقم بھیج دے۔

ان حالات میں شیراز علی کی گمشدگی کسی سنگین واقعے کا پیش خیمہ سمجھی جا رہی تھی... اور بڑے پیمانے پر شیراز علی کی تلاش اور تحقیقات کا آغاز ہو چکا تھا۔

جب سے میں نے یہ خبر پڑھی تھی، میں نیناں کے بارے میں عجیب طرح کے شکوک و شبہات کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً اسے فون کیا۔

''نیناں!'' رابطہ ہوتے ہی میں نے بلا تمہید کہا۔ ''تم نے آج صبح کا اخبار پڑھا؟''

''ہاں... پڑھا ہے۔''

''تب... تم اس بارے میں کیا کہو گی؟''

''میں جانتی ہوں کہ تم میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔'' میرا سوال سن کر اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اس رقم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی... نہ میں نے اس کے پاس کوئی رقم دیکھی، نہ ہی اُس نے اس بارے میں کوئی تذکرہ کیا۔''

''مگر وہ رقم بہر حال، اس کے پاس موجود تھی...'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں اِک تلخی سی در آئی تھی۔ ''میں بار بار تم سے درخواست کرتا رہا کہ نیناں... مجھے ساری باتیں بالکل سچ سچ بتا دو لیکن تم نے بہت کچھ مجھ سے چھپا لیا۔

اب اگر معاملہ بگڑتا ہے تو بگڑے... مجھے کیا؟''

''کامران... پلیز!'' اس کے التجائیہ انداز نے مجھے پگھلا دیا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک ساتھ بیٹھ کر بات کرنی ہو گی... تفصیل کے ساتھ اور آج ہی، میں آ رہا ہوں۔''

نیناں کا خوب صورت گھر باہر سے ویسا ہی شاندار اور پُرسکون دکھائی دے رہا تھا... کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہاں کیسا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔

نیناں نے میرے دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا اور پھر یوں بند کیا، گویا میرے پیچھے بہت سے شکاری کتے لگے ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے تھے مگر اس عالم میں بھی وہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

''تمہیں ابھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، کامران!'' نیناں نے آہستہ سے کہا۔

''جو مصیبت مجھ پر کل آنی ہے، آج ہی آ جائے تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنی کہو...''

''میں نہیں چاہتی کہ تم پر کوئی مصیبت آئے... ورنہ تمہارے آنے سے مجھے جو خوشی ہوئی ہے اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں اکیلے وقت گزارنا میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں...''

''نیناں! میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، خدا کے لیے مجھے اور زیادہ نہ الجھاؤ۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگر شیراز کو یہیں سے سیدھا گوا روانہ ہونا تھا تو وہ رقم اس کے پاس ہی ہونی چاہیے تھی؟'' میں نے کہا۔

نیناں چند لمحوں تک زخمی نگاہوں سے میری جانب تکتی رہی، بالآخر وہ گویا ہوئی۔ ''یہ درست ہے کہ اپنی بدقسمتی کے باعث میں اپنے مقام سے خاصی نیچے گر چکی ہوں... لیکن اس حد تک کم از کم اب بھی نہیں گری۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ''میں اُس نہیں جانتی کہ اس کے پاس کوئی رقم تھی۔ اگر جانتی تب بھی میں اس رقم کو ہاتھ نہ لگاتی۔''

میرے پاس اس کی بات تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ہوں بھی میں اس کو دل گرفتہ دیکھ کر شرمندہ تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ رقم اس کے سوٹ کیس میں تھی اور اس کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''وہ رقم کی وجہ سے وہ گن ساتھ لیے پھر رہا تھا۔''

''اوہ... ہمیں وہ سوٹ کیس کھول کر دیکھنا چاہیے تھا۔'' نیناں چونک کر بولی۔

''اس وقت سوٹ کیس کی تلاشی اتنی اہم نہیں تھی کیونکہ ہم رقم کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''آج رات میں دوبارہ اس جگہ کی کھدائی کر کے دیکھوں گا۔''

نیناں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''اگر تم وہ رقم تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو؟'' اس نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ وہ قبر کھودے جانے کے خیال سے خوف زدہ تھی۔

''میں صرف یہ تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ وہ رقم واقعی اس سوٹ کیس میں موجود ہے... یا نہیں۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم اس رقم کو لوٹا تو نہیں سکتیں کہ یہ شیراز علی نے میرے پاس رکھوائی تھی۔''

''کیا گمنام رہ کر یہ کام نہیں کیا جا سکتا؟'' نیناں نے سوال کیا۔

''ہرگز نہیں۔ اس طرح کرن ورما کے علاوہ پولیس بھی ہمارے پیچھے پڑ جائے گی اور پھر وہ ہمارا سراغ لگا کر ہی چھوڑیں گے۔'' میں نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ''بہتر ہے انہیں یہی سوچنے دیا جائے کہ راستے میں شیراز کو کسی نے رقم کے لیے قتل کر دیا اور اس کی کار بھی چوری ہو گئی... یا یہ کہ اسے رقم اور کار سمیت کسی نے اغوا کر لیا یا پھر وہ خود ہی کہیں غائب ہو گیا۔''

''اُف... میں کس مشکل میں گرفتار ہو گئی۔'' نیناں کراہی۔ ''اگر کرن ورما یا پولیس میں سے کسی ایک کو بھی میرے بارے میں کوئی سراغ مل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے... پولیس والے بھی اس رقم کو حاصل کرنے کے لیے اتنے ہی بے تاب ہوں گے جتنا کہ کرن ورما۔''

اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ چونکی اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر وہ اٹھ کر سامنے والی کھڑکی کی طرف گئی اور باہر جھانکنے لگی۔ اس کے بعد وہ تیزی سے میری جانب مڑی۔ ''یہ تو کرن ورما کی گاڑی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں کیا کروں... کہیں چھپ جاؤں کیا؟'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں... میں اسے بتا دوں گی کہ تم ایک اداکار ہو، پرانے دوست ہو اور یونہی ملنے کے لیے آئے تھے۔'' نیناں نے کہا۔

اسی لمحے ڈور بیل گنگنائی... ایک مناسب سے وقفے کے بعد نیناں اپنے چہرے پر اطمینان و سکون کے تاثرات

لانے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔

”ہیلو کرن!“ دروازہ کھولتے ہی نیناں نے متوازن لہجے میں کہا۔ ”تم یہاں؟“

”میں اندر آسکتا ہوں؟“ ایک بھاری اور سپاٹ سی آواز سنائی دی۔

نیناں نے پیچھے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ تب میں نے پہلی بار کرن ورما کو دیکھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ درمیانے قدوقامت کا مالک تھا مگر باڈی بلڈر ٹائپ دکھائی دیتا تھا۔ چہرے کے خدوخال کرخت تھے، رنگ سانولا اور بال لہریئے دار تھے۔ اس نے لائٹ براؤن سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، اس کی نظر مجھ پر پڑی لیکن اس نے مجھے یوں نظرانداز کردیا گویا میں اس کمرے میں پڑے سازوسامان کا ایک حصہ ہوں۔

”یہ میرا پرانا دوست کامران ہے... ہم نے ٹی وی پر اکٹھے کام کیا ہے۔“ نیناں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں... کامران! یہ کرن ورما ہیں... فلم پروڈیوسر۔“

اس نے بے دلی کے ساتھ میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور فوراً ہی چھوڑ دیا۔ ”تم اداکار ہو؟“ کرن ورما نے میرے کندھے کے اوپر سے کسی غیر مرئی نکتے کو گھورتے ہوئے کہا اور اسی جانب چل دیا۔

”ہاں... میں اداکار ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ممبئی میں ہر ایک اداکار ہے۔“ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا پھر وہ یکایک نیناں سے مخاطب ہوا۔ ”تمہیں معلوم تو ہوگیا ہوگا...؟“

نیناں کا رنگ ایک دم فق ہوگیا۔ کرن ورما کے اس غیر واضح اور ادھورے سوال میں نہ جانے کتنے سوال پوشیدہ تھے۔

”میں نے آج صبح اخبار پڑھا تھا۔“ نیناں نے جلد ہی خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ...!“ وہ نیناں کی جانب پلٹا۔ ”تب پھر ان خبروں سے تم کس نتیجے پر پہنچیں... تمہارے ذہن میں کیا آیا؟“

”پہلے تو میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شیراز حسبِ عادت شراب کے نشے میں غرق ہو کر اِدھر اُدھر رک گیا ہوگا لیکن جب میں نے رقم کے بارے میں پڑھا تو... ویسے کیا یہ رقم والی بات سچ ہے؟“ آخر میں نیناں نے ہمت کر کے سوال کر ڈالا۔

”ہوں...!“ کرن ورما نے ایک ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل سچ ہے۔“

”کتنی رقم تھی؟“ نیناں نے ایک اور سوال کیا۔

”پچاس لاکھ روپے۔“

”اوہ!“ نیناں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”جب تم نے رقم کے بارے میں پڑھا تو تمہارے ذہن میں کیا خیال آیا؟“ کرن نے پوچھا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا نیناں کے نزدیک چلا آیا۔ اس کی نظریں، نیناں کے تاثرات کا بغور مشاہدہ کر رہی تھیں۔

”میں نے سوچا کہ رقم لے کر وہ کہیں غائب ہوگیا۔“ نیناں نے جواب دیا۔ ”اسے نوابوں کی طرح ٹھاٹ سے رہنے اور روپیا اڑانے کی عادت تھی۔ اس وجہ سے وہ ہمیشہ قرض دار بھی رہتا تھا تو شاید...“

”غلط... بالکل غلط۔“ کرن نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”جب کسی کا چہرہ شیراز کی طرح چلتے پھرتے سائن بورڈ کی طرح ہو... کہ دیکھو، میں ہوں شیراز علی... جانا مانا فلم اسٹار... تو پھر وہ کیسے غائب ہوسکتا ہے... وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔“

”شاید وہ کسی دوسرے ملک نکل گیا ہو۔“ نیناں نے خیال ظاہر کیا۔

کرن ورما نے یوں نیناں کی طرف دیکھا جیسے اسے، اس لڑکی کی عقل پر افسوس ہو رہا ہو۔ ”شیراز علی کے لیے پچاس لاکھ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں پھر وہ اس فلم میں میرا حصے دار بھی تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ منافع حاصل کرنے والا تھا... بہرحال، تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مجھے دھوکا دے سکتا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ نیناں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھلا یہ کیسے جان سکتی ہوں؟“

”جان سکتی ہو نیناں... تم جان سکتی ہو۔“ کرن ورما نے سرد لہجے میں کہا۔

جواب میں نیناں نے اس کی جانب ایسی نظروں سے دیکھا جن میں احتجاج تھا... بے بسی تھی اور دبا دبا غصہ بھی تھا۔

کرن نے اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔ ”وہ رقم لے کر بھاگ تو نہیں سکتا...“ چند لمحوں کے توقف سے اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا... سوچو نیناں۔“

”تب پھر کسی نے رقم کے لیے اسے ہلاک کردیا ہوگا۔“ نیناں نے تحمل سے کہا۔

''کس نے؟'' کرن نے نیناں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ تمہارے نام نہاد دوستوں اور ساتھیوں میں سے کسی نے یہ کام کیا ہو۔'' نیناں نے کہا۔

''ہوں...'' کرن نے ہنکارا بھرا۔ ''مگر کس نے؟''

''میرا خیال ہے کہ بہت ہو چکا کرن... اب تم چلے جاؤ۔'' نیناں کا ضبط جواب دے گیا۔

وہ چند لمحوں تک سپاٹ سی نظروں سے نیناں کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''ہم جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالیں گے... اس سلسلے میں ہمیں قانون کی مدد بھی حاصل ہے۔''

وہ دھیرے دھیرے پُروقار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا اور اسے کھول کر دوبارہ نیناں کی جانب پلٹا۔ ''ویسے پچھلے تین دنوں میں تم نے شیراز کو بالکل نہیں دیکھا؟''

نیناں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

کرن ورما کے جانے کے بعد نیناں یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ وہ کھڑکی میں کھڑا عین اسی جگہ کیوں گھور رہا تھا، جہاں شیراز کا مدفن تھا... میں نے اسے تسلی دی کہ وہ خوامخواہ وہم میں نہ پڑے۔ کرن، یونہی چند لمحوں کے لیے کھلی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کررہا تھا۔

''گھبراؤ مت... تمہارا رویّہ اس کے سامنے بالکل پُرسکون دکھائی دے رہا تھا... بلکہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کم از کم تمہیں اس کو یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ پچھلے دنوں تم نے شیراز کو بالکل نہیں دیکھا۔''

''اگر میں اس کے سامنے ایسا رویّہ اختیار نہ کرتی تو وہ شک میں پڑ جاتا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اب میرا شیراز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔'' نیناں نے جواب دیا۔

''تو پھر وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟'' میں نے کہا۔ ''اور اس قدر عجیب و غریب انداز میں سوالات کیوں کررہا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ ہر ممکنہ جگہ اسی طرح سراغ رسی کرتا پھر رہا ہے... آخر میں اس نے سوچا ہوگا کہ یہاں بھی چیک کرلیا جائے۔''

''اچھا!'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ پوری صورتِ حال معلوم ہوتے ہوتے میری عمر گزر جائے گی۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہیں شیراز سے اس قدر نفرت کیوں ہے؟''

''یہ جاننا بہت ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت ضروری ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کیبنٹ سے بوتل اور گلاس نکال لائی۔ ''اس کے بغیر میں بات نہیں کرسکوں گی۔'' اس نے کہا۔

''زیادہ مت پینا... تمہارا ذہن اس وقت بالکل صاف رہنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''پلیز کامران... وہ سب باتیں بیان کرنے سے پہلے مجھے اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس سارے قصے کا آغاز کرن ورما سے۔'' نیناں نے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میرے معاملے میں وہ شیراز سے کم قصوروار نہیں... وہ صرف اور صرف ایک بنیا ہے، بے رحم اور لوگوں کا خون چوسنے والا بنیا! روپیا کمانے کے لیے اسے محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اس کے اپنے ذرائع ہیں روپیا حاصل کرنے کے... یہ جو اس کا تھوڑا بہت جائز کاروبار ہے، اس کے لیے بھی رقم انڈرورلڈ کے ناجائز ذرائع سے ہی آتی ہے۔''

''انڈرورلڈ؟'' میں نے چونک کر کہا۔ ''کیا واقعی کرن کا انڈرورلڈ سے کوئی تعلق ہے؟''

''وہ تو پلا بڑھا ہی اسی دنیا میں ہے۔'' نیناں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس کی ساری کہانی تو نہیں معلوم لیکن چند ایک باتیں ضرور جانتی ہوں۔ ممبئی کے شاید سارے غیر قانونی دھندوں میں اس نے اپنی ٹانگ پھنسا رکھی ہے۔ ایک بہت بڑے جوئے خانے کا مالک ہے اور سنا ہے کہ کئی قحبہ خانے بھی اس کی سرپرستی میں چل رہے ہیں جہاں سے وہ باقاعدہ کمیشن وصول کرتا ہے... بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ فلمی دنیا کے بزنس میں آنے سے پہلے انڈیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اس نے کال گرلز کا ایسا نیٹ ورک قائم کررکھا تھا جس کے لیے بکنگ وغیرہ کا کام وہ یہیں... ممبئی میں بیٹھ کر انجام دیتا تھا۔ ایک فلم پروڈیوسر کے بے ضرر سے نقاب کے پیچھے کرن ورما کا اصل چہرہ بڑا بھیانک ہے۔''

''اور اس ساری کہانی میں تم کہاں فٹ ہوتی ہو؟'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

نیناں نے بے چینی سے پہلو بدلا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی تک گئی۔ باہر جھانکتے ہوئے اس نے ایک جھرجھری لی اور چند لمحوں کے بعد پلٹ آئی۔ بالآخر وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''کرن ورما نے ایک پارٹی کے دوران میں مجھے ایک رول آفر کیا تھا۔ اگر اسے واقعی آفر کہہ سکتے ہیں تو... اس نے بغیر کسی تمہید کے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟ میں کچھ حیران تو ہوئی کیونکہ اس کے ساتھ میرا باقاعدہ تعارف نہیں تھا۔ بہرحال، میں نے ایمان داری کے ساتھ جواب دیا کہ کوئی خاص نہیں... اس پر وہ بولا کہ تمہارے لیے میرے پاس ایک بہت اچھا رول ہے اور اس کا معاوضہ میں تمہیں اے کلاس ہیروئن کے مطابق ادا کروں گا۔ لیکن جلدی کی کوئی بات نہیں... تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں فلم کا کنٹریکٹ تمہارے تکیے کے نیچے رکھ دوں گا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ اس پر سوئیں گے۔

''اس وقت ہم ایک میز کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے اس میز پر رکھا ہوا ڈرنک سے بھرا گلاس اٹھایا اور سارا مشروب اس کے چہرے پر پھینکتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ میرا جواب ہے۔

''اس کے علاوہ بھی میں نے اسے خوب کھری کھری سنائیں۔ پورا ہال دم بخود ہوکر میری اور اس کی جانب متوجہ تھا۔ وہاں بہت سے فلمی لوگوں کے علاوہ، فلم رپورٹرز بھی تھے جو بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر ہیں... لہٰذا خفت کے باعث کرن ورما کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا اور میری اس حرکت پر مجھے مزہ چکھا کر رہے گا۔ اس موقع پر اس نے مجھے گندی گندی گالیوں سے نوازنے کے علاوہ... نفسیاتی مریضہ بھی کہا اور یہ انکشاف بھی کیا کہ میں دراصل عورت ہی نہیں ہوں۔''

نیناں سانس لینے کو رکی تو میرا انہماک ٹوٹا... اور میں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔ ''اتنا بڑا واقعہ ہوگیا اور میں نے کسی کے منہ سے اس کا ذکر تک نہیں سنا۔''

''تم کرن ورما کو نہیں جانتے...'' نیناں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ ''سب اس سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی کو اس کے خلاف ایک لفظ کہنے کی جرأت نہیں... اس کی صرف ایک تنبیہ کافی ہے۔ یہاں تک کہ رپورٹرز نے بھی چپ سادھ لی۔ بہرحال، کرن ورما نے میرے خلاف جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس مقصد کے لیے اس نے شیراز کو استعمال کیا۔ شیراز دراصل اسی کا آدمی تھا، میں یہ نہیں جانتی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ میں شیراز کو پسند کرنے لگی ہوں۔ ہم اکثر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔

''ایک روز شیراز نے کچھ اس انداز میں مجھ سے شادی کا مطالبہ کیا کہ میں فوراً مان گئی۔ دو روز بعد ہم نے کورٹ میرج کرلی۔ ہمیں شادی کا لائسنس مل گیا۔ میں نے نکاح کی شرط رکھی تو شیراز نے بھی منظور کرلی۔ جھٹ پٹ قاضی اور گواہوں کا انتظام کیا گیا اور ہمارا نکاح ہوگیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ قاضی، گواہ اور نکاح نامہ، سب جعلی تھے۔ یہاں تک کہ وہ کورٹ میرج بھی جعلی تھی۔ صرف کورٹ حقیقی تھا لیکن مجسٹریٹ، گواہ اور لائسنس جعلی۔''

''میرے خدا... اس کے بعد کیا ہوا؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہم ہنی مون منانے کے لیے شملہ چلے گئے۔ وہاں ہم نے کرن ورما کے خوب صورت کاٹیج میں قیام کیا۔ کرن، شیراز کے دوست کی حیثیت سے ہماری شادی میں بھی شریک تھا۔ سہاگ رات کو شیراز نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے اتنی پلا دی کہ میں مدہوش ہوگئی... اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ شیراز کا رویّہ میرے ساتھ کچھ عجیب سا تھا... لیکن میں اس کی ہر حرکت کو اس کی محبت سمجھتی رہی۔

''ایک ہفتے بعد ہم وہاں سے لوٹ آئے۔ کرن ورما نے شادی کی خوشی میں ہمیں اپنے گھر پر دعوت دی۔ چونکہ ہم نے اس شادی کو خفیہ رکھا ہوا تھا اس لیے یہ دعوت کہیں باہر نہیں رکھی گئی تھی۔ شادی کو خفیہ رکھنا بھی شیراز کا فیصلہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھے اپنے مقابلے پر بہت بڑی اسٹار بنانا چاہتا ہے، لہٰذا مجھے ابھی اپنی شادی کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔

''کھانے کے بعد کرن ہمیں اپنے گھر میں بنے پروجیکشن روم میں لے گیا۔ وہ اپنی نئی فلم کی جھلکیاں ہمیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہاں ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ کرن نے خود پروجیکٹر وغیرہ آن کیا... اور جو پہلا منظر میں نے دیکھا... اس میں، میں خود اپنی نگاہوں کے سامنے تھی، دلہن کے روپ میں۔

''میرا پیارا شوہر بھی اس منظر میں موجود تھا لیکن اس کا چہرہ کیمرے کی رینج میں نہیں تھا۔ کرن ورما کے کاٹیج پر ہماری سہاگ رات کو عکس بند کرلیا گیا تھا... اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ... اور اس کے مناظر میری نگاہوں کے سامنے سے کسی خواب کی طرح گزر رہے تھے۔''

''نہیں...'' یکایک میں چلا اٹھا۔

''ہاں... ہاں!'' نیناں سسک اٹھی۔ ''یقین کرو کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ تم تصور نہیں کرسکتے کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سب کچھ ایک دھوکا، ایک فراڈ تھا... وہ دونوں شیطان میری حالت

دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا اور میں نے دیوانوں کی طرح چلانا شروع کر دیا کہ بند کرو... یہ بند کرو! بالآخر کرن نے اسے بند کر دیا اور انتہائی خبیثانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ تو ان دونوں کا ایک چھوٹا سا مذاق تھا۔“

نیناں سر جھکا کر گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ اس کے انکشافات نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔

”لیکن ان کا وہ مذاق پھر ختم نہیں ہوا۔“ چند لمحوں کے بعد اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں نے اس فلم کے ذریعے مجھے بلیک میل کیا اور میں ان کے اس گندے ریکٹ میں شامل ہونے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے کئی دفعہ خودکشی کے بارے میں سوچا... لیکن ہر مرتبہ کچھ سوچ کر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ میرے مرنے سے ان خبیثوں کو بھلا کیا فرق پڑتا، مزہ تو تب تھا کہ ان کو مار کر مروں۔

”بہرحال، میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور ان کے ذریعے آنے والے پیسے کو قبول کرتی رہی... لیکن شیراز کو اس روز کے بعد سے میں نے اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔“

”تم اس سے نفرت کرنے میں حق بجانب تھیں۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسے خبیث انسان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیر، تم مجھے مزید حالات بھی بتاؤ تاکہ...“

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ نیناں اٹھ کر فون سننے لگی۔ دوسری جانب جو کوئی بھی تھا، اس کی بات سن کر نیناں کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔ آخر میں اس نے صرف اتنا کہا کہ ’مجھے دس منٹ دو!‘ اور اس کے بعد فون رکھ دیا۔

میں اسی کی جانب متوجہ تھا لیکن وہ گویا مجھے نظر انداز کرتی ہوئی شاید اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک شولڈر بیگ تھا اور وہ اس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹول رہی تھی۔ اس کا ہاتھ جب باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں ایک چھوٹی سی نوٹ بک دبی ہوئی تھی۔

”مجھے ابھی باہر جانا ہوگا۔“ نیناں نے میری جانب بڑھتے ہوئے نروس سے انداز میں بتایا۔ ”مجھے اسی وقت کسی سے ملنا ہے... بہت ضروری۔“

”اتنی ایمرجنسی میں آخر کس سے ملنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اسے نہیں جانتے... اس کا نام ماریا ہے، ماریا ڈی سوزا۔“

”کیا اس ملاقات کو کچھ دیر کے لیے ٹالا نہیں جا سکتا؟“ میں نے کچھ جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا فوری طور پر جاننا میرے لیے بہت ضروری ہے۔“

”اس وقت میرا ماریا سے ملنا بھی بہت ضروری ہے... اس سارے چکر میں وہ بھی پوری طرح ملوث ہے۔ میری طرح وہ بھی کرن ورما کے ریکٹ کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے۔ اس وقت ایسی کوئی نئی بات اس کے علم میں آئی ہے جسے وہ مجھے بتانا ضروری سمجھتی ہے۔“ نیناں نے ایک ہاتھ سے اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں آپس میں بات کر کے آئندہ کے لیے کوئی پلان بنانا ہے۔“

”پلان... وہ کس لیے؟“

”اس منحوس ریکٹ سے باہر نکلنے کا پلان۔“ نیناں نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”شاید نجات کا کوئی راستہ نظر آ جائے۔ ویسے ماریا یہ سب کچھ میرے لیے کر رہی ہے، ورنہ وہ تو اپنے حال میں بہت خوش ہے۔“

”تم تو معموں میں باتیں کر رہی ہو...“ میں نے کچھ الجھتے ہوئے کہا۔ ”ماریا اس خوفناک چکر میں ملوث ہونے کے باوجود خوش کیونکر ہے؟“

”اس نے شاید اس بے حیا زندگی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے۔“ نیناں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یا شاید حقیقت کچھ اور ہو، بہرحال مردوں کو شکار کرنا اس کی عادت بن چکی ہے۔“

”نیناں! خدا کے لیے مجھے کچھ تو بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟“ میں نے عاجز آتے ہوئے کہا۔ میں جلد از جلد اصل حقیقت تک پہنچنا چاہتا تھا۔

”یہ ایک ایسا گیم ہے جو دولت مندوں سے ان کی دولت اینٹھنے کے لیے ایجاد کیا گیا ہے... اس زبردست اور خطرناک گیم کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔“ نیناں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بعد میں کب آخر...؟“ میری جھنجلاہٹ اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تم ابھی جاؤ۔“

”دیکھو... اگر تم یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرنا نہیں چاہتے تو تین بجے تک دوبارہ آ جانا۔“ نیناں نے رسانیت سے کہا اور اپنا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے ایک چابی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ ”یہ چابی رکھ لو۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو تم آ کر بیٹھ جانا۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر چابی لے لی اور ایک بار پھر اسے دیکھنا چاہا مگر وہ تیزی کے ساتھ باہر نکلی اور اپنی کار کی جانب بڑھ گئی۔ میں بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں، نسبتاً ایک الگ تھلگ علاقے میں واقع ہارڈ ویئر اسٹور پر کھڑا ایک پھاوڑا خرید رہا تھا۔ اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے ایک بار پھر پھاوڑا اٹھا کر لانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ دکان دار نے پھاوڑے کو اچھی طرح اخبار اور پلاسٹک بیگ میں لپیٹ کر مجھے تھما دیا۔ پھاوڑا لے کر میں جلدی سے اپنی کار کی جانب آیا۔ کار میں نے ایک سائڈ میں پارک کی تھی۔ میں نے کار کی ڈگی کھول کر پھاوڑا اس میں رکھ دیا... اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اب میری کار کا رخ اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی جانب تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے دو آدمی دکھائی دیے جو نیچے اتر رہے تھے۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ میں نے غور سے ان کا جائزہ لیا، وہ دونوں میرے لیے قطعی اجنبی تھے... معقول لباس میں تھے، دونوں دراز قامت اور فربہی مائل جسامت کے مالک تھے... عمر تیس اور پینتیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔

یہ جائزہ لینے میں گو کہ مجھے محض چند لمحے لگے تھے... لیکن ان چند لمحوں میں ہی میری چھٹی حس نے کسی گڑبڑ کا احساس دلا دیا تھا۔ باوجود یہ کہ وہ دونوں اجنبی افراد معقول اور شریفانہ حلیے میں تھے مگر کوئی بات ایسی ضرور تھی جو مجھے ان کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کر رہی تھی... شاید یہ احساس کہ جیسے وہ دکھائی دے رہے تھے، درحقیقت ویسے نہیں تھے۔

میں نے اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور لیونگ روم میں کھڑے ہو کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ بظاہر سب کچھ ویسا ہی تھا۔ ساری چیزیں اسی طرح ترتیب سے اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھیں۔ بے ترتیبی سے مجھے سخت چڑ تھی لہٰذا میری کوئی چیز اِدھر اُدھر بکھری ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ایش ٹرے بھی ایک میز سے دوسری میز پر رکھی ہوتی تو مجھے فوراً پتا چل جاتا۔

میں اپنے مختصر سے بیڈ روم میں گیا اور مختلف درازیں کھول کر ان میں جھانکنے لگا۔ کوئی بھی چیز جگہ سے بے جگہ نہیں تھی... مگر نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے چینی کا سا احساس تھا۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو معمول سے ہٹ کر تھی۔

اچانک میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ غیر معمولی بات کون سی تھی... کمرے کی محدود سی فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی مخصوص بُو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی آیا تھا... کیونکہ میں تو گھنٹوں سے باہر تھا اور جانے سے پہلے بھی میں نے سگریٹ نہیں پی تھی۔ ویسے بھی میں کوئی عادی سگریٹ نوش نہیں تھا۔

میں نے جلدی سے الماری کھولی اور ایک خانے سے جوتوں کے دو ڈبے نکالے... ان ڈبوں میں، میں اپنا کیمرا اور فوٹوگرافی سے متعلق دوسرا سامان رکھتا تھا۔ ایک ڈبے میں، کارڈ بورڈ سے دوہرا پیندا بنا ہوا تھا... شیراز کی گن میں نے اسی خفیہ خانے میں رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ گن وہاں موجود تھی... میں نے ڈبوں کو دوبارہ ان کی جگہ پر رکھ دیا۔

کپڑوں کا جائزہ لینے پر بالآخر یہ معلوم ہوا کہ ان کو چھیڑا گیا تھا... کیونکہ ایک کوٹ دوسرے کپڑوں کے برخلاف الٹے رخ پر لٹکا ہوا تھا... نیچے رکھے ہوئے جوتوں کے جوڑے بھی اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے تھے۔

میں بلڈنگ کے کیئر ٹیکر کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا دو افراد مجھے پوچھتے ہوئے یہاں آئے تھے... یا کسی نے اس سے میرے فلیٹ کے بارے میں دریافت کیا تھا... کیئر ٹیکر کا جواب نفی میں تھا۔ میں اس سوچ میں ڈوبا گھر واپس آ گیا کہ آخر وہ دونوں کون تھے اور میرے فلیٹ میں کیا کرنے آئے تھے؟

تین بجے کے بعد میں نے نیناں کو فون کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب تک وہ گھر واپس پہنچ گئی ہوگی۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ نیناں نے فون نہیں اٹھایا۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون کیا مگر اب بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد تیسری بار بھی جواب نہ ملنے پر بے چینی میرے اندر سر اٹھانے لگی... اس مرتبہ میں نے نیناں کے موبائل فون پر کال کی... لیکن یہ جان کر میری بے چینی فزوں تر ہو گئی کہ نیناں کا فون بند تھا۔

جب رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے، کسی دشمن کی طرح دبے پاؤں گھر میں اترنے لگا تو میری برداشت جواب دے گئی... میں نیچے اترا اور اپنی کار لے کر نیناں کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے بھر مختلف سوچیں میرے ذہن میں گردش کرتی رہیں... نہ جانے نیناں فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہی تھی؟ اس کا سیل فون کیوں آف تھا؟ وہ گھر واپس پہنچی بھی تھی یا نہیں... وہ کسی مشکل میں تو گرفتار نہیں ہو گئی تھی؟

انہی سوچوں میں غرق، میں نیناں کے گھر تک پہنچ گیا۔ گھر میں اندھیرا پڑا تھا۔ اس کے ملازم اتفاق سے اپنے اپنے

مسائل میں الجھ کر کام پر واپس نہیں پہنچے تھے۔ نیناں آج کل جن مسائل سے دوچار تھی، ان کے تحت یہ اتفاق اس کے لیے اچھا ہی تھا کہ اس کے اردگرد کوئی مداخلت کار موجود نہ ہو۔

نیناں کی دی ہوئی چابیوں سے میں گھر کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گاڑی کو میں نے پورچ میں پارک کر دیا تھا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی جو میں نے اسی روز خریدی تھی۔ لائٹیں آن کرنے سے میں نے گریز کیا کیونکہ میں کسی کو گھر کی جانب متوجہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ٹارچ کے گرد دونوں ہاتھوں کا حلقہ بنا کر میں نے اسے آن کیا اور ایک طرف ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اس کی روشنی باہر نہ جا سکے۔ اس وقت میں لیونگ روم میں موجود تھا۔ کمرے میں کسی ذی روح کی موجودگی کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے کمرے کے پردے اچھی طرح برابر کر دیے اور پھر بیڈ روم میں چلا گیا۔

اس وقت تک میری آنکھیں کافی حد تک تاریکی سے ہم آہنگ ہو چکی تھیں۔ جونہی میری نظر بیڈ کی طرف گئی، مجھے یوں لگا جیسے وہاں کوئی لیٹا ہے... میں بے اختیار آگے بڑھا۔ پھر میں نے ٹھہر کر ایک لمحے کے لیے ٹارچ کی روشنی بیڈ پر ڈالی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ بیڈ پر چادر اور کمبل وغیرہ ایک ڈھیر کی صورت میں اس طرح پڑے تھے کہ ان پر کسی سوئے ہوئے شخص کا گمان ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے باتھ روم اور کچن میں بھی جھانک لیا مگر وہ بھی خالی پڑے تھے۔

میں نے کار سے پھاوڑا نکالا اور مکان کے پچھلے احاطے میں پہنچ گیا۔ چاند کی روشنی میرے کام کے لیے کافی تھی۔ میں نے غور سے زمین کا جائزہ لیا اور اسی قطعۂ زمین کو کھودنا شروع کر دیا جہاں شیراز کا مدفن تھا۔ تازہ کھدی ہوئی زمین میرے تصور سے بھی زیادہ نرم ثابت ہوئی تھی۔ لہٰذا کھدائی کی رفتار اس مرتبہ تیز تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ہاتھ روک کر ذرا سانس لی اور مکان کا جائزہ لیا... مگر وہاں کوئی آہٹ، کوئی روشنی نہیں تھی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے دوبارہ کھدائی شروع کر دی۔ جب میں اپنے اندازے کے مطابق مطلوبہ گہرائی تک کھدائی کر چکا تو مجھے مٹی میں کوئی چیز چمکتی دکھائی دی۔ وہ سونے کا ایک کف لنک تھا جس میں چھوٹے چھوٹے سفید نگینے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ حیرت سے اس کف لنک کا جائزہ لیتے ہوئے اسے جیب میں ڈال لیا۔

میں نے ایک بار پھر کھدائی شروع کر دی مگر اب پریشانی مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔ تقریباً دو فٹ تک کھدائی کرنے کے باوجود شیراز کی لاش یا اس کے سوٹ کیس کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بالآخر تین فٹ تک کھدائی کرنے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی... میں نے اردگرد کی زمین کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہاں کچھ نہیں تھا سوائے اس ایک کف لنک کے...!

شیراز کی لاش بمعہ سوٹ کیس وہاں سے غائب ہو چکی تھی لیکن یہ اس بات پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہوا... میں نے جلدی جلدی لمبے لمبے ہاتھ چلا کر اس گڑھے کو بھرا اور سطح کو اچھی طرح ہموار کر دیا۔

پھاوڑے کو میں نے دوبارہ کار میں رکھ دیا اور اپنے کپڑے جھاڑ کر لیونگ روم کے صوفے پر جا بیٹھا۔ اس وقت تک میں پورا پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ کچھ دیر تو میں یونہی خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ شیراز کی لاش کا غائب ہو جانا میرے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ اس پر ستم یہ کہ نیناں بھی اب تک غائب تھی۔

میرے علاوہ صرف نیناں ہی ایسی ہستی تھی جو یہ جانتی تھی کہ شیراز کہاں دفن تھا... بمعہ ایک بھاری رقم کے۔

اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا تھا کہ نیناں نے اس بارے میں کرن ورما یا پھر پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ لیکن نہیں... اگر وہ پولیس کو مطلع کرتی تو اب تک اس عمارت کے چپے چپے کو گھیرے میں لیا جا چکا ہوتا۔

معاً مجھے یاد آیا کہ نیناں نے باتوں کے دوران مجھے بتایا تھا کہ کرن ورما کے پولیس کے ساتھ گہرے روابط ہیں... خصوصاً دو پولیس والے تو اس کے مکمل پالتو اور وفادار تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں چونک گیا۔ آج اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر ٹکرانے والے دو مشکوک افراد کہیں کرن ورما کے وہی زرخرید پولیس والے تو نہیں تھے؟

بہرحال... اس وقت یہ بات میرے لیے زیادہ اہم تھی کہ میرے ساتھ کون سا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ یہ خیال میرے لیے بے حد روح فرسا تھا کہ نیناں نے جان بوجھ کر مجھے ایک قتل اور چوری کے الزام میں ملوث کر دیا تھا اور خود کہیں دور چھپ کر میرا تماشا دیکھ رہی تھی۔ مجھے اب ہر حال میں اس کو ڈھونڈنا تھا۔

میں غم و غصے کی کیفیت میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا۔ تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لائٹیں جلائیں اور اس میز کی طرف بڑھا جہاں ٹیلی فون سیٹ اور ڈائریکٹری رکھی ہوئی تھی۔ میں ڈائریکٹری کے صفحات الٹنے لگا... اس وقت مجھے ماریا ڈی سوزا کے فون نمبر کی تلاش تھی... لیکن وہاں [illegible] موجود نہیں تھا۔

میں [illegible] تھا کہ نیناں نے اس بارے میں بھی غلط بیانی [illegible] لیا ہو اور ماریا ڈی سوزا نامی کسی لڑکی کا سرے سے کوئی [illegible] ہی نہیں ہو۔

لیکن میری جھنجلاہٹ مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں ہار نہ [illegible] اور کوشش جاری رکھوں۔ میں نے سارے شیلفوں اور [illegible] کی تلاشی لے ڈالی۔ میں اتنا تو نیناں کے بارے میں [illegible] گیا تھا کہ کمپیوٹر کے اس تیز رفتار دور میں بھی وہ خاص [illegible] باتیں نوٹ بکس میں نوٹ کرنے کی عادی تھی۔

بیڈ روم کی ایک دراز سے بالآخر مجھے ایک ایڈریس [illegible] بک مل گئی... یہ مختلف نام و پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ [illegible] ان میں بہت سے جانے پہچانے اور مشہور لوگوں کے نام و پتے [illegible] بھی تھے۔ انہی کے درمیان ماریا ڈی سوزا کا نام بھی تھا... [illegible] اس کے آگے ایڈریس اور فون نمبر بھی درج تھا۔

ماریا سے فون پر رابطہ کرنا شاید سودمند ثابت نہ ہوتا۔ [illegible] اجنبی آواز پر بھلا کوئی کیسے بھروسا کر سکتا ہے۔ لہٰذا میں [illegible] بنفس نفیس جا کر ماریا سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

نوٹ بک کو جیب میں رکھ کر میں نے لائٹس آف کیں [illegible] اور فرنٹ ڈور کو کھینچ کر بند کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

مطلوبہ اپارٹمنٹ بلڈنگ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ [illegible] دقت پیش نہیں آئی۔ کار کو ایک مناسب جگہ پارک کر کے میں [illegible] نیچے اتر آیا۔ ماریا کا اپارٹمنٹ آخری بلاک کی تیسری منزل پر [illegible] تھا۔ ڈور بیل بجانے سے پہلے میں نے ناقدانہ انداز میں اپنے [illegible] کپڑوں کا جائزہ لیا... پینٹ کو ایک مرتبہ پھر جھاڑا، قمیص کا [illegible] کالر درست کیا اور اس کے بعد گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ ذرا سا کھلا اور اس کی جھری [illegible] میں ایک نسوانی چہرے کی جھلک دکھائی دی۔

''کون ہے؟'' مشکوک انداز میں پوچھا گیا۔

''میں دراصل... نیناں کی تلاش میں یہاں آیا [illegible] ہوں۔'' میں نے بلاتمہید مقصد بیان کیا۔ ''آپ ماریا ڈی سوزا [illegible] ہیں... نیناں کی دوست؟''

چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی پھر جواب ملا۔ ''نیناں [illegible] یہاں نہیں ہے... لیکن آپ کون ہیں؟''

''میں نیناں کا دوست ہوں... کامران صدیقی۔''

''لیکن آپ نیناں کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک [illegible] پہنچے؟'' چند لمحوں کے توقف کے بعد ماریا نے سوال کیا۔

[illegible] جب آپ نے نیناں کو فون کیا تو میں وہیں [illegible] اس کے پاس۔'' میں نے کہا۔ ''تب اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔''

میری بات سن کر اس نے پورا دروازہ کھول دیا۔ اب وہ مجسم میری نظروں کے سامنے تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے بے اختیار وہ افسانوی جملہ یاد آیا کہ... اوپر والے نے شاید بڑی فرصت سے اسے بنایا تھا۔

''آپ اندر آ جائیں۔'' اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر مجھے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''نیناں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔''

وہ مجھے اندر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ ڈرائنگ روم خاصا کشادہ اور بہت اچھے طریقے سے آراستہ تھا۔ میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا، ماریا سامنے والے صوفے پر بڑے اطمینان کے ساتھ ٹانگ کے اوپر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''میں آپ سے نیناں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ملاقات کے لیے مجھے آج سہ پہر تین بجے کا وقت دیا تھا لیکن اس کا اب تک کوئی پتا نہیں۔''

ماریا نے ایک طرف رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکالا، اسے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھایا اور ایک کش لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ سگریٹ پیتے ہیں؟''

''کبھی کبھار پی لیتا ہوں لیکن اس وقت تو...''

''مجھے معلوم ہے، اس وقت آپ نیناں کے علاوہ کوئی اور بات کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ سگریٹ آپ کو آسمانوں کی سیر کرا سکتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نشہ آور سگریٹ پی رہی تھی... شاید میری جوانا یا اسی قسم کی کوئی دوسری چیز۔

''میں ایسی چیزوں سے کوسوں دور ہوں... کیونکہ میں زمین پر ہی رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سگریٹ کی بو مجھے ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔

''اوہ...'' ماریا نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''خیر... تو آپ نیناں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لیکن مجھے اس کے بارے میں کوئی آئیڈیا نہیں کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ کہاں گئی ہو گی۔''

''آپ کے پاس سے وہ کس وقت روانہ ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس وقت تقریباً دو بج رہے تھے۔'' ماریا نے سگریٹ کا ایک اور کش لینے کے بعد کہا۔

''کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟''

"اس کے یہاں آنے کے بعد ہم نے کچھ دیر آپس میں باتیں کیں پھر نیتاں نے کہا کہ اسے گھر جانا ہے اور وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔" ماریا نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کچھ نروس تھی... لیکن آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔"

"کیا اس نے ایسا کوئی ذکر کیا تھا کہ اسے میرے علاوہ کسی اور سے بھی ملنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اونہوں... ہوں۔" ماریا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس نے کہا تھا کہ کامران، دنیا میں وہ واحد شخص ہے جس پر میں بھروسا کر سکتی ہوں... اور وہ میری خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"اس نے ایسا کہا تھا؟" میں نے بے یقینی سے ماریا کی جانب دیکھا۔

"یہ بالکل سچ ہے، مائی ڈیئر۔" وہ مسکرائی۔

میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے سر جھکا لیا۔ اس وقت میں متضاد قسم کے محسوسات کا شکار ہو رہا تھا... جہاں مجھے اپنے بارے میں نیتاں کے خیالات جان کر یک گونہ خوشی محسوس ہوئی تھی، وہیں ایک تاسف بھی تھا کہ جیسے ان خوب صورت الفاظ کی آڑ میں نیتاں نے مجھے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔

"ماریا... آپ کے خیال میں شیراز علی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟" چند لمحوں کے توقف سے میں نے سوال کیا اور ماریا کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا... کہ نیتاں نے اس بارے میں اسے کچھ بتایا تو نہیں۔

ماریا کے چہرے کے تاثرات بدستور نارمل تھے۔

"اس آدمی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے کہا۔ "وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے... ہو سکتا ہے کہ اس نے جوئے میں سب کچھ ہار دیا ہو... کرن ورما کی رقم بھی داؤ پر لگا دی ہو اور اب منہ چھپائے کہیں بیٹھا ہو۔"

"کرن ورما کے ڈر سے؟" میں نے کہا۔

"تمہیں نیتاں نے بہت سی باتیں بتائی تو ہوں گی... ہے نا؟" ماریا نے کہا۔ اب تک چونکہ اس کے اور میرے درمیان کچھ بے تکلفی کی فضا قائم ہو چکی تھی لہٰذا وہ "آپ" سے "تم" پر آ گئی تھی۔

"اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔" میں نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے شملہ میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتا رہی تھی کہ اتنے میں تمہارا فون آ گیا۔"

"شیراز اور اس کا ہنی مون..." ماریا نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کرن ورما اور اس کے خفیہ کیمرے..." میں نے کہا اور میرے منہ میں جیسے تلخی سی گھل گئی۔

"یہ مت سمجھنا کہ صرف نیتاں کے ساتھ ایسا ہوا۔" ماریا نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں، کرن ورما کے 'ہنی مون کا میچ' میں اپنا سب کچھ گنوا چکی ہیں۔"

"تو... کیا تم بھی؟"

"ہاں... میں بھی۔" ماریا نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

"نیتاں مل جائے تو میں اس بارے میں مزید باتیں معلوم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کوئی آئیڈیا نہیں کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟"

جواب میں وہ عجیب سے انداز میں مسکرا دی... مجھے محسوس ہوا کہ اس نشہ آور سگریٹ کا نشہ شاید اس پر غالب آنے لگا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا... اتنی جلدی چل دیے؟" ماریا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو ابھی تک تمہیں چائے، کافی کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ دراصل میری دونوں فرینڈز باہر گئی ہوئی ہیں ورنہ..."

عین اسی لمحے ڈور بیل گنگنا اٹھی۔

"شاید وہ دونوں آ گئیں۔" ماریا نے دروازے کی جانب رخ کیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ دو خاصی طرح دار لڑکیاں موجود تھیں۔ بالکل کسی فیشن ماڈل کی طرح خوب صورت اور بنی سنوری... دونوں کے لباس بھی خاصے مختصر تھے۔

"یہ جینی ہے اور یہ کومل۔" ماریا نے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں اس اپارٹمنٹ کو میرے ساتھ شیئر کرتی ہیں۔"

ان دونوں نے مجھے ہیلو کہا اور باری باری مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کے تعارف کی تو کوئی ضرورت نہیں۔" کومل نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ آپ کامران صدیقی ہیں۔"

"مگر یہ کیا بات ہوئی کہ ہم آئے اور آپ جا رہے ہیں؟" جینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں... آپ لوگوں سے پھر ملاقات رہے گی۔" میں نے کہا۔

دروازے پر ماریا نے مجھ سے کہا۔ "زندگی ایک بہت بڑا جوا ہے، مائی ڈیئر! محبت اور نفرت ایک ہی سکے کے دو

ہیں... اس لیے ہو سکتا ہے کہ نیتاں وہیں ہو جہاں شیراز ہے... اسی کے پاس۔"

میں متوحش نگاہوں سے اس کا چہرہ تکتا رہ گیا... وہ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت وہ کیا کہہ رہی تھی... لیکن اس کی بات نے مجھے بُری طرح سہما دیا۔

وہ میرے انتہائی قریب چلی آئی اور ایک ہاتھ سے میری گردن سہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نیتاں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گی۔" اس لمحے اس کا لہجہ حالی سنجیدہ اور پُرخلوص تھا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ، ماریا۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔ "میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔"

☆☆☆

گھر واپس پہنچ کر میں نے ایک بار پھر نیتاں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی... مگر جواب ندارد... اس کا سیل فون بدستور آف تھا اور گھر کے فون پر بھی کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

تھک ہار کے میں ماریا کا نمبر ملانے ہی والا تھا کہ اچانک مجھے کال بیل کی آواز سنائی دی... میں خوشی سے اچھل پڑا... یقیناً یہ نیتاں تھی۔ میں جلدی سے دروازہ کھولنے کے لیے دوڑا۔

وہاں وہی دونوں آدمی کھڑے تھے جو میرے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر میرے قریب سے گزرے تھے اور میری چھٹی حس نے انہیں مشکوک قرار دیا تھا۔

وہ دونوں سرد نگاہوں سے میری جانب گھور رہے تھے۔ "جی، فرمایئے؟" میں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا حالانکہ میرا دل اس وقت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"پولیس!" سانولی رنگت اور باریک ناک نقشے والے آدمی نے کہا۔ "ہمارا تعلق خفیہ ڈپارٹمنٹ سے ہے۔"

مجھے پہلے ہی یہ شبہ تھا کہ وہ دونوں پولیس والے ہیں اور کرن ورما کے زرخریدوں میں سے ہیں۔ ان کے مخصوص عادات و اطوار یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھے۔

"کیا تم ہمیں اندر آنے کی اجازت دو گے؟" سانولی رنگت والے نے چند لمحوں کے توقف سے کہا۔ "ہمیں تم سے بات کرنی ہے۔"

میں نے بحث کرنے کے بجائے ایک طرف ہٹ کر راستہ دے دیا۔

"کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور..." سانولی رنگت والے نے مصنوعی خوش اخلاقی سے کہا۔ "لیکن پہلے ہم اپنا تعارف کرا دیں، میرا نام سلیم خان ہے اور یہ امرناتھ ہے... دراصل باقاعدہ تعارف کے بعد میرا خیال ہے کہ بات چیت کرنے میں آسانی رہتی ہے۔"

"بہت شکریہ آپ کا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب آپ اپنے آنے کا مقصد بھی بیان کر دیں تو مزید مہربانی ہوگی۔" ان دونوں نے اپنے عہدے مجھے نہیں بتائے تھے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرے لیے اتنا جاننا کافی تھا کہ وہ کرپٹ قسم کے پولیس والے تھے اور بس...

"ہمیں شبہ ہے کہ تم نے شیراز علی کو قتل کیا ہے۔" سلیم خان نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب!" میں نے بدستور طنزیہ انداز میں کہا۔ "جبکہ میں اس نام کے کسی شخص کو جانتا تک نہیں..." میں نے اس بارے میں انجان رہنا ہی بہتر سمجھا۔

"تم خود ایکٹر ہونے کے باوجود، فلمی ہیرو شیراز علی کو نہیں جانتے؟" امرناتھ نے کمرے کے درمیان دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے۔"

"اچھا... وہ شیراز علی! اسے کون نہیں جانتا؟ اس کے بارے میں تو یہ خبر ہے کہ وہ غائب ہے... لیکن آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔"

ان دونوں میں سے کسی نے میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ سلیم خان متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا ہوا بیڈروم کی جانب بڑھا۔

"ہم ذرا ایک نظر تمہارے فلیٹ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، امید ہے کہ تم بُرا نہیں مانو گے، کامران!" اس نے تمسخرانہ سے انداز میں میری جانب دیکھا۔

"شوق سے جائزہ لیجیے..." میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج دوپہر سے کوئی بھی چیز اِدھر سے اُدھر نہیں کی۔"

سلیم خان نے مڑ کر معنی خیز نظروں سے امرناتھ کی طرف دیکھا۔ "لڑکا ہوشیار ہے... امید ہے کہ یہ ہمارے لیے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کرے گا۔"

امرناتھ نے مسکراتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ سلیم خان بیڈروم میں گھس گیا جبکہ امرناتھ وہیں ایک صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک وہ بیزار سے انداز میں مجھے گھورتا رہا، اس کے بعد ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لینے لگا۔

اس دوران میں سلیم خان بیڈروم کی تلاشی لینے کے بعد باتھ روم اور پھر کچن میں گیا۔ مجھے درازیں کھولنے، بند کرنے اور کھڑپٹر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب ڈراما تھا... ورنہ تلاشی تو وہ پہلے ہی لے چکے تھے۔ یہ سب مجھے خوف زدہ کرنے اور اعصابی طور پر توڑنے کے حربے تھے... اور حقیقت یہ تھی کہ میں خوف زدہ ہو چکا تھا۔ میرے اعصاب اسی لمحے کشیدہ ہو چکے تھے جب ان دونوں نے اندر قدم رکھا تھا۔

بالآخر سلیم خان، لیونگ روم میں لوٹ آیا۔ ''شیراز کو قتل کرنے کے بعد تم نے اس رقم کا کیا کیا، کامران؟'' اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا... لیکن میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری کوشش تھی کہ اپنے تاثرات کو نارمل رکھوں۔

''تم اپنی کار کہاں کھڑی کرتے ہو؟'' اس مرتبہ امرناتھ نے سوال کیا۔

''نیچے، پارکنگ میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''گاڑی کی چابیاں مجھے دو۔'' سلیم خان نے مطالبہ کیا۔

میں نے جیب سے چابیاں نکال کر سلیم خان کی جانب اچھال دیں۔ وہ چابیاں کیچ نہیں کر سکا اور وہ زمین پر گر گئیں۔

''چابیاں اٹھاؤ۔'' وہ غرایا۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا... میرے اندر دبا ہوا غصہ دھیرے دھیرے سر اٹھانے لگا تھا۔ میرا کبھی کسی پولیس والے سے سابقہ نہیں پڑا تھا لیکن میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ قانون کے ان رکھوالوں کے آگے قانون کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ میرے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتے تھے اور بعد میں مجھ پر کوئی بھی الزام عائد کر سکتے تھے۔ اس لیے غصے میں ہونے کے ساتھ ساتھ.... کچھ خوف زدہ بھی تھا۔

امرناتھ اٹھ کر میرے عقب میں آیا اور مجھے ایک زوردار دھکا دے کر فرش پر گرا دیا... ''اٹھا ان چابیوں کو۔'' اس نے مجھے ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا... چابیاں میرے پیروں کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹھوکر مار کر انہیں دور اچھال دیا۔

''دوبارہ ذرا ایسی حرکت کر کے دیکھ... پھر میں تجھے کیسا مزہ چکھاتا ہوں، کتے!'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

میں اس وقت شدید طیش کے عالم میں تھا... لہٰذا ڈر، خوف سب غائب ہو گیا تھا۔

دوسری جانب امرناتھ کے چہرے کے تاثرات بھی غضب ناک ہو گئے تھے۔ یکایک اس نے جیب سے گن نکال لی اور میری طرف بڑھا... میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی آنکھ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی جانب ہٹا اور اس کی کلائی میری گرفت سے نکل گئی... اس نے دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھال لیا اور اپنی گن کی نال میرے سینے پر رکھ دی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میرے زوردار دھکے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی اور چہرہ تکلیف سے بگڑا ہوا تھا۔ طیش کے عالم میں وہ کسی بھی لمحے مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اس کے گھٹنے پر ضرب لگائی اور وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے گر پڑا۔

گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی... میں اسے اٹھانے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ امرناتھ نے میرے سر پر ایک زوردار پنچ لگایا اور میں الٹ کر پشت کے بل گر پڑا۔

دوسرے ہی لمحے ہم دونوں بیک وقت اچھل کر اپنے پیروں پر یوں کھڑے ہوئے .... گویا ہمارے پیروں میں اسپرنگ فٹ ہوں۔ میں امرناتھ کو ایک اور مکا رسید کرنے والا تھا کہ عین اسی لمحے کسی نے عقب سے بازو ڈال کر میری گردن کو جکڑ لیا... یہ سلیم خان تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے مجھے فرش پر گرا دیا۔ امرناتھ نے آگے بڑھ کر میری پسلیوں پر ایک زوردار ٹھوکر لگائی اور اس کے بعد لگاتار میرے جسم کے مختلف حصوں پر ٹھوکریں برسانے لگا۔

اس کے بعد اس نے آگے بڑھ کر میرے گلے پر اپنا بھاری جوتا رکھ دیا اور پوری قوت سے اسے دبانے لگا... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا نرخرہ پھٹ جائے گا... میں بری طرح کھانسنے اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

دفعتاً سلیم نے خان چیخ کر کچھ کہا اور میرے نرخرے سے امرناتھ کے جوتے کا دباؤ ہٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد جب میرے حواس کچھ قابو میں آئے اور میں نے آنکھیں کھولیں تو امرناتھ کو گھٹنوں کے بل اپنے اوپر جھکا ہوا پایا...

''میں تیرے چہرے کی ایک ایک ہڈی توڑ ڈالوں گا... کمینے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے گن کا بٹ میرے چہرے کی جانب آیا تو میں نے اپنا سر دوسری جانب گھما لیا... گن زوردار آواز

سردی برداشت کر لی جائے گی مگر روشنی زہر لگ رہی تھی

کے ساتھ فرش سے ٹکرائی اور ایک جھٹکے سے امرناتھ کا توازن بگڑا تو میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور چھلانگ لگا کر اٹھ کھڑا ہوا... مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی اور حرکت کر پاتا، سلیم خان اپنی گن مجھ پر تان چکا تھا۔

''بس...!'' وہ حلق کے بل دہاڑا۔ ''کھیل ختم ہو گیا اور تم بھی اپنے آپ پر قابو رکھو امرناتھ۔ یہ شخص ہمیں صحیح و سالم حالت میں چاہیے... سمجھے۔'' اس نے جھک کر کار کی چابیاں اٹھائیں۔ ''اب چلو، ہم پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکے ہیں۔''

امرناتھ چند لمحوں تک دانت بھینچے، خوں خوار نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنی گن واپس رکھ لی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''دیکھ لوں گا تجھے... فکر مت کر... آج رات حوالات میں تو بہت کچھ سیکھ جائے گا، بچے۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''چلو، چلو... نیچے چلو۔'' سلیم خان نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا اور مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں دروازے سے باہر نکلا اور انہیں اپنی راہنمائی میں نیچے پارکنگ میں کھڑی گاڑی تک لے گیا۔ پارکنگ میں خاصا اندھیرا تھا۔

سلیم خان نے اپنی ہپ پاکٹ سے ایک ٹارچ نکال کر جلائی... ٹارچ کی روشنی خاصی تیز تھی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر کار کے دروازے پر مختلف چابیاں آزمانے لگا۔ میں زیادہ فکرمند نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ کار سے انہیں کچھ نہیں مل پائے گا۔ بالآخر دروازہ کھل گیا۔ سلیم خان کار کے اندر گھسا اور ٹارچ کی روشنی میں اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے سیٹ کے نیچے بھی جھانکا اور پھر گلووکمپارٹمنٹ چیک کیا۔

''خالی ہے۔'' اس نے گویا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

''اور ڈکی میں کیا ہے؟''

اچانک مجھے یاد آیا کہ وہ بیلچا ابھی تک ڈکی میں رکھا ہوا تھا... ''کچھ نہیں۔'' میں نے اپنا انداز نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس کچھ اوزار وغیرہ پڑے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' سلیم خان نے بے پروائی سے کہا۔ ''واپس اوپر چلو۔''

میں نے جلدی سے سیڑھیوں کی جانب رخ کیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے میری جان کیسے چھوٹ گئی ... نہ جانے یہ میری قسمت کی کارستانی تھی یا پھر ان کی حماقت۔

ابھی میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتاً امرناتھ کی

کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ٹھہر جاؤ۔“ وہ چلایا۔ ”ہم اس کی بات پر کیسے یقین کر سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اس نے وہ رقم ڈکی میں ہی چھپائی ہو۔“

میں ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا۔

”ہاں۔“ سلیم خان نے پُرخیال انداز میں سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں ڈکی کو ایک نظر دیکھ ہی لینا چاہیے۔“

”کون سی چابی ہے؟“ امرناتھ نے غراتے ہوئے پوچھا۔

”گول والی...“ میں نے بتایا۔ اتنا ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی... میں نے سوچا، ڈکی میں کدال و پھاوڑا وغیرہ رکھنا کوئی جرم تو نہیں تھا۔

سلیم خان نے جھک کر ڈکی کا لاک کھولا اور ایک جھٹکے سے اسے اوپر اٹھایا۔ پھر اس نے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی... اسی لمحے میری ناک سے ایک ناگوار سی بو ٹکرائی۔ موت کی دہشت ناک بو!

”اوہ خدایا!“ سلیم خان کے منہ سے یک دم نکلا۔

”ہے بھگوان... یہ کیا؟“ امرناتھ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور میں بالکل ساکت کھڑا، ٹارچ کی روشنی میں واضح طور پر دکھائی دینے والی... شیراز علی کی گلی سڑی اور بے لباس لاش کو تک رہا تھا۔

☆☆☆

سلیم خان، میرے لیونگ روم میں ایک صوفے پر سوٹ کیس کھولے ہوئے بیٹھا تھا... یہ سوٹ کیس میری کار کی ڈکی میں، شیراز علی کی سڑی تڑی لاش کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔

”اس میں تو سوائے کپڑوں اور اسکاچ کی ایک بوتل کے کچھ نہیں ہے۔“ سلیم خان نے امرناتھ کو مطلع کیا اور پھر میری جانب مڑا۔ ”تم بتاؤ... وہ رقم کہاں ہے؟“

”مجھے شیراز اور اس رقم کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میری بات کا یقین کرو۔“

”تمہاری بات پر یقین کرلوں؟“ سلیم خان نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”تو پھر اس کا مطلب ہے کہ شیراز علی اپنا سوٹ کیس اور ایک بیلچہ اٹھائے... یونہی اپنے فطری لباس میں چہل قدمی کرتا پھر رہا تھا کہ اسے تمہاری کار نظر آئی اور وہ تمہاری کار کی ڈکی میں گھس گیا... اندر گھس کر اس نے ڈکی کو بند کیا اور اپنے آپ کو ختم کر ڈالا... ہے نا؟“

میں خاموش کھڑا رہا۔ میرے پاس اس کی طنزیہ باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ شیراز کی لاش میری کار کی ڈکی میں کب اور کس طرح پہنچی؟

”اس کی جیبوں کی تلاشی بھی لو۔“ امرناتھ نے کہا۔

”اے... اپنی جیبوں سے ایک ایک چیز نکال کر میز پر رکھ دو۔“ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

ماسوائے ایک چھوٹی سی چیز کے... میں نے اپنی جیبوں سے تمام چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ لیکن امرناتھ نے خود میری جیبوں کو ٹٹولا... اور وہ چیز برآمد کرلی۔

”یہ اسے کیوں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا؟“ امرناتھ نے سونے کے کف لنک کو روشنی کی جانب اٹھا کر اس کا معائنہ کیا۔ ”ارے... اس پر تو "S.A" لکھا ہوا ہے۔“ وہ چلایا۔ ”یعنی شیراز علی کے نام کے ابتدائی حروف...“

”بہت اچھے۔“ سلیم خان نے میری جیب سے نکلنے والی دوسری چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکانے کے لیے اب بھلا کس چیز کی کمی رہ گئی ہے؟“

اس لمحے میں نے سوچا کہ وہ واقعی درست کہہ رہا تھا۔ میرے مجرم ٹھہرائے جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں لاکھ اپنی بے گناہی پر اصرار کرتا لیکن بغیر کسی ثبوت کے کون میری بات پر یقین کرتا... میں نیناں کے بچھائے ہوئے جال میں بری طرح پھنس چکا تھا۔

”ثبوت تو سارے مل گئے۔“ سلیم خان نے ایک لمحے کے توقف سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب سیدھی طرح وہ رقم بھی ہمارے حوالے کردے... بتا، کہاں ہے وہ رقم؟“ وہ چلایا۔

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے اور نہ ہی میں نے شیراز کو قتل کیا ہے... اس کی لاش کسی نے مجھے پھنسانے کے لیے میری کار کی ڈکی میں رکھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا؟“ سلیم خان نے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ بیلچہ... اور شیراز کا یہ کف لنک... ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

میں کہنا چاہتا تھا کہ ان سب باتوں کے بارے میں نیناں سے پوچھو... لیکن نہیں کہہ پایا۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے اس کا نام لینے سے روک لیا اور میں چپ رہا۔

امرناتھ اپنی آستین چڑھاتا ہوا میری جانب بڑھا۔ ”اب تو اس کے حلق سے بھی رقم نکلوا کر رہوں گا۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

مگر سلیم خان نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ اس کے چہرے پر خلافِ توقع اس وقت نرمی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ اس طرح مجھ سے مخاطب ہوا گویا میں کوئی ناسمجھ بچہ تھا۔ ”دیکھو، برخوردار... اب جبکہ تمہارے خلاف سارے ثبوت ہمیں مل چکے ہیں، ہم بڑے آرام کے ساتھ تمہیں ہتھکڑی لگا کر لے جا سکتے ہیں۔“ اس نے بُردباری کے ساتھ کہا۔

”دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم اس رقم کے بارے میں بتا دو کہ تم نے اسے کہاں چھپایا ہے... اس کے بعد ہم بھول جائیں گے کہ تم کون ہو۔ یوں سمجھ لو کہ ہماری، تم سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ہم یہ بھی بھول جائیں گے کہ تمہاری کار میں کیا تھا۔ اب یہ تمہارا مسئلہ ہوگا کہ اس لاش کو کس طرح ٹھکانے لگاتے ہو۔ اس طرح بدنصیب شیراز ہمیشہ کے لیے گمشدہ افراد کی فہرست میں شامل ہو جائے گا اور کوئی اسے کبھی تلاش نہیں کر پائے گا... تم سمجھ رہے ہو نا؟“

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کا کیا مقصد تھا... میں ان کی گھناؤنی اسکیم کے بارے میں اندازہ لگا چکا تھا اور اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

”میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں۔“

”کیسے سوال؟“ امرناتھ ایک دم غرایا۔

سلیم خان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ ”ہاں... پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے متانت سے کہا۔

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں کا یہ رویہ ایک سوچا سمجھا ڈراما تھا... میرے اعصاب توڑنے کے لیے وہ مجھ پر نفسیاتی حربے آزما رہے تھے۔

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں شیراز کی لاش کے بارے میں کس نے بتایا کہ وہ کہاں دفن ہے؟“ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

ان دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور مسکرائے۔

”کیا نیناں نے تمہیں بتایا تھا؟“ چند لمحوں کے توقف سے میں نے دوسرا سوال کیا۔ نیناں کا نام لیتے ہوئے میری زبان اب بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

”نیناں... کون نیناں؟“ سلیم خان نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کہیں تم فلم اسٹار نیناں کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”اس کا مطلب ہے اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ رقم، سوٹ کیس میں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب اسے سوٹ کیس سے رقم نہیں ملی تو اسے ہماری مدد کی ضرورت پیش آئی۔“ سلیم خان نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ویسے ایک بات کہوں برخوردار... تم نے بڑی غلط جگہ ہاتھ ڈالا تھا۔ اب اس کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔“

”ہاں تو پھر تم کیا کہتے ہو؟“ امرناتھ نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہماری پیشکش منظور ہے یا نہیں؟“

”ظاہر ہے کہ منظور ہے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور راستہ بھی تو نہیں... مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ رقم حاصل کرنے کے بعد تم مجھے دھوکا نہیں دو گے؟“

”کوئی گارنٹی نہیں۔“ سلیم خان نے کہا۔ ”مگر یہ جوا تو تمہیں کھیلنا ہی پڑے گا۔“

میں بظاہر سوچ میں پڑ گیا... پھر چند لمحوں کے توقف سے میں نے کہا۔ ”چلو، ٹھیک ہے... رقم میں نے ایک لاکر میں رکھی ہے۔ میں ابھی اس کی چابی لے کر آتا ہوں۔“

”اب کی نا تم نے سمجھ داری کی بات۔“ سلیم خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا تو امرناتھ فوراً میرے پیچھے لپکا۔ ”اے... کہاں جا رہے ہو تم؟“

”چابی لینے۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

وہ دونوں میرے پیچھے پیچھے اندر آئے۔ میں نے الماری سے جوتوں کا مخصوص ڈبا نکالا، وہ بغور میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

”ہمیں دو... چابی ہم نکالیں گے۔“ امرناتھ نے کہا۔

”تمہیں نہیں ملے گی۔“ میں نے کہا اور ڈبے کو کھول کر ذرا ٹیڑھا کرتے ہوئے اندر اس طرح ہاتھ چلایا گویا میں اس چھوٹے موٹے کاٹھ کباڑ کے درمیان چابی تلاش کر رہا ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر چشم زدن میں گن باہر نکالی اور ان دونوں کی طرف تان لی۔

میرے ہاتھ میں اچانک گن دیکھ کر ان دونوں کی جو کیفیت ہوئی، اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا... میں نے زندگی میں کبھی اس قدر حیرت زدہ چہرے نہیں دیکھے

تھے۔

"واپس چلو۔" میں نے لیونگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

وہ بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اٹھے اور پلٹ کر میرے آگے آگے چلنے لگے... چلتے چلتے سلیم خان نے مڑ کر دیکھا تو میں غرایا۔ "کوئی چالاکی نہیں... دونوں ہاتھ اپنے اپنے سروں پر رکھ لو۔"

ان دونوں نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ میرے لہجے اور انداز سے وہ سمجھ گئے تھے کہ اس وقت میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔

داخلی دروازے کے نزدیک پہنچ کر میں ٹھہر گیا۔

"دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ لگا لو... جلدی کرو۔" میں نے انہیں ایک ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

میں ان سے ان کی گن... اور اپنی کار کی چابیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میرے خیال کے مطابق ان کے پاس میری کار کی چابیوں کا ایک دوسرا سیٹ بھی ہونا چاہیے تھا... ورنہ وہ چابیوں کے بغیر میری کار کی ڈکی کھول کر وہاں شیراز کی لاش کیسے رکھ سکتے تھے۔

امرناتھ میرے حکم کی تعمیل میں دیوار کی جانب مڑنے لگا... "کوئی ضرورت نہیں اس کا حکم ماننے کی۔" دفعتاً سلیم خان نے چلا کر کہا۔ "یہ آدمی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پولیس والے پر یہ کبھی گولی چلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" پھر وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا۔

"اگر ایک قدم بھی اور آگے بڑھایا تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا، سلیم خان۔" میں نے اسے دھمکی دی لیکن میں خود اس بارے میں پُریقین نہیں تھا کہ وقت پڑنے پر میں گولی چلا پاؤں گا یا نہیں۔

سلیم خان نے میری دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک قدم اور بڑھایا... لیکن میں فائر نہیں کر پایا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغور میری کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہر چند کہ میں بے گناہ تھا اور اپنے دفاع میں یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ جس دیس میں اندھیر نگری چوپٹ راج ہو، وہاں میری کوئی شنوائی نہیں ہو سکتی... نہ میں اپنے بے گناہ ہونے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ سلیم خان کا اعتماد لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا... امرناتھ ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔ میں آہستہ سے غیر محسوس انداز میں اپنا خالی ہاتھ پشت کی جانب لے گیا اور دروازے کی ناب کو پکڑ لیا۔

"گن مجھے دے دو۔" سلیم خان نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اعتماد سے بھرپور، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں چپ چاپ کھڑا سلیم خان اور امرناتھ دونوں پر بیک وقت نظر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاً سلیم خان نے ایک جست بھری اور آن کی آن میں میرے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ بائیں ہاتھ کا ایک پنچ اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ میرے اس طاقتور پنچ نے اسے لمبا لمبا لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ اسی لمحے میری نظر امرناتھ پر پڑی... وہ اپنی گن نکالنے والا تھا۔ میں نے.... اسی پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہی تیزی کے ساتھ اسے بند کر دیا۔

عین اسی لمحے مجھے گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا۔

میں گرتا پڑتا سیڑھیوں سے نیچے کی جانب دوڑا... بالآخر آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں اوندھے منہ گرا اور گن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ عین اسی لمحے اوپر کی جانب سے دو فائر ہوئے اور گولیاں فرش کا سیمنٹ اکھاڑتی ہوئی مجھ سے محض ایک فٹ دور زمین میں پیوست ہو گئیں۔

میں پھرتی کے ساتھ اس جگہ سے دور ہٹا اور اپنے قدموں پر اٹھ کھڑا ہوا۔ کوئی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ پھر کوئی چلایا... اور میں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

فائرنگ کی آواز پر کچھ لوگ اپنے اپنے دروازے کھول کر باہر جھانک رہے تھے اور چلا چلا کر ایک دوسرے سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اصل حقیقت ظاہر ہے کہ کسی کو معلوم نہیں تھی۔ اس کے بعد میرے عقب میں ایک اور فائر ہوا اور خوش قسمتی سے اس بار بھی میں بچ گیا۔ میں زگ زیگ کے انداز میں دوڑتا ہوا، دو بلڈنگوں کی درمیانی گلی میں گھس گیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ تنگ اور نیم تاریک گلی آگے سے بند تھی... میں بوکھلا کر پیچھے مڑا۔ ان دونوں خبیثوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور تیزی سے میری طرف آ رہے تھے۔

میں بُری طرح پھنس چکا تھا... دفعتاً مجھے بیسمنٹ کی طرف جانے والی سیڑھیاں دکھائی دیں۔

میں آگے کی جانب دوڑا۔ بیسمنٹ میں اندھیرا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ خاصا وسیع و عریض تھا اور بالکل خالی پڑا تھا۔ لہٰذا میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ معاً مجھے روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی اور میں بے اختیار اسی جانب دوڑ پڑا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے خود کو ایک راہداری میں پایا... وہاں چند قدم کے فاصلے پر مجھے ایک لفٹ کا دروازہ دکھائی دیا مگر لفٹ بند تھی۔ میں نے سیڑھیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی... سیڑھیاں نظر آتے ہی میں تیزی کے ساتھ اوپر کی جانب دوڑا۔

ذرا دیر بعد میں نے خود کو گراؤنڈ فلور پر پایا۔ اب میرا رخ نیچے مین گیٹ کی جانب تھا... کچھ دیر بعد میں گیٹ کے باہر، سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ وہاں تیرہ، چودہ سال کا ایک لڑکا اپنی بغیر سائلنسر والی موٹر بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں ایک پولیس مین ہوں۔" میں نے لڑکے کے قریب جا کر تیزی سے کہا۔ "دو ڈاکو ایک بینک لوٹ کر بھاگے ہیں اور میں ان کا پیچھا کر رہا ہوں۔"

میری بات سن کر لڑکے کا منہ پورا کا پورا کھل گیا... اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔ اس وقت تک وہ اپنی موٹر بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں جلدی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "جلدی چلو!" میں نے چلا کر کہا۔

لڑکے نے موٹر بائیک کو طوفانی رفتار سے دوڑا دیا۔ روانہ ہوتے وقت میں گیٹ کے باہر سلیم خان اور امرناتھ کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں اب بھی گنیں تھیں اور وہ بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

"راستہ تو بتائیں... آخر جانا کدھر ہے؟" موٹر بائیک کے کان پھاڑ دینے والے شور میں لڑکے نے چلا کر پوچھا۔

"آگے جا کر دائیں ہاتھ پر مڑ جانا۔" میں نے گلا پھاڑ کر کہا۔ "ہمیں سفید رنگ کی کرولا کا پیچھا کرنا ہے... وہ اسی طرف گئی ہے۔"

لڑکے نے ایک لمحے کے لیے گردن گھما کر میری جانب دیکھا... اس کی آنکھیں اندرونی جوش کے باعث چمک رہی تھیں۔ "آپ سادہ کپڑوں میں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"مگر آپ کے پاس گن تو ضرور ہوگی؟"

"ہاں بیٹے، گن میرے پاس ہولسٹر میں موجود ہے۔"

لڑکا موٹر بائیک کو طوفانی رفتار سے اڑائے لیے جا رہا تھا [illegible] عمری کے باوجود موٹر بائیک چلانے میں اسے خاصی مہارت تھی۔ اس طویل سڑک پر سفر کرتے ہوئے بالآخر ہم [illegible] پر پہنچنے والے تھے کہ دور سے مجھے اپنے پیچھے [illegible] کی آواز سنائی دی۔

"[illegible] طرف موڑ لو۔" میں چلایا۔ "بائیں طرف۔"

لڑکے نے تیزی سے موڑ کاٹا۔

"اسپیڈ کم کرو۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "ڈاکو ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔"

"اوہ... ڈیم اٹ۔" لڑکے نے خالص امریکی انداز میں کہا۔ وہ سخت مایوس ہوا تھا۔ رفتار کم کرتے ہوئے اس نے اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور سر کو جھٹکا۔ اس بے چارے نے کسی ایڈونچر کی تمنا میں میرا ساتھ دیا تھا مگر اس کی وہ تمنا دل میں رہ گئی تھی۔

"بس... مجھے یہیں اتار دو۔" میں نے کہا۔ اب ہم ایک رہائشی کمرشل ایریا میں پہنچ چکے تھے۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔" بائیک سے اترنے کے بعد میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی ایک بہادر لڑکے ہو۔ بڑے ہو کر تم ایک پولیس آفیسر بننا۔"

پھر میں اسے حیران و پریشان چھوڑ کر بھاگتا ہوا ایک شاپنگ سینٹر میں گھس گیا۔ اندر جانے کے بعد شاپنگ سینٹر کے دوسرے حصے میں جا کر میں نے ایک دکان کی آڑ سے باہر دیکھا، لڑکا وہاں سے جا چکا تھا۔ میں مطمئن ہو کر باہر نکل آیا۔ سڑک کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ اس قدر بھاگ دوڑ کے بعد میرے اعصاب کو کچھ سکون کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔

میں نے اپنے لیے ایک کولڈ ڈرنک منگوائی اور جیب سے نیناں کی نوٹ بک نکالی۔ اس میں سے ماریا ڈی سوزا کا نمبر دیکھ کر میں نے اپنے موبائل فون سے اسے کال کی۔ اس بھاگ دوڑ میں موبائل محفوظ رہا تھا۔

"ہیلو!" چند لمحوں کے بعد ماریا کی آواز سنائی دی۔

"ماریا... میں کامران بات کر رہا ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میری بات غور سے سنو، میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ تم کہیں جانا مت... میں اس وقت سخت مصیبت میں ہوں اور مجھے ہر حال میں نیناں کو تلاش کرنا ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو... پلیز! مجھے مایوس مت کرنا۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

☆☆☆

ماریا کے گھر تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک ٹیکسی لے لی تھی۔ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی میں ٹیکسی سے اتر گیا۔ ایک خیال کے تحت میں نے ماریا کو دوبارہ فون کیا۔

"میں تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ میں موت کے منہ میں جا کر واپس آیا

ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور اگر میں جلد ہی نیناں کو نہ ڈھونڈ پایا تو اس بار نہیں بچ پاؤں گا... تم نیناں کو تلاش کرنے میں میری مدد کرو... اپنی گاڑی نکالو اور مجھے یہاں سے ساتھ لے لو، ہم کہیں سکون سے بات کریں گے۔''

''ضرور کروں گی۔'' ماریا نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ ''اور فکر نہ کرو... اگر وہ چاند پر ہوئی تب بھی ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

ماریا مجھے اپنے ساتھ جس جگہ لے گئی تھی، وہاں میں اس سے پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ ایک نائٹ کلب تھا لیکن سب سے الگ تھلگ اور ایک پُرسکون جگہ پر تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر اور سجاوٹ بھی بالکل منفرد تھی جو ممبئی کے دوسرے نائٹ کلبوں سے بالکل مختلف...

راستے میں ایک پولیس موبائل کار کے نزدیک سے گزری تو میں بے ساختہ نیچے کو جھک گیا۔ میری اس حرکت کو دیکھ کر ماریا ایک دم نروس ہو گئی۔ تب اس نے کہا کہ اگر میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں پولیس سے کیوں چھپ رہا ہوں تو وہ ہرگز میری مدد نہیں کرے گی... مجبوراً میں نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

ماریا میری روداد سن کر انتہائی حیران دکھائی دے رہی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس وقت وہ پورے ہوش و حواس کے عالم میں تھی۔ ورنہ خدا معلوم وہ کس کس نشے کی عادی تھی... اس قسم کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی زندگی سے بھی بہت سے مسائل اور المیے وابستہ تھے۔

بہرحال... سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اندر چھپا ہوا اچھا انسان ابھی مرا نہیں تھا، تب ہی اس کی آنکھوں سے میرے لیے ہمدردی کے جذبات عیاں تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سلیم خان اور امرناتھ کے ذکر پر اس کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے... میرا اندازہ تھا کہ وہ یقینی طور پر ان سے واقف تھی اور دل ہی دل میں ان سے خوف زدہ بھی تھی۔ میں نے اس بارے میں ماریا سے سوال بھی کیا لیکن عین اسی لمحے ہم نائٹ کلب تک پہنچ گئے اور یوں میری بات درمیان ہی میں رہ گئی۔

اندر جانے کے بعد ہم ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔ اس ہال کی سجاوٹ بالکل کسی محل کی حرم سرا کی طرح کی گئی تھی۔

ماریا اس خواب ناک ماحول کو نظرانداز کرتی ہوئی بار کے نزدیک دکھائی دینے والے ایک دروازے کی جانب بڑھی۔ دروازے پر رک کر اس نے بارٹینڈر کی جانب دیکھا۔

جونہی وہ ماریا کی جانب متوجہ ہوا، ماریا نے آنکھوں آنکھوں میں اسے کوئی اشارہ کیا... بارٹینڈر نے غیر محسوس سے انداز میں گردن ہلائی اور پھر ایک ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی... ماریا نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور ہم سامنے دکھائی دینے والی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔

''بارٹینڈر، سائڈ میں لگا ہوا ایک بٹن دباتا ہے... جس سے یہ دروازہ کھل جاتا ہے۔'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ماریا نے وضاحت کی۔

اوپر والی منزل کی سجاوٹ اور ماحول بھی بالکل ویسا ہی تھا لیکن یہاں نیچے کے مقابلے میں روشنی مزید کم تھی۔ یہاں بھی ایک بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور یہاں دکھائی دینے والی ویٹریس۔۔ عربی کاسٹیوم میں ملبوس تھی۔ مگر خاص بات یہ تھی کہ نیچے کی طرح یہاں کوئی کسٹمر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی خوب صورت ویٹریس ہماری جانب بڑھی۔ اس نیم تاریک ماحول کے باوجود انتہائی حسین اور نیم عریاں عربی کاسٹیوم سے اس کا حسن بلاخیز بجلیاں گراتا محسوس ہو رہا تھا۔ نزدیک آ کر وہ مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ سے سارا ماحول گویا روشن ہو گیا۔

''آپ کو بوتھ چاہیے، مس ماریا؟'' ویٹریس نے گنگناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آف کورس، ڈیئر۔'' ماریا نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

ویٹریس کی راہنمائی میں ہم ایک قطار میں بنے ہوئے کیبنوں کی جانب بڑھے۔ ان کیبنوں کے دروازوں پر سرخ مخملیں پردے تھے۔ بیشتر کیبنوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے... ویٹریس ایک کیبن کے آگے جا کر ٹھہر گئی۔ ماریا اور میں، کیبن کے اندر داخل ہو گئے جبکہ ویٹریس دروازے پر ہی کھڑی رہی۔ اس کیبن میں آمنے سامنے سرخ مخملیں کور والے دو دیوان تھے جو فرش سے تقریباً لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں شیشم کی ایک میز رکھی ہوئی تھی۔

ماریا گرنے کے سے انداز میں ایک دیوان میں دھنس گئی۔ مجھے ہونقوں کی طرح کھڑا پا کر اس نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔

ہماری میزبان آہستگی سے اندر داخل ہوئی۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''بوربن... برف اور پانی۔'' ماریا نے فوراً جواب دیا۔

لڑکی کے روانہ ہوتے ہی وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پریشان مت ہو... ہماری پرائیویسی میں یہاں دوبارہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔'' ذرا دیر بعد وہی لڑکی ہماری مطلوبہ چیزیں رکھ کر خاموشی سے چلی گئی۔

لیکن میں واقعی بہت نروس تھا۔ ماریا نے ایک پیگ بنا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا مگر مجھے کچھ احساس نہیں تھا کہ میں کیا پی رہا ہوں۔

''یقین نہیں آتا کہ شیراز مر گیا۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماریا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر تاسف کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔ گولڈن کلر کے ٹاپ اور بلیک اسکرٹ میں وہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

''اور نیناں... اس لڑکی کو میں کبھی نہیں سمجھ پائی۔'' چند لمحوں کے توقف سے اس نے کہا۔ ''وہ سب سے ملتی جلتی تو ضرور تھی مگر ایک فاصلے کے ساتھ... زیادہ گھلنے ملنے کی وہ قائل نہیں تھی۔ بہرحال... میرے نزدیک وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔''

''تھی؟ تم اس کے لیے 'تھی' کا لفظ کیوں استعمال کر رہی ہو؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''جیسے کہ وہ...''

''جیسے کہ وہ مر چکی ہو۔'' ماریا نے میرا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا بالکل ہو سکتا ہے... ان خطرناک لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔''

''نہیں... میرا دل نہیں مانتا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ یقیناً کہیں روپوش ہے اور جب تک میں جیل نہیں چلا جاتا وہ سامنے نہیں آئے گی۔''

''اس نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔'' ماریا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''شیراز کا انجام تو خیر یہی ہونا چاہیے تھا... لیکن تمہاری ہمدردی اور خلوص کا یہ صلہ؟''

''ماریا!'' میں نے چند لمحوں کے توقف سے اسے مخاطب کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم بھی اس سارے چکر میں کسی نہ کسی طرح ملوث ہو... کیوں اور کیسے؟ اس بات سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں تو بس کسی طرح اس مصیبت سے نکلنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا بھی کوئی مسئلہ، کوئی مشکل رہی ہو... لہٰذا ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ اگر تم مجھے اس گھناؤنے گیم کے بارے میں سب کچھ بتا سکو تو... اور سلیم خان اور امرناتھ جیسے پولیس والوں کے بارے میں بھی۔''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے نروس سے انداز میں اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا... جیسے کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہو۔

''چلو، چھوڑو...'' اسے خاموش پا کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بھول جاؤ ان سب باتوں کو۔ میں جا رہا ہوں کیونکہ میں اپنی موت کے انتظار میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس وقت نہ جانے کتنے بھیڑیے میرے تعاقب میں ہیں... مگر یاد رکھو، جب شیراز کا قتل منظرِ عام پر آئے گا تو نہ جانے کتنے لوگ اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں تمہارے بارے میں بھی کسی قسم کا شبہ ہو جائے... اور تم تو ان بھیڑیوں کو مجھ سے زیادہ جانتی ہو...''

دفعتاً ماریا نے میری آستین پکڑ کر کھینچی... ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ ''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

میں تھکے تھکے سے انداز میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''یہ ایک شیطانی چکر ہے۔'' ماریا نے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''مجھے پہلے ہی اس بارے میں اندازہ لگا لینا چاہیے تھا لیکن میں جیسے آنکھیں بند کر کے اس میں جا پھنسی۔ مجھے بھی نیناں ہی کی طرح ٹریپ کیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شیراز کو میرے ساتھ شادی کا ڈراما رچانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں ان دنوں بطور ماڈل اپنا کیریئر بنانے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ اپنے مقصد کی خاطر میں کسی بھی حد تک جانے سے گریز نہیں کرتی تھی... لہٰذا جب شیراز نے کام دلوانے کا جھانسا دے کر مجھے شملہ والے کاٹیج پر چلنے کی دعوت دی تو میں بخوشی راضی ہو گئی۔''

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور چند لمحوں کے توقف سے بولی۔ ''نیناں نے تمہیں بتایا ہی ہوگا کہ اس کاٹیج میں کس طرح ان لوگوں نے فلمیں بنانے کا خفیہ سسٹم قائم کیا ہوا ہے... بعد میں وہ فلمیں دکھا کر ان کے ذریعے بلیک میلنگ کرتے ہیں کہ اگر وہ ان کے اشاروں پر چلنے کے لیے راضی نہ ہوئیں تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔''

''شیراز بھی تو ان فلموں میں موجود ہوتا ہے... کیا وہ پہچانا نہیں جاتا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں... وہ بہت چالاک لوگ ہیں۔ فلمیں کچھ ایسے زاویے سے بنائی جاتی ہیں کہ شیراز کا چہرہ بالکل دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی اسے پہچانا جا سکتا ہے۔''

''اور لڑکیوں کی فلمیں بنانے کا اصل مقصد کیا ہے؟''

میں نے پوچھا۔

"بہت گھناؤنا اور بہت زیادہ منافع بخش!" ماریا نے کہا۔ "کرن ورما اور اس ریکٹ کے دوسرے افراد بڑے بڑے لوگوں سے دوستیاں استوار کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر فلم اسٹارز، پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز وغیرہ ہوتے ہیں مگر بہت سے بڑے نام ایسے بھی ہیں جو بظاہر بڑے نیک نام اور پارسا دکھائی دیتے ہیں... جتنا انہیں اپنا دھرماتما مانتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس بے حساب دھن دولت ہے لہٰذا ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دولت کو وہ کہاں خرچ کریں... کون سا ایسا نیا کام کریں جس سے ان کے بے چین من کو شانتی مل سکے۔ ان کی عیاش طبیعت انہیں نئے نئے تجربوں پر اکساتی رہتی ہے...

"کرن ورما ایسے لوگوں کو تاڑ لیتا ہے... اور شیراز انہیں ایسی پارٹیوں میں لے جاتا تھا جہاں بدمستیوں کا راج ہوتا ہے... شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ ہر من پسند نشہ ایک اشارے پر حاضر کر دیا جاتا ہے۔ حسین لڑکیاں ساقی گری کے ساتھ ساتھ ہر خدمت بجا لانے کو تیار رہتی ہیں اور یہ لڑکیاں کوئی عام سی پیشہ ور کال گرلز وغیرہ نہیں ہوتیں...

"لہٰذا اس کام کے لیے یہ لوگ نیناں جیسی حسین اور تر و تازہ لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں... اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکیوں کو خاصا معقول معاوضہ ادا کیا جاتا ہے لیکن بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے کوئی بھی لڑکی کسی بھی قیمت پر تیار نہیں ہوتی... یہی وجہ ہے کہ اس مقصد کے لیے لڑکیوں کو ٹریپ کیا جاتا ہے۔"

میں سانس روکے ماریا کی باتیں سن رہا تھا... اس گھناؤنے سیٹ اپ کے بارے میں جان کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ کرن ورما اور شیراز کے جال میں پھنسنے والی لڑکیاں ذلت کی کن انتہاؤں سے گزرنے پر مجبور ہوتی ہوں گی۔

ماریا کے خاموش ہوتے ہی میں چونکا... "اوہ!" میں نے بے اختیار ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ پارٹیاں بھی ظاہر ہے کہ کرن ورما کا ریکٹ ہی ارینج کرتا ہوگا۔ ان کے بدلے ان بڑے بڑے نامور لوگوں سے بھاری رقوم وصول کی جاتی ہوں گی اور وہ بہ خوشی یہ رقم ادا کرتے ہوں گے... لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اس سارے سیٹ اپ میں سلیم خان اور امرناتھ کہاں فٹ ہوتے ہیں؟"

"شروع میں یہ دونوں اس ریکٹ میں شامل نہیں تھے۔" ماریا نے کہا۔ "لیکن کرن اور شیراز اس ذریعے سے حاصل ہونے والی رقم پر مطمئن نہیں تھے۔ اس رقم میں سے انہیں دوسرے لوگوں کا حصہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں شیراز کی کئی فلمیں فلاپ ہو گئی تھیں، لہٰذا مزید فلمیں ملنے کا امکان نہیں تھا۔ کرن ورما بھی ان دنوں بالکل قلاش تھا، اس لیے انہوں نے سلیم خان اور امرناتھ جیسے کرپٹ پولیس والوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا پلان ترتیب دیا جس کے ذریعے وہ اپنے شکار سے مزید رقم اینٹھ لیتے ہیں۔"

"کس طرح؟" میں نے سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے کہ ان کا طریقۂ کار کیا ہوتا تھا؟"

ماریا نے اپنا سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ نکالا۔

"بہت سادہ اور آسان... اور بالکل فول پروف۔" اس نے کہا۔ "جب اس نام نہاد پارٹی میں بدمستیاں اپنے عروج پر ہوتی تھیں تو شیراز اپنے آدمیوں کو ایک مخصوص سگنل دیا کرتا تھا جس کے بعد سلیم خان اور امرناتھ اچانک دندناتے ہوئے اندر چلے آتے تھے... ان کے ساتھ دو ایک جعلی رپورٹرز اور ایک کیمرا مین بھی ہوتا تھا۔ ان کو دیکھ کر پوری محفل ایک دم ساکت ہو جاتی تھی۔ لڑکیوں کو تو خیر معلوم ہوتا تھا کہ ریڈ نقلی ہے لیکن پارٹی میں شامل بڑے بڑے نام والے آدمیوں کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی تھی... ان کا کیریئر، ان کا نام سب تباہ ہو سکتا تھا۔"

"لہٰذا وہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر بڑی سے بڑی رقم بطور رشوت ادا کرنے کو تیار ہو جاتے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک ایک شکار سے پچاس، ساٹھ لاکھ سے کم پر معاملہ طے نہیں ہوتا۔" ماریا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"رقم کی وصولیابی کا کیا طریقہ ہوتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ اتنی رقم وہ جیب میں رکھ کر تو نہیں لاتے ہوں گے؟"

"ان میں سے ہر ایک کو صبح بینک کھلنے تک وہاں روک کر رکھا جاتا تھا۔" ماریا نے کہا۔ "شیراز ان آدمیوں کا نمائندہ بن کر ان کی جانب سے پولیس والوں سے معاملات طے کرتا تھا لہٰذا اسے ہی بینکوں سے رقم نکلوانے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ وہ لوگ چیک لکھ کر اس کے حوالے کرتے تھے اور اپنے اپنے بینک کو فون کر دیا کرتے تھے کہ چیک کی رقم، شیراز کے حوالے کر دی جائے۔ امرناتھ، شیراز کے ساتھ جاتا تھا اور جب وہ فون پر سلیم خان کو بتاتا تھا کہ کام ہو گیا ہے... یعنی رقم مل گئی ہے... تب وہ ان آدمیوں کو وہاں سے جانے کی اجازت دیتا

تھا۔ اس بات کا انہیں اطمینان تھا کہ ان آدمیوں میں سے کوئی ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کرن ورما مکمل طور پر بیک گراؤنڈ میں رہتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہمیشہ..." ماریا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سامنے صرف شیراز ہی ہوتا تھا اور وہ اپنے آپ کو ان سب کی طرح ہی ظاہر کرتا تھا۔"

"آخری پارٹی کب ہوئی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"شیراز کے غائب ہونے سے ایک رات پہلے۔" ماریا نے بتایا۔

"اور اس سے رقم کتنی حاصل ہوئی تھی؟"

"تین کروڑ پچاس لاکھ!"

"اب بات صاف ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "شیراز کے پاس جو رقم تھی، وہ کسی فلم کے اخراجات اور ادائیگیوں وغیرہ کے لیے نہیں تھی... بلکہ وہ اسی گندی بلیک میلنگ سے حاصل شدہ رقم تھی۔"

"میں بھی یہ خبر سنتے ہی اصل حقیقت سمجھ گئی تھی۔" ماریا نے کہا۔

"اگر تم یہ بات جانتی ہو تو پھر نیناں بھی جانتی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "وہ شیراز سے نفرت کرتی تھی، شدید نفرت... لہٰذا اس نے موقع ملتے ہی اسے جان سے مار ڈالا۔ اس کے پاس جو رقم تھی، وہ نیناں نے مالِ غنیمت سمجھ کر رکھ لی ہوگی۔ وہ جانتی تھی کہ اس پر کوئی شبہ نہیں کرے گا کیونکہ شیراز کسی کو کچھ بتائے بغیر اس کے پاس آیا تھا۔ لیکن وہ اکیلی اس کی لاش کو ٹھکانے نہیں لگا سکتی تھی۔ ایسے میں اسے اپنے عاشق نامراد کامران کی یاد آئی اور وہ کاٹھ کا الو اس کی ایک آواز پر دوڑا چلا آیا۔"

"تمہیں محبت کی چھری سے ذبح کیا گیا ہے کامران!" اس نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور اب... لگتا ہے کہ میری باری بھی کچھ زیادہ دور نہیں۔"

"اب میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "نیناں کو شیراز کے پاس سے وہ رقم یقیناً مل گئی ہوگی... اور اس نے کسی محفوظ جگہ پر اسے چھپا دیا ہوگا لیکن کرن ورما کسی نہ کسی طرح اصل حقیقت کی بو سونگھتا ہوا اس تک پہنچ گیا... نیناں اس کے سامنے سچائی سے مکمل طور پر انکار نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا اس نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس نے کرن کے سامنے شیراز کے قتل کا اعتراف کر لیا ہوگا اور اسے بتایا ہوگا کہ اس سلسلے میں، میں نے اس کی مدد کی تھی۔ مزید یہ کہ رقم کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں... رقم مجھے ملی ہوگی اور یقیناً میں نے رکھ لی ہوگی۔ کرن ورما کو ظاہر ہے کہ اس کے بیان پر یقین آ گیا ہوگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کیے جائیں... نیناں کو بچا کر قتل کے الزام میں وہ مجھے پھنسا بھی سکتا ہے اور چاہے تو سودے بازی پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"ویری اسمارٹ... ویری اسمارٹ۔" ماریا نے خمار زدہ آواز میں کہا۔ "مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نیناں کو واقعی وہ رقم نہ ملی ہو اور اس کا خیال ہو کہ رقم تمہارے پاس ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ "اگر نیناں کو بھی وہ رقم نہیں ملی تو پھر کہاں گئی؟"

مگر ماریا نے شاید میری بات سنی ہی نہیں تھی... اس کا دھیان اب کہیں اور تھا، وہ کچھ عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اگر تم میری مدد کرنے کے موڈ میں نہیں ہو تو پھر میں جا رہا ہوں..." میں نے کہا۔

"او کے... او کے!" ماریا نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "لیکن ایسے معاملات میں، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرنا مناسب ہوتا ہے۔"

میں سر جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا۔ ماریا کی بات بالکل درست تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ قدرے نشے اور سرور میں ہونے کے باوجود اس کا دماغ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ کرن ورما کو یقیناً یہ معلوم ہوگا کہ نیناں کہاں ہے... اس کے علاوہ سلیم خان اور امرناتھ بھی اس بات سے واقف ہوں گے۔ ان کی نگرانی اور پیچھا کر کے نیناں کا پتا لگایا جا سکتا تھا... ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ۔

یہ کام آسان تو نہیں تھا مگر بہرحال ناممکن بھی نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میری اعصابی کشیدگی میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ میں نے سر اٹھا کر نیناں کی جانب دیکھا۔ وہ پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت میری رفاقت کی خواہاں ہے مگر میں اس کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں کوئی فرشتہ تھا اور ایسا بھی نہیں تھا کہ میرے پاس اس کو دینے کے لیے چند منٹ بھی نہیں تھے... بلکہ درحقیقت میرا دل ہی اس طرف مائل نہیں تھا۔ نیناں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد میں خود کو مردہ سا محسوس کر رہا تھا۔ گویا... چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ... اتنا بُرا سلوک مری سادگی کے ساتھ۔

کچھ دیر بعد میں ماریا کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا

ہوا تھا۔ میری ہدایت پر وہ بڑی احتیاط کے ساتھ ڈرائیو کر رہی تھی، معقول رفتار اور ٹریفک قوانین کا خیال رکھتے ہوئے۔

"تم بس اگلے موڑ پر مجھے اتار دینا۔" میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ رات کے ایک بجے اس ویران جگہ پر کیوں آئے ہو؟" ماریا نے سوال کیا۔

"سوری... اس وقت میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "بٹ تھینکس فار ایوری تھنگ۔"

"اوکے... جیسی تمہاری مرضی۔" ماریا نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری مشکلات کو سمجھ سکتی ہوں۔" اس نے گاڑی روکی۔

"گڈ بائے، ماریا... اگر قسمت نے ساتھ دیا اور میں اس چکر سے نجات پا سکا تو پھر ملیں گے۔"

"کیا تم مجھے فون بھی نہیں کر سکتے؟" اس نے میری جانب جھکتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے جانا چاہیے۔" میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا۔

اس نے بے اختیار اپنی بانہیں میرے گرد حمائل کر کے میرا رخسار چوم لیا۔ "گڈ لک۔"

میں نے نرمی کے ساتھ اسے خود سے علیحدہ کیا۔ میں اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ان مسافروں میں سے تھی جو دورانِ سفر اپنا رستہ کھو بیٹھتے ہیں... مگر اوروں کی طرح وہ کسی منزل کی متلاشی نہیں تھی بلکہ راستوں کی دلدادہ تھی۔ زندگی گزارنے اور اچھائی بُرائی کے بارے میں اس کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ شاید وہ جیو اور جینے دو کی قائل تھی۔ بہرحال، اس کے بارے میں میرا تجزیہ یہ کہتا تھا کہ وہ بہت سے بظاہر نیک نام اور پارسا دکھائی دینے والے افراد سے بہتر تھی... کیونکہ اس کا ظاہر و باطن ایک سا تھا، بالکل کسی آئینے کی طرح شفاف!

"گھر جا کر اپنا تھوڑا بہت سامان پیک کرو اور اس وقت تک کہیں غائب ہو جاؤ، جب تک تمہارے لیے ممکن ہو۔" میں نے کہا۔ "ان حالات میں، میں تمہیں اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا۔" میں نے کار سے نیچے اتر کر دروازہ بند کیا۔

"اب اس کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔" ماریا نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مگر تم اپنا خیال رکھنا... ویسے اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"کہیں بھی نہیں۔" میں نے اس کی جانب دیکھ کر ہاتھ لہرایا اور تیزی کے ساتھ ایک طرف چل دیا۔

نزدیک ہی ایک ٹیلی فون بوتھ تھا۔ اس کی آڑ میں کھڑا ہو کر میں ماریا کی گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا... جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی، تب میں بوتھ کے اندر گیا اور فون کر کے اپنے لیے ایک ٹیکسی منگوائی۔ ذرا دیر بعد میں ٹیکسی میں بیٹھا راج کمار کے گیراج کی جانب جا رہا تھا جہاں میں نے شیراز کی کار کھڑی کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ راج کمار رات کے اس پہر بھی مجھے اپنے گیراج ہی میں ملے گا کیونکہ وہ وہیں سوتا تھا۔

گیراج وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا لہٰذا وہاں تک پہنچنے میں تقریباً پینتالیس منٹ صرف ہو گئے۔ راج کمار، گیراج میں بنے اس چھوٹے سے کمرے میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا جسے وہ دفتر کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر اس کی نیند ایک دم ہوا ہو گئی۔

"یار... تو اس وقت کیسے؟" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں... ہاں، سب ٹھیک ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میں وہ گاڑی لینے آیا ہوں۔"

اس نے ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز کی دراز کھول کر گاڑی کی چابی نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے بولا۔ "ویسے آج کل تو ہے کس چکر میں؟" اس کا انداز کچھ تشکیک زدہ سا تھا۔ "مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔"

"کوئی چکر وکر نہیں ہے یار... تو فکر نہ کر۔" میں نے کہا مگر وہ بدستور شک زدہ انداز میں مجھے گھورتا رہا۔

میں نے اسے تسلی دی اور گاڑی میں بیٹھ کر تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اس وقت صبح کے تین بجنے والے تھے جب میں اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں میرے ہونے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں گم صم سا نیناں کے گھر کے آگے کھڑا تھا... مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور نیچے اتر کے گیٹ کھولا، کار پورچ خالی تھا۔ میں شیراز کی گاڑی کو اندر لے گیا، گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد جیب سے نیناں کی دی ہوئی چابی نکالی اور مکان کا داخلی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

جیب سے ٹارچ نکال کر میں نے سٹنگ روم پر روشنی ڈالی... تمام پردے ابھی تک ویسے ہی کھنچے ہوئے تھے جیسا کہ میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر جونہی میری نظریں ایک کونے

میں رکھی ہوئی رائٹنگ ٹیبل پر پڑیں تو میں چونک گیا... وہ ٹیبل ہرگز پہلے جیسی حالت میں نہیں تھی۔ اس کی تمام درازیں نیچے فرش پر الٹی پڑی تھیں۔ میں ٹارچ لے کر اندر کی جانب بڑھا، پورا گھر بکھرا پڑا تھا۔ الماریاں کھلی پڑی تھیں، تمام چیزیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں اور میٹرلیس الٹا پڑا تھا۔ اسی طرح کچن کا حال بھی خراب تھا۔ سارے کیبنٹس کھلے ہوئے تھے اور سامان وغیرہ رکھنے کے ڈبے کھلے پڑے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ بالآخر انہیں نیناں پر یہ شبہ ہو گیا تھا کہ وہ رقم اس کے پاس ہو سکتی ہے... اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں نیناں کے خلاف موجود غبار یکدم چھٹ سا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ماریا نے اس کے بارے میں موت کا خدشہ ظاہر کیا تھا... یہ سوچتے ہی میرے دل کو گویا کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔

کئی لمحوں تک میں اپنا سر پکڑے ایک جانب بیٹھا رہا مگر جلد ہی اس بھیانک خیال کو ذہن سے جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس قسم کی منفی سوچوں کو میں اپنے ذہن میں جگہ دینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا فوری طور پر اپنی توجہ اس مسئلے کی جانب مرکوز کر دی جس کی خاطر میں شیراز کی گاڑی لے کر اس وقت یہاں آیا تھا۔

اس وقت میرے لیے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اگر وہ رقم نیناں نے نہیں چھپائی تھی اور وہ رقم شیراز کی لاش کے ساتھ بھی دفن نہیں ہوئی تھی تو پھر وہ کہاں گئی؟

فی الوقت اس سوال کا ایک ہی جواب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ رقم کو گاڑی میں چھپایا گیا تھا۔ تلاشی کا آغاز میں نے گاڑی کے اندرونی حصے سے کیا، سیٹوں کے نیچے اور ان کے درمیان دیکھا... مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔

اس کے بعد میں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا کر اچھی طرح دیکھا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہونے پر میں نے اپنی شرٹ اتاری اور گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ ٹارچ روشن کر میں نے وہاں ایک ایک انچ کا بغور جائزہ لیا، وہاں کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں رقم کا پیکٹ چھپایا یا باندھا جا سکتا تھا لیکن وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ ناچار میں رینگ کر باہر آیا اور اپنے جسم کو جھاڑ کر شرٹ پہن لی۔

ایک خیال کے تحت میں نے ڈگی کو ایک بار پھر کھولا... ڈگی میں ایک فاضل ٹائر اور چند اوزاروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ سب میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اب ایک بار پھر غائب دماغی کے سے عالم میں وہاں جھکا ہوا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود خیال شاید ابھی خود مجھ پر واضح نہیں ہوا تھا۔ میں نے جھنجلا کر ڈگی کو بند کیا اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گھر کے اندر چلا آیا۔

میرا ذہن اس وقت بے سروپا قسم کی سوچوں سے بھر گیا تھا... انہی سوچوں سے الجھتا، الجھتا میرا دھیان ایک بار پھر شیراز کی گاڑی کی جانب مرکوز ہو گیا۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جو مجھے چبھ رہی تھی... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کچھ بھول رہا ہوں۔ کوئی چیز ایسی ضرور تھی جس کی جانب میں توجہ دیتے دیتے رہ گیا تھا۔

میرے ذہن کے پردے پر گاڑی کے اندر کا منظر گھومنے لگا... تقریباً سب ہی جگہوں کی تلاشی تو میں لے چکا تھا۔ پھر نہ جانے کیا بات تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی... ڈگی کے اندر صرف ضروری اوزار وغیرہ رکھے ہوئے تھے اور ایک فاضل ٹائر تھا۔

دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا... میں اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر گاڑی کی جانب دوڑا۔ ڈگی کھول کر دیکھا تو میری توقع کے عین مطابق فاضل ٹائر، ٹیوب کے بغیر تھا۔ ٹائر کی ہوا نکالنے کے بعد میں نے ڈگی میں رکھے ہوئے ٹائر آئرن سے اسے کریدا... یہاں تک کہ ربڑ ٹائر کے کنارے سے علیحدہ ہو گئی۔

میرا خیال سو فیصد درست تھا۔

رقم وہیں موجود تھی۔ ربر بینڈ سے باندھے گئے رولز کی صورت میں...!

کچھ دیر بعد میں کمرے میں بیٹھا اپنے سامنے رکھے نوٹوں کے ڈھیر کو گھور رہا تھا۔ اسی لمحے یہ خیال میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ میں ساری دنیا پر لعنت بھیج کر کہیں دور چلا جاؤں... رقم اب میرے پاس موجود تھی، پیسے کے ذریعے دنیا کا ہر کام ممکن تھا۔ میں کہیں بھی جا سکتا تھا، یورپ... امریکا یا پھر دبئی۔

جب دوسرے لوگ میری زندگی کے ساتھ کھیل کھیل رہے تھے تو میں ایک گیم کیوں نہیں کھیل سکتا تھا؟

میں نے رقم کو ایک شاپنگ بیگ میں ڈال کر میلے کپڑوں کی باسکٹ میں کپڑوں کے درمیان چھپا دیا۔ البتہ ایک لاکھ روپے کا ایک بنڈل میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ میری جیب میں موجود رقم مجھے تحفظ کا احساس دلا رہی تھی۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ایک کھڑکی کے آگے بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا اور نہ جانے کن کن سوچوں کے ہجوم کے ساتھ طلوعِ صبح کا منتظر تھا۔

☆☆☆

جب صبح کی پہلی کرن آسمان پر نمودار ہوئی، تب تک میں اپنا ذہن تبدیل کر چکا تھا... صورتِ حال پر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ چوروں کی طرح منہ چھپا کر فرار ہو جانے والی میری خواہش جذباتیت پر مبنی ہے۔ اس طرح فرار ہونے کا مطلب تھا، اپنے آپ کو پکا مجرم قرار دینا... جبکہ میں بے قصور تھا، شیراز کا قاتل کوئی اور تھا... لہٰذا مجھے ہر صورت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنی تھی اور اپنے دامن سے قتل کا وہ داغ دھونا تھا۔ اگر میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو مجھے صرف شریکِ جرم ہونے یا جرم کا راز چھپانے کی سزا ملتی، اس کے بعد میں آزاد ہوتا۔

میرے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا رہا تھا مگر اس سلسلے میں مجھے بہت کام کرنا تھا۔ فرار، بہرحال میرے مسئلے کا حل نہیں تھا۔

نیناں کے کمرے کی تلاشی لینے پر مجھے چھوٹے سائز کا ایک بیگ مل گیا۔ میں نے رقم بیگ میں رکھی اور سائڈ میں ایک ڈوری کے ذریعے لٹکتی چابی سے اسے لاک کر دیا۔ چابی اپنی جیب میں رکھ کر اب میں باہر نکلنے کے لیے تیار تھا۔

میں شیراز کی گاڑی کو آہستہ روی کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا۔ روڈ پر ٹریفک برائے نام تھا کیونکہ ابھی پوری طرح دن کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے شیراز کی گاڑی کو ایک پرائیویٹ پارکنگ لاٹ میں پارک کر دیا اور پیدل وہاں سے کچھ ہی دور واقع ایک ریسٹورنٹ کی جانب چل دیا۔ یہ ریسٹورنٹ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔

ریسٹورنٹ کے ایک بوتھ میں بیٹھ کر میں نے اپنے لیے ناشتے کا آرڈر دیا۔ مجھے بھوک نہیں تھی لیکن وقت گزارنے کی خاطر وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز تو ہونا چاہیے تھا۔ سات بج کر دس منٹ ہو رہے تھے اور مجھے کم از کم نو بجے تک کا وقت وہاں گزارنا تھا کیونکہ رینٹ اے کار کا ایک قریبی دفتر نو بجے کے بعد ہی کھلتا تھا۔

تقریباً سوا آٹھ بجے، چائے کا چوتھا کپ پیتے ہوئے میں نے صبح کا اخبار کھولا۔ یہ اخبار ویٹر میرے کہنے پر مجھے دے کر گیا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے فرنٹ پیج کھول کر اس پر نظر دوڑائی... مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ فرنٹ پیج پر تو کیا، پورے اخبار میں کہیں شیراز کے قتل کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ کرن ورما اور اس کے حواری پولیس والے شاید اس وقت تک اس خبر کو چھپانا چاہتے ہوں گے جب تک کہ گویا میرے حلق میں ہاتھ ڈال کر رقم نہ اگلوالیں۔

مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سب کچھ اتنی دیر سے وقوع پذیر ہوا تھا کہ صبح کے اخبار میں خبر شائع نہیں ہو پائی۔

بہرحال، نو بجے میں رینٹ اے کار کے نزدیکی دفتر پہنچ گیا۔ وہاں کاؤنٹر پر موجود شخص سے میں نے کہا کہ میں ذرا جلدی میں ہوں اور مجھے کہیں پہنچنے کے لیے ایک عمدہ سی گاڑی کی فوری ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے اسے الگ سے کچھ رقم دینے کی بھی پیشکش کی تاکہ مجھے اچھی سی گاڑی بلاتامل مل سکے۔ میری پیشکش پر وہ شخص ذرا مستعد نظر آنے لگا۔ باتوں باتوں میں، میں نے یہ ذکر بھی احتیاطاً کر دیا تھا کہ میری اپنی کار اوور ہالنگ کے لیے ورکشاپ گئی ہوئی تھی۔

اپنا نام اور پتا میں نے ظاہر ہے کہ غلط لکھوایا اور جب اس نے مجھ سے رسماً لائسنس کے بارے میں سوال کیا تو میں نے جیب میں اپنا لائسنس نکال کر دور ہی سے اسے دکھا دیا اور لائسنس نمبر بھی غلط ہی درج کروایا۔ اس کے بعد میں نے اسے رقم ادا کی اور گاڑی میں بیٹھ کر فوراً وہاں سے چل دیا۔

اب میرا رخ ایک ایسی دکان کی جانب تھا جہاں تھیٹر اور ڈراموں میں کام کرنے والوں کے لیے میک اپ وغیرہ کا سامان ملتا تھا۔ اس دکان سے میں نے ایک وگ، ایک بڑا سا چشمہ اور میک اپ سے متعلق سامان خریدا۔ اس کے بعد میں نے ایک باربر شاپ پر جا کر اپنی شیو بنوائی اور حلیہ درست کیا۔

مجھے اچھے لباس کی بھی ضرورت تھی لہٰذا میں نے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور جا کر ضروری سامان خریدا... اس میں ایک لیدر کا سوٹ کیس اور بریف کیس بھی شامل تھے۔ ان تمام چیزوں کے لیے ادائیگی میں نے کرن ورما والی رقم سے کی...

لباس میں نے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے ڈریسنگ روم میں ہی تبدیل کر لیا تھا اور بریف کیس میں کچھ دیر پہلے خریدا ہوا میک اپ کا سامان رکھ دیا... اب میں نے ایک ایسے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکی جہاں ہر وقت رش رہتا تھا۔ میک اپ کے سامان والا بریف کیس اٹھا کر میں ریسٹورنٹ کے نیم تاریک ماحول میں داخل ہوا اور بڑی آسانی کے ساتھ کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک واش روم میں گھس گیا۔ اندر جا کر میں نے جلدی جلدی اپنا حلیہ تبدیل کیا۔ چونکہ ایک اداکار ہونے کے باعث اب میں ان کاموں میں اچھا خاصا ماہر ہو چکا تھا لہٰذا مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی اور جب میں باہر نکلا تو ادھیڑ عمر کا ایک ایسا شخص نظر آ رہا تھا جس کی رنگت خاصی گہری اور ناک چوڑی تھی... رہی سہی کسر بڑی سی عینک

اور مونچھوں نے پوری کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد میں ساحلِ سمندر کے نزدیک واقع ایک لگژری ہوٹل کے ریسیپشن پر کھڑا اپنے لیے ایک کمرا بک کروا رہا تھا۔ وہاں میں نے اپنا نام سنتوش کمار لکھوایا... میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنی اصلی آواز میں بات نہ کروں۔

ہوٹل کا پورٹر، میرا سوٹ کیس اٹھا کر کمرے تک لایا جبکہ بریف کیس میں خود لے کر آیا تھا۔ اس بریف کیس میں رقم تھی۔ بریف کیس ایک محفوظ جگہ رکھنے کے بعد میں نے اپنے لیے لنچ کا آرڈر دیا اور ساتھ میں تازہ اخبار بھی بھیجنے کی ہدایت کی۔ اس وقت تک سہ پہر ہو چکی تھی۔

جونہی روم سروس کا ویٹر میرا کھانا رکھ کر رخصت ہوا، میں نے سب سے پہلے شام کا اخبار کھولا...

اخبار کے پہلے صفحے پر دو تصویریں نمایاں طور پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر شیراز کی لاش کی تھی اور اس کے عین نیچے میری تصویر تھی جس کے ساتھ یہ سرخی تھی کہ... کامران صدیقی، جس پر شیراز علی کے قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

میں سانس روکے ان تصویروں کو گھور رہا تھا۔ پھر میری نظر ان سرخیوں کی طرف گئی جن میں بتایا گیا تھا کہ ایکشن ہیرو، شیراز علی کی لاش میری کار کی ڈگی سے برآمد ہوئی تھی اور یہ کہ اس قتل کا شبہ مجھ پر کیا جا رہا ہے، پولیس سرگرمی کے ساتھ قاتل کی... یعنی میری تلاش میں تھی۔

پوری اسٹوری خاصی طویل تھی۔ اس میں شیراز علی کی پوری لائف ہسٹری بیان کی گئی تھی۔

شیراز علی اپنی زندگی میں دوسرے درجے کا اداکار مانا جاتا تھا لیکن موت نے اسے نمبر ون ہیرو بنا دیا تھا۔

اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے شیراز کے پاس موجود رقم کے بارے میں کس طرح علم ہوا... لیکن خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ قتل کی رات شیراز سے کسی بار وغیرہ میں میری ملاقات ہوئی ہوگی اور اس نے باتوں باتوں میں مجھے رقم کے بارے میں بتا دیا ہوگا...!

اس کے بعد میری کار کی ڈگی سے شیراز کی لاش برآمد کیے جانے سے متعلق جو تفصیلات بیان کی گئی تھیں، وہ خاصی مضحکہ خیز تھیں۔

اخبار میں میری جو تصویر چھپی تھی، وہ کچھ دھندلی سی تھی۔ یہ ان فائل فوٹوز میں سے تھی جو اکثر پروڈیوسرز کے پاس موجود تھیں۔ اس تصویر میں ظاہر ہے کہ میں ایک اسٹائلش گلیمر بوائے نظر آ رہا تھا... میں سوچ رہا تھا کہ رینٹ اے کار والا شخص شاید اس تصویر کے ذریعے مجھے نہ پہچان پائے کیونکہ اس وقت میرا حلیہ انتہائی خستہ حال تھا۔

اخبار ایک طرف رکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جو بھی تھا، بہرحال... میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ رقم والا بریف کیس نکال کر میں نے اس کا لاک چیک کیا اور نیچے جا کر اسے ہوٹل کے سیف میں رکھوا دیا۔

ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے ٹیلی فون بوتھ تلاش کیا اور اندر گھس گیا۔ اخبار میں، میں نے اس پولیس آفیسر کا نام پڑھ لیا تھا جو شیراز کے قتل کی تحقیقات پر مامور کیا گیا تھا۔ اس کا نام انسپکٹر وجے شرما تھا۔

پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کر کے میں نے انسپکٹر وجے شرما سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی... انہوں نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں بالآخر انہیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ میں بہت اہم معاملے پر انسپکٹر وجے شرما سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

"میرا نام سنتوش کمار ہے۔" وجے شرما سے رابطہ ہونے پر میں نے اسے اپنا نیا فرضی نام بتایا۔

"آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں؟" وجے شرما نے سوال کیا۔ اس کی آواز تیز اور چبھتی ہوئی سی تھی۔

"اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں دو ایک روز میں آپ کو کامران صدیقی سے ملوا سکتا ہوں۔" میں نے بلاتمہید کہا۔

"اچھا... وہ کس طرح؟ کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟" وجے شرما نے تیزی سے کہا۔ "لیکن میں ایک بات کلیئر کر دوں کہ آپ جب تک اپنی شناخت نہیں بتائیں گے، میں آپ کی بات پر توجہ نہیں دے سکتا... ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ اس قسم کی کالوں پر..."

"دیکھیے... آپ میری بات پر یقین کریں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "میں نے کچھ ہی دیر پہلے فون پر اس سے بات کی ہے اور جلد ہی یہ بھی معلوم کر لوں گا کہ وہ کہاں چھپا ہے۔"

"آپ اسے کیوں پکڑوانا چاہتے ہیں؟" وجے شرما نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں اسے پکڑوانا نہیں چاہتا۔ کامران صدیقی کا کہنا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس نے وہ قتل نہیں کیا... اور مجھے اس

کی بات پر یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر وہ بے گناہ ہے تو پھر اسے کس بات کا ڈر ہے؟'' وبے شرما نے برہمی سے کہا۔ ''وہ ہمارے پاس کیوں نہیں آجاتا... کیوں مجرموں کی طرح اپنا منہ چھپائے بیٹھا ہے؟''

''معاف کیجیے گا... بھلا اس طرح کون چل کر موت کے منہ میں آتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کامران صدیقی جب تک شیراز کے اصل قاتل کو تلاش نہیں کر لیتا، تب تک وہ آپ کے سامنے نہیں آسکتا... وہ پکے ثبوت کے ساتھ قاتل کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ ایک آدھ روز میں کسی بھی وقت وہ آپ کو کال کرے گا... میری درخواست ہے کہ آپ اس کی بات دھیان سے سنیے گا!''

''آپ مجھے اپنی صحیح شناخت اور ایڈریس وغیرہ بتائیں مسٹر... میں آپ سے مل کر تفصیلی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وبے شرما نے کہا۔

''سوری، یہ نہیں ہوسکتا... ویسے بھی میں تو درمیان کا آدمی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں واپس آکر میں نے ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر ایک اعتراف نامہ تحریر کرنا شروع کر دیا جس کا مضمون میں پہلے ہی اپنے ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ اداکاری اور صداکاری کے علاوہ میں طرزِ تحریر بدلنے کے فن میں بھی خاصا ماہر تھا لہٰذا یہ اعتراف نامہ میں اپنی اوریجنل ہینڈ رائٹنگ سے بالکل مختلف رائٹنگ میں لکھ رہا تھا۔

یہ اعتراف نامہ، عیناں کی جانب سے تھا... اس میں، میں نے سیدھے سادے انداز میں وہی تحریر کیا تھا جو سچ تھا۔

اس مضمون کو ایک بار پھر پڑھنے کے بعد میں نے کاغذ کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ فائیو اسٹار تھا۔ اس شان دار ہوٹل میں بے شمار کمرے تھے اور اس کی عمارت نہ جانے کتنے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی... بیشتر فلمی شخصیات مختلف مواقع پر اسی ہوٹل میں قیام کرنا پسند کرتی تھیں اور میں اپنے فلمی دوستوں سے ملنے اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔ لہٰذا میں جانتا تھا کہ یہاں ہر فلور کے آخر میں آمنے سامنے دو شان دار سوئٹ واقع تھے۔ ان کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ ہال وے کے آخر میں ہونے کے باعث ایل شیپ میں ٹرن ہو کر ان کی درمیانی دیوار ایک دوسرے سے مل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں ایسے ہی دو جڑواں سوئٹس میں منعقد ہونے والی پارٹی میں شریک ہوا تھا۔

اپنے ذہن میں مرتب کردہ پلان کے مطابق اس وقت میں وہی دونوں سوئٹس حاصل کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں ٹہلتا ہوا کاؤنٹر تک پہنچا اور وہاں موجود شخص سے مخاطب ہوا۔

''میرا نام راہول ہے۔ میں کمرا نمبر 512 میں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' میں نے انگریزی میں کہا۔ ''دراصل مجھے اپنے بزنس ایسوسی ایٹس کی جانب سے ابھی ابھی ایک کال موصول ہوئی ہے کہ وہ میرے پاس پہنچ رہے ہیں، لہٰذا مجھے ان کے لیے بھی کمروں کی ضرورت ہوگی۔''

''یس سر!'' ریسپشنسٹ نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''آپ کو کس قسم کے کمرے درکار ہوں گے؟''

''ایک مرتبہ میں یہاں چھٹے فلور پر سوئٹ نمبر 609 اور 610 میں ٹھہرا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ان کا ویو بہت پسند آیا تھا... کیا مجھے وہ سوئٹس مل سکتے ہیں؟''

ریسپشنسٹ نے کمپیوٹر پر چیک کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ مجھے میرے مطلوبہ سوئٹس مل سکتے ہیں۔

دس منٹ کے اندر اندر میں اپنے مطلوبہ سوئٹ میں موجود تھا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری سے کرن ورما کا فون نمبر تلاش کر رہا تھا۔

ڈائریکٹری سے میں نے کرن ورما کے گھر کا فون نمبر تو تلاش کر لیا لیکن اس کو فون تک بلانا میرے لیے خاصا مشکل ثابت ہوا۔ فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا تھا اور چونکہ میں اپنا صحیح تعارف نہیں کرا سکتا تھا لہٰذا مجھے پہچانے بغیر وہ اپنے مالک سے بات کرانے پر قطعی رضامند نہیں تھا۔ بالآخر مجھے یہ بتانا پڑا کہ میں کامران صدیقی کے سلسلے میں اس کے مالک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

چند لمحوں کے بعد کرن ورما لائن پر موجود تھا۔

''میں تمھیں نہیں جانتا۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہ کسی قسم کا مذاق تو نہیں؟''

''یہ ہرگز کوئی مذاق نہیں... میں واقعی کامران کی طرف سے بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ بادلِ ناخواستہ بولا۔

''کامران تم سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہے... اگر تم اپنی رقم واپس حاصل کرنا چاہتے ہو تو...''

''انتہائی احمقانہ سوال ہے یہ...'' وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم آخر ہو کون؟'' وہ چلّایا۔

''میں جو کوئی بھی ہوں مگر تم یہ جان لو کہ میرے بغیر تم یہ ڈیل نہیں کر سکو گے۔'' میں نے گویا بے نیازی اختیار کرتے

ہوئے کہا۔

چند لمحوں تک دوسری جانب خاموشی طاری رہی، بالآخر کرن ورما نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈیل کس طرح طے پائے گی؟''

''تم جانتے ہو کہ ہوٹل اسکائی ویو کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''جانتا ہوں... پھر؟'' اس نے گویا غراتے ہوئے کہا۔

''آج رات ٹھیک نو بجے وہاں پہنچ جانا۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہاں پہنچ کر کسی بوتھ میں بیٹھ جانا، میں تمھیں ڈھونڈ لوں گا... مگر خیال رہے کہ تمھیں وہاں اکیلے ہی آنا ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

مجھے اس بات پر ہرگز یقین نہیں تھا کہ کرن ورما واقعی اکیلا وہاں پہنچے گا لیکن اس بارے میں، میں بہرحال پُریقین تھا کہ وہ آئے گا ضرور...!

اس سے ملاقات کے لیے میں نے ایک ایسے ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جو شہر کے ہنگاموں سے ذرا الگ تھلگ واقع تھا۔ وہاں بہت سے بوتھ بنے ہوئے تھے جہاں مکمل پرائیویسی حاصل ہوتی تھی اور روشنی بھی بہت مدھم ہوتی تھی کہ ماحول رومان پرور اور خواب ناک سا معلوم ہو۔ لیکن میں اس ماحول میں کرن ورما سے مل کر اپنے نئے چہرے کا امتحان لینا چاہتا تھا کہ میرا میک اپ کس قدر کامیاب ہے۔

☆☆☆

ہوٹل اسکائی ویو میں داخلے کے دو راستے تھے۔ ایک سامنے کی جانب سے، دوسرا پیچھے بنے ہوئے پارکنگ لاٹ کی جانب...

میں نے اندر جانے کے لیے پارکنگ لاٹ والے راستے کا انتخاب کیا۔ نو بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ اندر پہنچ کر میں خاموشی کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ میری آنکھوں کو وہاں کے نیم تاریک ماحول سے مانوس ہونے میں چند لمحے لگے۔ مجھے اپنے اردگرد کوئی بھی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بار میں تقریباً دس بارہ افراد دکھائی دے رہے تھے اور سب پینے میں مگن تھے۔

میں اس وقت نروس ہو رہا تھا۔ بہرحال، اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں سست قدموں کے ساتھ بوتھس کی جانب بڑھا۔ پہلے بوتھ میں ایک جوڑا دنیا و مافیہا سے بے خبر، ایک دوسرے میں گم بیٹھا تھا۔ دوسرا بوتھ خالی تھا... اور پھر اس سے اگلے بوتھ میں مجھے کرن ورما بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔

اس کے سامنے سے گزر کر میں ذرا آگے گیا اور پھر واپس آکر اس کے سامنے ٹھہر گیا۔

کرن ورما کی آنکھیں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''آپ ہی مسٹر کرن ورما ہیں؟'' میں نے اس کی جانب جھکتے ہوئے شائستگی سے پوچھا۔

اس نے میری جانب گھورتے ہوئے آہستگی کے ساتھ سر ہلا دیا۔ جونہی میں اس کے سامنے بیٹھا، اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں مسٹر... فوراً شروع ہو جاؤ۔''

میں نے جیب سے اپنا تحریر کردہ اعتراف نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''رقم تیار ہے...'' میں نے کہا۔ ''مگر پہلے ہمیں اس اعتراف نامے کا مضمون، عیناں کی ہینڈ رائٹنگ میں اس کے دستخط کے ساتھ چاہیے۔''

کرن ورما نے جواب میں کچھ نہیں کہا... اعتراف نامہ اٹھا کر پڑھنے کے بجائے اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور اطمینان کے ساتھ اس کے کش لینے لگا۔ اس دوران اس کی نظریں مجھ پر ہی جمی تھیں۔

ذرا دیر بعد اس نے سامنے پڑا ہوا کاغذ اٹھا کر پڑھا اور پھر بے پروائی کے ساتھ دوبارہ اسے میز پر ڈال دیا۔

''اس کے علاوہ ایک شرط اور ہوگی...'' اس کو بدستور خاموش پا کر میں نے کچھ توقف سے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ لڑکی اعتراف نامے پر دستخط کرنے کے لیے کسی طے شدہ جگہ پر خود آئے۔''

میری بات سن کر اس کے ہونٹ بھنچ گئے لیکن منہ سے وہ اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس کی خاموشی پر مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی... طرح طرح کے اندیشے میرے دل میں سر ابھار رہے تھے۔

''عیناں کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو گے کہ وہ کہاں ہے؟'' میں نے کرن ورما کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

وہ چند لمحوں تک پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا اور پھر سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے بولا۔ ''کامران کو وہ رقم کہاں سے ملی؟''

''شیراز علی کی کار سے... اسپیئر وہیل کے اندر۔'' میں نے کہا۔

اس نے عجیب سے انداز میں سر جھٹکا اور پھر میری جانب جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''رقم پوری ہے؟''

''اس میں سے پانچ لاکھ، بطور میری فیس کم کر لو۔''

"کامران نے پہلے ہی یہ ڈیل کیوں نہیں کی؟" کرن ورما کی نظریں گویا میرا ایکسرے کر رہی تھیں۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ایک لمحے کو اندر ہی اندر مجھے کپکپا دیا...

"پہلی مرتبہ کامران نے یہ ڈیل اس لیے نہیں کی کیونکہ تب تک اسے وہ رقم نہیں ملی تھی۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "اس نے تمہارے آدمیوں کو یہ بات بتائی تھی لیکن انہوں نے اعتبار نہیں کیا۔"

"میرے آدمی؟" اس نے بھویں اچکائیں۔ "میں تو ایک سیدھا سادہ سا بزنس مین ہوں اور اپنی گمشدہ رقم کی واپسی چاہتا ہوں... تم پتا نہیں کون سے آدمیوں کی بات کر رہے ہو؟"

"چلو، یہی سہی..." میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اور کامران یہ چاہتا ہے کہ اس کی پوزیشن بالکل صاف ہو جائے... قتل کا جھوٹا الزام اس کے سر سے ہٹ جائے۔"

"لیکن تم کون ہو؟" وہ ایک بار پھر میری طرف جھکا۔

"فکر نہ کرو، میں جو کوئی بھی ہوں... کم از کم پولیس والا نہیں ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"کیا رقم تمہارے پاس ہے؟" کرن ورما نے سوال کیا۔

"کیا تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟" میں نے کہا۔

وہ بے اختیار مسکرایا۔ "ہوں...!"

"اور یہ بھی سن لو کہ میں کامران کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے... نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں میری سلامتی ہے۔ لہٰذا اگر میرے بارے میں کوئی ایسا ویسا خیال تمہارے دل میں ہو تو اسے نکال دو۔ مجھ سے تم کچھ نہیں معلوم کر پاؤ گے۔ نہ ہی میرے بغیر کامران سے رابطہ کر سکو گے۔" میں نے اطمینان کے ساتھ کہا۔ میں اپنی گھبراہٹ پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔

"تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو پھر اس سے رابطہ کس طرح کرتے ہو؟" کرن ورما نے پوچھا۔

"وہ خود مجھے کال کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر یہ ڈیل طے ہو جاتی ہے تو پھر آگے کیا ہوگا؟" کرن ورما نے سوال کیا۔

"تب کامران اس کارروائی کے دوران مجھے فون کرے گا اور میں اسے بتاؤں گا کہ میں نے اعتراف نامہ اور اس پر نیتاں کے دستخط چیک کر لیے ہیں... اس کے بعد میں نیتاں سے اس کی بات کراؤں گا، صرف ایک منٹ کے لیے... مگر کامران کا اصرار ہے کہ جب وہ نیتاں سے بات کرے تو میرے سوا کوئی اور وہاں موجود نہ ہو... اگر وہ مطمئن ہو گیا تو ذرا ہی دیر بعد اس کا ایک آدمی رقم لے کر یہاں پہنچ جائے گا، تم رقم گننا اور اسے لے کر روانہ ہو جانا۔ نیتاں میری تحویل میں رہے گی۔"

"تم نیتاں کا کیا کرو گے؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم نے تو تم سے یہ سوال نہیں کیا کہ تم رقم کا کیا کرو گے؟"

میرے جواب پر کرن ورما نے ایک لمحے کے لیے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو جائے گی؟"

"میرا خیال ہے تم اسے مجبور کر سکتے ہو۔" میں نے کہا اور کرن ورما کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرنے لگا...

"ٹھیک ہے۔" کرن ورما نے غراتی ہوئی سی آواز میں کہا تو میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "کب اور کہاں؟" اس نے اپنی بات مکمل کی اور ایک بار پھر کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

"کامران، ایک ہوٹل کے کمرے میں یہ میٹنگ ارینج کرنا چاہتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوٹل میں کس لیے؟" کرن ورما نے اعتراض کیا۔

"پبلک پلیس ہونے کی وجہ سے... اسے ڈر ہے کہ کسی ویران جگہ پر ڈبل کراس کیا جا سکتا ہے، بڑی آسانی سے۔"

"اور یہ ہوٹل کون سا ہوگا؟" کرن ورما نے میرے جواب پر کوئی تبصرہ کیے بغیر پوچھا۔

"اس بارے میں، میں تمہیں کل شام چھ بجے بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"مگر میری بھی ایک شرط ہوگی کہ میں اپنے ساتھ دو گارڈز ضرور لاؤں گا۔" کرن ورما نے کہا۔ "ڈیل مکمل ہونے تک وہ نیتاں کی حفاظت کریں گے۔"

مجھے پہلے ہی اس کی جانب سے کسی ایسی شرط کی توقع تھی۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن جب تک نیتاں فون پر کامران سے بات کرے گی، تب وہ دروازے کے باہر کھڑے رہیں گے۔"

"میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" اس نے کہا۔ "ہم سب باہر چلے جائیں اور تم اندر سے دروازہ لاک کر لو۔"

"دروازے کی چابی تمہیں دے دی جائے گی، تم چیک کر لینا۔ اس کے علاوہ وہ صرف ایک منٹ کے لیے بات

کریں گے۔" میں نے کہا۔

"او کے... ڈیل۔" کرن ورما نے چند لمحے تک غور کرنے کے بعد کہا۔ "اگر چابی ہمارے پاس ہوگی تو ٹھیک ہے۔"

میں نے اعتراف نامے والا پرچہ اس کی جانب کھسکا دیا اور اس نے وہ پرچہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

کرن ورما کے جانے کے بعد میں وہیں بیٹھا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اس خطرناک شخص کے ساتھ گفتگو کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر رہا تھا، لہٰذا میرے اعصاب سخت کشیدہ تھے۔ بہرحال اس بات پر تو مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا... میری فنکارانہ صلاحیتیں تو کامیاب رہی تھیں لیکن اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے...

کرن ورما کے ساتھ جو معاملہ طے پایا، اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ ایسے لوگوں کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ وہ کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش ضرور کرتا۔ خواہ وہ نیتاں کو سامنے لاتا یا نہ لاتا... اور اگر وہ مجھے پھانسنے کے لیے نیتاں کو سامنے نہ لاتا تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا... اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی میں اسی دشمنِ جاں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے بارے میں فکرمند تھا۔ شاید ماریا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ محبت اور نفرت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر نیتاں، کرن ورما کے ساتھ نہ ہوئی تو پھر کوئی میٹنگ... کوئی بات چیت نہیں ہوگی۔

میں نے ڈرنک کا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا اور ویٹریس کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ کرن ورما نے تو کچھ بھی پینے سے انکار کر دیا تھا لیکن میں نے بہرحال ایک ڈرنک منگوالی تھی۔ تب ہی میں نے بار کاؤنٹر پر ان دونوں کو دیکھا... سلیم اور امرناتھ وہاں کھڑے بظاہر ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ درحقیقت مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے وہ دونوں یقیناً باہر ہوں گے اور اب کرن ورما نے روانہ ہوتے وقت انہیں میرے بارے میں بتایا ہوگا کہ یہ صورتِ حال میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی پھر بھی ان کی صورتیں... بلکہ منحوس صورتیں دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا۔

میں ان سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ یہ ظاہر تھا کہ انہیں میرا پیچھا کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ بل میں ادا کر چکا تھا... ذرا دیر بعد میں اچانک اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا، سلیم خان اور امرناتھ خاصی دور کھڑے تھے، انہیں میرے پیچھے آنے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ لہٰذا میں پھرتی کے ساتھ پچھلی جانب پارکنگ کی طرف گیا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے اسٹارٹ کر کے تیزی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ان دونوں کو مجھ سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں ہوگی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق میں تو انہیں جانتا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا میں تصور کر سکتا تھا کہ چند لمحوں تک تو وہ شاک کی سی کیفیت میں بیٹھے رہ گئے ہوں گے۔

میں نے بیک ویو مرر میں ایک گاڑی کو اپنے پیچھے آتے دیکھ لیا تھا لیکن ابھی وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر تھی۔ میں نے اسپیڈ بڑھا دی... میں اس فاصلے کو مزید بڑھانا چاہتا تھا۔ پیچھے آنے والی گاڑی کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ راستے میں ٹریفک زیادہ نہیں تھا لیکن اس بات کا فائدہ وہ لوگ بھی اٹھا رہے تھے اور تیز رفتاری کے ساتھ میرے تعاقب میں تھے۔ میں نے اپنے اوسان پر قابو رکھتے ہوئے تیز اسپیڈ کے ساتھ ہی کئی موڑ کاٹے اور بالآخر ایک موڑ پر میں انہیں چکما دینے میں کامیاب ہو گیا۔ کافی دیر تک جب وہ گاڑی مجھے اپنے تعاقب میں دکھائی نہیں دی، تب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں ان سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے اپنا ناشتا وہیں سوئٹ میں منگوا لیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں صبح کا اخبار دیکھنے لگا۔ وہ اسٹوری اب بھی فرنٹ پیج کی زینت بنی ہوئی تھی۔ خبر کے مطابق میری تلاش بڑے پیمانے پر جاری تھی۔ پولیس انسپکٹر وجے شرما نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے بڑے پراسرار انداز میں انہیں بتایا تھا کہ محکمے کی دن رات کی کوششیں بہت جلد رنگ لانے والی ہیں اور "میری" گرفتاری کا وقت اب زیادہ دور نہیں...!

مجھے یقین تھا کہ انسپکٹر صاحب نے یہ بیان میری گزشتہ روز والی فون کال کی روشنی میں دیا تھا۔

آگے لکھا تھا کہ شیراز علی کی تدفین کے انتظامات کیے جا رہے تھے اور اس موقع پر بہت سے لوگوں کی شرکت متوقع تھی... جن میں بڑے بڑے فلمی ستارے بھی شامل تھے۔

ان سب خبروں اور معلومات کے ساتھ ساتھ میرا ذہن مسلسل اپنی پلاننگ میں بھی مصروف تھا... جب ملازمہ صفائی

وغیرہ کرنے کے بعد چلی گئی تب میں باہر نکلا۔ میرا رخ ایک ہارڈ ویئر اسٹور کی جانب تھا۔ اسٹور سے میں نے ایک ہتھوڑا، پیمائش والا رول ٹیپ اور کچھ کیلیں وغیرہ خریدیں۔

واپس آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنے سوئٹ کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا سٹنگ روم، ایک بیڈروم اور ایک باتھ روم تھا۔ دوسرے سوئٹ کا نقشہ بھی بالکل یہی تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ دونوں سوئٹس کے درمیان ایک دروازہ بھی تھا...

میں نے سوئٹ 609 کو میٹنگ کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ درمیانی دروازہ اسی سوئٹ کے سٹنگ روم سے دوسرے سوئٹ کے بیڈروم میں کھلتا تھا۔ پیمائشی فیتہ نکال کر میں نے اس دروازے کی اونچائی ناپی اور پھر اس دیوار کی لمبائی کو ناپا جس میں یہ دروازہ تھا۔ دونوں پیمائشوں کو میں نے اپنے پاس نوٹ کیا اور کمرے کی سجاوٹ اور کلر اسکیم پر ایک نظر ڈالتا ہوا باہر روانہ ہوگیا۔

کچھ دیر بعد جب میں واپس آیا تو آف وائٹ کلر کا ایک بھاری پردہ میرے ساتھ تھا۔ یہ سادہ سا پردہ کمرے کی کلر اسکیم سے بالکل میچ کر رہا تھا۔ اس کے بعد تقریباً دو گھنٹے کی محنت سے میں نے بڑی صفائی اور مہارت کے ساتھ وہ پردہ، فرش سے لے کر دروازے کی اونچائی تک، پوری دیوار پر فکس کر دیا۔ اب یہ دیوار کا ہی ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا اور دروازہ اس کے پیچھے چھپ چکا تھا۔

سٹنگ روم کا صوفہ اور سینٹر ٹیبل میں نے اسی دیوار کے آگے اس طرح سیٹ کر دی کہ ان سے دروازہ بند نہ ہونے پائے۔ یہ کام انجام دینے کے بعد میں نے ذرا دور ہٹ کے اپنی ہنرکاری کا جائزہ لیا... اور مجھے احساس ہوا کہ وہ کام میری توقع سے بھی زیادہ اچھا ہوگیا تھا۔ وہ پردہ گویا کمرے کی ڈیکوریشن کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا، بلکہ اس نے کمرے کی سجاوٹ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ اگلے روز صفائی کے لیے آنے والی ملازمہ یہ نیا سیٹ اپ دیکھ کر کس قدر حیران ہو گی اور پھر اس کی رپورٹ، منیجر یا اسسٹنٹ منیجر تک ضرور پہنچے گی۔

شام کے چھ بجے میں نے کرن ورما کو فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا۔ ”نیتاں کو لے کر ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل بلیو مون کی لابی میں پہنچ جانا... وقت کا خیال رکھنا کیونکہ کامران ٹھیک سوا آٹھ بجے فون کرے گا... اس کے بعد وہ دوبارہ کال نہیں کرے گا... اور ورما جی... کل رات کی طرح پھر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ یہ ڈیل پوری نہیں ہو پائے گی۔“ اتنا کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

نیچے لابی میں جا کر میں نے ہوٹل کے سیف سے اپنا بریف کیس حاصل کیا۔

بریف کیس لے کر میں اپنے پرانے کمرے میں پہنچا جہاں اس کے ساتھ میں نے ہتھوڑا، اپنا پرس اور دوسرے تمام شناختی کاغذات چھپا دیے۔

اس کے بعد میں نے اوپر، سوئٹ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اپنا ریوالور اور دوسرے کمروں کی چابیاں، فرنیچر اور پردے والی دیوار کی درمیانی جگہ پر چھپا دیں۔ فون، میں نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا... اور اب میں گویا آنے والے وقت کے لیے تیار تھا۔

ہوٹل کے میزنائن فلور پر لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں، میزیں اور صوفے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہاں ایک بالکونی سی بنی ہوئی تھی جہاں گرل لگی ہوئی تھی۔ میں جا کر اس گرل کے آگے پڑی ہوئی ایک کرسی میں بیٹھ گیا۔ اس جگہ سے میں بآسانی پوری لابی اور ریسیپشن کا نظارہ کر سکتا تھا۔

میں تقریباً آدھ گھنٹا پہلے وہاں براجمان ہو گیا تھا۔ انتظار کے وہ لمحات میرے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں تھے۔ جب سے یہ اذیت ناک سلسلہ شروع ہوا تھا تب سے میرے اعصاب شدید دباؤ کا شکار تھے۔ اس دوران میرا ذہن طرح طرح کے منصوبے بنانے میں مصروف رہا تھا... پھر میں خود ہی کبھی ان منصوبوں کو بگاڑتا اور کبھی ان میں ترمیم کرتا رہا... میری ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ میرے مرتب کردہ پلان میں کوئی غلطی، کوئی سقم باقی نہ رہ جائے۔

کبھی کبھی میں ایک دم خوف زدہ سا ہو جایا کرتا..... آخر میں نے اتنے خطرناک گروہ سے تن تنہا ٹکر لی تھی۔ میں اس وقت بھی یہ سوچ سوچ کر حیران پریشان تھا کہ اگر کرن ورما مجھے پہچان جاتا تو کیا ہوتا؟

آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے... جب میں نے کرن ورما کو ہوٹل کے اندر آتے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس نے ریسیپشن کے قریب رک کر گہری نظروں سے پوری لابی کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے ریسیپشنسٹ سے کچھ پوچھا... میں نے جواب میں اسے نفی میں سر ہلاتے دیکھا۔ کرن ورما کے چہرے پر ایک لمحے کو پریشانی کی جھلک دکھائی دی... اس نے ایک بار پھر لابی کا معائنہ کیا اور پلٹ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ اگر وہ نیتاں کو ساتھ نہیں لایا تھا تو میرا سارا پلان دھرا کا دھرا رہ جاتا... میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کرن ورما ایک بار پھر لابی میں نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے سلیم خان اور امرناتھ تھے... اور ان دونوں کے درمیان جو ہستی تھی، وہ یقیناً نیتاں ہی تھی۔

اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جس میں، میں نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ اس لباس میں وہ آج بھی اسی قدر خوب صورت دکھائی دے رہی تھی... لیکن میں اس کے چہرے پر تناؤ کی ایک ہلکی سی پرچھائیں صاف دیکھ سکتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل میں گویا ایک ٹھنڈک سی پڑ گئی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی کرم فرمائیاں یاد آتے ہی میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

میں جلدی سے اٹھ کر اپنے سوئٹ میں گیا... وہاں جا کر میں نے پولیس آفیسر وجے شرما کو فون کیا۔ وہ اپنے آفس میں موجود نہیں تھا لیکن جب میں نے کامران کا حوالہ دیا تو میرا رابطہ فوراً اس سے کروا دیا گیا۔

”شیراز علی کے قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے تیار رہیے گا آفیسر!“ میں نے رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ ”ایک گھنٹے کے اندر اندر میں آپ کو دوبارہ فون کروں گا اور آپ کو لوکیشن بتاؤں گا۔“

اس کے بعد میں نے ہوٹل کے فون سے کرن ورما کو کال کی۔ ”لڑکی کو لے کر سوئٹ نمبر 609 میں آجاؤ۔“ میں نے اسے بتایا۔

میں اپنے آپ کو خاصا نروس محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں نے ایک بہت بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے آئینے میں اپنے گیٹ اپ کا جائزہ لیا اور پھر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک سنائی دی... میں نے گھڑی کی جانب دیکھا، آٹھ بج کر چھ منٹ ہوئے تھے۔

”دروازہ کھلا ہے، اندر آجاؤ۔“ میں نے اپنی بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

سب سے پہلے کرن ورما اندر آیا، نیتاں اس کے پیچھے تھی اور آخر میں سلیم خان اور امرناتھ اندر داخل ہوئے۔ سلیم خان نے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

نیتاں کا چہرہ اس وقت بالکل بے تاثر دکھائی دے رہا تھا۔ کرن ورما نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ کسی روبوٹ کی طرح وہاں ٹک گئی۔

سلیم خان نے ایک سرد نگاہ مجھ پر ڈالی اور حسب عادت پان کی جگالی کرتا ہوا، ادھر اُدھر گھوم پھر کر کمرے کا

جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے صوفوں کے کشن پلٹ کر دیکھے... فرنیچر کے نیچے جھانکا، دیوار کے ساتھ رکھی میز کی دراز کھول کر دیکھی۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک کر معائنہ کیا اور پلٹ کر اس پردے کا جائزہ لینے لگا۔

میں سانس روکے اپنی جگہ بیٹھا تھا... باقی سب بھی اب تک خاموش تھے۔ سلیم خان نے اچانک ہاتھ بڑھا کر پردے پر انگلی پھیری اور پھر ایک دم پلٹ کر امرناتھ سے مخاطب ہوا۔ ”آجا... دوسرے کمرے کو بھی دیکھتے ہیں۔“

وہ دونوں بیڈروم کی جانب بڑھ گئے... تب میری رکی ہوئی سانس دوبارہ خارج ہوئی۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نیتاں کی تصویر نکالی۔ یہ تصویر ہمیشہ میرے پرس میں رکھی رہتی تھی... میں نے گویا اس تصویر سے سامنے بیٹھی ہوئی نیتاں کا موازنہ کیا۔

”تمہیں یہ تصویر کہاں سے ملی؟“ کرن ورما نے پوچھا۔

”کامران نے کوریئر کے ذریعے مجھے بھیجی تھی۔“ میں نے بیڈروم کی جانب کان لگاتے ہوئے کہا جہاں سے کھٹر پٹر کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور سلیم خان اور امرناتھ کی کارروائیاں جاری تھیں۔

نیتاں، میری ہی جانب دیکھ رہی تھی لیکن اس کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ ذرا دیر بعد سلیم خان اور امرناتھ سٹنگ روم میں لوٹ آئے۔

”ہم نے اچھی طرح چیک کر لیا ہے۔“ سلیم خان نے کہا۔ ”بیڈروم میں کچھ نہیں ہے... نہ ہی کوئی بیگ وغیرہ اور نہ ہی کپڑے۔“

کرن ورما نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ میں نے نیتاں کی تصویر میز پر رکھ دی اور کہا۔ ”مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ یہ لڑکی نیتاں ہی ہے۔ اب مجھے اعتراف نامہ دکھاؤ۔“

”کھڑے ہو جاؤ۔“ امرناتھ نے اچانک کہا۔

”تم نے مجھ سے کچھ کہا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”کیوں... کیا تم بہرے ہو؟“ سلیم خان نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”تم کون ہوتے ہو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے والے؟“

”اگر تم فوراً کھڑے نہ ہوئے تو تمہارے تھوبڑے پر پڑنے والا گھونسا تمہیں بتا دے گا کہ میں کون ہوں۔“ سلیم خان نے اسی لہجے میں کہا۔

میں نے کرن ورما کی طرف دیکھا اور پھر اپنی گھڑی کی

جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر پانچ منٹ کے اندر اندر کامران نے فون پر میری آواز نہیں سنی تو پھر یہ سمجھ لو کہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔“

”یہ دونوں صرف تمہاری تلاشی لینا چاہتے ہیں کہ کہیں تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں۔“ کرن ورما نے جلدی سے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں وضاحت کی۔

”تو ایسا کہنا تھا نا۔“ میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سلیم خان نے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں میرے جسم پر ہاتھ پھیر کر میری تلاشی لی۔ ”اب اپنی جیبوں کو باہر پلٹ دو۔“ اس نے کہا۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور اپنی جیبوں سے گاڑی کی چابی، سوئٹ کی چابی، چار ہزار روپے اور ایک بال پین نکال کر میز پر رکھ دیا۔

”بس یہی کچھ ہے تمہارے پاس؟“ امرناتھ نے سوئٹ کی چابی اٹھا کر اپنے قبضے میں کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا پرس اور کاغذات وغیرہ کہاں ہیں؟“

میں نے ان سوالات سے بچنے کے لیے ایک بار پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”تین منٹ گزر چکے... اور میں نے اب تک اعتراف نامہ نہیں دیکھا۔“ میں نے میز پر سے اپنی چیزیں اٹھا کر دوبارہ جیبوں میں رکھنی شروع کر دیں۔

”ٹھیک ہے۔“ کرن ورما نے سر ہلایا۔ ”نیناں! دکھا دو...“

نیناں نے خودکار سے انداز میں اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے کاغذ کو کھولا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اعتراف نامے کا مضمون بالکل وہی تھا جیسا کہ میں نے لکھ کر دیا تھا۔ میں نیناں کی ہینڈ رائٹنگ کو بخوبی پہچان سکتا تھا... اس پر دستخط ہونا باقی تھے۔

”مس نیناں! یہاں میز کے قریب آ کر اس پر سائن کر دو۔“ میں نے جیب سے اپنا پین نکالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس سے پہلے اس میں ایک لائن کا اضافہ کرنا ہے۔“

”کیسی لائن؟“ کرن ورما نے غراتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے پُرسکون رہنے کی تلقین کی۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، صرف یہ لکھنا ہے کہ میں نے یہ اعتراف نامہ بقائمی ہوش و حواس میں تحریر کیا ہے اور اس سلسلے میں مجھ پر کوئی جبر نہیں کیا گیا۔“

کرن ورما میری بات سن کر خاموش ہو گیا اور نیناں نے میری ہدایت کے مطابق وہ جملہ تحریر کر دیا اور اس کے بعد اپنے دستخط کر دیے۔

نیناں کے اس طرح بے چون و چرا دستخط کر دینے سے میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ وہ سب مل کر میرے ساتھ ڈراما کر رہے تھے۔ نیناں اس اعتراف نامے پر کبھی سائن نہ کرتی اگر اسے یقین نہ ہوتا کہ کرن ورما اور اس کے گرگے اسے، اعتراف نامے کے ساتھ یہاں سے نکال لے جائیں گے۔ عین ممکن تھا کہ انہوں نے نیناں سے، رقم میں سے کچھ حصہ دینے کا وعدہ بھی کیا ہو۔

نیناں نے وہ پرچہ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس پر سرسری سی نگاہ ڈال کر اسے واپس کر دیا اور کہا کہ جب تک میں نہ مانگوں، وہ اس پرچے کو اپنے پاس رکھے۔ نیناں نے خاموشی سے اسے اپنے پرس میں واپس رکھ لیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک وہ بے چینی کے عالم میں اپنے ہاتھ ملتی رہی پھر اچانک ہی پھٹ پڑی۔ ”کرن... کیوں مجھ پر یہ ظلم کر رہے ہو؟“ اس نے روہانسی آواز میں کہا۔ ”تمہارے سینے میں آخر دل ہے کہ نہیں؟ تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟ آج کا اخبار تو پڑھا ہو گا تم نے؟ پولیس جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالے گی اور پھر تمہاری رقم مل جائے گی۔ پلیز، کرن... میں تم سے بنتی کرتی ہوں... اتنے ظالم نہ بنو۔ مجھے بلی چڑھا کر آخر تمہیں کیا...“

”شٹ اَپ۔“ یکایک وہ دہاڑا۔ ”بند کرو اپنی یہ بکواس۔ تم جیتی ہو یا مرتی ہو، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں... مجھے صرف اپنی رقم سے غرض ہے اور بس۔“

نیناں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں ساکت بیٹھا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ اداکاری تھی تو میرے حساب سے یہ نیناں کی بہترین پرفارمنس تھی۔

”تمہارے کامران صدیقی کا بھیجا ہوا آدمی آخر کب تک یہاں پہنچے گا؟“ کرن ورما نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کامران نے کہا تھا کہ وہ آدمی دس منٹ کے اندر یہاں پہنچ جائے گا۔“ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا... اور سوچنے لگا کہ ہوٹل کے ریسپشن سے ابھی تک کال کیوں نہیں آئی؟ کہیں ریسپشنسٹ بھول تو نہیں گیا... اس خیال کے ساتھ میرے تنے ہوئے اعصاب مزید کچھ تن گئے۔ یہ کال میرے پلان کا اہم حصہ تھی۔

وہ چاروں خاموش اور ساکت بیٹھے کبھی میری جانب اور کبھی میز پر رکھے فون کی جانب گھور رہے تھے۔

دفعتاً فون کی گھنٹی نے ماحول پر چھایا ہوا سکوت توڑ دیا... سب نے چونک کر فون کی جانب دیکھا، میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو!“

”ہیلو... مسٹر؟“ دوسری جانب سے کہا گیا۔

”ہاں، میں بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں ہوٹل کا آپریٹر بات کر رہا ہوں، سر! آپ نے سوا آٹھ بجے اپنے روم میں کال کرنے کی ہدایت کی تھی۔“

”ہاں، ہاں... وہ یہاں پہنچ گئی ہے۔“ میں نے آپریٹر کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے وہ کاغذ دیکھ لیا ہے اور اس پر سائن بھی ہو چکے ہیں... تم ذرا ہولڈ کرو، میں ابھی سب کو باہر بھیجتا ہوں پھر تم اطمینان کے ساتھ اس سے بات کر لینا۔“

بے چارہ آپریٹر بار بار درمیان میں مجھے ٹوکنے اور یہ وضاحت دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہا ہوں لیکن میں نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ماؤتھ پیس پر اپنا ہاتھ رکھا اور کرن ورما کی جانب متوجہ ہوا۔

”مجھے دو!“ اس نے غراتی ہوئی سی آواز میں کہا اور فون کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ ”پہلے میں اس... سے بات کروں گا۔“ اس نے ایک شاندار سی گالی دی۔

”ہرگز نہیں۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”نیناں کے علاوہ سب لوگ باہر چلے جائیں... فوراً!“

سلیم خان نے اپنے ہولسٹر کی جانب ہاتھ بڑھایا اور امرناتھ نے میری جانب پیش قدمی کی... میرا دل ایک دم اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے اپنا پلان فیل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ قریب تھا کہ میں ریسیور کو واپس کریڈل پر رکھ دیتا کہ... کرن ورما نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... ہم بات کرنے کے لیے اسے صرف ایک منٹ دے سکتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔“

وہ سب دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ باہر جانے سے پہلے امرناتھ نے چابی کو دروازے میں لگا کر آزمایا اور مطمئن ہونے کے بعد باہر جا کر اسے بند کر دیا۔

نیناں اور میں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ وہ منتظر نگاہوں سے ریسیور کی جانب دیکھ رہی تھی جو میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور اس کی جانب بڑھایا لیکن ساتھ ہی کھردرے انداز میں رابطہ منقطع کر دیا۔

”وہ آپ سے صرف دو ایک باتیں پوچھے گا، مس نیناں!“ میں نے ریسیور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

جونہی وہ پوری طرح فون کی جانب متوجہ ہوئی، میں نے جھک کر پردے کے پیچھے ہاتھ ڈالا اور اپنی گن نکال لی... اس کے بعد میں نے ایک نپا تلا ہاتھ اس کے سر پر رسید کیا۔ وہ ”ہیلو، ہیلو“ کہتے کہتے ایک کراہ کے ساتھ لہرائی اور دوسرے ہی لمحے بے ہوش ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

میں نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کریڈل پر رکھا، پردے کے پیچھے رکھی ہوئی چابیاں نکالیں... پھرتی کے ساتھ دوسرے سوئٹ کا درمیانی دروازہ کھولا اور نیناں کو کندھے پر لاد کر دوسری جانب کے بیڈ روم میں لا کر بیڈ کے اوپر لٹا دیا۔ اس کے بعد دوڑ کر نیناں کا پرس بھی اٹھا لایا اور درمیانی دروازے کو لاک کر دیا۔

میری گھڑی بتا رہی تھی کہ اس ساری کارروائی میں وقت صرف ہوا تھا... اب میں نے سوئٹ کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا، راہداری خالی پڑی تھی۔ کونے سے مجھے کرن ورما کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے تو اب تک ایک لفظ بھی نہیں سنائی نہیں دیا۔“ وہ یقیناً دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا۔

”ہمیں اندر چلنا چاہیے۔“ سلیم خان کی آواز آئی۔

میں نے دوبارہ نیناں کو کندھے پر لادا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ میں نے کسی نہ کسی طرح کھینچ کر آہستگی کے ساتھ بند کر ہی دیا۔ اسے اٹھائے اٹھائے میں دبے قدموں آگے بڑھا، عین اسی لمحے میں نے ایک شخص کو لفٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ پایا تھا۔ پھر میں نے سیڑھیوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ بے ہوش ہونے کے بعد نیناں خاصی بھاری ہو گئی تھی مگر اچھی بات یہ تھی کہ میں سیڑھیاں چڑھ نہیں رہا تھا بلکہ اتر رہا تھا۔ پانچویں فلور پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں خدا کی اس مہربانی پر دل ہی دل میں شکر ادا کرتا ہوا اپنے کمرے کی جانب لپکا... ابھی میں کمرے سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا کہ برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان جوڑا باہر نکلا۔ اس وقت میری کیفیت بڑی عجیب تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟

مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بدستور آگے بڑھتا رہا۔ وہ دونوں مجھ پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئے۔ عورت نے خوف زدہ سے انداز میں بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں میرے کندھے پر جھولتی نیناں پر مرکوز تھیں۔

”کیا ہوا... خیریت تو ہے؟“ مرد نے تیزی سے

پوچھا۔ ”آپ کو کسی۔۔ مدد کی ضرورت ہے؟“

”نہیں، نہیں... تھینک یو۔“ میں نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”آج میری بیوی نے کچھ زیادہ چڑھا لی ہے۔“

”اوہ!“ مرد ترحم آمیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر نیناں کو بڑی احتیاط کے ساتھ کمرے کی دیوار سے ٹکا کر بٹھایا اور جلدی سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ پھر میں نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اندر داخل ہوتے ہی پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میری نظر اس جوڑے پر پڑی... وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے، آنکھیں پھاڑے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

نیناں کو بیڈ پر لٹانے کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ لاک کیا اور اس کے پرس سے اعتراف نامہ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے نیناں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے ٹٹولا... اس کے سر پر جس جگہ میں نے گن کا دستہ رسید کیا تھا، وہاں ایک چھوٹا سا گومڑا ابھر آیا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ کوئی خون وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس کے چہرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے... اور اس کے گال تھپتھپائے۔ تب اس نے کسمساتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔

”ہوش میں آؤ، نیناں!“ میں نے اپنی اصلی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

صورتِ حال کا احساس ہوتے ہی یکایک اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ اپنے مضروب سر پر گیا اور وہ کراہتے ہوئے دوبارہ لیٹ گئی۔

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”میں تو کامران سے بات کر رہی تھی لیکن پھر...“

”اس وقت میں نے تمہارے سر پر ضرب لگا کر تمہیں بے ہوش کیا اور پھر اٹھا کر یہاں لے آیا۔“

نیناں کی حیرت زدہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اب ان میں حیرت کے ساتھ غصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ”یہ کون سا کمرا ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”جس کمرے میں تم موجود تھیں... اس سے دو فلور نیچے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم... تم...!“ اس نے بے یقینی کے عالم میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے بدلے ہوئے روپ کے باوجود اب وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ یکایک اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا اور اسے کھینچ کر دوبارہ بیڈ تک لے آیا۔

”دوبارہ ایسی کوشش مت کرنا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ورنہ تم جان سے بھی جا سکتی ہو۔“

اس نے شکوہ کناں نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ”تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیوں ایسا رویہ اختیار کر رہے ہو کہ میں تم سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاؤں؟“

”نفرت...؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تو تمہیں مجھ سے محبت کب تھی... نیناں بیگم؟“ وہ مجھے گھورتی رہ گئی۔

میں ٹہلتا ہوا ٹیلی فون کی جانب بڑھا۔ میرا موبائل فون تو ان لوگوں نے میری جیب سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا لیکن مجھے انسپکٹر کا نمبر زبانی یاد تھا۔

نیناں اپنے سر کے مضروب حصے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ”وہ ہمیں جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے۔“ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”کسی بھی لمحے وہ یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“

”وہ یہاں نہیں پہنچ سکتے۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس ہوٹل میں کئی سو کمرے ہیں اور یہ کمرا میں نے ظاہر ہے کہ اپنے اصل نام سے بک نہیں کرایا۔ اس کے علاوہ انہیں ہرگز یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں عین ان کی ناک تلے، کسی کمرے میں موجود ہوں۔ وہ تو یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں تمہیں لے کر ہوٹل سے بھاگ نکلا ہوں۔“

”تم نے یہ سب کیوں کیا؟“ وہ پھنکاری۔ ”تم نے انہیں کیوں بتایا کہ لاش کہاں ہے؟ اس لیے نا کہ وہ رقم تمہیں مل گئی تھی؟“ وہ چلائی۔ ”اور تم پولیس کے پھندے سے نکلنا چاہتے تھے لہٰذا تم نے میری گردن پھنسانے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔“

”میں نے تمہیں نہیں پھنسایا نیناں... بلکہ میں تو خود پھنسنے والا ہوں۔“ میں نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ”جب میں ماریا کے پاس تھی تو تم نے پوری اسٹوری پولیس کے سامنے بیان کر دی۔ مجھے بیچ ڈالا... تم نے! بلکہ تم نے پیسے کی خاطر اپنی روح تک بیچ ڈالی۔“

میں نے اپنا ملایا ہوا آپریٹر کا نمبر ڈس کنکٹ کر کے اس کی جانب دیکھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر مجھے نفرت کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیا۔ اس وقت یقیناً وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی۔

”نیناں!“ میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”جرم تم نے کیا لیکن سزا کاٹنے کے لیے مجھے آگے کر دیا۔ تمہاری مہربانی سے اس وقت میں پولیس کا سب سے مطلوب مجرم بن چکا ہوں۔ اگر میں چھپنا چاہوں تو کب تک چھپ سکتا ہوں؟ بالآخر ایک روز پکڑا جاؤں گا۔ پھر نہ جانے مجھے سزائے موت ہوتی ہے یا عمر قید... بہرحال، میری زندگی تو ختم ہو گئی نا... اور تم مجھے بتا رہی ہو کہ میں نے پولیس کے ہاتھوں تمہیں بیچ ڈالا؟ بہت خوب مس نیناں...! ذرا تفصیل سے بتانا پسند کرو گی کہ میں نے یہ سب کچھ کس طرح انجام دیا؟“ میں نے ایک طنزیہ اور دکھ بھری نظر اس پر ڈالی۔

”اگر... اگر اس وقت میرے پاس گن ہوتی تو میں فوراً تمہیں شوٹ کر ڈالتی۔“ نیناں نے غصے سے گویا بپھرتے ہوئے کہا۔

”تم تو چاقو سے بھی یہ کام بہت اچھی طرح انجام دے سکتی ہو۔“ میں نے اس پر طنز کا ایک اور وار کیا۔ ”بہرحال... میں یہ سننا ضرور پسند کروں گا کہ میں نے کس طرح پولیس کے ہاتھوں تمہیں فروخت کیا؟“

وہ بیڈ کے کنارے بالکل ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک اس کے چہرے پر ایک عجیب الجھن بھرا تاثر ابھرا۔

”تو کیا تم نے ایسا نہیں کیا؟“ اس نے تشکیک زدہ لہجے میں کہا۔ ”کرن نے تو کہا تھا کہ یہ تمہاری حرکت ہے۔“

”کون سی حرکت؟ یعنی کرن کے کہنے کے مطابق میں نے کیا کیا ہے؟“

”اس نے مجھے بتایا کہ جب میں ماریا کے پاس تھی، جب انسپکٹر سلیم خان اور امرناتھ پوچھ گچھ کے لیے تمہارے فلیٹ پر گئے تھے۔ انہوں نے تم پر شیراز کے قتل کا الزام لگایا اور رقم چرانے کا بھی... اس پر تم نے فوراً ان سے کہا کہ یہ سب میں نے کیا ہے اور انہیں یہ بھی بتا دیا کہ لاش کہاں دفن ہے۔“

میں نے غور سے نیناں کے چہرے کی جانب دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ ”اور تم نے کرن ورما جیسے شخص کی بات کا اعتبار کر لیا؟“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے... مجھے اعتبار کرنا پڑا کیونکہ تمہارے علاوہ یہ بات کون جانتا تھا کہ لاش کہاں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ تم نے کرن ورما سے یہ سوال کیا؟“

”میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا اور اس نے جواب دیا کہ تم نے رقم کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ تم نے سلیم خان اور امرناتھ کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ان دنوں تمہارے مالی حالات بہت خراب تھے اور تمہیں رقم کی شدید ضرورت تھی۔ میرا ساتھ بھی تم نے اسی امید پر دیا تھا کہ وہ رقم تم خود ہتھیا لو گے۔ لیکن جب رقم تمہیں نہیں ملی تو تمہیں مجھے بچانے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی... پھر جب پولیس نے تمہیں تحفظ دینے کا وعدہ کیا تو تم نے سچائی بیان کر دی۔“

”تم انہیں ’پولیس‘ کہتی ہو؟ سلیم خان اور امرناتھ جیسے لوگوں کو؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”اچھے یا برے... بہرحال، وہ ہیں تو پولیس والے۔“ نیناں نے کہا۔ ”اور کرن کے کہنے کے مطابق تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم...“

”تو انہوں نے تمہیں یہ جھوٹی کہانی سنائی اور اس کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے بعد میں سخت پریشان اور خوف زدہ ہو گئی۔ کرن نے مجھے آفر کی کہ اگر میں انہیں رقم کے بارے میں بتا دوں تو وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ مجھے اس وقت تم پر سخت غصہ تھا کیونکہ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا... میں نے کہہ دیا کہ رقم تمہارے پاس ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ شاید حقیقت میں ایسا ہی ہو... اس کے علاوہ میرے پاس اپنی جان بچانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ پھر کرن کے کہنے پر میں اس کے ایک فلیٹ میں چھپ کر رہنے لگی۔ کرن نے کہا تھا کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ تمہیں ہینڈل کر لے گا... اور پھر تم نے انہیں لاش کے بارے میں بتا دیا تھا، ہے نا؟“

”نہیں...“ میں نے کہا۔ ”تم بھی میری طرح ان کے جال میں آ گئیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا۔“

”مائی گاڈ!“ وہ کراہی۔ ”تو پھر درحقیقت کیا ہوا تھا؟“

تب میں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اسے ساری حقیقت بتائی۔

”اور اب وہ رقم کہاں ہے؟“ پوری بات سننے کے بعد اس نے سوال کیا۔

”رقم میں نے یہیں چھپا کر رکھی ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”اسے میں پولیس کے حوالے کرنے ہی والا تھا۔“

اس کے چہرے پر یکدم نرمی بچھا گئی... دفعتاً وہ دوڑتی ہوئی میری جانب آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ ”کامران... اوہ کامران! شکر ہے کہ میں نے تمہیں کھویا نہیں۔ ورنہ میں... میں تو سمجھ رہی تھی کہ میں نے جس سے محبت کی وہ دھوکے باز نکلا... اوروں کی طرح۔“

میں نے اس کے نرم و نازک وجود کے گرد اپنے بازو حمائل کر کے اسے خود سے مزید لپٹا لیا۔ میرے اندر چھائی ہوئی دکھوں کی تلخی یکدم دور ہوگئی اور میں ایک بار پھر اسے اپنے دل کے قریب محسوس کرنے لگا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ آنے والا وقت ہم دونوں کے لیے اپنے دامن میں نہ جانے کیا لے کر آتا ہے؟

ہم ایک دوسرے کے برابر خاموش بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ میں نے اپنا ایک بازو اس کے گرد حمائل کر رکھا تھا۔

"اوہ... میں سمجھ گئی۔" دفعتاً نیتاں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"کیا سمجھ گئیں؟" میں نے اس کے دلکش چہرے پر نظر ڈالی۔

"اب میری سمجھ میں آگیا ہے کہ کرن حقیقت کی تہ تک کیسے پہنچا۔" نیتاں نے کہا۔

"یعنی یہ کہ شیراز کو تم نے قتل کیا... مگر اسے یہ سب کس طرح معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کل کرن میرے پاس آیا تو میں ڈرنک کر رہی تھی... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت تک تقریباً مدہوش ہو چکی تھی۔ اس کیفیت میں نہ جانے میں نے اس کے سامنے کیا کیا کہہ ڈالا... میں اس وقت سخت نروس تھی اور میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے۔" نیتاں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے ہلکا ہلکا یاد آرہا ہے کہ کرن نے مجھ سے سب کچھ اگلوا لیا تھا۔"

"یعنی وہ جان گیا کہ شیراز کا قتل تمہارے ہاتھوں ہوا اور اس کی لاش دفن کرنے میں، میں نے تمہاری مدد کی؟" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پھر کرن نے انسپکٹر سلیم اور امرناتھ کو بلایا اور انہوں نے زمین کھود کر شیراز کی لاش برآمد کر لی۔"

"اب ہم کیا کریں گے، کامران؟" نیتاں نے زرد ہوتے چہرے سے میری جانب دیکھا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرمی سے دبایا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو چکا... اب تمہیں اپنے آپ کو حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔ ہم اس کیس کے انچارج پولیس آفیسر سے بات کریں گے اور ساری حقیقت اس کے گوش گزار کر دیں گے۔ میں ساری رقم بھی اس کے حوالے کر دوں گا اور اسے شیراز، سلیم اور امرناتھ کے بارے میں بتانے کے ساتھ ساتھ کرن ورما کے بلیک میلنگ والے ہتھکنڈوں کے بارے میں بھی آگاہ کروں گا۔"

"تمہیں کرن ورما کے بارے میں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" نیتاں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"مجھے ماریا نے اس گھناؤنے کھیل کے بارے میں بتایا تھا۔ لیکن مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو... ہم ایک اچھے وکیل کی خدمات حاصل کریں گے، خواہ اس کے لیے مجھے کہیں سے رقم ادھار لینی پڑے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم اس گندے کھیل کو سب کے سامنے لا کر رہیں گے اور تم نے جو کچھ کیا، وہ اپنے دفاع کی خاطر کیا... ٹھیک ہے نا؟"

نیتاں چند لمحوں تک عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھتی رہی۔ "میں نے تمہیں بہت مشکل میں ڈال دیا ہے نا کامران؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا... جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور بے مقصد سے انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس وقت وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں دکھائی دے رہی تھی۔

"نہ جانے کتنے لوگ... لاکھوں... کروڑوں لوگ..." وہ اپنے ہاتھ ملتے ہوئے بے ربط سے انداز میں بڑبڑائی۔ "میری زندگی کی گھناؤنی سچائیوں کے بارے میں پڑھیں گے۔ ٹی وی پر میرے بارے میں کیسے کیسے تبصرے کیے جائیں گے... تصویریں دکھائی جائیں گی اور... اور پھر کسی گندی سی جیل کا بدبودار اور تاریک کمرا میرا مقدر ہوگا۔"

یکایک اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ "تمہارے پاس میرا اعتراف نامہ ہے نا؟"

"ہاں۔"

"گڈ... بس تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ ایک بار پھر خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی۔ "یہ اعتراف نامہ بہت کام آئے گا۔" وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ "میرا دم گھٹ رہا ہے۔ یہ کھڑکی کھول دو پلیز۔"

مجھے اس کی حالت پر تشویش ہونے لگی۔ اس لمحے وہ برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جائے گی۔ میں جلدی سے اٹھا اور لپک کر کمرے کی کھڑکی کھول دی۔

"تم کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ نیتاں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے، تم پریشان مت ہو۔" میں اس کے پاس چلا آیا۔

نیتاں نے قطعیت کے ساتھ اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں، نہیں... میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا اور کھڑکی کے نزدیک جا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

"کاش میں تمہارا ساتھ دینے کے قابل ہوتی، کامران!" اس نے دل شکستہ سے انداز میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی... اس لمحے میں دل ہی دل میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا، اس نے پردے کو اس قدر سختی سے پکڑا ہوا تھا کہ اس کی انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے تھے۔ اور... پھر اسی لمحے میں جان گیا کہ وہ کیا کرنے والی تھی...!

جونہی وہ پردہ ایک جانب سرکا کر کھڑکی پر جھکی... میں اس کی جانب دوڑ لگا چکا تھا۔ میں نے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑی مگر وہ میرے ہاتھ سے نکل گئی کیونکہ نیچے کی جانب پھسلتے ہوئے اس کے جسم کو جھٹکا لگا تھا... یکایک اس کا پاؤں میرے ہاتھ میں آگیا اور میں نے اپنے جسم کی ساری توانائی صرف کرتے ہوئے اسے تھام لیا۔ اس کی سینڈل اتر چکی تھی اور اب اسٹاکنگ میں چھپا اس کا پیر میری پسینے میں بھیگی ہتھیلیوں سے پھسلنے کو بے تاب تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لٹکی، اپنا پیر میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی... ایک لمحے کی دیر تھی اور پھر وہ چند ہی سیکنڈ کے وقفے میں پانچویں منزل سے پختہ فرش پر گر کر زندگی کی قید و بند سے آزاد ہو جاتی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا پیر تھام رکھا تھا۔ دفعتاً میں نے فوری طور پر ایک خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا اور تیزی کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کے پیر سے ہٹا لیا... پھر اسی پھرتی کے ساتھ میں نے اس کا دوسرا پیر اپنی گرفت میں لیا اور پوری قوت سے اسے اندر کھینچ لیا۔

وہ بری طرح سسکتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے مضبوطی کے ساتھ اسے اپنی باہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

"کیوں، کیوں... تم نے مجھے مرنے نہیں دیا؟" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟ آج نہیں تو کل... مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا تو ہے۔"

میں اسے اپنی باہوں میں لیے کرسی تک آیا اور اسے لٹا کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ "میرے خدا...!" میں نے بے اختیار ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتی ہو؟"

وہ سر جھکائے دل شکستہ اور ہارے ہوئے انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی تھوڑی اوپر اٹھائی اور اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔ "چلو ٹھیک ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کچھ کہا ہم اس پر ہرگز عمل نہیں کریں گے۔ اس کے بجائے ہم کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ اب تم رونا بند کرو اور اس بات پر یقین رکھو کہ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"

میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "کچھ دیر بعد ہم اس شہر سے کہیں دور روانہ ہو جائیں گے۔ آخر ہمارے پاس خاصی رقم موجود ہے۔"

میں نے جیب سے نیتاں کا اعتراف نامہ نکالا اور اسے پرزے پرزے کر ڈالا۔

☆☆☆

رات دو بجے کولکتہ جانے والی پرواز پر دو ٹکٹوں کا انتظام ہو گیا تھا۔ کولکتہ یقیناً دنیا کا دوسرا سرا تو نہیں تھا لیکن ممبئی سے بہرحال کافی دور تھا۔

فون پر ریزرویشن کروانے کے بعد میں نیتاں سے مخاطب ہوا۔ "یہ تو اچھی بات ہے کہ ہمیں گیارہ بجے سے پہلے یہاں سے روانہ ہونے کی ضرورت نہیں... ابھی تو پولیس والے یہاں منڈلا رہے ہوں گے لیکن امید ہے کہ اس وقت تک میدان صاف ہو چکا ہوگا۔"

"کیا ائرپورٹ کی نگرانی نہیں کی جا رہی ہوگی؟" نیتاں نے پوچھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی چمک کسی قدر لوٹ آئی تھی۔

"عین ممکن ہے۔" میں نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ "لیکن تم بھول رہی ہو کہ سلیم خان اینڈ کمپنی کو صرف میری تلاش ہے اور وہ مجھے پہچان نہیں پائیں گے۔"

"اوہ...!" نیتاں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم بدلے ہوئے روپ میں ہو... لیکن کیا انہیں میری تلاش نہیں ہوگی؟"

"یہ بات تو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ تمہارے پیچھے نہیں ہیں۔"

"کامران... مجھے بہت برا محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری وجہ سے تم کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے!"

"اب تم کتنی مرتبہ یہ بات دہراؤ گی؟" میں نے نرمی سے کہا۔ "اب خدا کے لیے پھر سے رونا شروع مت کر دینا اور نہ ہی کھڑکی کی جانب دوڑ لگا دینا۔"

میری بات پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "دیکھو..." میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ انسپکٹر دبے شرما میرے بارے میں یہی سوچے گا کہ وہ کوئی فراڈ شخص تھا جس نے فون پر بات کی تھی۔ کیوں کی تھی... یا پھر وہ دراصل تھا کون؟ اس بارے میں وہ جب تک کوئی نتیجہ نکالے، ہم یہاں سے روانہ ہوچکے ہوں گے۔ ابھی ہمارے پاس دو گھنٹے ہیں۔"

"تب تو روانہ ہونے سے پہلے ہمیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔" نیتاں نے تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خود کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کررہی تھی اور یقیناً یہ ایک اچھی علامت تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھ کر خوش دلی کے ساتھ اپنے شانے اچکائے تو اس نے مسکرا کر اپنا چہرہ تکیے میں گھسالیا۔

گیارہ بجنے میں محض بیس منٹ باقی رہ گئے تھے اور نیتاں بستر پر گہری نیند سورہی تھی۔ میں اس کے پہلو میں دراز تھا اور اس نے سوتے میں اپنا بازو میری کمر پر رکھا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سخت کشیدگی کا شکار رہنے کے باعث اس کے اعصاب تھک چکے تھے لہٰذا سکون کے کچھ لمحات میسر آتے ہی وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہوگئی تھی۔ لیکن میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھیں بند نہیں کر پایا تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں غیر یقینی کی کیفیت اور سخت دباؤ کا شکار تھا۔ نیتاں کی ذمے داری مکمل طور پر مجھ پر عائد ہوچکی تھی۔

میں نے ایک نظر اس کے خوابیدہ حسن پر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر آہستگی کے ساتھ اس کا شانہ ہلایا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک وہ اجنبی اجنبی نظروں سے میری جانب دیکھتی رہی۔

"اوہ..." اس نے اپنی پیشانی ملتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہیں پہچان ہی نہیں پائی۔ کیا وقت ہوگیا؟"

"یہاں سے روانہ ہونے کا وقت ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔

ہم نے پھرتی کے ساتھ ضروری تیاری کی۔ میں نے اپنے ساتھ صرف بریف کیس اور گن لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ باقی تمام اشیا پیسوں سے خریدی جاسکتی تھیں۔

نیتاں اپنے ہینڈ بیگ سے ہیئر برش نکال کر اپنے بال سنوار رہی تھی۔ میں تیار کھڑا بے چینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

نیتاں چونک کر میری جانب پلٹی۔ "یہ کون ہوسکتا ہے؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "کیا تم نے ہوٹل والوں سے جگانے کے لیے کہا تھا؟"

میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور فون کی جانب گھورنے لگا۔

"فون اٹھاؤ۔" اس نے کہا۔

"نہیں... ہوسکتا ہے کہ وہ چیک کررہے ہوں۔ اس وقت فون سننا مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ جلدی یہاں سے نکلو۔" میں نے کہا۔

میں نے گن کو جیب میں رکھا، بریف کیس اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ کوریڈور بالکل سنسان پڑا تھا۔ ہم جلدی سے سیڑھیوں کی جانب لپکے اور پھرتی کے ساتھ نیچے اترنے لگے۔ لابی میں کچھ لوگ موجود تھے لیکن وہ سب اجنبی تھے۔

"باہر جانے کے دو راستے ہیں۔" میں نے آہستگی کے ساتھ کہا۔ "ہم پچھلے دروازے سے باہر نکلیں گے، آرام اور احتیاط کے ساتھ۔"

ہم نارمل انداز میں چلتے ہوئے لابی سے گزرے اور بائیں جانب مڑ کر باہر جانے والے دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے اشارے سے نیتاں کو ایک جانب رہنے کو کہا اور خود بھی کونے میں کھڑے ہو کر شیشے کے دروازے کے پار دیکھنے لگا۔

دروازے کی دوسری جانب، قدرے بائیں طرف... سلیم خان چوکنا انداز میں کھڑا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر امرناتھ، ٹانگیں پھیلائے اور ہونٹوں میں سگریٹ دبائے موجود تھا۔

میں نے جلدی سے نیتاں کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے واپس پلٹا۔ "اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم سامنے والے دروازے سے باہر نکلیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "کسی کو اندازہ نہیں ہوگا کہ ہم سامنے سے نکلنے کا خطرہ مول لیں گے۔"

ہم ایک زینہ اتر کر نیچے پہنچے اور ہوٹل کے مرکزی دروازے کی جانب آہستگی کے ساتھ بڑھے... باہر نظر ڈالتے ہی مجھے یونیفارم میں ملبوس ایک پولیس والا، سادہ لباس والے ایک شخص سے باتیں کرتا دکھائی دیا۔

"میرے خدا...!" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "دو مزید پولیس والے... نہ جانے یہ ہماری مدد کے لیے یہاں موجود ہیں یا پھر؟"

"اب ہم کیا کریں گے؟" نیتاں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ اس کے ہونٹ بُری طرح کپکپا رہے تھے۔

میرا ذہن اس لمحے تیزی کے ساتھ مصروفِ کار تھا۔ اس صورتِ حال کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا لیکن نیتاں کی تسلی کی خاطر میں اسے بہلاتا رہا۔ اس کے سوا میں کرتا بھی کیا...

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کی صورت میں بھی ہم یقیناً پکڑے جاتے۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، باہر نکلنے کی کوشش کرنی ہی تھی۔

دفعتاً مجھے ہوٹل کے بار کا خیال آیا... اور میں گویا امید وبیم کی سی کیفیت میں نیتاں کا بازو تھام کر اس جانب چل دیا۔

بار کے نیم تاریک ماحول میں قدرے سکون کا سا احساس ہوا۔ بہت سے جوڑے میزوں کے گرد بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ یہاں داخل ہونے کے بعد ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے باہر کی دنیا سے کٹ کر ہم کسی اور دنیا میں آپہنچے ہیں۔

بار کی دوسری جانب ایک اور گلاس ڈور تھا جو سوئمنگ پول کی طرف کھلتا تھا۔ ہم اپنی جانب بڑھتی ویٹریس کو نظرانداز کرکے اس دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

"یہاں تو کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔" نیتاں نے باہر قدم رکھتے ہی کہا۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہاں کوئی ہمارا راستہ روکنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ پول کے نزدیک سے گزر کر ہم ایک لان میں پہنچے جہاں بہت سے پھول دار پودے اور جھاڑ لگے ہوئے تھے۔ لان کو عبور کرکے ہم پارکنگ لاٹ میں پہنچ سکتے تھے۔ یہاں روشنی خاصی مدھم تھی۔

عین اسی وقت... نیم تاریکی میں سے اچانک سلیم خان اپنی گن ہاتھ میں تھامے نمودار ہوا۔ "آپ کہیں جارہے ہیں؟" اس نے طنزیہ کہا۔

نیم تاریکی کے باوجود میں اس کے پان چباتے ہوئے جبڑوں کی حرکت دیکھ سکتا تھا... اس لمحے میں سوچ رہا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔

"ہاں۔" میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں کہیں جارہا تھا لیکن اب میں نے اپنا ارادہ تبدیل کردیا ہے۔"

نیتاں میرے پیچھے کھڑی تھی۔ سلیم خان سے بات کرتے ہوئے میں نے نیتاں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ہپ پاکٹ پر رکھ دیا جہاں میری گن موجود تھی۔ پھر میں نے سلیم خان کی جانب دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ قدرے اوپر اٹھا دیے۔ بریف کیس میری بغل کے اندر دبا ہوا تھا۔

"تم اب اپنے فرینڈ کے پاس جاسکتی ہو نیتاں!" میں نے کہا۔ اسی وقت مجھے اپنی جیب سے گن نکالے جانے کا احساس ہوا۔

"ہاں، چلو نیتاں!" سلیم خان نے کہا۔ "اور اپنے ساتھ یہ بریف کیس بھی لیتی آنا، شاباش..."

نیتاں نے میرے بازو کے نیچے دبے بریف کیس کو نکالا اور گن کو اپنے پیچھے چھپائے اس کی جانب بڑھی۔ سلیم خان کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا گن والا ہاتھ بلند کرکے اس کے سر پر رسید کرنا چاہا... مگر وہ کم بخت فوراً نیتاں کی اس حرکت کو بھانپ گیا اور جھکائی دے کر ایک جانب ہوگیا۔ نیتاں کا وار اس کے شانے پر پڑا.... وہ ذرا لڑکھڑایا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔

اس وقت تک میں بھی اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا گن والا ہاتھ بلند کرتا، میں اس کے سر پر ایک لیفٹ ہک رسید کرچکا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں نے اس کے چہرے پر رائٹ پنچ مارا... میرا مکا خاصا زوردار تھا، سلیم خان کا چہرہ یک دم بگڑ کر رہ گیا۔ وہ لہرا کر پیچھے ہٹا، گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے بہ دقت تمام اپنی گن آگے کی... میں نے اس کی گن کی نال کو دیکھا لیکن نیتاں اس کے پیچھے کھڑی تھی، اس مرتبہ اس نے جونہی گن کا دستہ سلیم خان کے سر پر رسید کیا، وہ زمین پر گرنے سے قبل ہی آؤٹ ہوچکا تھا۔

میں نے فوراً بریف کیس اٹھایا اور نیتاں کے ہمراہ کار کی جانب دوڑ لگا دی۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے بہ دقت تمام کار اسٹارٹ کرکے میں نے کار باہر کی جانب دوڑائی۔ ہوٹل کی جانب سے دو آدمی دوڑتے ہوئے آرہے تھے، میں تیزی کے ساتھ سڑک پر آیا اور کار کا رخ مشرق کی سمت کر دیا۔ ائرپورٹ اسی جانب تھا۔

ڈرائیونگ کے دوران، میں گاہے بگاہے بیک ویو مرر سے پیچھے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابھی تک تو مجھے اپنے تعاقب کے کوئی آثار نہیں نظر آئے تھے۔ اس کی وجہ بہرحال کچھ بھی رہی ہو لیکن فی الحال تو ہمیں کچھ مہلت مل گئی تھی۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور نیتاں سے مخاطب ہوا۔ "ہمارے پاس اب بھی ٹائم ہے، ابھی ہم ائرپورٹ پہنچ سکتے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد سے اب تک اس نے ایک لفظ بھی نہیں ادا کیا تھا۔

ائرپورٹ کی جانب داخل ہونے والی سڑک پر ایک پیٹرولنگ کار کھڑی تھی... میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا لیکن وہ ٹریفک کنٹرول والے تھے، انہوں نے ہماری جانب کوئی دھیان نہیں دیا۔ نیتاں ابھی تک بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔

جونہی میں ائرپورٹ ٹرمینل بلڈنگ میں داخل ہوکر ٹکٹ کاؤنٹر کی جانب بڑھا، وہ ایک دم ٹھہر گئی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اس کے ساکت وجود کی جانب دیکھا۔

نیناں نے ایک بے بس سی نظر مجھ پر ڈالی، اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار پھسل پڑے۔

"ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس طرح تو ساری زندگی ہمیں بھاگتے ہی رہنا ہوگا... ہم جہاں بھی جائیں' ایک خوف ہمارے تعاقب میں ہوگا۔ میں ساری زندگی اس خوف کے ساتھ نہیں جی سکتی... میں تو ابھی سے بہت تھک چکی ہوں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو نیناں؟" میں نے پریشانی سے کہا۔ "ہمارا پلین مس ہوجائے گا۔"

"ہم کہیں نہیں جارہے کامران!" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ کسی طرح بھی تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ کبھی نہیں... اور پھر تم جلد ہی مجھ سے نفرت کرنے لگو گے، میری بزدلی پر مجھے نفرین بھیجو گے۔ زندگی تمہارے لیے ایک بوجھ بن جائے گی کیونکہ میرے کیے ہوئے جرم کی سزا میں تم دنیا بھر میں بھاگتے پھرو گے، عمر بھر... کسی مجرم، کسی بھگوڑے کی طرح... محض میری وجہ سے..." الفاظ اب ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے ادا ہو رہے تھے۔

"اور... یہ فیصلہ تم نے کب کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت جب ہم بار میں تھے... میں نے وہاں بیٹھے لوگوں کو دیکھا جو بے فکری اور خوش دلی کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے اور خوش گوار انداز میں اپنا وقت گزار رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہم دنیا بھر میں کہیں بھی چلے جائیں، اس طرح کے لوگوں کو ہمیشہ حسرت بھری نظروں سے دیکھیں گے۔ ان کے درمیان رہ کر بھی ہم ان میں کبھی شامل نہیں ہو پائیں گے۔ ہماری زندگی ایک تہمت، ایک عذاب بن کر رہ جائے گی..."

"تم نے بالکل سچ کہا۔" میں بولا تو میرا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ "تمہاری بات میں سمجھ گیا ہوں لیکن تم... میرا مطلب ہے کہ اب تم..."

"میں اب خودکشی کی کوشش نہیں کروں گی۔ اب میں حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکی ہوں۔" اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اور جیل کی کھڑکیوں پر تو موٹی موٹی سلاخیں ہوتی ہیں، ہے نا؟"

میں ایک ثانیے تک اس کی جانب دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ یہ درست تھا کہ آلۂ قتل نیناں کے ہاتھ میں تھا مگر قتل اس نے نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف پولیس کو نیناں کی نہیں، میری تلاش تھی جبکہ قتل کی اس واردات میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ لاش کی تدفین میں اعانت کا الزام اتنا کمزور تھا کہ مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکانا ممکن نہیں تھا۔

لیکن ہمارے دشمن وہ تھے جو طاقت اور دولت کے نشے میں چور تھے۔ امرناتھ اور سلیم خان جیسے حریص اور لالچی پولیس افسران ان کی مٹھی میں تھے۔ پیسے کی خاطر وہ کسی معصوم کو پھانسی لگوا سکتے تھے یا کسی سفاک قاتل کو بری بھی کرا سکتے تھے۔ ہم دونوں اس ماحول اور معاشرے کے قیدی بن چکے تھے جہاں انصاف کا حصول ایک خواب سے کم نہیں تھا... تفتیش کرنے والے امرناتھ اور سلیم خان جیسے پولیس افسران ہوتے تو ہمارا بچنا محال تھا۔ نیناں سچ بولتی یا میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا، دونوں صورتوں میں صرف اور صرف ہمارے خون کے پیاسوں کا مقصد پورا ہوتا... اپنی جانوں کی بھینٹ دے کر بھی ہم سچائی کے علم بردار نہیں بن سکتے تھے۔

بہتر یہی تھا کہ ہم جس دیس میں رہ رہے تھے، اسی کے رنگ میں رنگے رہتے... ضمیر کی پکار اور سچائی کی راہ پر چلنا ہمارے لیے مہلک ثابت ہو سکتا تھا... مافیا کے سفاک گرگے ہماری پیشانیوں پر جرم کے داغ لگا کر ہمیں بے ننگ و نام کر دیتے۔

نیناں میری زندگی کا خوب صورت ترین خواب تھی۔ وقت کے بے رحم دھارے میں ہولناک تھپیڑے کھانے کے بعد وہ میرے قریب آئی تھی۔ اس قربت کو اپنے دشمنوں کی خواہشات کا ایندھن بنا کر ہم دونوں کو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے غور سے نیناں کے نینوں میں جھانکا... وہاں دو موتی سے جھلملا رہے تھے۔ وہ اپنی دانست میں ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر اب اس کا فیصلہ میرے ہاتھ میں تھا۔

میری آنکھوں میں عزم اور حوصلے کی چمک دیکھ کر اس کے ہونٹوں کے گوشے کپکپائے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا داہنا ہاتھ بھینچ لیا۔

"کامران... کامران...!" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور اگلے الفاظ اس کے رندھے ہوئے حلق میں معدوم ہو گئے۔

"ہاں نیناں!" میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "ہمارے پاس پیسا ہے جس سے اس دیس میں سب کچھ خریدا جا سکتا ہے... یہاں سے کولکتہ اور پھر کہیں بھی... دنیا بہت بڑی ہے... یہاں کے سوا ہمیں ہر جگہ امان ہی امان ملے گی۔"

اور ہم دونوں واپس ٹرمینل کی طرف چلے دیے۔

انجام بخیر

جمال دستی

غیر قانونی سرگرمیوں سے وابستہ ایک سرپھرے مجرم کی انوکھی کارگزاری... اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ کر ناکامیابی کے باوجود وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹا... سفاک و بے رحم لوگوں کی صحبت نے اس کے اندر کے آدمی کو نہیں مارا... اسے ایک منفرد دوست کی ہمراہی مل گئی...

کتاب اور مصنف کی یکجائی سے ایک نیا رخ اختیار کرتی دلچسپ مسکراتی تحریر

سیلی پیشہ ور قاتل تھا اور جرائم کی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اپنا کام اس صفائی سے انجام دیتا کہ پولیس سرتوڑ کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔ اس کے کام کرنے کا انداز بھی دوسرے پیشہ ور قاتلوں سے مختلف تھا۔ وہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے لیے کام نہیں کرتا تھا اور نہ ہی براہ راست گاہکوں سے ڈیلنگ کرتا بلکہ اس کے رابطے مختلف جرائم پیشہ گروہوں سے تھے اور بالعموم انہی کے لیے کام کیا کرتا تھا۔

البتہ جب سے وہ فرانکو کی سرپرستی میں آیا تھا، اس نے چھوٹے موٹے گروہوں سے دوری اختیار کر لی تھی۔ فرانکو ایک بڑی تنظیم کا سرغنہ تھا اور اس کے وسائل لامحدود تھے۔ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا پورا خیال رکھتا۔ اگر وہ کسی مشکل میں پھنس جاتے تو انہیں اس سے نکالنے میں بھرپور مدد کرتا۔ گوکہ وہ پیسے دینے کے معاملے میں بخیل واقع ہوا تھا لیکن ایک بار جو معاوضہ طے کر لیتا، اس کی ادائیگی میں کبھی ٹال مٹول سے کام نہیں لیتا تھا۔ اسی لیے سیلی اس کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو بہت محفوظ اور مطمئن سمجھتا تھا۔

اس روز جب فرانکو نے اسے اطالوی ریستوران میں لنچ پر بلایا تو وہ سمجھ گیا کہ باس کو اس سے کوئی کام پڑ گیا ہے۔ البتہ اسے فرانکو سے اس فیاضی کی توقع نہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرانکو جیسا کنجوس شخص اسے ایک مہنگے ریستوران میں کھانے پر بلائے گا۔ اس کا مطلب تھا کہ فرانکو اس سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس بار وہ کوئی رعایت نہیں کرے گا اور کام کی نوعیت دیکھتے ہوئے منہ مانگا معاوضہ طلب کرے گا۔

وہ وقتِ مقررہ پر ریستوران میں پہنچ گیا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی اسے فرانکو ریستوران میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ وہ تنہا ہی آیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ خاصا گمبھیر ہے جس میں وہ کسی تیسرے فرد کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے سیلی کے سامنے والی کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم نے کسی اور سے اس ملاقات کا تذکرہ نہیں کیا ہوگا؟“

”میں اپنے معاملات میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا۔“ سیلی منہ بناتے ہوئے بولا۔

فرانکو نے مینو پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ”اپنے لیے جو چاہو منگوا لو۔ البتہ میں بھنے ہوئے پارچے لینا پسند کروں گا۔“

”بھنے ہوئے پارچے اور اٹالین ریستوران میں!“ سیلی حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم سنجیدہ ہو؟“

”بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”تم سے جو کہا جا رہا ہے، وہی کرو۔“

سیلی کو اس کا اندازِ تخاطب بہت بُرا لگا۔ وہ اس کا ملازم یا ماتحت نہیں بلکہ کنٹریکٹ پر اس کے لیے کام کرتا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے غصے کو پی گیا۔ ان دنوں اسے پیسوں کی شدید ضرورت تھی اور وہ توقع کر رہا تھا کہ فرانکو نے اسے جس کام کے لیے بلایا ہے، اس کے عوض معقول معاوضہ ملے گا۔

سیلی نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ویٹرس بھنے ہوئے پارچوں کے لیے معذرت کرے گی لیکن ویٹرس نے مسکراتے ہوئے آرڈر نوٹ کیا اور لہراتی ہوئی چلی گئی۔ فرانکو نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ لگتا تھا جیسے کئی دنوں سے بھوکا ہے۔ پھر اس نے وائن کے دو گلاس چڑھائے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”یہ بہت اہم اور غیر معمولی نوعیت کا کام ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

سیلی کا جی چاہا، کہہ دے کہ یہ کون سی نئی بات ہے۔ تمہارے سارے ہی کام غیر معمولی بلکہ انتہائی خطرناک ہوتے ہیں لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی کیونکہ اسے ہمیشہ ان کاموں کا معقول معاوضہ ملتا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے لیے گلاس میں وائن انڈیلتے ہوئے بولا۔ ”کام کی نوعیت بتاؤ۔“

”تم نے اسٹیو ایڈیسن کا نام سنا ہوگا۔ وہ جاسوسی ناول لکھتا ہے اور اس کی کتابیں بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرضی قصے کہانیاں بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی کتابیں حقیقی واقعات پر مبنی ہوتی ہیں اور وہ ہم جیسے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

پارچے بہت لذیذ تھے اور سیلی پچھتا رہا تھا کہ اس نے اپنے لیے بھی اسی ڈش کا آرڈر کیوں نہیں دیا۔ وہ فرانکو کی پلیٹ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ رہا ہوں لیکن اس سے تمہیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی نئی کتاب میرے بارے میں ہے۔“

”تمہارے بارے میں؟“ سیلی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، کہنے کو تو وہ فکشن لکھتا ہے لیکن اس کا تمام مواد حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ شخص کسی زمانے میں کرائم رپورٹر رہ چکا ہے اور بڑی چھان بین کے بعد ہم جیسے لوگوں کے بارے میں مواد اکٹھا کرتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے ہمارے گروہ کے بارے میں بھی کافی کچھ معلومات اکٹھی کر لی ہوں گی جنہیں وہ ناول کی شکل میں لے کر آ رہا ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو کہ وہ یہ کتاب نہ لکھے؟“

اس احمقانہ سوال پر فرانکو نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ”اس نے حال ہی میں تمہارے آبائی شہر کے ایک ہوٹل میں کمرا کرائے پر لیا ہے۔ وہ تھوڑا سا پاگل ہے۔ ہمیشہ اپنی کتاب کی ایک کاپی ٹائپ کرتا ہے۔ اسے کمپیوٹر پر کام کرنے

کی عادت ہے اور وہ گھر پر کام نہیں کرتا بلکہ کتاب لکھنے کے لیے ہمیشہ کسی ہوٹل کا انتخاب کرتا ہے۔“

”واقعی، یہ تو پاگل پن ہے۔“ سیلی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں وہ گھر پر بیٹھ کر زیادہ سکون سے کام کر سکتا ہے۔“

”یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”واقعی، میں کیوں پریشان ہو رہا ہوں۔“ سیلی اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تم بتاؤ، مجھے کیا کرنا ہے؟“

”کوئی بات بغیر کہے بھی سمجھ جایا کرو۔“ فرانکو کے حلق سے ایک اور غراہٹ ابھری۔ ”اس کا قصہ پاک کر دو اور اس کتاب کو آگ لگا دو۔ اس کے پاس وہی ایک کاپی ہوگی۔ پھر مجھے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”واقعی، یہ غیر معمولی کام ہے۔ اب تک میں لوگوں کو ٹھکانے لگاتا رہا ہوں۔ اب تم نے اس کے ساتھ کتاب کی بیخ بھی لگا دی ہے۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بندے کے ساتھ ساتھ کتاب کو بھی ٹھکانے لگا دینا۔“

سیلی نے سوچا کہ کسی زندہ انسان کو مارنے کے مقابلے میں کتاب کو ضائع کرنا زیادہ آسان ہے لیکن اس کی وجہ سے معاوضے میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے بولا۔

”مجھے کب روانہ ہونا ہے؟“

”میرے حساب سے تو تمہیں گزشتہ روز ہی چلے جانا چاہیے تھا۔ جتنی جلدی یہ کام ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اگر ایڈیسن نے کتاب مکمل کر کے پبلشر کے حوالے کر دی تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔“

سیلی کے پاس اب مزید کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا اوورکوٹ اٹھا کر پہننے لگا۔

”تم کچھ بھول رہے ہو۔“ فرانکو ایک مرتبہ پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”کیا؟“

”تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ چلو میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ اس کا قیام ریجنٹ ہوٹل کے کمرا نمبر 81 میں ہے۔“

☆☆☆

سیلی نے فلی جانے کے لیے ٹرین کا انتخاب کیا۔ گوکہ ہوائی جہاز کے مقابلے میں اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں دیر لگتی لیکن وہ ائرپورٹ پر ہونے والی سیکیورٹی چیکنگ سے گھبراتا تھا۔ اسٹیشن سے اس نے ٹیکسی لی اور سیدھا ریجنٹ ہوٹل پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہی وہ گھر جائے گا اور اگر فوری طور پر کام نہ ہو سکا تو کم از کم اسے حالات کا جائزہ لینے کا موقع تو مل ہی جائے گا۔

ہوٹل کی لابی میں بہت کم لوگ تھے۔ وہ وہاں رکے بغیر سیدھا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اتفاق سے لفٹ میں سوار ہونے والا وہ واحد شخص تھا۔ اس نے لفٹ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اسے چہرے پر تھکن کے آثار دکھائی دیے۔ اس کے ساتھ ہی پیٹ میں مروڑ اٹھنا شروع ہو گئے۔ وہ جب بھی کسی مہم پر جاتا تو اس کی یہی کیفیت ہو جاتی لیکن اس بار وجہ کچھ اور تھی۔ اٹالین ریستوران کے بھنے ہوئے پارچے اپنا اثر دکھا رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ شیف نے پارچے پوری طرح گلائے نہیں تھے۔ اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنی صحت پر توجہ دینا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ وہ گوشت کے بجائے سبزیاں استعمال کرے اور ہلکی ورزش یا چہل قدمی کو اپنا معمول بنائے۔

آٹھویں منزل کی راہداری سنسان تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کمرا نمبر اکیاسی کے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

”سپروائزر... کمرے کا ہیٹنگ سسٹم چیک کرنا ہے۔“

”کیا تم کچھ دیر بعد نہیں آ سکتے؟“

”نہیں جناب! ہمیں یہ کام ابھی کرنا ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

قدموں کی چاپ سنائی دی پھر ایک دبلے پتلے درمیانی عمر کے آدمی نے دروازہ کھولا۔ اس نے ٹی شرٹ اور صرف پینٹ پہن رکھی تھی اور ایک کان میں بال پوائنٹ لگا ہوا تھا جیسے وہ کچھ لکھتے لکھتے اپنا کام چھوڑ کر آیا ہو۔ سیلی نے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکالا اور اسے دھکیلتے ہوئے کمرے کے اندر آ گیا۔ اس شخص کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن سیلی نے اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گوکہ ریوالور میں سائلنسر لگا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ہلکی سی آواز بھی کمرے کے سناٹے میں صاف سنائی دی۔

ایڈیسن تیورا کر گرا اور کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو

گیا۔ سیلی نے اسے جھک کر دیکھا اور اس کی طرف سے اطمینان ہوجانے کے بعد اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں۔ اب اسے کتاب کی تلاش تھی۔ میز پر ایک چھوٹا ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا جس میں ایک کاغذ لگا ہوا تھا اور اس کے برابر ہی میں سادہ کاغذوں کا ایک کھلا ہوا پیکٹ پڑا ہوا تھا۔ لیکن وہاں لکھے ہوئے یا ٹائپ شدہ کاغذ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ سیلی کے دل میں اندیشے جنم لینے لگے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی اور ایڈیسن نے وہ کتاب اس کے آنے سے پہلے ہی پبلشر کے حوالے کردی ہو۔ وہ بے چین ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اسے اچھی طرح کمرے کی تلاشی لینی چاہیے۔

بالآخر اسے دو انچ موٹا کاغذوں کا بنڈل ایک سوٹ کیس میں رکھا ہوا مل گیا۔ یہ اسی کتاب کے صفحات تھے جس کی وجہ سے ایڈیسن اپنی جان سے گیا تھا۔ اب سیلی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان کاغذات سمیت ہوٹل سے باہر کس طرح جائے؟ اگر وہ اپنی بغل میں اس بنڈل کو دبا کر لابی سے گزرتا ہے تو خوامخواہ ہی لوگوں کی نظروں میں آجائے گا اور کسی کو اس پر شک بھی ہوسکتا ہے۔ پھر وہ کیا کرے؟ ان کاغذات کو سوٹ کیس میں ہی رہنے دے اور سوٹ کیس سمیت چل دے... لیکن اس طرح کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا عملہ اور سیکیورٹی اسٹاف یہ سمجھے گا کہ کوئی گیسٹ ہوٹل کا بل ادا کیے بغیر جارہا ہے کیونکہ چیک آؤٹ کرنے والے لوگوں کا سامان پورٹر لے کر جاتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ ڈھیلی کی اور وہ بنڈل وہاں باندھ لیا۔ اسے یقین تھا کہ جیکٹ اور اوور کوٹ کے نیچے چھپ جانے کے بعد اس کا ابھار کسی کو نظر نہیں آئے گا۔

جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ایک بار پھر ایڈیسن کی لاش کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور خون بہہ کر کمرے کے قالین میں جذب ہوگیا تھا۔ بال پوائنٹ ابھی تک اس کے کان میں لگا ہوا تھا۔ سیلی نے سوچا کہ وہ یہ بال پوائنٹ نکال لے۔ اب ایڈیسن کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن پھر اسے استاد کی نصیحت یاد آگئی کہ جائے واردات پر کسی شے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری پہلے کی طرح سنسان پڑی ہوئی تھی۔ وہ لفٹ میں سوار ہوکر نیچے آگیا۔ لابی میں چند بے فکرے بیٹھے خوش گپیاں کررہے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا ہوٹل کے مرکزی دروازے سے باہر آگیا۔ سیکیورٹی گارڈ سمیت کسی شخص نے اس پر توجہ نہیں دی۔

گھر پہنچتے ہی اسے فرانکو کا فون موصول ہوا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔ ”مجھے تم سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ تم نے ایڈیسن کے بجائے اس کے بھائی کو گولی مار دی۔“

اس کے دماغ میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ بوکھلاتے ہوئے بولا۔ ”کیا؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیا تم نے اس کے کمرے کا نمبر اکیاسی نہیں بتایا تھا؟“

”ہاں، کمرا وہی تھا لیکن ٹی وی پر خبروں میں بتایا گیا ہے کہ ایڈیسن کا بھائی اس سے ملنے آیا ہوا تھا اور اسی نے دروازہ کھولا ہوگا کیونکہ اس وقت ایڈیسن کافی شاپ میں موجود تھا۔“

”لیکن اس شخص نے تو اپنے کان میں بال پوائنٹ لگایا ہوا تھا جس سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہی ایڈیسن ہے۔“

”بے وقوف... وہ بھی مصنف تھا۔“

”مجھے کیا معلوم کہ وہ اس کا بھائی تھا۔ کیا میں اسے قتل کرنے سے پہلے اس کا ڈرائیونگ لائسنس دیکھتا؟“

”تم کبھی بھی اپنی عقل کا استعمال نہیں کرتے۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”تمہیں چاہیے تھا کہ اس سے ایک دو باتیں کرتے۔ اسے ڈراتے دھمکاتے اور مارنے سے پہلے اسے شناخت کرتے لیکن تم نے بہت زیادہ بے صبری دکھائی۔ شاید تمہیں اس کو مارنے کی جلدی تھی تاکہ فوراً ہی مجھ سے پیسے وصول کرسکو۔“

”تم زیادتی کررہے ہو۔ میں نے تمہارے کہنے کے مطابق اپنا کام کیا ہے۔“ اسے ابھی تک اپنا اوور کوٹ اتارنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ کمرے کا درجۂ حرارت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔

”کچھ بھی ہو، تمہیں ایک پیسا نہیں ملے گا۔“ فرانکو کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔

”لیکن میں کتاب لے آیا ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ زندہ ہے اور ایسی کتاب دس مرتبہ لکھ لے گا۔ لگتا ہے کہ تم نے نشہ آور گولیوں کا استعمال شروع کردیا ہے۔ کل کو کہہ دو گے کہ نکسن اب بھی امریکا کا صدر ہے۔“

”دیکھو، میں نے بندہ ماردیا اور کتاب بھی لے آیا۔ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔ ایمان داری کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے معاوضے کی رقم ادا کردو۔“

”اس کی جگہ میں تمہارے پیٹ میں لات نہ ماردوں تاکہ تمہارا قصہ ہی تمام ہوجائے۔“ وہ فون پر دہاڑتے ہوئے بولا۔

سیلی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولا۔ ”اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”اصلی آدمی کو مار ڈالو اور اس کتاب کو جلا دو۔“

اس کے پاس فرانکو کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے مردہ آواز میں پوچھا۔

”اب وہ کہاں ہے؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں لیکن میں تمہیں اس کا سیل نمبر دے سکتا ہوں۔ تم اسے فون کرکے اپنے آپ کو پبلشنگ ہاؤسنگ کا نمائندہ یا ہالی ووڈ کے کسی فلم میکر کا ایجنٹ ظاہر کرو اور باتوں باتوں میں اس کے ٹھکانے کا پتا لگانے کی کوشش کرو۔“

”شاید وہ کسی دوسرے ہوٹل میں چلا گیا ہو کیونکہ وہ اس کمرے میں رہنا پسند نہ کرے جہاں اس کے بھائی کا قتل ہوا ہے۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں رہ رہا ہے۔ یہ پتا لگانا تمہارا کام ہے۔ البتہ اس بار تمہیں اس کو مارنے میں آسانی رہے گی کیونکہ اس کا کوئی اور بھائی نہیں جسے تم شوٹ کرسکو۔“

وہ اس پر مسلسل طنز کے تیر برساتا رہا، اس کی بے عزتی کرتا رہا۔ سیلی یہ سب کچھ سننے پر مجبور تھا۔ اسے اس وقت تک یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا جب تک اس کے ہاتھ میں رقم نہ آجاتی۔ اگر ایڈیسن کے دس بھائی بھی ہوتے تو وہ ان سب کو مار ڈالتا۔

اس نے ٹھنڈے دل سے صورتِ حال کا جائزہ لیا تو اسے اپنی غلطی ہی محسوس ہوئی۔ ایڈیسن کے بھائی کو مارنے سے فرانکو کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا پھر وہ اسے کس بات کے پیسے دیتا۔ فرانکو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ اگر وہ اجنبی بن کر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ اسے ایڈیسن سے ملنا ہے تو اسی وقت بات صاف ہوجاتی۔ اس کا بھائی جواب میں یہی کہتا کہ ایڈیسن کمرے میں نہیں ہے۔ اس طرح اس کی جان بھی نہ جاتی اور سیلی کو بھی خفت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے ایڈیسن کی کتاب کا مسودہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ اس نے بھی اس مصنف کی بڑی شہرت سن رکھی تھی۔ اسے یاد آیا کہ

جب وہ ایک مرتبہ فرانکو ہی کے کسی کام سے جہاز کے ذریعے میکسیکو جا رہا تھا تو اس نے وقت گزاری کے لیے اس کی ایک کتاب خرید لی تھی، اسے وہ کتاب بہت اچھی لگی۔ مصنف کو اپنی تحریر پر عبور حاصل تھا۔ پلاٹ کی مضبوطی اور کردار نگاری پر اس کی خاص توجہ تھی۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتا تھا کہ پڑھنے والا ایک لمحے کے لیے بھی کتاب سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ سیلی کو مطالعے کا کوئی خاص شوق نہ تھا لیکن جب اس نے کتاب پڑھنا شروع کی تو وہ اسے ختم کیے بغیر نہ رہ سکا۔ سفر کے دوران تو پوری کتاب پڑھنا ممکن نہ تھا لیکن اس نے کتاب کا بقیہ حصہ ہوٹل میں قیام کے دوران میں پڑھا تھا۔

اس نے مسودے کے صفحات پلٹنا شروع کیے اور ابتدائی صفحات نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ وہ آرام سے بستر کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پوری دلچسپی و محویت سے ان صفحات کو پڑھتا رہا۔ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اچانک ہی اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ دیکھا تو دس بج رہے تھے گویا وہ تقریباً تین گھنٹے تک اس کتاب کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ اس دوران اسے باتھ روم جانے کی حاجت ہوئی اور نہ ہی اسے بیئر کے دو گھونٹ لینے کا خیال آیا۔ اس نے اس سے پہلے ایڈیسن کی جو کتاب پڑھی تھی، یہ اس کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ پلاٹ انتہائی مربوط اور اندازِ بیان انتہائی دلکش تھا۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے سیلی کو لگا جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہے اور کہیں کہیں اس نے اپنے آپ کو بھی ان واقعات کا ایک کردار محسوس کیا۔ واقعی وہ کتاب حقیقت سے بہت قریب تر تھی پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے وہ نمبر ڈائل کر دیا جو فرانکو نے اسے دیا تھا۔

دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔''

''کیا میں مسٹر ایڈیسن سے بات کر سکتا ہوں؟''

''بول رہا ہوں... تم کون ہو؟''

اس سوال پر سیلی سٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اب اسے احساس ہوا کہ ایڈیسن کا نمبر ملانے سے پہلے اسے تھوڑی سی ریہرسل کر لینی چاہیے تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنا تعارف کس طرح کروائے۔ جب کچھ نہ سوجھا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔

''میرے پاس تمہاری نئی کتاب کا مسودہ ہے۔''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایڈیسن بولا۔

''اوہ... تو تم وہی ہو جس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے؟''

''نہیں، وہ کوئی اور تھا۔ میں تو بس اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ دراصل میں ایک چور ہوں اور تمہارے کمرے میں مجھے کوئی قیمتی چیز نظر نہیں آئی تو میں تمہاری نئی کتاب کا مسودہ اٹھا لایا۔ میں جانتا ہوں کہ کسی مصنف کے لیے اس کی تحریر کتنی قیمتی ہوتی ہے۔''

''وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ قاتل جو کوئی بھی ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا کیونکہ اس نے مجھے ایک عذاب سے نجات دلا دی۔ میں ٹاڈ سے تنگ آ چکا تھا۔ اس بار بھی وہ مجھ سے مزید رقم ادھار مانگنے آیا تھا جبکہ اس نے آج تک میرا ایک پیسا بھی واپس نہیں کیا۔''

''ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ کتاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مجھے وہ کتاب واپس چاہیے۔''

سیلی کے دل میں پھلجھڑیاں پھوٹنے لگیں۔ گویا فرانکو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایڈیسن کے پاس اس مسودے کی ایک ہی نقل تھی اور اب وہ ہر قیمت پر اس کی واپسی چاہے گا۔ سیلی نے سوچا کہ رقم بٹورنے کا یہ ایک اچھا موقع ہے، کیوں نہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ ایک بار یہ مسودہ ایڈیسن کو واپس کر کے اس سے منہ مانگی رقم وصول کی جا سکتی ہے۔ اسے قتل کرنے کے بعد وہ اس مسودے کو نذرِ آتش کر دے گا۔ یہی سوچ کر اس نے ایڈیسن کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دیا۔

''اگر تمہیں یہ مسودہ واپس چاہیے تو اس کی کچھ فیس ہو گی۔''

ایڈیسن نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سن لیا ہو۔ وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میری تخلیق ہے اور میں اسے دوبارہ بھی لکھ سکتا ہوں۔''

سیلی کا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایڈیسن محض اس مسودے کی اہمیت کم کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔

''شاید تم ایسا نہ کر سکو کیونکہ تمہارے پاس بہت کم وقت ہے اور پبلشر زیادہ دیر انتظار نہیں کرے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم اس کا ایڈوانس واپس کرنے کے بجائے مجھ سے اصل مسودہ حاصل کر لو۔''

دوسری جانب سے چند لمحے خاموشی رہی پھر ایڈیسن بھاری آواز میں بولا۔ ''اپنا مطالبہ بتاؤ۔''

''پچاس۔''

''تمہارا مطلب ہے پچاس ہزار ڈالرز؟'' ایڈیسن حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہارے لیے یہ رقم کیا حقیقت رکھتی ہے مسٹر ایڈیسن... جبکہ تم پہلے ہی پبلشر سے دو لاکھ ڈالرز بطور ایڈوانس وصول کر چکے ہو اور کتاب کی اشاعت کے بعد تمہیں لاکھوں ڈالرز رائلٹی کی صورت میں ملیں گے۔''

''اوہ، اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ان احمقوں میں شامل ہو جو باقاعدگی سے نیویارک ٹائمز پڑھتے ہیں۔''

''ہاں، یہی سمجھ لو۔''

''میرے پبلشر سے متعلق غلط بیان منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے درمیان اتنی بڑی رقم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔''

''میں کیسے یقین کر لوں؟ اتنا بڑا اخبار ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔''

''وہاں بھی انسان کام کرتے ہیں اور انسانوں سے ہی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔''

''خیر، مجھے اس سے غرض نہیں کہ رقم بڑی تھی یا چھوٹی۔ میں اپنے مطالبے پر قائم ہوں۔''

''اسے بھول جاؤ۔ میں اتنا احمق نہیں کہ ایک قاتل اور بلیک میلر سے کوئی ڈیل کروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ اس مسودے کو دوبارہ لکھ لوں۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سیلی ''ہیلو ہیلو'' ہی کرتا رہ گیا لیکن دوسری جانب سے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ وہ کچھ دیر تک یونہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پسینے سے تر ہو رہے تھے اور نظریں فرش پر بچھے ہوئے قالین پر گڑی ہوئی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے قالین اس کے قدموں کے نیچے سے کھسکتا جا رہا ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ ان حالات میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے ایڈیسن کا نمبر دوبارہ ڈائل کر دیا۔

ایڈیسن نے فون اٹھانے میں دیر نہیں لگائی اور کسی تمہید کے بغیر بولا۔ ''امید ہے کہ تمہاری عقل ٹھکانے آ گئی ہو گی۔ اگر میں چاہوں تو پولیس کو بھی اطلاع دے سکتا ہوں۔ اس نمبر کے ذریعے تم تک پہنچنا کچھ مشکل نہ ہو گا۔''

''کوشش کر کے دیکھ لو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ نمبر ایک ایسے شخص کا ہے جسے اس دنیا سے رخصت ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ کیا تم نے مجھے اتنا ہی احمق سمجھ رکھا ہے کہ تمہیں اپنے نمبر سے فون کروں گا؟''

''مجھے تو تم احمق ہی لگتے ہو۔ ورنہ باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مسودہ واپس کر دیتے۔ شاید اس طرح تمہیں تھوڑا بہت فائدہ ہو جاتا۔ خیر، یہ بتاؤ کہ دوبارہ فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

تھوڑے بہت فائدے کا سن کر سیلی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے فون سیٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری کتاب پڑھ رہا تھا.... یہ اچھی بلکہ بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ حالانکہ میں عام طور پر کتابیں نہیں پڑھتا۔''

''اس ملک میں ایسے بدنصیب لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اچھی کتابوں سے محروم رہتے ہیں۔ بہرحال، مجھے ایک ایسے شخص کی زبان سے یہ تعریف سن کر خوشی ہوئی جو میرے بھائی کے قاتل کا دوست ہے۔''

''میں نے یہ کتاب وہاں تک پڑھ لی ہے جب جیف واپس وکیل کے دفتر جاتا ہے۔''

''پڑھتے رہو، آگے چل کر تمہیں اور مزہ آئے گا۔'' ایڈیسن نے خوش مزاجی سے کہا اور پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں مطلب کی بات کر لینی چاہیے۔''

''تم اب بھی اپنی ضد پر قائم ہو کہ مجھے پچاس ہزار ڈالرز نہیں دو گے؟''

''ہاں۔''

سیلی نے غصے میں آ کر فون بند کر دیا۔ اس پاگل شخص سے مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اسے قتل کر کے فرانکو سے اپنا معاوضہ وصول کر لے۔ اگر یہ شخص کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتا تو وہ اس معاوضے کی رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ ابھی وہ اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی اور اسے یہ سمجھنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی کہ اسے فون کرنے والا شخص کون ہو سکتا ہے۔

''تم نے اس کا پتا معلوم کر لیا؟'' فرانکو غراتے ہوئے بولا۔

''میں نے کوشش کی تھی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم نے اس کے لیے کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا ہو گا۔''

''نہیں کیونکہ میں نے جب بھی اسے فون کیا، ہمیشہ یہی آواز سنائی دی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔''

فرانکو نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے جیسے ہی تمہیں اس کا پتا معلوم ہو جائے، مجھے بتا دینا۔''

اسے امید نہیں تھی کہ فرانکو اتنی آسانی سے اس کی جان بخش دے گا۔ سلسلہ منقطع ہونے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے فریج میں سے برگر اور بیئر کی بوتل نکالی اور لیونگ روم میں آکر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ بیئر کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ سامنے ہی میز پر وہ مسودہ رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی زندگی عذاب میں آگئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس مسودے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذرِ آتش کر دے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ فرانکو نے مسودہ جلانے کے ساتھ ساتھ ایڈیسن کو قتل کرنے کی شرط بھی لگا رکھی تھی۔ ویسے بھی اس نے ابھی وہ ناول پورا نہیں پڑھا تھا۔ چنانچہ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کتاب اٹھائی اور نشان زدہ صفحہ کھول کر اسے وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ دو گھنٹے تک محویت کے عالم میں اس مسودے کو پڑھتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ اس کا منہ خشک ہو گیا تھا اور کمرے میں سگار کا دھواں بھر جانے سے اسے تازہ ہوا میں سانس لینے کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ اس کہانی کا انجام جانے بغیر اٹھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کہانی اپنے کلائمیکس کی جانب بڑھتی، آخری صفحہ بھی ختم ہو گیا۔ سلی کو یاد آیا کہ ایڈیسن کے کمرے میں ٹائپ رائٹر پر کاغذ لگا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ ابھی کہانی کا کچھ حصہ باقی تھا۔ اس لمحے اسے ایڈیسن پر بہت غصہ آیا۔ آخر اسے نامکمل کہانی چھوڑ کر کافی شاپ جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کتاب میں اس کی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ کہانی کا انجام جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

اس نے پہلے سیل فون کی طرف دیکھا پھر گھڑی پر نظر دوڑائی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کیا ایڈیسن ابھی تک جاگ رہا ہو گا؟ ویسے یہ لوگ رات دیر تک جاگ کر کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور اگر وہ سو گیا ہو تو کیا اسے جگا دینا چاہیے؟ ایسا ہی کرنا ہو گا ورنہ اس کہانی کا انجام جانے بغیر وہ خود بھی ساری رات نہیں سو سکے گا۔

اس نے تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد ایڈیسن کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے ایڈیسن نے ''ہیلو'' کہا۔ اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی جاگ رہا تھا۔

''میڈوکس کے ساتھ کیا ہوا اور قاتل کون ہے؟''

جواب میں ایڈیسن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ایک اچھے ریڈر کی پہچان یہی ہے کہ وہ کتاب پڑھ کر خود ہی انجام کے بارے میں اندازہ لگائے۔''

''مذاق مت کرو ایڈیسن۔ میں اس کہانی کا انجام جاننا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں کچھ فیس دینا ہو گی۔ تم جانتے ہو کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کا انجام ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں نے تمہارے بھائی کو ٹھکانے لگا دیا جس نے تمہارا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ کیا تم میرا یہ احسان بھی نہیں مانو گے؟''

''سوری۔'' وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم یہ کام نہ کرتے تو ایک دن میں خود ہی اسے دوسری دنیا میں پہنچا دیتا۔''

سلی خاموش ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کو کس طرح آگے بڑھائے۔ وہ کم بخت مصنف ضرورت سے زیادہ ہی چالاک اور ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں پھر مروڑ اٹھنے لگے۔ بھوک کی وجہ سے اس کی آنتوں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔

''کیا تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میرا مطالبہ کیا ہو گا؟'' ایڈیسن ہنستے ہوئے بولا۔ ''چلو، میں خود ہی بتا دیتا ہوں... پچاس ہزار ڈالرز۔ آج کل کے لحاظ سے تو یہ بھی کم ہے لیکن میں گاہک کی حیثیت دیکھ کر بات کرتا ہوں۔ عام طور پر لکھنے والوں کو کاروباری امور کی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی اس لیے وہ دھوکا کھا جاتے ہیں لیکن میں ہارورڈ بزنس اسکول کا گریجویٹ ہوں۔ اس لیے اپنے مالی معاملات خود ہی طے کرتا ہوں یا تم میرے ایجنٹ سے بات کرنا چاہو گے؟''

سلی کے لیے بھوک ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی اور اس کے لیے سلسلۂ کلام جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ ''ہم بعد میں بات کریں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

رات کے کسی پہر وہ اچانک ہی اٹھ بیٹھا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہو گیا ہو۔ وہ اس وقت بھی کتاب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایڈیسن کی کتاب منظم جرائم پیشہ گروہوں کے بارے میں تھی لیکن اس میں فرانکو جیسا کوئی کردار نہ تھا بلکہ اس کتاب کے سبھی کردار فرانکو کے ساتھیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اسے پوری کتاب میں کوئی ایسا واقعہ پڑھنے کو نہیں ملا جس کا ذرا سا بھی تعلق فرانکو کی مجرمانہ زندگی سے ہو۔ یقیناً کسی نے فرانکو کو اس کتاب اور مصنف کے بارے میں غلط معلومات فراہم کی تھیں۔

صبح وہ جلدی اٹھ گیا۔ اس نے اپنے لیے انڈے ابالے۔ سلائس پر مکھن اور جیلی لگائی۔ یہی اس کا ناشتا تھا۔

پھر ایک کپ کافی پینے اور سگار سلگانے کے بعد اس نے فرانکو کا نمبر ڈائل کیا۔

''میں نے گزشتہ رات وہ پوری کتاب پڑھ ڈالی۔'' اس نے اتنے پُرجوش انداز میں کہا جیسے وہ فرانکو کو ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی سر کرنے کے بارے میں بتا رہا ہو۔

''میں نے تمہیں کتاب پڑھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔'' فرانکو غراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے جلانے کے لیے کہا تھا۔''

''اس کتاب میں تمہارے یا تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔''

''تم ہوش میں تو ہو۔ لگتا ہے آج کچھ زیادہ ہی نشہ آور گولیاں کھائی ہیں۔''

''یقین کرو فرانکو... اس کتاب کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی کردار کی تم سے کوئی مشابہت نہیں۔ اس کا مرکزی کردار تمہارے مقابلے میں پچاس پونڈ زیادہ وزنی اور خاصا بدصورت ہے اور بقیہ کردار بھی تمہارے گروہ کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں کتابوں کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں ہے اور تم نے شاید ہی کبھی کوئی کتاب پڑھی ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرا مطالعہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ میں صرف اسی وقت دورانِ سفر کتاب پڑھتا تھا جب تم مجھے کسی کام کے سلسلے میں بیرونِ شہر بھیجتے تھے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مجھے بھی یہ کتاب پڑھنی چاہیے؟''

''کیا واقعی تم یہ کتاب پڑھنا چاہو گے؟'' سلی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بالکل، مجھے تمہارے کہنے پر یقین نہیں آ رہا اس لیے میں خود اس کتاب کو پڑھنا چاہوں گا۔''

سلی نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔ ''میں تمہیں یہ کتاب پہنچا دوں گا۔ تم اسے پڑھ کر فیصلہ کرو کہ کیا واقعی ایڈیسن تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اگر میری بات غلط ہو تو جو چاہے سزا دے سکتے ہو۔ فرانکو! تم میری بات سن رہے ہو نا؟''

''ہاں، تمہاری باتوں میں سچائی محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔ بہرحال تم وہ کتاب فوراً مجھے پہنچا دو۔''

سلی نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

☆☆☆

تین دن بعد اسے فرانکو کا فون موصول ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے لیکن تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔“

سیلی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنی مسرت چھپاتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ ”تم بھی میری سابقہ بیوی کی طرح ہو۔ اس نے کبھی میری بات کا بھروسا نہیں کیا۔ اب تو تمہیں میرا معاوضہ دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”تمہیں پیسے مل جائیں گے لالچی بلے۔“ یہ کہہ کر فرانکو نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پانچ منٹ بعد سیلی نے ایڈیسن کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی گھنٹی پر اس نے فون اٹھالیا اور بولا۔

”میرا خیال ہے کہ تم ڈیل کے لیے تیار ہو گئے ہو؟“

”ہاں، یہ ممکن ہے۔ میں تمہیں کتاب بھیج دوں گا اور جب مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتاب تمہیں مل چکی ہے تو میں تمہیں دوبارہ فون کروں گا تاکہ تم مجھے اس کے انجام کے بارے میں بتا سکو۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ قاتل کا ساتھی اور چور مجھ پر اس حد تک بھروسا کر سکتا ہے۔“

”میرے باس نے بھی بیس سال میں پہلی بار میری بات پر بھروسا کیا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ مجھے بھی تم پر بھروسا کرنا چاہیے۔“

”بالآخر مجھے ایک ایمان دار مجرم مل ہی گیا ہے۔“ ایڈیسن قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے، ہمارے درمیان یہ طے پا گیا کہ تم مسودہ واپس کر دو اور میں تمہیں اس کا انجام بتا دوں گا جسے جاننے کے لیے تم اتنے بے تاب ہو رہے ہو۔“

اس کے بعد دونوں فریقوں نے اس معاہدے پر پوری طرح عمل کیا۔ سیلی نے کتاب بھیجنے کے چند دن بعد ایڈیسن کو فون کیا اور اس سے وہ تمام معلومات حاصل کرلیں جو وہ جاننا چاہ رہا تھا۔ ایڈیسن بہت خوش تھا کہ اسے دوبارہ مسودہ لکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے فون پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جیسے شخص کے ساتھ معاملہ طے کر کے بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں ایک نہ ایک دن ضرور ملنا چاہیے۔“

”میں اسے ضروری نہیں سمجھتا۔“ سیلی نے کہا۔ ”تمہارا کیا بھروسا اگر تم نے پولیس والوں کو میرا حلیہ بتا دیا تو وہ مجھے تمہارے بھائی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیں گے۔“

ایڈیسن ہنستے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم واقعی مجھ پر بھروسا نہیں کرتے۔“

”ہاں، میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔“ سیلی نے جواب دیا۔

☆☆☆

تقریباً ایک سال بعد سیلی 59 ویں اسٹریٹ سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر کتابوں کی ایک دکان پر گئی۔ وہاں نئی کتابوں کا ایک مینار سا بنا ہوا تھا اور اس پر ایک بڑا سا پلے کارڈ لگا ہوا تھا جس پر تحریر تھا۔ ”اسٹیو ایڈیسن کا نیا سنسنی خیز ناول۔“

سیلی اندر چلا گیا اور کتابوں کے ڈھیر سے ایک کاپی اٹھائی پھر وہ جلدی جلدی اس کے صفحات پلٹنے لگا۔ یہ وہی کہانی تھی جو وہ پڑھ چکا تھا اور اس کا انجام بھی وہی تھا جو ایڈیسن نے اسے فون پر بتایا تھا۔ اس نے وہ خریدنے کا ارادہ کرلیا تاکہ اس کی لائبریری میں ایک اور اضافہ ہو جائے جو صرف ایک بائبل پر مشتمل تھی اور جس کے پڑھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی کتاب خریدنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے اسے بھی کیشیئر کی قطار میں کھڑا ہونا پڑا۔ اس نے وقت گزاری کے لیے کتاب کھولی اور پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایڈیسن نے لکھا تھا:

”میں اس کتاب کو گاڈ فادر فرانکو کیلنڈ ریلا کے نام منسوب کرتا ہوں جس کی زندگی اور کارناموں سے متاثر ہو کر میں نے یہ دہشت ناک کہانی لکھی۔ اس کہانی کے تمام واقعات اور کردار حقیقی ہیں لیکن فرانکو کو کسی رائلٹی کی امید نہیں کرنی چاہیے۔“

سیلی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور کیشیئر سے بولا۔ ”ریسٹ روم کہاں ہے؟“

کیشیئر نے ایک کمرے کی جانب اشارہ کیا تو سیلی لڑکھڑاتے قدموں سے اس جانب بڑھ گیا۔ اب اسے دنیا کے نقشے پر کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں چھپنے کے بعد وہ فرانکو کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکے۔ اس کے لبوں پر ایک ہی دعا تھی کہ کاش فرانکو، یہ کتاب کبھی نہ پڑھ سکے یا کم از کم اسے اتنی مہلت مل جائے کہ وہ فرانکو کی پہنچ سے دور ہو سکے جبکہ دونوں دعاؤں کی قبولیت کا بہت کم امکان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اب اسے فرانکو کے فون کا انتظار تھا۔

انتقام ہو ....یا محبت....جنون کی کوئی حد مقرر نہیں ....جنون کی حدیں پار کرلینے والے کا اختتام ہمشیہ تباہی پر منتج ہوتا ہے....ہر بچہ اپنا بچپن پھولوں کی وادی میں گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے ....مگر کبھی کبھی زندگی میں سب کچھ الٹ ہوتا چلا جاتا ہے ....چند ایسے ہی کرداروں کے بکھرنے اور ٹوٹنے پھوٹنے کا ماجرا جو اعتبارِ زات کے قابل نہ تھے....

انتقام

مریم کے خان

خوف و دہشت سے ہر سو کہرام بپا کر دینے والی پُرانتقام بھتنا

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے ابر والی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں بیٹھی عورت مجھے دیکھ کر طرائی تو اس کا منہ کسی غار کی طرح کھلتا چلا گیا اور اس غار میں سوائے تاریکی کے کچھ نہیں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ تاریکی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ اچانک تیز ہارن کی آواز نے مجھے چونکایا اور ایک بڑا ٹرک بالکل میری کار کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ اگر میں چونک کر اسٹیئرنگ نہ گھماتا تو ٹرک کار کو کم سے کم سائڈ سے رگڑ دیتا اور اس دیوہیکل ٹرک کی رگڑ

بھی کافی ہوتی میری کار کا کچومر نکالنے کے لیے...

میں نے سر کو جھٹکا شاید مجھے نیند کا جھونکا آ گیا تھا۔ میرا نام جم کارلوس ہے اور میں گزشتہ نو گھنٹے سے مسلسل ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں میامی سے روانہ ہوا تھا اور میری منزل جھیل مشی گن کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ نارتھ ٹاؤن تھا۔

مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا شاید اسی وجہ سے میں نے خواب کی سی حالت میں اس عورت کو دیکھا۔ اگر میں بروقت نہ سنبھلتا تو کار کو حادثہ پیش آ چکا ہوتا۔ میرے اعصاب کو زبردست جھٹکا لگا تھا اس لیے میں نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے اعصاب جلد قابو میں آ گئے۔ میں نے دوبارہ کار اسٹارٹ کی اور آگے روانہ ہو گیا۔ میں اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ یقیناً میرا وہم تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس قسم کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ میرے اعصاب اتنے ہی مضبوط تھے جتنے میامی پولیس میں ہوی سائڈ کے ایک افسر کے ہونے چاہیے تھے اور چند دن پہلے مجھے ترقی ملی تھی اور مجھے سینئر جاسوس کا درجہ مل گیا تھا۔ گزشتہ رات مجھے اپنے فیملی ڈاکٹر وانبرگ کا فون آیا اور اس کے بعد میں صبح ہوتے ہی اپنی کار میں روانہ ہو گیا کیونکہ انڈیانا کی طرف جانے والی تمام فلائٹس دو دن تک مکمل بک تھیں۔ میں چانس کے انتظار میں نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کار سے جانے کا فیصلہ کیا اور صبح سورج نکلتے ہی روانہ ہو گیا۔ ہائی وے پر میں نے چار ریاستوں کو کراس کیا اور اب انڈیانا میں تھا۔

انڈیانا، کارلوس خاندان کی آبائی ریاست ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اسپین سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ لیکن میں نے مستقل رہائش کے لیے فلوریڈا کو پسند کیا تھا۔ گھر اور باپ سے دور جانے کا فیصلہ میں نے اپنی ممی کی وفات کے بعد کیا تھا۔ وہ نفسیاتی مریضہ تھیں۔ کبھی کبھی ان کی حالت اتنی خراب ہو جاتی تھی کہ انہیں اسپتال میں داخل کرانا پڑتا۔ وہ خوف کا شکار تھیں۔ راتوں میں انہیں بہت مشکل سے نیند آتی تھی اور اکیلے ہوتے ہی وہ چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ اکیلے ہونے کا خوف اتنا زیادہ تھا کہ وہ باتھ روم بھی اکیلی نہیں جا سکتی تھیں وہاں بھی ان کے ساتھ کسی نہ کسی کا ہونا ضروری تھا۔ ڈیڈی نے ان کے لیے ایک کل وقتی نرس کا انتظام کر دیا تھا جو ان کے ساتھ رہتی، ان کا خیال رکھتی اور انہیں کمپنی بھی دیتی تھی۔

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد بہت کم اپنی ممی کو نارمل حالت میں دیکھا۔ اکثر انہیں دورے پڑتے اور وہ چیخنے چلانے اور رونے لگتیں۔ اس وقت گھر کا ماحول بہت عجیب سا تھا.. شاید اس ماحول سے دور رکھنے کے لیے ڈیڈی نے مجھے بچپن میں ہی بورڈنگ اسکول بھیج دیا تھا۔ میں ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا جب ممی نے خودکشی کر لی۔ وہ گھر کی سب سے اوپری منزل سے نیچے کود گئی تھیں۔ سر کے بل گرنے کی وجہ سے ان کا سر بُری طرح مجروح ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آخری دیدار میں، میں اور دوسرے لوگ صرف ان کے چہرے کا نچلا حصہ دیکھ پائے تھے۔ اس کے چند مہینے بعد میں میامی آ گیا۔ ڈیڈی نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ انہوں نے خوشی سے مجھے میامی جانے کی اجازت دے دی تھی۔

میامی میں قیام کے دوران میں صرف تین چار بار ہی گھر گیا اور وہاں میرا قیام چند دن سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ بچپن سے میرا قیام اپنے گھر میں بہت کم رہا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ میں اپنے گھر کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ممی نفسیاتی مریضہ کیوں بنیں؟ شاید مجھے جاننے میں دلچسپی بھی نہیں تھی۔ مجھے گھر جانا کم ہی اچھا لگتا تھا مگر اس وقت مجبوری تھی مجھے ہر صورت جانا تھا۔ ڈاکٹر وانبرگ نے فون کر کے مجھے اطلاع دی تھی کہ ڈیڈی کو برین ہیمرج ہو گیا ہے اور اس وقت وہ اسپتال میں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں داخل ہیں۔ ڈاکٹر ان کی زندگی یا موت کے بارے میں کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وانبرگ صرف ڈاکٹر نہیں بلکہ کارلوس فیملی کا دوست بھی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بہتر ہے تم آ جاؤ اور اپنا دل مضبوط کر کے آنا یہاں تمہیں کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“

ٹرک والے واقعے کے دو گھنٹے بعد میں قصبے میں داخل ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی تیزی سے اپنے پَر پھیلا رہی تھی۔ میں پہلے قصبے کے مرکز پہنچا۔ اسپتال اور ڈاکٹر وانبرگ کی رہائش یہیں تھی۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے ڈاکٹر وانبرگ کو کال کر دی تھی۔ اس نے کہا۔

”تم آتے ہی مجھ سے ملاقات کرنا... چاہے کتنی دیر سے پہنچو۔“

”میں آ جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ ڈاکٹر وانبرگ مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ اس لیے قصبے میں داخل ہوتے ہی میں نے کار کا رخ اس کے مکان کی طرف کر دیا۔ مکان کے ساتھ ہی ڈاکٹر وانبرگ کا کلینک بھی تھا۔ یہاں رہائش پذیر زیادہ تر امرا نے ڈاکٹر وانبرگ کو اپنا فیملی ڈاکٹر بنایا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس دیہی علاقے میں بھی خوب کما رہا تھا اسی کمائی سے اس نے یہ

عالی شان مکان اور کلینک بنایا تھا۔ میں نے اس کے گھر کی کال بیل بجائی تو اس نے دروازہ خود کھولا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ وا کیے تو میں اس کے سینے سے لگ گیا۔

”کیسے ہو بیٹے؟“

”ٹھیک ہوں وان انکل۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے اپنی اسٹڈی میں لے آیا۔ ”تم نے کھانا کھایا ہے؟“

”جی راستے میں کھا لیا تھا......“

”نہیں، میرا خیال ہے تم نے باقاعدہ کھانا نہیں کھایا ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا اور کچھ دیر بعد میں اس کے کچن میں میز پر موجود تھا اور وہ میرے لیے سینڈوچ بنا رہا تھا۔ ساتھ اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا فرائی پان میں تلنے کے لیے رکھ دیا۔ جب تک میں کھاتا رہا، اس نے کافی تیار کر لی اور پھر ہم اسٹڈی میں آ گئے۔ میں نے وانبرگ کی طرف دیکھا۔ ”ڈاکٹر، ڈیڈی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”یہ تو میں بھی نہیں سمجھ سکا ہوں کیونکہ جیک کو کبھی ہائی بلڈ پریشر یا دل کا کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے۔ اس کی بلڈ رپورٹ بھی ہمیشہ نارمل آئی ہے پھر اس طرح سے اتنا شدید برین ہیمرج میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

”وہ کسی وجہ سے پریشان تھے؟“

”تم جانتے ہو وہ پریشان ہونے والا آدمی نہیں ہے لیکن ایک ہفتے پہلے میں اس سے ملنے گیا تھا تو میں نے اسے کچھ خوف زدہ پایا تھا۔ وجہ نہ میں نے پوچھی اور نہ اس نے بتائی لیکن اس خوف کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں تھا، وہ بدستور بالکل ٹھیک تھا۔“

”آپ نے کہا کہ میں یہاں آتے ہی آپ سے ملوں اور اس وقت مجھے لگا جیسے کوئی خاص بات ہے جو آپ مجھے بتانا چاہتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ”خاص بات تو ہے لیکن وہ تمہارے ڈیڈی نہیں بلکہ تمہاری ممی کے بارے میں ہے۔“

میں چونکا۔ ”ممی کے بارے میں؟“

”ہاں جب میں جیک کو دیکھنے اسپتال گیا تو مجھے وہاں وہ نرس مل گئی جو تمہاری ماں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس نے مجھے کچھ عجیب باتیں بتائیں جو اس سے پہلے کبھی میرے علم میں نہیں آئی تھیں حالانکہ تمہاری ماں کی عمومی صحت کی دیکھ بھال میں ہی کرتا تھا۔“

”کیسی باتیں؟“

”اس نرس کا نام آئرس اسٹیو ہے۔ اس نے بتایا کہ تمہاری ماں اصل میں کسی عورت سے خوف زدہ رہتی تھی جو صرف اسے نظر آتی تھی۔“

”یہ تو میں جانتا ہوں کہ ان کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ تھا، وہ خوف زدہ رہتی تھیں۔“

ڈاکٹر وانبرگ نے اپنی واجبی سی شیو کھجائی۔ ”اس وقت میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن نرس نے مجھے بتایا کہ مسز کارلوس نے خودکشی سے ایک رات پہلے اسے بتایا تھا کہ کوئی عورت اسے تنگ کرتی ہے اور وہ اسے مارنا چاہتی ہے۔ وہ اکثر اسے منہ کھول کر ڈراتی ہے۔“

ڈاکٹر کی اس بات نے مجھے چونکا دیا، مجھے بے ساختہ راستے کا خواب یاد آ گیا جس میں، میں نے اس عورت کو دیکھا تھا اور اس کا تاریک غار جیسا منہ خوفناک حد تک کھل گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرے تاثرات میں تبدیلی محسوس کر لی، اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، آپ نرس آئرس کے بارے میں بتا رہے تھے؟“

”ہاں آئرس کا کہنا ہے کہ تمہاری ماں اس وقت بالکل ہوش میں تھی اور اس کی کیفیت پُرسکون تھی۔ اس نے نرس سے کہا کہ وہ اس کھیل سے تنگ آ گئی ہے پھر اس نے بڑی عجیب سی بات کی، اس نے آئرس سے کہا کہ یہ سب اس کے شوہر یعنی تمہارے ڈیڈی کا کیا دھرا ہے جو اسے بھگتنا پڑ رہا ہے اور اسے یقین ہے اس کے شوہر کو بھی بھگتنا پڑے گا۔“

”ڈیڈی کو۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”اس کا مطلب ہے ممی کچھ جانتی تھیں؟“

”بالکل، اس نے نرس آئرس سے یہ باتیں کہیں اور اس سے اگلی رات اس نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔ مجھے یقین ہے نرس اس بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتی ہے لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا۔ میں نے تمہیں اس لیے سب بتایا ہے کہ اگر تم چاہو تو نرس آئرس سے بات کر سکتے ہو۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا آپ کے پاس بتانے کو اور کچھ ہے؟“

”نہیں بس یہی بتانا تھا۔“ ڈاکٹر وانبرگ نے کہا۔

”ان معلومات اور کھانے کا شکریہ۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں جا کر ڈیڈی کو دیکھوں گا۔“

”گھر میں تمہارے ڈیڈی کا بٹلر ہے اگر تم چاہو تو وہاں بھی جا سکتے ہو اور اگر چاہو تو رات میرے گھر رہو۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ نارتھ ٹاؤن کا اسپتال قصبے میں ہے اور ڈاکٹر وانبرگ کے گھر

سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ میں نے کار اسپتال کی پارکنگ میں کھڑی کی اور اندر استقبالیہ پر آیا۔ ڈیڈی کا نام بتانے پر استقبالیہ کی نرس نے مجھے آگاہ کیا۔

"وہ آئی سی یو کے کمرا نمبر بارہ میں ہیں لیکن مہربانی کر کے براہ راست وہاں جانے کے بجائے پہلے ڈاکٹر شیفرڈ سے بات کریں۔ وہ آئی سی یو کے انچارج ہیں۔"

ڈاکٹر شیفرڈ اپنے دفتر میں تھا۔ میں اجازت لے کر اندر آیا اور ڈیڈی کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "اوہ مسٹر جیک کارلوس، میں بھی ان کا مدح ہوں اور ان کے سارے ناول میں نے کئی کئی بار پڑھے ہیں۔"

"میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟"

"نہایت سیریس۔" ڈاکٹر شیفرڈ نے صاف گوئی سے کہا۔ "برین ہیمرج اتنا شدید ہے کہ ریکوری مشکل نظر آ رہی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں ہمیشہ پُرامید رہتا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے تمہارے ڈیڈی موت کی سرحد سے بہت قریب ہیں اور کسی وقت بھی، اسے پار کر سکتے ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے کہا۔ "کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں، وہ ہوش میں ہیں۔ اگرچہ ان سے بات کرنے کی کوشش کرنا ان کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اگر آپ ان سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اجازت ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیوں اجازت دے رہا ہے۔ ڈاکٹر، ڈیڈی کی زندگی سے مکمل طور پر مایوس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں آخری بار ان سے بات کر لوں۔ میں نے سر ہلایا۔

"ان کی اس کنڈیشن کی ممکنہ وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"کوئی شاک... بہت بڑا شاک، کیونکہ ڈاکٹر واٹبرگ نے مسٹر جیک کارلوس کی مکمل کیس ہسٹری فراہم کی ہے۔ ان کی صحت بہت اچھی تھی اور ان کو کبھی بلڈ پریشر، شریانوں کی سختی اور خون کے گاڑھا ہونے کی شکایت نہیں رہی ہے اس لیے برین ہیمرج کی کوئی جسمانی وجہ تو نظر نہیں آتی ہے۔"

میں ڈاکٹر شیفرڈ سے اجازت لے کر ڈیڈی والے کمرے میں آیا۔ انہیں مکمل طور پر مشینوں پر رکھا گیا تھا۔ ایک مشین انہیں سانس دلا رہی تھی اور ایک ان کے دل کی دھڑکنوں کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ سامنے دیوار کو گھور رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے ہلکا سا سر گھمایا اور مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بیک وقت خوف اور پریشانی کے تاثرات ابھرے۔ انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں تیزی سے ان کے پاس آیا۔ ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور الفاظ غیر واضح تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "ڈیڈی کیا ہوا تھا؟"

انہوں نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ان کے الفاظ مفہوم کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ برین ہیمرج نے ان کی زبان کو متاثر کیا تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔ "ڈیڈی آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے... آپ کو جو کہنا ہے، وہ ایک الفاظ میں کہنے کی کوشش کریں۔"

انہوں نے میری بات سمجھ لی اور کچھ دیر رک کر آہستگی سے کچھ کہا۔ بڑی مشکل سے میں کچھ سمجھ سکا۔ "ڈیڈی آپ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں، عورت بڑے منہ والی۔"

انہوں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ پھر کچھ کہہ رہے تھے۔ اس بار انہوں نے کئی بار دہرایا تو میری سمجھ میں آیا۔ "جھیل والا کیبن... آپ جھیل والا کیبن کہہ رہے ہیں۔"

ڈیڈی نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ذرا سی دیر میں وہ نڈھال نظر آنے لگے۔ اور ان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس بار میں جلد سمجھ گیا۔ "دیوار کے پیچھے؟"

انہوں نے آخری بار اثبات میں سر ہلایا اور نڈھال ہو کر سر تکیے پر ڈال لیا۔ انہوں نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اپنی ساری توانائی استعمال کر لی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے، اچانک ان کی آنکھوں میں دہشت کا تاثر نمودار ہوا۔ انہوں نے میرے عقب میں دیکھا۔ پھر کچھ کہنے کی کوشش کی اور مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں "چلے جاؤ... چلے جاؤ۔"

مجھے لگا کہ میرے پیچھے کوئی موجود ہے لیکن میں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا اور جب میں نے ڈیڈی کی طرف دیکھا تو ان کی سانس کو ساکت پایا اور ان کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔ اسی لمحے دل کی دھڑکن بتانے والی مشین کی لکیر سیدھی ہو گئی۔ میں نے تیزی سے ایمرجنسی الارم کا بٹن دبایا لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑی، دل کی دھڑکن رکتے ہی اسپتال کی سینٹرل آئی سی یو کنٹرول روم میں الارم بج گیا۔ ایک منٹ میں ڈاکٹر شیفرڈ اور دوسرا عملہ آ گیا۔ ایک نرس نے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا اور وہ ڈیڈی کی جان بچانے کی کوشش میں لگ گئے۔ میں شیشے سے دیکھ رہا تھا، ڈیڈی کے دل کی دھڑکن بحال کرنے کی ان کی ہر کوشش ناکام جا رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد انہوں نے ہار مان لی اور ڈیڈی کا چہرہ

سفید چادر سے ڈھک دیا۔ ڈاکٹر شیفرڈ باہر آیا اور اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"آئی ایم سوری۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنی بہترین کوشش کی ہے لیکن مقدر میں یہی تھا۔"

"کیا کوئی جذباتی سچویشن تھی جس کا اثر ان کے دل اور دوران خون پر ہوا؟"

"نہیں، وہ مجھے کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے اور اسی دوران میں ان کی سانس اکھڑ گئی۔"

ڈاکٹر شیفرڈ نے ایک بار پھر میرا شانہ تھپکا۔ "اگر تم چاہو تو ڈیڈ باڈی کل ہی مل جائے گی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی مطلع کرنا ہے اور یقیناً تدفین میں کئی دن لگ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تب پوسٹ مارٹم کے بعد مسٹر جیک کارلوس کا جسم سرد خانے میں رکھ دیتے ہیں۔" ڈاکٹر شیفرڈ نے کہا۔ اس نے اسی وقت مجھے عارضی ڈیتھ سرٹیفکیٹ تیار کر کے دے دیا۔ میں اسپتال سے باہر آیا تو موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ جب میں نے پارکنگ سے کار نکالی تو ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جیمس طر یقیناً سونے کے لیے لیٹ گیا تھا کیونکہ خاصی دیر تک کال بیل بجانے کے بعد وہ نمودار ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا اور حسب معمول سپاٹ لہجے میں بولا۔

"مسٹر جم آپ کب آئے؟"

"کچھ دیر پہلے آیا ہوں اور اسپتال سے سیدھا یہیں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور کچھ دیر بعد بولا۔ "ڈیڈی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

اس بار جیمس طر کو جھٹکا لگا لیکن اس نے جلد خود پر قابو پا لیا۔ اس نے رسمی انداز میں تعزیت کی اور کسی خدمت کا پوچھا۔ "نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ویسے ڈیڈی کو ہوا کیا تھا؟"

"میں بے خبر ہوں جناب۔ مسٹر کارلوس نے کافی کی فرمائش کی تھی اور جب میں کافی لے کر اسٹڈی میں پہنچا تو وہ فرش پر گرے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ایمرجنسی میڈیکل امداد کے لیے کال کی۔"

"تم نے کوئی خاص بات محسوس کی جو معمول سے ہٹی ہوئی ہو؟"

اس نے سوچا اور بولا۔ "صرف ایک چیز خلاف معمول تھی جب مسٹر کارلوس نے مجھے کافی لانے کو کہا تو لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند تھی لیکن جب میں کافی لے کر آیا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جب کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ پہلے بند تھی۔ شمال کی طرف سے تیز ٹھنڈی ہوا چلنے کی وجہ سے مسٹر کارلوس نے اس طرف کھلنے والی تمام کھڑکیاں بند کرا دی تھیں۔"

میں جیمس کے ساتھ اسٹڈی میں آیا۔ ڈیڈی کی خاصی بڑی اسٹڈی ہے، اس میں کوئی بیس ہزار کے قریب کتابیں ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے یہ تمام کتابیں نفسیات، فلسفے اور تاریخ کی ہیں۔ ڈیڈی جو لکھتے تھے، اس کا ان کتابوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا ہے۔ جیمس نے وہ جگہ بتائی جہاں ڈیڈی فرش پر گرے تھے۔ یہ کھلی ہوئی کھڑکی سے کچھ ہی دور تھی۔ کھڑکی اب بند تھی۔ جیمس نے بتایا کہ اس نے اسی وقت کھڑکی کو دوبارہ بند کر دیا تھا۔

میں نے جیمس سے کہا۔ "ٹھیک ہے، اب تم جا کر آرام کرو کل کا دن بہت مصروف گزرے گا۔ خاندان میں سب کو مطلع کرنا ہے۔ تم مہمانوں والے کمرے کھول دینا۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔ میں نے ڈیڈی کے کمرے کا رخ کیا۔ مجھے وہاں جھیل والے کیبن کی چابیوں کی تلاش تھی۔ چابیاں مجھے ان کے بیڈ کی سائڈ دراز میں مل گئیں۔ چابیاں لے کر باہر آیا تو مجھے خیال آیا اور میں نے لان کا رخ کیا۔ وہاں خزاں سے جھڑنے والے پتے اڑ رہے تھے۔ میں نے پینسل ٹارچ نکال کر روشن کی اور ڈیڈی کی اسٹڈی کی کھڑکی کے نیچے زمین کا معائنہ کیا۔ وہاں بھی پتے جمع تھے اور جب میں نے پتے ہٹائے تو مجھے کچی زمین پر جوتوں کے نشان نظر آئے۔ یہ نسوانی جوتے تھے۔ ایڑی اور سپاٹ تلے کا نشان نمایاں تھا۔ یہاں عورت کہاں سے آئی؟ میں نے سوچا اور پھر جیب سے ڈاکٹر شیفرڈ کا کارڈ نکالا۔ اس پر اس کا سیل نمبر لکھا تھا، میں نے نمبر ملایا۔

"ڈاکٹر، میں جم کارلوس بات کر رہا ہوں، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں تمہاری ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"آپ کے اسپتال میں ایک نرس آئرس ہے۔"

"بالکل ہے لیکن اس وقت وہ آف ہے۔"

"ڈاکٹر وہ کسی زمانے میں میری ممی کی دیکھ بھال کرتی رہی ہے۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے، کیا اس کا سیل نمبر مل سکتا ہے؟"

"میں کوشش کرتا ہوں براہِ راست میرے پاس تو نہیں ہے لیکن اسپتال کے ریکارڈ سے مل جائے گا، ایسا کرو تم دس منٹ بعد مجھے کال کرو۔"

"میں شکر گزار ہوں گا ڈاکٹر۔" میں نے کہا اور... کار میں آ گیا لیکن انجن اسٹارٹ نہیں کیا، میں انتظار کر رہا تھا۔ دس منٹ پورے ہوتے ہی میں نے ڈاکٹر شیفرڈ کا نمبر ملایا، اس نے کہا۔ "ہاں نمبر مل گیا ہے، تم نوٹ کر لو۔"

میں نے نوٹ پیڈ پر ڈاکٹر کا بتایا ہوا نمبر لکھ لیا۔

"شکریہ ڈاکٹر۔"

"ویلکم۔" اس نے کہا۔ میں نے کال کاٹ کر نرس آئرس کا نمبر ملایا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور امکان یہی تھا کہ وہ سو چکی ہوگی لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ جاگ رہی تھی جیسے ہی میں نے اپنا تعارف کرایا، اس نے کہا۔

"ہلڈا کے بیٹے ہو؟" اس نے ممی کا نام لیا۔

"جی مسز آئرس۔" میں نے تصدیق کی۔ "میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے تم ڈاکٹر وانبرگ سے بات کر چکے ہو۔"

"جی اور ان کا خیال ہے کہ آپ مزید کچھ اور بھی جانتی ہیں جو آپ نے انہیں نہیں بتایا ہے۔"

میری بات پر وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "جم یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ ان کو دہرانے کا فائدہ نہیں ہے۔"

"مسز آئرس میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے باپ نے ایسا کیا کیا تھا جس کی وجہ سے میری ماں نفسیاتی مریض بن گئی اور بالآخر انہوں نے خودکشی کر لی۔ آپ سمجھ سکتی ہیں میں نے کیسے گھر میں پرورش پائی ہے اور میں یقیناً مستحق ہوں کہ اپنے ماضی کے بارے میں جان سکوں۔"

آئرس نے مدافعتی انداز میں کہا۔ "میں تمہارے یا تمہارے ماں باپ کے ماضی کے بارے میں نہیں جانتی ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں صرف وہ جاننا چاہتا ہوں جو آپ جانتی ہیں اور میں نہیں جانتا ہوں۔"

"وہ اتنا اہم نہیں ہے کیونکہ وہ میرے ذاتی مشاہدات ہیں۔"

"مسز آئرس، میری ممی نے خودکشی کر لی اور ڈیڈی کچھ دیر پہلے برین ہیمرج میں دنیا سے گزر گئے ہیں۔"

"اوہ آئی ایم رئیلی سوری۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں بتانے کو تیار ہوں لیکن فون پر نہیں، تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔"

میں خوش ہو گیا۔ "اپنا پتا بتایئے۔"

وہ مرکزی قصبے کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس نے پتا بتا کر کہا۔ "لیکن تمہیں جلد آنا ہوگا، میں بارہ بجے تک سو جاتی ہوں۔"

"میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میں انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں گھر سے نکلا اور قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد میں نرس آئرس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر تھا۔ کال بیل کے جواب میں اس نے دروازہ خود کھولا۔ مجھے اس کی صورت دھندلی سی یاد تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ اچھی خاصی عمر والی ہوگی لیکن خلافِ توقع وہ تقریباً پینتیس برس کی اسمارٹ اور خوش شکل عورت نکلی۔ اس نے خود کو پوری طرح سنبھال کر رکھا تھا اور پچیس چھبیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے آخری بار اسے تیرہ سال پہلے دیکھا تھا جب میں خود سترہ برس کا تھا۔ یعنی وہ اس وقت بائیس سال کی تھی۔ ڈیڈی نے اسے ممی کی خودکشی سے چار سال پہلے رکھا تھا۔

"آ جاؤ مسٹر جم کارلوس۔" اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ باریک نائٹ گاؤن میں تھی جس میں اس کا سراپا نمایاں تھا۔ اس کے پاس سے بہت دل کش اور دھیمی سی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے غالباً میری حیرت بھانپ لی اس لیے مجھے لاؤنج میں لاتے ہوئے بولی۔ "میں نرسنگ اسکول سے نکلتے ہی مسٹر جیک کارلوس کی جاب میں آ گئی تھی۔"

"میں تم کو عمر رسیدہ سمجھ رہا تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "تم شادی شدہ ہو؟"

"ایک بار کی پھر میں نے شوہر سے طلاق لے لی۔" اس نے جواب دیا۔ "تم کچھ پینا پسند کرو گے؟"

"اگر کوئی گرم چیز مل جائے تو۔"

"میں کافی لاتی ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ اس نے کافی بناتے ہوئے وہیں سے کہا۔ "تمہاری ماں ایک بہت اچھی عورت تھی، وہ اس انجام کی مستحق نہیں تھی۔"

میں اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔ "کیا کوئی اور اس انجام کا مستحق تھا؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ "میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی...."

وہ کافی بنا کر لاؤنج میں لے آئی۔ اس نے مگ میرے سامنے رکھا۔ "ڈاکٹر وانبرگ نے تمہیں کیا بتایا ہے؟"

ڈاکٹر نے مجھے جو بتایا تھا، وہ میں نے دہرا دیا۔ وہ غور سے سنتی رہی پھر اس نے تائید کی۔ "میں نے اسے یہی کچھ بتایا ہے۔"

"لیکن تمہارے کچھ مشاہدات ہیں جو تم نے اسے بھی نہیں بتائے ہیں۔"

وہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "بات ہی ایسی ہے اگر میں کسی کو بتاتی تو کوئی یقین نہیں کرتا اور میرا پروفیشن ایسا ہے اگر یہ بات کسی کے علم میں آ جاتی تو شاید مجھے کوئی جاب نہیں دیتا۔ ویسے بھی میں نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے۔ یہ ملازمت بھی ڈاکٹر شیفرڈ کی مہربانی سے ملی ہے۔"

لفظ مہربانی ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ شاید ڈاکٹر شیفرڈ نے اسپتال میں ملازمت دلانے کے بدلے میں اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "یعنی تم مجھے جو بتاؤ گی وہ ایک طرح سے ان آفیشل ہوگا۔ اگر کوئی موقع آیا تو تم اس کی تصدیق کرنے سے انکار کر دو گی؟"

"بالکل یہی بات ہے۔" آئرس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ "جس دن ہلڈا نے خودکشی کی، اس سے ایک رات پہلے وہ بہت پُرسکون تھی اور اس نے مجھ سے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ اس کے سکون کی وجہ اس کا فیصلہ تھا۔ وہ اس صورتِ حال سے تنگ آ چکی تھی۔"

"کس صورتِ حال سے؟"

آئرس نے جواب دیا۔ "وہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھی کہ ایک بڑے منہ والی عورت اسے ڈراتی ہے اور جان سے مارنے کی کوشش کرتی ہے۔"

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "بڑے منہ والی عورت سے کیا مراد ہے؟"

"ہلڈا کا کہنا تھا، جب وہ نظر آتی تو اپنا منہ کھول کر دکھاتی ہے اور پھر اس کا منہ کسی غار کے دہانے کی طرح وسیع اور تاریک ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہلڈا کا کہنا تھا اسے لگتا ہے، یہ منہ کسی دن اسے نگل لے گا۔"

سرد لہر کا احساس بڑھ رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ "ایسا کیسے ممکن ہے۔ وہ عورت یقیناً ممی کا وہم ہوگی۔"

"میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ جب ہلڈا کو دورہ پڑتا اور وہ خوف زدہ ہو کر چیختی چلاتی تو میں اسے قابو میں کرتی اور دوا دے کر سلاتی۔ ان چار سالوں میں، میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جو غیر معمولی ہو اور ہلڈا کی باتوں کی تصدیق کرتی ہو۔ وہ مکمل طور پر نفسیاتی مریضہ ہی نظر آتی تھی۔"

"پھر تم نے کیا دیکھا؟"

"خودکشی کی رات میں اپنے کمرے میں تھی جو ہلڈا کے کمرے کے برابر میں تھا۔ رات کسی وقت میں نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ سوتے میں سسکیاں لیتی تھی۔ پھر میں نے اس کی آواز سنی، وہ کسی سے التجا کر رہی تھی کہ وہ اسے کچھ نہ کہے، اسے معاف کر دے کیونکہ اس کے ساتھ جو ہوا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ بھی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر سوتے میں سسکیاں لینے کے دوران ایسی باتیں ہی کرتی تھی۔ مجھے لگا جیسے کوئی اور بھی بول رہا ہے، آواز نسوانی تھی لیکن الفاظ غیر واضح تھے۔ میں نے اٹھ کر درمیانی دروازہ کھولنا چاہا تو وہ دوسری طرف سے لاک نکلا۔ میں سامنے سے نکل کر ہلڈا کے کمرے میں آئی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور کھڑکی کے ساتھ ہنگامی سیڑھیاں تھیں۔ میں نے باہر جھانکا تو ہلڈا سیڑھیاں چڑھتی اوپر جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کسی سے التجا بھی کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا نہ کرے۔ مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہلڈا کے آگے کوئی سایہ سا تھا۔ ایک موقع پر ہلڈا رک گئی اور سیڑھیوں سے چپک گئی تب میں نے اس سے آگے ایک نسوانی ہیولا دیکھا۔ ہیولے نے مڑ کر نیچے کی طرف دیکھا تو ایک عورت کا چہرہ سامنے آیا پھر اس نے منہ کھولا تو وہ کسی غار کی طرح بڑا اور تاریک تھا۔ میں دم بہ خود تھی اور میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ عورت نے منہ کھول کر میری طرف دیکھا تو مجھے چکر آ گیا اور میں کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ایک منٹ بعد ہلڈا کی چیخ سنائی دی اور پھر دھپ کی آواز کے ساتھ خاموشی چھا گئی۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہ روش پر گری ہوئی تھی اور اس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا....."

میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "پھر تم ہمارے گھر سے چلی گئیں؟"

"ظاہر ہے اس کے بعد وہاں میری موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میری طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ میں ہلڈا کی تدفین میں بھی شریک نہیں ہو سکی تھی۔"

"تم نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی؟"

"کسی کو نہیں... حد یہ کہ مسٹر جیک کارلوس کو بھی نہیں

بتائی۔"

"ممی نے ڈیڈی کے کسی ایسے کام کا ذکر کیا جس کی سزا ان کے بجائے ممی کو ملی۔ تمہارے خیال میں اس بات میں کوئی حقیقت ہے؟"

آئرین نے شانے اچکائے۔"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ویسے تم بالکل کسی پولیس والے کی طرح تفتیش کر رہے ہو؟"

"کیوں کیا صرف پولیس والوں کے پاس ہی ذہانت ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے انداز سے ایسا لگا۔"

میں خالی مگ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔"فکر مت کرو میں اس تعاون پر تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"مجھے بھی تم سے تعاون کر کے خوشی ہوئی ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو اور ہلڈا کے بیٹے بھی ہو۔"

"لگتا ہے، تمہیں ممی سے لگاؤ ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر تمہیں کوئی ایسی بات یاد آ جائے جو تم بتانا بھول گئی ہو تو تم مجھ سے سیل پر رابطہ کر سکتی ہو، میرا نمبر تمہارے سیل میں آ گیا ہوگا۔"

"تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

"ڈاکٹر شیفرڈ نے دیا ہے۔" میں نے بتایا اور اس کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ اب مجھے ڈیڈی کے جھیل والے کیبن تک جانا تھا۔ رات بہت ہو چکی تھی لیکن مجھے تجسس تھا۔ میں دن نکلنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ کیبن جھیل مشی گن کے کنارے بنا تھا۔ یہ پرانے زمانے کا کیبن تھا اور پتھر کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں۔ نیچے ایک پورا ہال تھا جس میں کچن بھی تھا اوپر صرف ایک بیڈ روم اور ایک باتھ روم تھا۔ ڈیڈی اپنے لکھنے کا کام یہیں کرتے تھے۔ ڈیڈی ہارر ناول لکھتے تھے اور ان کے ناول ہمیشہ بیسٹ سیلر میں شامل رہے۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں بھی بنی تھیں اگرچہ فلمیں اتنی کامیاب نہیں ہوئیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ امریکا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ہارر ناول ڈیڈی کے ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیس سالہ کیریئر میں صرف آٹھ ناول لکھے اور اس کے بعد انہوں نے لکھنا بند کر دیا۔ آخری ناول انہوں نے ممی کی خودکشی سے دو سال پہلے لکھا تھا۔ ان کے ناول ہمیشہ ایک پر اسرار اور خوف ناک عمارت کے گرد گھومتے تھے۔ کبھی یہ عمارت کوئی قلعہ ہوتی تھی اور کبھی کوئی ویرانے میں کھڑی حویلی یا محل۔ یہ آٹھوں ناول بے پناہ مقبول ہوئے اور آج تک ان کے ایڈیشن نکل رہے ہیں۔

ڈیڈی شروع سے مصنف نہیں تھے بلکہ وہ ایک رسالے میں ملازمت کرتے تھے پھر انہوں نے اسی ملازمت کے دوران میں پہلا ناول لکھا جو چھپتے ہی مقبول ہو گیا اور اس کے بعد ڈیڈی کو ملازمت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اپنے ناولوں سے مقبول ہونے والے ڈیڈی، نجی زندگی میں بے پناہ کم گو اور تنہائی پسند انسان تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی انٹرویو نہیں دیا، کسی پرستار کو ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ حد یہ کہ وہ جاننے والوں سے اپنے ناولوں کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اگر کسی محفل میں ان کے ناولوں کا ذکر آ جاتا تو وہ وہاں سے اٹھ جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ سمجھ گئے کہ انہیں اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں ہے۔

میں نے کیبن کے سامنے کار روکی تو وہاں سناٹے کا عالم تھا۔ جھیل کی جانب سے تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ سوئچ دبا کر روشنی کی اور پہلی نظر میں کیبن کی حالت نے بتا دیا کہ یہاں برسوں سے کوئی نہیں آیا۔ ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے نچلے حصے کا جائزہ لیا۔ فرنیچر اور تمام چیزیں گرد آلود تھیں۔ میں صرف ایک بار یہاں آیا تھا اور مجھے سب کچھ اب تک یاد تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ خستہ ہو جانے والے تختے چرچرا رہے تھے لیکن ان کے ٹوٹنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

بیڈ روم کا حال بھی باقی کیبن سے مختلف نہیں تھا۔ گرد کے علاوہ اگر کچھ تھا تو وہ آتش دان سے باہر پھیل جانے والی راکھ تھی۔ یہاں بجلی تھی لیکن ڈیڈی نے روایتی لکڑی سے جلنے والے آتش دان کو برقرار رکھا تھا۔ ایک چھوٹے سادہ بیڈ کے علاوہ وہاں ایک رائٹنگ ٹیبل ایک کرسی اور ایک آرام کرسی تھی۔ فرش پر ہلکے سرمئی رنگ کا قالین بچھا تھا لیکن اب اس کا رنگ مٹی جیسا ہو گیا تھا۔ میز بالکل صاف تھی اور اس پر کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ دو عدد قیمتی پین تھے اور کچھ دوسرا سامان جو لکھنے میں کام آتا ہے۔ تعجب کی بات تھی یہاں ایک بھی کتاب کے سادہ کاغذ کا ورق نہیں تھا۔ شاید ڈیڈی کام کے وقت یہ چیزیں ساتھ لاتے ہوں گے اور جب کام ہو جاتا ہوگا تو واپس لے جاتے ہوں گے۔

ڈیڈی نے مجھ سے دیوار کے پیچھے کا کہا تھا۔ اب اس سے ان کی کیا مراد تھی، میں سمجھ نہیں پایا تھا لیکن امکان یہی تھا کہ وہ کیبن میں کہیں دیوار کے پیچھے مجھے دیکھنے کو کہہ رہے تھے۔ نچلے حصے میں دیوار کے پیچھے کچھ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہاں ہر دیوار کے باہر کھلی جگہ تھی۔ لیکن بیڈ روم میں ایک دیوار ایسی تھی جس کے پیچھے کچھ ہونے کا امکان ہو سکتا تھا اور یہ دیوار آتش دان والی تھی۔ اس کے پیچھے باتھ روم تھا اور دیوار کے درمیان کچھ چھپایا جا سکتا تھا کیونکہ آتش دان ہونے کی وجہ سے یہ خاصی موٹی تھی۔ میں نے اس دیوار کا معائنہ کیا، اس پر پتھر سے بنے کھردرے آرائشی ٹائلز لگے تھے۔ میں نے میز پر رکھا پیپر ویٹ اٹھایا اور دیوار بجا بجا کر دیکھنے لگا پھر ایک جگہ پیپر ویٹ مارا تو ایسی آواز آئی جیسے کھوکھلی سطح سے آتی ہے، میں نے دوبارہ مار کر تصدیق کی۔ دیوار یہاں سے کھوکھلی تھی۔ میں نے پیپر ویٹ مار کر دیوار کے اس حصے کو توڑنے کی کوشش کی لیکن پیپر ویٹ اس کام کے لیے ناکافی تھا۔ میں نیچے آیا اور کچن کی درازیں کھول کر دیکھیں۔ ایک دراز سے مجھے ہتھوڑا اور چھینی مل گئے۔ ان سے کام آسان ہو گیا اور میں نے پہلے کھوکھلی سطح کی آؤٹ لائن تیار کی اور پھر چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے اسے توڑنے لگا۔ پہلا ٹائل نکلتے ہی کام آسان ہو گیا۔ دس منٹ میں سارے ٹائلز آرام سے نکل آئے اور ان کے پیچھے خلا میں ایک مضبوط قسم کا چرمی بیگ موجود تھا۔

میں نے بیگ نکالا اور اسے کھولا۔ اسے زپ اور پھر بکس کی مدد سے بند کیا گیا تھا۔ بیگ کے اندر فائلیں تھیں اور ان کی تعداد آٹھ تھی۔ میرے ذہن میں ایک خدشہ سر سرانے لگا۔ میز اور کرسی جھاڑ کر لیمپ روشن کیا۔ میں نے تمام فائلیں نکال کر میز پر رکھیں اور پہلی فائل کھولی۔ فائل کے اندر موجود کاغذات کسی کے ہاتھ کی تحریر میں تھے اور اوپر کسی ایملی مارش کا نام لکھا تھا۔ کاغذ پر تحریر بھی نسوانی تھی اور اس کے چند صفحے دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں ڈیڈی کا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ اگرچہ ڈیڈی کا ناول اس سے ذرا مختلف تھا لیکن وہ اسی تحریر پر مبنی تھا۔

میں نے جلدی سے دوسری فائل کھولی اور پھر تیسری، چوتھی اور ایک ایک کر کے تمام فائلیں دیکھ لیں۔ یہ تمام کے تمام وہی ناول تھے جو ڈیڈی کے نام سے چھپے تھے اور انہوں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی۔ یہ تمام فائلیں بہت پرانی تھیں اور ان کا کاغذ پیلا پڑ گیا تھا۔ کیا یہ ناول اصل میں اس عورت ایملی مارش نے لکھے تھے اور ڈیڈی نے کسی طریقے سے انہیں حاصل کر کے اپنے نام سے شائع کرا لیا تھا۔ مجھے لگا، میرا سر چکرا رہا ہے۔ سو فیصد یہی بات تھی۔ ڈیڈی نے ایک جرم کیا تھا اور اس جرم سے دولت بھی حاصل کی تھی۔ شاید یہی چیز ہمارے گھر کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ لیکن وہ عورت کون تھی؟ اس سوال کا فی الحال میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے تمام فائلیں بیگ میں رکھیں اور کیبن کی روشنیاں بند کرتا ہوا باہر آیا۔ باہر بدستور سناٹا اور ا[illegible]لی تھی۔ آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے رات اور بھی تاریک لگ رہی تھی۔

میں کار کی طرف آیا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا ہی تھا کہ عقب سے ہلکی سی آواز آئی اور کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ میں چکرا گیا لیکن بے ہوش نہیں ہوا... چند لمحے کے لیے آس پاس سے غافل ہو گیا۔ میں بے ہوشی سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھے ٹٹول رہا ہے پھر ٹٹولنے والے نے برابر میں رکھا ہوا بیگ اٹھا لیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی تو اس نے دوبارہ میرے سر پر وہی چیز ماری اور اس بار میں فوراً بے ہوش ہو گیا۔ مجھے خاصی دیر بعد ہوش آیا کیونکہ صبح ہو چکی تھی۔ ایک مسلسل آواز سن کر میں ہوش میں آیا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور درد کی لہریں ان چکروں میں اضافہ کر رہی تھیں اس لیے مجھے دیر سے سمجھ میں آیا کہ بارش ہو رہی تھی اور چھت پر گرتی بوندیں جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

میں نے دروازہ کھول کر سر باہر کیا۔ بارش کا سرد پانی سر پر پڑا تو مجھے خاصا افاقہ محسوس ہوا۔ درد میں کمی آئی اور چکر ختم ہو گئے۔ میرے پاس کار میں دواؤں کا ایک بیگ ہمیشہ موجود رہتا ہے اس میں سے دو درد کش گولیاں نکال کر نگل لیں تو چند منٹ بعد درد میں واضح کمی آ گئی۔ ہوش میں آتے ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ بیگ غائب ہے گویا جو بھی آیا تھا وہ اسی بیگ کے لیے آیا تھا۔ مگر کسی اور کو اس بیگ سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔ میں نے ایملی مارش کے بارے میں سوچا۔ یہ نام میں نے پہلی بار سنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کون مجھے اس کے بارے میں بتا سکتا ہے تو مجھے ڈاکٹر وانبرگ کا خیال آیا شاید وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔

ڈاکٹر وانبرگ مجھے صبح سویرے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ جاگ گیا تھا اور شاید ناشتا بنا رہا تھا۔"جم اتنی صبح ؟... خیریت تو ہے؟"

میرے سر میں رہ رہ کر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں لیکن سر نہیں پھٹا تھا صرف سوج گیا تھا اس لیے میں نے اپنی خیریت کا اقرار کر لیا۔"جی انکل وانبرگ میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

وہ مجھے کچن میں لے آیا۔"یقیناً تم نے ناشتا نہیں کیا ہے۔" اس نے کافی کا اضافی پانی چڑھاتے ہوئے کہا اور میرے سامنے ایک پیالہ رکھ کر اس میں سیریل بھر دیے۔ دودھ کا پیکٹ رکھا۔"دودھ اپنی مرضی سے ڈال لو۔"

مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے تکلف سے کام نہیں لیا اور دودھ ڈال کر ناشتا کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے

اور نج جوس کا جگ بھی نکال لیا تھا لیکن میں نے اس کے بجائے کافی کو ترجیح دی۔ ناشتے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہاں اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”آپ کسی ایملی مارش سے واقف ہیں۔“

ڈاکٹر واضح طور پر چونکا۔ ”تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”پلیز ڈاکٹر میرے سوال کا جواب دیں۔“

”ایملی مارش ایک غریب عورت تھی اور وہ نفسیاتی مریضہ بھی تھی۔ جوانی میں اسے مرگی کے دورے پڑتے تھے اور وہ خاصے عرصے نفسیاتی اسپتال میں زیرِ علاج بھی رہی تھی۔“

”اس کا مرض کس نوعیت کا تھا؟“

”وہ دوسروں کے لیے خطرہ نہیں تھی۔ اسے لکھنے کا خبط تھا اور وہ اکثر کاغذ اور قلم لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی۔ پھر اس کے ساتھ ٹریجڈی ہوئی۔ اسپتال میں کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور وہ حاملہ ہوگئی۔ وہیں اس نے بچے کو جنم دیا۔ بچے کو اسپتال انتظامیہ نے کسی ادارے کے سپرد کر دیا تھا کیونکہ ایملی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بچے کو پال سکتی۔ چار سال بعد اسے صحت یاب قرار دے کر اسپتال سے رخصت کر دیا گیا۔“

”پھر وہ کہاں گئی؟“

ڈاکٹر وانبرگ نے شانے اچکائے۔ ”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔“

”باقی آپ کس طرح جانتے ہیں؟“

”میں اسی نفسیاتی اسپتال میں بہ طور فزیشن کام کرتا تھا اور کئی بار ایملی کا علاج بھی کر چکا تھا۔“

”وہ کیا لکھتی تھی کسی نے کبھی دیکھا؟“

ڈاکٹر وانبرگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ کسی کو دیکھنے نہیں دیتی تھی اور اگر کوئی دیکھنا چاہتا تو وہ غضب ناک ہو جاتی تھی۔“

”ایملی مارش کے بارے میں کہیں اور سے معلوم ہو سکتا ہے؟“

ڈاکٹر نے سوچا اور بولا۔ ”شاید ایک جگہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ ایک این جی او دماغی امراض کے شکار افراد کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ خاص طور سے ایسے مریض جو غریب ہوں اور ان کا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ ممکن ہے وہاں سے ایملی مارش کے بارے میں کچھ پتا چل جائے۔“ ڈاکٹر وانبرگ نے ایک کاغذ پر مجھے اس این جی او کا پتا لکھ دیا۔ میں اس کے تعاون اور ناشتے کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکل آیا۔ لیکن پہلے میں گھر گیا۔ مجھے ڈیڈی کی آخری رسومات کے انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔

نہا دھو کر میں نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر فون اور خاندان والوں کی فون ڈائریکٹری لے کر بیٹھ گیا۔ صرف انڈیانا میں کارلوس خاندان کے سو سے زیادہ افراد تھے اور پورے امریکا میں ان کی مجموعی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ تھی۔ سب کو اطلاع دیتے دیتے کوئی تین گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران میں جیمس دوسرے انتظامات میں مصروف تھا۔ اس نے چرچ میں سروس کے لیے تین دن بعد کا وقت لے لیا تھا اور ڈیڈی کی آخری تیاری کے لیے ایک معیاری انڈر ٹیکر ادارے سے بکنگ کرالی تھی۔ اب وہ گھر میں مہمانوں کے لیے مخصوص کمرے کھول رہا تھا۔ اس نے صفائی کے لیے ایک مقامی ادارے کو کال کر دی تھی۔

جیمس تجربہ کار اور منظم بٹلر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس قسم کی صورتِ حال میں اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے ڈاکٹر شیفرڈ کو کال کی اور انڈر ٹیکر ادارے کے بارے میں بتاتے ہوئے درخواست کی۔

”ڈیڈی کی لاش وہاں تک پہنچا دی جائے تاکہ وہ اسے تیار کر سکیں۔“

”میں آج ہی بھیج دیتا ہوں۔“ ڈاکٹر شیفرڈ نے کہا اور پھر کچھ توقف کر کے پوچھا۔ ”تمہاری نرس آئرس سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں کل رات میری اس سے ملاقات ہوئی ہے۔“

”اس کے گھر پر؟“ ڈاکٹر شیفرڈ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”ہاں... لیکن میں زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔“ میں نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر شیفرڈ نے پھر مجھے تعاون کی پیش کش کی اور فون بند کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ کیوں پوچھا کہ میں نرس آئرس کے گھر پر اس سے ملا تھا، کیا اسے کسی قسم کا شک تھا یا آئرس سے اس کا کوئی ایسا تعلق تھا کہ یہ بات اسے کھٹکی تھی۔ میں تھک گیا تھا اور سر کی تکلیف باقی تھی اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ آرام کر لوں۔ مگر جب سونے کے لیے لیٹا تو ایملی مارش اور اس کے مسودے ذہن میں در آئے۔ مجھے خیال آیا کہ ڈیڈی نے یہ مسودے کہاں سے حاصل کیے تھے۔ پھر اچانک مجھے اس پبلشنگ ادارے کا خیال آیا جہاں ڈیڈی ملازمت کرتے تھے اور وہیں کام کرتے ہوئے انہوں نے اپنا پہلا ناول شائع کرایا تھا۔ کیا ایملی مارش نے اپنے ناول ان کو شائع کرنے کے لیے بھیجے تھے اور ڈیڈی نے یہ مسودے اپنے قبضے میں کر لیے اور بعد میں انہیں اپنے نام سے شائع کراتے رہے۔ شاید ایسا ہی ہوا تھا یا پھر ڈیڈی نے کسی اور طرح سے یہ مسودے حاصل کیے تھے۔ مجھے اس شخص کا خیال آیا جس نے کار میں حملہ کر کے مجھے بے ہوش کر دیا تھا اور بیگ لے اڑا تھا۔ اس بیگ سے کس کو دلچسپی ہو سکتی تھی؟ میں حملہ آور کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا تھا اور نہ ہی اس نے کار میں اپنا کوئی نشان چھوڑا تھا۔

☆☆☆

ڈیڈی کی تدفین کے بعد آخری مہمان بھی گھر سے رخصت ہو گیا اور اب صرف ڈاکٹر وانبرگ میرے ساتھ تھا۔ اس نے تدفین کے تمام معاملات اپنے ذمے لے لیے تھے اور مجھے فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ آخری مہمان کے جانے کے بعد ڈاکٹر وانبرگ نے گہری سانس لی۔ ”جم، میرا خیال ہے تم یہاں نہیں رہو گے؟“

”جی انکل کیونکہ میری جاب میامی میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کچھ عرصے رکوں گا، یہاں کے معاملات نمٹانے ہیں اور ڈیڈی کے وکیل سے ملاقات بھی کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب مجھے اجازت دو۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کسی بھی مسئلے میں میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بلا تکلف کہہ دینا۔“

ڈاکٹر وانبرگ کو رخصت کر کے میں اندر آیا تو میرے سیل فون کی بیل بجی۔ یہ کسی پبلک بوتھ کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”جم کارلوس؟“ دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز نے پوچھا۔

”بات کر رہا ہوں۔“

”تمہیں اس بیگ کی واپسی سے کوئی دلچسپی ہے جس میں تمہارے باپ کے جرم کا ثبوت ہے۔“

اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کوئی ثبوت ہے۔“

”ٹھیک ہے تب میں ان مسودوں کی کاپیاں کر کے اخبارات کو بھیج دیتا ہوں۔ ویسے بھی ہر اخبار عظیم ہارر رائٹر جیک کارلوس پر مضامین شائع کر رہا ہے۔“

”تمہارے خیال میں اس کا تمہیں کوئی فائدہ ہوگا؟“

”شاید نہیں لیکن تمہیں اور تمہارے مرحوم باپ کو نقصان ضرور ہوگا۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”اس نقصان سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟“

”صرف پانچ ملین ڈالرز۔“ اس نے کہا۔ ”اگر تم مجھے پانچ ملین ڈالرز ادا کر دو تو میں یہ بیگ تمہیں واپس کر دوں گا۔ تم ایسا کر سکتے ہو۔ جیک کارلوس تمہارے لیے کم سے کم پندرہ ملین ڈالرز چھوڑ کر گیا ہے۔“

”کیا تم صرف اس لیے پانچ ملین ڈالرز مانگ رہے ہو کہ یہ بیگ تمہارے پاس ہے۔“

”نہیں۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”میں اس کا مستحق ہوں۔ میں ایملی مارش کا اکلوتا بیٹا ہوں۔“

اس نے فون بند کر دیا اور میں دم بہ خود سا رہ گیا۔ میں نے فون آپریٹر کو کال کی اور اس سے مذکورہ نمبر کے بوتھ کے بارے میں پوچھا۔ آپریٹر نے جواب دیا۔ ”مسٹر جم کارلوس یہ انڈیانا اسٹیٹ ہائی وے باون پر بائیسویں میل پر واقع بوتھ ہے۔“

یہ جگہ نارتھ ٹاؤن سے صرف دس میل کی دوری پر تھی یعنی اگر قصبے کا کوئی باشندہ یہ کال کرنا چاہتا تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شام کا وقت ہو چلا تھا، میں نے کار نکالی اور این جی او کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر جھیل کی طرف جانے والی ایک سڑک پر قصبے سے ذرا آگے تھا۔ عمارت خوب صورت اور سادہ تھی اور یہاں ان مریضوں کے لیے ایک وارڈ تھا جو اپنی دیکھ بھال خود کرنے سے قاصر تھے اور دنیا میں ان کا کوئی والی وارث بھی نہیں تھا۔ استقبالیہ پر ایک دلکش اور کم عمر لڑکی نے مجھے بتایا کہ این جی او کے بارے کسی قسم کی معلومات دینے کے مجاز اس کے سربراہ مسٹر کارمن ہیں۔

تقریباً ساٹھ سالہ کارمن اپنے دفتر میں موجود تھا اور اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں جیک کارلوس کا بیٹا ہوں تو اس نے کہا۔ ”میں تمہارے ڈیڈی کے مداحوں میں شامل ہوں۔“

”میں شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس وقت میں آپ کے پاس ایک نفسیاتی مریضہ خاتون کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔ شاید کبھی آپ کی این جی او نے اس کی مدد کی ہو۔“

”مریضہ کا نام کیا تھا؟“ اس نے مستعدی سے اپنے کمپیوٹر پر انگلیاں چلائیں۔ میں نے اسے ایملی مارش کا نام بتایا۔ اس نے یہ نام اپنے کمپیوٹر میں ڈالا اور ایک منٹ بعد بولا۔ ”بالکل، ایملی مارش ہماری ایک ممبر تھی۔ ہم ان لوگوں کو ممبر کہتے ہیں جن کی مدد کرتے ہیں۔“

”آپ نے کس قسم کی مدد کی تھی؟“

”وہ اکیلی تھی اور دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ ہمارا ادارہ اسے خوراک اور ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں مہیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دیکھ بھال کے لیے

ہمارے رضا کار ہر دوسرے دن اس کے گھر جاتے تھے۔“

”بس یہی مدد کرتے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، اس کے آخری دنوں میں جب وہ بالکل ہی ہوش کھو چکی تھی تو ہم اسے یہاں لے آئے تھے۔ اس کا مرگی کا مرض اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ وہ کئی کئی دن ہوش و حواس سے بے گانہ رہتی تھی۔“

”اس سے پہلے وہ چار سال نفسیاتی امراض کے اسپتال میں بھی داخل رہی تھی اور وہاں سے اسے صحت یاب قرار دے کر رخصت کیا گیا تھا۔“

”صحت یاب۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اسپتال والوں نے اپنی جان چھڑائی تھی کیونکہ اس کے علاج کے اخراجات کی ادائیگی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد ہماری این جی تین سال تک اس کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔“

”یہ کب سے کب تک کی بات ہے؟“

کارمن نے کمپیوٹر پر چیک کیا اور دورانیہ بتایا۔ یہ ٹھیک وہ دورانیہ تھا جب ڈیڈی پبلشنگ ادارے میں کام کرتے تھے اور ایملی مارش کے این جی او میں داخل ہونے کے دو سال بعد ان کا پہلا ناول منظر عام پر آیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”ایملی مارش کتنے عرصے یہاں رہی؟“

”صرف اٹھارہ مہینے اور پھر مرگی کے شدید دورے میں اس کا انتقال ہو گیا۔“

بالکل درست ٹائمنگ تھی۔ ایملی کی موت کے چار مہینے بعد پاپا نے پہلا ناول شائع کرایا تھا۔ کیونکہ اب ایملی مارش اس دنیا میں نہیں رہی تھی جو ان ناولوں کے بارے میں کوئی دعویٰ کر سکتی۔

”ایملی مارش لکھتی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا اس کی لکھی ہوئی کوئی چیز یہاں موجود ہے؟“

کارمن نے سوچا۔ ”اس بات کو بہت عرصہ گزر گیا ہے۔ اس وقت میں نے اور میرے ساتھیوں نے نئی نئی یہ این جی او قائم کی تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں اچھے سپورٹر مل گئے تھے اس لیے ہم اپنا سیٹ اپ قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ مریضوں سے متعلق تمام چیزیں اسٹور روم میں رکھ دی جاتی ہیں۔ لیکن مجھے دیکھنا ہوگا ایملی سے متعلق کوئی چیز ہے یا نہیں ہے۔“

اسٹور روم عمارت کے تہ خانے میں تھا اور خاصا وسیع و عریض تھا۔ گزر جانے والے اور صحت یاب ہو کر جانے والے مریضوں کا سامان اس کے ایک حصے میں گتے کے چھوٹے بڑے کارٹنوں میں رکھا ہوا تھا۔ کارمن کارٹن پر لکھے نام پڑھ رہا تھا۔ کارٹن الفابیٹ کے حساب سے رکھے تھے۔

”ایڈگر... ایڈم... ایمی... یہ رہا ایملی مارش۔“ اس نے کارٹن اٹھایا۔ ان کی جھاڑ پونچھ ہوتی رہتی تھی اس لیے مٹی نہیں تھی لیکن جب کارٹن کھولا تو اس سے باسی پن کی بو آ رہی تھی۔ اس میں چند جوڑے کپڑے اور کاغذات کا ایک بڑا سا پلندہ تھا۔ یہ سارے کھلے کاغذ تھے اور ان کو بنڈل بنا کر تھیلی سی لپیٹ دیا گیا تھا۔ میں نے بنڈل نکالا۔ اس پر ایملی نے کچی پنسل سے لکھا ہوا تھا تحریر وہی تھی جو میں چھن جانے والے بیگ میں موجود مسودوں میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کارمن سے کہا۔

”کیا میں یہ کاغذات لے جا سکتا ہوں۔ مجھے عارضی طور پر درکار ہیں میں ان کی رسید دے دیتا ہوں۔“

کارمن کے خیال میں ان کی کوئی وقعت نہیں تھی اس لیے اس نے اجازت دے دی۔ اگر میں مستقل مانگ لیتا تو وہ اس کی اجازت بھی دے دیتا۔ ہم اس کے دفتر میں آئے اس نے رسید تیار کر کے دستخط کے لیے میری طرف بڑھائی۔ میں نے دستخط کیے۔ ”مسٹر کارمن ایک سوال اور ہے۔ ایملی مارش کا کوئی بیٹا بھی تھا؟“

”نہیں، اس بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم ہے اور نہ اس کی فائل میں ایسا کوئی ذکر ہے۔“

”اس سے پہلے وہ جس اسپتال میں داخل رہی تھی وہاں اس کا بچہ ہوا تھا۔ شاید دورے کی حالت میں کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور وہ امید سے ہو گئی تھی۔ بچے اسپتال انتظامیہ نے کسی ادارے کے سپرد کر دیا تھا۔“

”ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو، اس بارے میں اسپتال کی انتظامیہ ہی بہتر بتا سکتی ہے۔“ کارمن نے جواب دیا۔

”میں اٹھنے والا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ ”آپ کے پاس ایملی مارش کی کوئی تصویر ہے؟“

”بالکل ہمارے کمپیوٹر ریکارڈ میں ہر چیز موجود ہے۔“ اس نے فخر سے کہا اور ایملی کی تصویر نکال کر مانیٹر میری طرف گھما دیا۔ میں ساکت رہ گیا، یہ وہی عورت تھی جسے میں نے ڈرائیونگ کے دوران میں ممکنہ طور پر خواب میں دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں نے خواب میں اسے بڑا سا منہ کھولے دیکھا تھا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکل آیا۔ اب میری اگلی منزل وہ اسپتال تھا جہاں ایملی مارش داخل رہی تھی۔ یہ نارتھ ٹاؤن سے کوئی دس میل مغرب میں واقع ایک اور قصبے میں تھا۔ رات ہو چکی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ مجھے کوئی نہ کوئی شخص مل جائے گا جو مجھے ایملی مارش کے بارے میں بتائے گا مگر استقبالیہ پر موجود کلرک نے بتایا کہ رات کے وقت اسپتال کا انتظامی شعبہ کام نہیں کرتا ہے اور میں کل صبح ہی رابطہ کر سکتا ہوں۔ میں مایوس واپس آ گیا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ ایک بار پھر ڈاکٹر وانبرگ سے بات کروں، ہو سکتا ہے اسے معلوم ہو کہ ایملی مارش کے بیٹے کو کس ادارے کے سپرد کیا گیا تھا۔ میں نے کار کا رخ اس کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ ڈاکٹر کا گھر تاریکی میں تھا۔ مجھے تعجب ہوا ابھی رات کے صرف نو بجے تھے اور وہ اتنی جلدی تو نہیں سو سکتا تھا۔ میں کار سے اتر کر دروازے تک آیا اور کال بیل بجائی۔ جواب میں خاموشی رہی۔ دوسری بار بیل بجانے پر کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تو میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور خلاف توقع دروازہ کھلا پایا۔ میں اندر آیا۔ نشست گاہ میں تاریکی تھی اور وہاں ایک ہلکی سی مہک تھی۔ کچن میں کوئی روشنی جل رہی تھی جس کا عکس لاؤنج تک آ رہا تھا۔ میں لاؤنج میں آیا تو ڈاکٹر آتش دان کے سامنے کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ہوش و حواس میں ہو اور اسے کال بیل نہ سنائی دی ہو۔ میں نے دیوار پر ہاتھ مارا اور سوئچ آن کر دیا۔ لاؤنج روشن ہو گیا۔

”انکل وانبرگ۔“ میں ان کی طرف بڑھا اور جب سامنے پہنچا تو ساکت رہ گیا۔ ان کا گلا کٹا ہوا تھا اور خون سے شرٹ اور پتلون سرخ ہو گئی تھی بلکہ خون قالین پر بھی پڑا تھا۔ وہ آتش دان کے سامنے بیٹھے کافی پی رہے تھے کیونکہ نیچے کافی کا مگ گرا ہوا تھا۔ قاتل نے یقیناً اچانک عقب سے ان کا گلا کاٹ دیا تھا اور ان کو مدافعت کا موقع ہی نہیں ملا تھا خون جم رہا تھا اور ان کی موت کو کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ یعنی قاتل کی وہاں موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً پورا مکان دیکھا اور پھر پولیس کو کال کی۔ پندرہ منٹ بعد پولیس اور ہومی سائڈ والے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں یہاں ڈاکٹر سے ملنے آیا تھا اور اسے اس حال میں پایا۔ پولیس کے ساتھ ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے زخم دیکھ کر کہا۔

”کوئی تیز دھار آلہ استعمال ہوا ہے جیسے سرجن والا چاقو یا شیو کرنے والا استرا، کیونکہ کھال بہت صفائی سے کٹی ہے۔“

ہومی سائڈ کے ایک افسر نے میرا بیان لیا اور مجھے قصبے میں رہنے کا پابند کرتے ہوئے جانے کی اجازت دے دی۔ انکل وانبرگ کی موت نہایت افسوسناک تھی۔ مجھے یقین تھا کہ قاتل نے اسے اس لیے مارا ہے کہ وہ مجھے ایملی مارش کے بچے کے بارے میں نہ بتا سکے۔ گھر جاتے ہوئے میں اس

معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ راستے میں ایک خواب سے بات شروع ہوئی اور میں نے ممکنہ طور پر ایملی مارش کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ ممی بھی اسے دیکھتی تھیں اور اسی طرح بڑا سا ڈراؤنا منہ کھولے دیکھتی تھیں۔ پھر نرس آئرس نے بھی ایسی ہی ایک عورت کو دیکھنے کی بات کی۔ کہانی رفتہ رفتہ کھلتی چلی گئی۔ ایملی مارش سامنے آئی اور پھر یہ حقیقت کہ وہی ان ناولوں کی اصل خالق تھی جو ڈیڈی نے اپنے نام سے شائع کرائے تھے۔ اس کے بعد ایملی مارش کا بیٹا آ گیا اور اس نے دعویٰ کیا کہ ایملی مارش کی تحریر والے تمام ناول اس کے پاس تھے اور اس نے مجھے بلیک میل کرنے کوشش کی۔

گھر آ کر میں نے جیمس ملر سے کہا کہ وہ مجھے کافی سینڈوچز بنا دے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور ایملی مارش کے لکھے کاغذوں کے بنڈل کو میز پر پھیلا لیا۔ جلد ہی میں جاننے میں کامیاب رہا کہ یہ ایملی کے لکھے مزید چھ عدد ناول تھے اور یہ اس نے اپنے آخری دنوں میں این جی او کے وارڈ میں رہ کر لکھے تھے۔ اس کا طرز تحریر نہایت پختہ تھا اور کسی پیشہ ور ناول نگار جیسا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ ایک نفسیاتی مریضہ تھی اور وہ جو لکھتی تھی لوگ اسے بے کار محض خیال کرتے تھے۔ اس نے شاید اپنے ناول اس پبلشنگ ہاؤس بھیجے جہاں ڈیڈی کام کرتے تھے۔ انہوں نے بھی ایملی مارش کی بیماری کا فائدہ اٹھایا اور اس کے ناول کسی طرح ہتھیا لیے۔ یہ آٹھ ناول ان کو مل گئے اور جب ایملی مارش انتقال کر گئی تو انہیں موقع ملا کہ وہ انہیں اپنے نام سے شائع کرائیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایملی مارش بعد میں بھی لکھتی رہی تھی اور اس نے مزید چھ ناول لکھے تھے جو اس این جی او کے اسٹور روم میں برسوں سے پڑے تھے۔

اس سارے معاملے میں ایملی مارش کے مبینہ بیٹے کا کردار میری سمجھ سے باہر تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں کیبن میں جا کر اس کی ماں کے ہاتھ کے لکھے مسودے نکالوں گا جو ڈیڈی نے وہاں چھپا کر رکھے تھے۔ اگر اسے ان کی جگہ کا علم ہوتا تو وہ بہت پہلے انہیں نکال چکا ہوتا۔ ممی کی موت پُراسرار تھی اور اب حالات جان لینے کے بعد مجھے ڈیڈی کی موت بھی پُراسرار لگ رہی تھی۔ کیا واقعی ان اموات کے پیچھے ایملی مارش کی روح تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے اس کی محنت سے لکھے ناول ہتھیا لیے تھے اور ان سے انہوں نے دولت اور شہرت کمائی جب کہ ایملی کو کچھ نہیں ملا اور وہ ایک خیراتی ادارے میں زندگی ہار گئی۔

ممی نے خودکشی کی اور ڈیڈی کو برین ہیمرج ہوگیا لیکن ڈاکٹر وانبرگ کسی روح کا شکار نہیں ہوا تھا، اس کا گلا کاٹا گیا تھا۔ معاملہ کچھ گڈمڈ تھا اور اس گتھی کو سلجھانے کے لیے مجھے مزید کام کرنا تھا۔ میں رات دیر تک جاگ کر سوچتا رہا پھر میں نے ایک فیصلہ کیا اور سوگیا۔ صبح اٹھ کر ناشتے کے بعد میں نے جیمس ملر سے کہا۔ ''ڈیڈی کے وکیل کی کال آئے تو اسے کہنا کہ وہ دو دن بعد مجھ سے رابطہ کرے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' جیمس ملر نے جواب دیا۔ ''میرے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''ابھی تم اپنا کام جاری رکھو اور میں نے جب بھی تمہیں فارغ کیا، تمہیں چھ مہینے کی تنخواہ اور بہترین خدمات کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ فارغ کروں گا۔''

وہ خوش ہوگیا۔ ''بہت شکریہ جناب۔''

میں روانہ ہوا اور اس نفسیاتی اسپتال جا پہنچا جہاں کبھی ایملی مارش داخل رہی تھی۔ اسپتال کا انچارج ڈاکٹر کارل گرینڈ تھا۔ میں نے اس سے ایملی مارش کے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کسی قسم کے تعاون سے انکار کردیا لیکن جب میں نے اسے اپنا پولیس کارڈ دکھایا تو اس کا رویہ کسی قدر بہتر ہوگیا۔ ''مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ایملی مارش نامی مریضہ جو اس اسپتال میں قیام کے دوران پُراسرار طور پر حاملہ ہوئی تھی، اس کا پیدا ہونے والا بچہ کہاں ہے؟''

ڈاکٹر کارل فکرمند نظر آنے لگا۔ وہ معمر شخص تھا اور یقیناً اس وقت اسپتال میں موجود تھا۔ جب ایملی یہاں تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں سچ کہوں گا، اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار اس وقت کا انچارج ڈاکٹر وکٹر آئیوان تھا۔ وہ نوجوانی میں روس سے بھاگ کر امریکا آگیا اور اس نے یہاں کی شہریت حاصل کرلی تھی۔ اس نے طب کی تعلیم بھی یہیں حاصل کی اور ایملی مارش اصل میں اسی کی مریضہ تھی۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے بچے کا باپ ڈاکٹر وکٹر ہی تھا۔ اس نے ایملی کو ڈلیوری کے دوران اپنے نجی کلینک منتقل کردیا تھا اور جب بچہ ہوگیا تو اسے واپس اسپتال لے آیا، کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے بچے کو کہاں بھیجا تھا لیکن اس کا کہنا یہی تھا کہ اس نے بچے کو ایک یتیم بچوں کے ادارے میں داخل کرادیا ہے۔''

میں نے بےیقینی سے اسے دیکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے تمہارے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے؟''

''یہی بات ہے۔'' ڈاکٹر کارل نے کہا۔ ''ہم بچے کے بارے میں مکمل طور پر بےخبر ہیں۔''

''اور ڈاکٹر وکٹر؟''

''ایملی کے مرنے کے آٹھ سال بعد وہ کار حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اس کی کار دو سو فٹ گہری کھائی میں جاگری تھی۔''

یہ حادثہ تھا یا ڈاکٹر وکٹر کی موت بھی پُراسرار تھی۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ان واقعات میں ایملی کی روح شامل تھی۔ یہ شاید اس کا بیٹا تھا جو ایملی کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر وکٹر نے ایملی کے ساتھ جسمانی زیادتی کی تھی اور ڈیڈی نے ایملی کے ناول چرائے تھے لیکن ممی کا کیا قصور تھا؟ اسپتال سے میں مایوس نکلا۔ اب میرے پاس ایک ہی امید تھی کہ میں حقیقت تک پہنچ سکوں۔ میں قصبے سے باہر جانے والی سڑک کے ساتھ ایک کچے راستے پر رک گیا۔ یہ جگہ سڑک سے نظر نہیں آتی تھی لیکن سڑک سے گزرنے والی ہر گاڑی یہاں سے صاف نظر آتی ہے میں انتظار کرنے لگا۔ دوپہر کا وقت قریب تھا۔ میں نے ایک کال کی اور پھر فون رکھ کر دوبارہ انتظار کرنے لگا۔ سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ سڑک سے اس دوران میں بےشمار گاڑیاں گزر چکی تھیں سوائے اس گاڑی کے جس کا مجھے انتظار تھا۔ شام قریب تھی کہ سڑک سے ایک سرخ چھوٹی کار گزری۔ ڈرائیور کی جھلک دیکھتے ہی میں نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر آگیا اس دوران میں سرخ کار کوئی دو سو گز آگے جا چکی تھی۔ میں نے فاصلہ مزید بڑھایا اور اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ کار کا رخ ہائی وے کی طرف تھا۔ چند میل بعد سرخ کار سڑک کے کنارے ایک فون بوتھ کے ساتھ رک گئی اور اسے رکتے دیکھ کر میں نے جلدی سے کار سڑک سے نیچے اتارتے ہوئے انجن بند کردیا، فوراً ہی میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں کار سے نیچے اترا اور کال ریسیو کی۔

''جم کارلوس۔'' بھاری مردانہ آواز نے کہا۔ ''تم نے سوچ لیا ہوگا؟''

''ہاں ایملی مارش کے بیٹے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے سوچ لیا ہے۔ میں تمہیں پانچ ملین ڈالرز دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ان مسودوں کے بدلے نہیں۔''

''پھر کس لیے دو گے؟''

''مجھے کچھ حقائق درکار ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میری ماں کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

''خودکشی سے۔''

''اور میرے باپ کی؟''

''برین ہیمرج سے۔''

''اور ڈاکٹر وکٹر آئیوان کی؟''

اس بار وہ خاموش ہوگیا... خاصی دیر بعد اس نے

کہا۔ ''اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میرا نہیں لیکن تمہارا تعلق تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے اسے مارنے سے پہلے بتایا ہوگا کہ تم اس کی اولاد ہو۔''

اس بار اسے زیادہ طویل چپ لگ گئی پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ انتقام لینے کے لیے تم بہت آگے چلی گئی ہو آئرس، باہر آجاؤ اب ہمیں بات کرنے کے لیے فون کی ضرورت نہیں ہے۔''

فون بوتھ میں موجود آئرس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے ریسیور پر گیلا کیا ہوا کپڑا لپیٹ رکھا تھا جس سے اس کی آواز ناقابلِ شناخت اور بھاری ہوگئی تھی۔ مجھے باہر موجود دیکھ کر اس نے خاموشی سے ریسیور رکھا اور باہر آگئی۔ وہ مجھے گھور رہی تھی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو مجھے پکڑوا دو گے؟''

میں نے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا لیکن میں یہ ضرور جان گیا ہوں کہ ان واقعات کے پیچھے تم ہو۔ تم نے ممی کو مارا۔ ان کو کسی طرح سے اوپر لے جا کر نیچے پھینکا اور واقعے کو خودکشی کا رنگ دے دیا مگر ممی کا قصور کیا تھا؟''

''میری ماں کے ناول چرانے کا خیال اسی نے تمہارے باپ کو دیا تھا۔'' آئرس بولی۔ میں نے دیکھا اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف جا رہا تھا۔

''تو یہ قصور تھا میری ماں کا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن ڈیڈی کو برین ہیمرج کس طرح ہوا؟''

''میں نے ماما کی صورت کا ایک نقاب بنایا ہوا ہے جس میں منہ بہت بڑا نظر آتا ہے اور نقاب بالکل اصل لگتا ہے۔ میں نے تمہارے باپ کو اس کی اسٹڈی کی کھڑکی سے یہ نقاب پہن کر ڈرایا تو اسے برین ہیمرج ہوگیا۔'' بولتے ہوئے اس کا ہاتھ جیکٹ کی جیب کے بالکل پاس پہنچ گیا تھا جیسے ہی اس نے ہاتھ اندر ڈالا، میں نے تیزی سے اس کا ہاتھ قابو کرلیا اور اس میں دبا ہوا پستول چھین لیا۔ اس نے پھر کر مجھے نوچنے کھسوٹنے کی کوشش کی لیکن پولیس والوں کو خواتین کے حملوں سے بچنے کی بھی تربیت دی جاتی ہے، میں نے نہایت آسانی سے اسے قابو کر کے اوندھے منہ زمین پر گرادیا۔

''ڈاکٹر وانبرگ کو کیوں مارا تم نے؟''

''کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایملی مارش کے لڑکی ہوئی تھی۔'' اس نے مچلتے ہوئے کہا۔

''اور وکٹر کو اس لیے کہ وہ تمہارا باپ تھا؟''

''میری ماں کی اصل بربادی کا ذمے دار وہی تھا۔ پہلے اس کی عزت لوٹی اور جب وہ ماں بنی تو اس کا بچہ چھین لیا صرف اس خوف سے کہیں وہ اس کا نام نہ لے دے، وہ میرے حوالے سے میری ماں کو بلیک میل کرتا رہا اور میں ایک گھٹیا یتیم خانے میں پلتی رہی اس لیے میں نے اسے تلاش کر کے مار ڈالا۔''

''تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ ایملی مارش ناول نگار تھی؟''

''ہلڈا یعنی تمہاری ماں سے جب میں اس کی نرس تھی۔ دیکھو قدرت کا انتقام کہ اس نے مجھے اسی گھر میں پہنچا دیا۔ ہلڈا مجھے ہمدرد جان کے سب بتاتی گئی۔ تب تک مجھے اپنی ماں کے بارے میں پتا چل چکا تھا۔''

''آئرس مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اگر تم نے اتنے لوگوں کو قتل نہ کیا ہوتا تو میں خوشی سے یہ دولت تمہارے حوالے کردیتا جو میرا باپ چھوڑ کر گیا ہے۔''

''مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''مجھے دولت کی خواہش بھی نہیں ہے۔ میں تو جیک کارلوس کے خاندان کو ختم کرنا چاہتی تھی لیکن تم بچ گئے۔''

میں نے اسے کھڑا کیا لیکن اپنی گرفت برقرار رکھی۔ ''ہاں اس لیے کہ میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا ہے اور مجھے بھی اس دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والی این جی او کو عطیہ کردوں گا اور تمہیں یہ جان کر شاید خوشی ہو کہ تمہاری ماں نے مزید چند ناول لکھے ہیں جو اس کے نام سے شائع ہوں گے۔ میں حقیقت کو منظرِ عام پر لے آؤں گا۔''

آئرس حیران ہوئی۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

''جب میں یہ سب کروں گا تو یقین بھی آجائے گا۔ لیکن تمہیں ان تمام واقعات کا علم کس طرح ہوا...''

''جیسے تم نے کھوج لگایا... اسی طرح میں بھی اپنی زندگی کے پوشیدہ گوشے جاننے کی متمنی تھی... تم بتاؤ تمہیں مجھ پر شک کیسے ہوا؟''

''دو چیزوں سے ایک تو تمہاری مخصوص خوشبو جو ڈاکٹر کے گھر میں پائی گئی تھی اور دوسرے وہ تیز دھار آلہ جس سے ڈاکٹر کا گلا کاٹا گیا تھا۔ پولیس سرجن نے اسے سرجیکل نائف قرار دیا اور ایک نرس سرجیکل نائف آرام سے حاصل کرسکتی ہے۔''

''تم نے بالکل پولیس والوں کی طرح سوچا۔''

اس بار میں نے اسے بتایا۔ ''کیونکہ میں پولیس والا ہی ہوں۔''

اور وہ دنگ رہ گئی۔

للکار

ان عاشق پیشہ لوگوں کا ماجرا جو للکار سنتے اور ... دیتے

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ---- مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ---- کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ---- عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ---- جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ..... ایک للکار ہے۔

طاہر جاوید مغل

اٹھائیسویں قسط

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں بگوڈا پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ پھر مجھے بگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہمیں ایک عجیب و الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے

ساتھ لے آئے۔ بعدازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو سیٹھ کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہاپسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے۔ میرا آپریشن ہوگیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سابر کا چیلنج کر ڈالا۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کر دیا۔ پھر سابر مقابلے والا دن آگیا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوگئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں نے لپک کر کسی کو گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ گھوڑا گاڑی ایک احاطے میں رک گئی۔ یہ گاؤں کا شفاخانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر لی وان بھی یرغمالیوں میں شامل تھا اور آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو اب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پھر عمران نے ایک انگریز افسر اینڈرسن کو قائل کر لیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ وہ راضی ہوگیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب بھی مارا گیا۔ سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ زرگاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ پھر انور خان بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ ہمیں جیل سے قاسمیہ چوک لے جایا گیا۔ ہمیں سولی چڑھایا جانا تھا۔ اچانک طلال فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم بھی حرکت میں آگئے۔ نیارڈ اور اسٹیل مارے گئے۔ ہم وہاں سے نکل کر پرانے قلعے میں آگئے۔ پھر وہاں گیتا شمی بھی آگئی۔ اس نے عمران کو کوئی خاص جانکاری دی۔ ہم پر حکم کے فوجیوں کی طرف سے حملہ ہوگیا۔ اسی دوران میں قلعے کے برآمدے سے گیتا شمی کی تشدد زدہ لاش ملی۔ ہم لوگ شفاخانے گئے تو وہاں زخمیوں کے بیچ رنجیت پانڈے موجود تھا۔ وہ ہم سے قلعے کا دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ تاہم ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور طویل سفر کے بعد ہم الٰہ آباد پہنچ گئے مگر وہاں مجھے اور عمران کو ڈی ایس پی سجاد نے گرفتار کر لیا اور ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے گیا۔ ہمیں اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعدازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ پھر وہاں اچانک میڈم صفورا اور دیگر لوگ پہنچ گئے۔ پھر ہمیں ایک پیر صاحب نے بلایا، وہ ہماری مدد چاہتے تھے۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ہم پر فائر ہوا۔ ہم نے ایف ایکس میں موجود شخص کا تعاقب کیا۔ اس کی کار ایک الیکٹرک پول سے ٹکرا گئی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ ہم اسے شاہین کے گھر پر لے گئے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ سیٹھ سراج کے ساتھیوں میں سے تھا۔ تاہم اس نے بند کمرے میں گلے اور بازو کی نسیں بلیڈ سے کاٹ کر خودکشی کر لی۔ ایک روز پیر احمد تھانوی صاحب کے ہاں میں نے ثروت کی بہن نصرت کو دیکھ لیا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے نتیجے میں مجھے ثروت نظر آگئی۔ اس سے میری ملاقات شاپنگ مال میں ہوگئی۔ اس کی شادی ہوگئی تھی اور اس نے مجھ سے دوبارہ نہ ملنے کا کہا۔ پھر میں نصرت سے ملا اور ثروت کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ وہاں ہم پر سیٹھ سراج کے ایک ساتھی نے حملہ کیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ نصرت مجھے ثروت کے بارے میں خاص بات بتانے لگی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولی۔ ''ان کے درمیان میاں بیوی والا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یوسف بھائی بری طرح گریس کی محبت میں گرفتار ہیں... انہوں نے والد کے مجبور کرنے پر اور اپنی بیمار والدہ کی خاطر باجی ثروت سے شادی تو کرلی مگر ان سے ہمیشہ دور رہے۔ باجی سے شادی کے صرف چھ مہینے بعد ہی انہوں نے گریس سے نکاح کرلیا تھا۔ ایک مہینا اس شادی کو خفیہ رکھنے کے بعد وہ گریس کو گھر لے آئے۔ اس کام کے لیے انہیں یقیناً گریس نے ہی مجبور کیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ چھپا رہے۔''

نصرت جو کچھ بتا رہی تھی، وہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ثروت شادی شدہ تھی اور نہیں بھی۔ اسے تا توی بیوی کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اسے ایک شخص بڑی بے حسی سے صرف اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اسے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے باپ کی طرف سے جائداد اس کے نام منتقل ہو جائے۔ ایک دو یا پھر تین چار سال بعد جب بھی جائداد اس کے نام منتقل ہو جاتی، وہ ثروت کو دھکا مار کر گھر سے نکال سکتا تھا۔

وہ اس گھر میں ایک بیکار شے کی طرح پڑی تھی جیسے کوئی ان چاہی مہمان... یا پھر کوئی بے ضرورت فرنیچر یا کوئی فالتو کپڑا۔ لیکن کیا وہ واقعی ان چاہی، بے ضرورت یا فالتو تھی؟ میرے سینے میں انگارے دہکے اور آنکھیں جل اٹھیں۔ اسے کیا پتا وہ کیا تھی؟ کسی کے لیے اس کی کیا اہمیت تھی؟ کوئی کس کس طرح اس کے لیے تڑپا تھا اور اب بھی تڑپ رہا تھا۔ وہ تو زندگی کا دوسرا نام تھی، وہ تو ہزار ہا روز و شب کا حاصل تھی۔ ان گنت دعاؤں کا گمشدہ ثمر تھی۔ میں نے چند روز پہلے اسے دیکھا تھا اور میری آنکھیں اب تک اس کی دید سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ اس کا نیج چہرہ، اس کی آبگینہ آنکھیں، اس کی دل کی گہرائی تک اتر جانے والی آواز، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

''آپ کس سوچ میں کھو گئے تابش بھائی جان؟'' نصرت کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میرے اور نصرت کے درمیان ثروت کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی۔ نصرت کے خیالات وہی تھے جو وہ اس سے پہلے پیر احمد تھانوی کے سامنے بیان کر چکی تھی۔ اس نے احمد تھانوی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن کے سارے گھریلو معاملات کو بڑی گہرائی سے دیکھتی رہی ہے اور اس کے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی بہن اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے۔

میں نے کہا۔ ''نصرت! اس بارے میں ثروت سے کبھی تمہاری کھل کر بات ہوئی ہے؟''

نصرت بولی۔ ''یہ کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ہم جرمنی میں ہی تھے۔ میں نے کئی دفعہ باجی کو کمرے میں بند ہو کر روتے دیکھا تھا۔ بے شک ناصر بھائی کی موت کا غم بھی ابھی پوری طرح بھولا نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی کہ یہ اور طرح کا غم ہے۔ ایک دن جب وہ سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں، میں نے ان سے وجہ پوچھی تو وہ بولیں کہ پاکستان بہت یاد آرہا ہے۔ پتا نہیں کہ فرح اور عاطف کہاں ہوں گے، کیا کر رہے ہوں گے اور پھوپی زینب اور ماموں عرفان۔ میں نے کہا باجی! آپ نے سب کا نام لیا ہے لیکن تابش بھائی کا نہیں لیا۔ ان کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ میں نے کہا مجھے پتا ہے باجی! آپ ان کو بہت یاد کرتی ہیں۔ وہ ہر وقت آپ کے خیالوں میں رہتے ہیں۔ آپ انہیں بھولی ہیں نہ کبھی بھول سکیں گی۔ وہ سسکنے لگیں۔ میں نے کہا، باجی! آپ دہری زندگی جی رہی ہیں۔ یہ کسی طور بھی مناسب نہیں۔ یوسف بھائی آپ کے نہیں ہیں اور نہ کبھی ہوں گے اور جو آپ کا ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ کیوں یوسف بھائی سے طلاق نہیں لے لیتیں۔ کیوں کسی کے مفاد کے لیے خود کو برباد کر رہی ہیں۔

''تابش بھائی! ان دنوں میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ باجی شاید اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہیں۔ لیکن انہی دنوں میں بیمار پڑ گئی۔ سینے میں دائیں طرف ذرا نیچے درد شروع ہوگیا۔ تیز بخار اور رات کے وقت گھٹن کی شکایت بھی شروع ہوگئی۔ اسپتال داخل ہونا پڑا۔ میری تکلیف کے دنوں میں یوسف بھائی نے بھی کافی ذمے داری اٹھائی اور بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ایسے کاموں میں وہ کافی ماہر ہیں۔ ناراض دوستوں کو منالینا، جہاں کوئی مطلب ہو وہاں اپنے لیے جگہ بنالینا، ضرورت ہو تو نرم پڑ جانا، ضرورت نہ ہو تو پتھر کی طرح سخت ہو جانا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید انہی دنوں میں باجی نے ایک بار پھر اپنا خیال بدل دیا۔ ویسے بھی ان کے پاس آپ کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ ہی پاکستان میں ہمارے کسی اور عزیز کو آپ کے اور فرح، عاطف کے بارے میں کچھ پتا تھا۔ ایسے میں بندہ کتنی دیر تک جھوٹی آسوں، امیدوں کا سہارا لے سکتا ہے۔ پھر جو کچھ بھی تھا باجی کی حیثیت ''شادی شدہ'' کی تھی۔'' نصرت کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

اس نے بیگ سے ٹشو نکال کر آنکھیں صاف کیں اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی! پھر میں نے ایک دن دیکھا کہ باجی نے کئی پرانے کاغذ جلا کر پھینک دیے۔ وہ ڈائری بھی لکھا کرتی تھیں، وہ بھی پھاڑ کر جلا دی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دن باجی نے آپ کے حوالے سے اپنے دل میں موجود ہلکی سی ہلکی امید بھی کھرچ کر پھینک دی۔ شاید انہوں نے اپنے حالات پر ہمیشہ صابر شاکر رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن نصرت... اس کے بعد وہ یوسف صاحب سے ناراض ہو کر اکیلی پاکستان آئی اور کئی ماہ اکیلی یہاں رہی بھی؟''

''وہ دوسرا معاملہ تھا تابش بھائی! گریس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا تھا... اس نے یوسف بھائی کو بھی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر دو مہینے کے اندر اندر انہوں نے باجی کو علیحدہ گھر لے کر نہیں دیا تو وہ خود گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ یہ شرط بھی لگا رہی تھی کہ یوسف بھائی، باجی سے برائے نام رابطہ بھی نہیں رکھیں گے۔ جب معاملہ بہت بڑھا تو باجی نے اپنی کچھ جیولری بیچ کر ٹکٹ کے پیسے اکٹھے کیے اور یوسف بھائی کے نام ایک طویل خط لکھ کر خاموشی سے پاکستان

آ گئیں۔"

"اور تم؟"

"میں ان دنوں یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"پھر تم لوگ ثروت کے پیچھے یہاں کیسے آئے؟"

"میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ یوسف بھائی کے والد انکل فاروقی ہیں۔ وہ تیس چالیس سال جرمنی میں رہے ہیں لیکن اب ان کی خواہش ہے کہ یوسف بھائی یہاں پاکستان میں اپنا گھر بنوائیں اور وہ اپنی زندگی کے آخری سال اپنے وطن میں گزار سکیں۔ باجی کے خاموشی سے پاکستان آ جانے کے بعد انکل فاروقی از حد پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یوسف بھائی جلد از جلد پاکستان پہنچیں اور باجی کو تلاش کریں۔ نہ صرف تلاش کریں بلکہ یوسف بھائی اور گریس دونوں ان سے معافی بھی مانگیں۔"

"تو کیا یوسف آسانی سے پاکستان آنے پر راضی ہو گیا؟"

"آسانی سے تو نہیں تابش بھائی لیکن ظاہر ہے کہ کروڑوں کی جائداد کا معاملہ ہے۔ انہیں انکل فاروقی کی بات ماننا پڑ رہی ہے۔ شروع میں یوسف بھائی نے مزاحمت کی... انہوں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ہمایوں کو پاکستان جانے پر آمادہ کریں مگر ہمایوں کی جاب کچھ اور طرح کی ہے۔ یوسف بھائی کے لیے یہ آسانی ہے کہ وہ پاکستان آ کر بھی جرمن کمپنی میں اپنی جاب بحال رکھے ہوئے ہیں۔ وہ یہیں پاکستان میں کام کر کے بذریعہ نیٹ جرمنی کے مین آفس میں بھیج دیتے ہیں۔ زیادہ ضرورت ہو تو وہاں کا چکر لگا لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پاکستان آ کر یوسف نے ثروت کو کیسے ڈھونڈا... اور وہ معافی والی بات کیا ہوئی؟"

"یہ تو پتا نہیں کہ باجی کو کیسے ڈھونڈا... بہرحال وہ یوسف بھائی کو مل گئیں۔ وہ یہاں اپنی ایک پرانی دوست کے پاس رہ رہی تھیں اور اسی کے دفتر میں ملازمت بھی کر رہی تھیں۔ جہاں تک معافی کا تعلق ہے، ضرورت پڑنے پر یوسف بھائی معافی تلافی بھی کر لیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ وقت گزاری کے لیے ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، گریس نے بھی ثروت سے معافی مانگی ہو گی؟"

"اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نصرت نے فوراً کہا۔ "اس میں بہت زیادہ اکڑ ہے۔ ابھی دو دن پہلے بھی اس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا ہے۔ معمولی سی بات تھی۔ اس نے ٹی وی کی آواز بہت اونچی کر رکھی تھی۔ باجی نے بس آواز کم کرنے کو کہا..."

میں یہ سارا واقعہ ملازمہ حمیدن کی زبانی سن چکا تھا۔

میرے اور نصرت کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔ نصرت کو اس سلسلے میں بہت تجسس تھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ مجھے اس معاملے میں نصرت سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں ابھی اس شادی کے بارے میں بتا کر نصرت کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میرا ارادہ مستقل طور پر اس شادی کو چھپانے کا ہو۔

نصرت اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ثروت کو یوسف جیسے مطلب پرست اور حیلہ ساز شخص کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے مجھ سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا اور ثروت کا کیا رشتہ تھا۔ اگر اس سلسلے میں، میں ثروت سے ملوں گا یا کوئی بات کروں گا تو اس کا الٹا اثر ہو گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں اپنے مطلب کے لیے اس کی ازدواجی زندگی کے مسئلوں کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے تابش بھائی! انہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ان کے سامنے گہرا کنواں ہے۔ اگر وہ..."

"میری بات سنو نصرت۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ایک بڑی اچھی تجویز دیتا ہوں۔ اگر تم واقعی سمجھتی ہو کہ معاملات "پوائنٹ آف نو ریٹرن" تک پہنچ چکے ہیں اور یوسف سے علیحدگی ہی ثروت کے لیے آخری حل ہے... تو پھر تم اس سلسلے میں احمد تھانوی صاحب سے مدد لو۔ وہ ایک بڑی متوازن روحانی شخصیت ہیں۔ تم ثروت کو ان سے ملواؤ۔ ساری بات کھول کر بیان کرو اور پھر ان سے مشورہ لو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ حالات کے مطابق بالکل ٹھیک مشورہ دیں گے۔ ان میں قائل کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جو مشورہ دیں، اس پر ثروت کو قائل بھی کر لیں۔"

نصرت گہری سوچ میں کھو گئی۔ پتا نہیں کیوں وہ کچھ مضمحل سی نظر آتی تھی۔ اس کے رنگ میں ایک پھیکا پن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ صورتِ حال ان گھریلو پریشانیوں ہی کا نتیجہ ہے جن کا سامنا وہ اس وقت کر رہی ہے۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "اگر آپ سچ پوچھیں تابش بھائی تو آج آپ سے ہونے والی اس اچانک ملاقات نے میرے

اندر بہت حوصلہ جگایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ ناصر بھائی کے بعد میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ جو کچھ بھی جھیلنا ہے، مجھ اکیلی کو جھیلنا ہے مگر آج ایسا نہیں ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "تم اپنی ہر فکر، پریشانی مجھے دے دو۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔ تمہارا یہ بھائی سب کچھ سنبھال لے گا۔ تم اپنی صحت کی طرف بھی توجہ دو۔ مجھے بہت تھکی ہوئی سی نظر آتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ "ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ پھر ناصر بھائی بھی چلے گئے اور یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ باجی پر جو گزر رہی ہے، وہ بھی آپ کو پتا چل گیا ہے۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اس ہنستے بستے گھر کو۔"

"ہر رات کے بعد سویرا اور ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے نصرت۔ انسان ہمت نہ ہارے اور انتظار کرے تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

وہ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ "تابش بھائی! آج آپ سے مل کر میں خوش ہوئی ہوں اور مجھے بہت ڈر بھی لگا ہے۔ ابھی اس اسنیک بار میں ہونے والی لڑائی نے مجھے بہت ڈرایا ہے۔ کہیں یہ معاملہ زیادہ میریس تو نہیں ہو جائے گا۔ مم... میرا مطلب ہے وہاں گولیاں چلی ہیں۔ آپ نے بھی گولی چلا کر ایک بندے کو زخمی کیا ہے۔ اگر..."

"اس بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں نصرت۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ بھائی بہت بدل چکا ہے۔ اب ان غنڈوں جیسے کن ٹٹے اس کی جیب میں رہتے ہیں۔" میں نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

میری اس مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں میں اطمینان آمیز حوصلے کی چمک کو نمایاں کر دیا۔

☆☆☆

میری توقع کے عین مطابق عمران نے اسنیک بار میں ہونے والے پھڈے سے بخوبی نمٹ لیا تھا اور مزے کی بات تھی کہ اس نے وہاں ہونے والے نقصان کے ضمن میں کوئی رقم بھی مالک کو نہیں دی تھی۔ صرف ایک زخمی ہونے والے لڑکی اشک شوئی کے لیے اس نے اپنی خوشی سے دو ڈھائی ہزار روپے دیے تھے۔ اس سارے واقعے میں ہمارے لیے اہم پہلو بس یہی تھا کہ سیٹھ سراج کا سراغ پھر لگتے لگتے رہ گیا تھا۔ دونوں حملہ آور گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ تاہم عمران کے کہنے پر جیلانی اپنے طور پران کا کھوج ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

اس صورتِ حال میں عمران نے میرے ساتھ طویل مشورہ کیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ سراج کے لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت خونی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم فرح، عاطف، بالو اور شاہین وغیرہ کی حفاظت کا سوچیں۔ بے شک ہم رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں آتے جاتے ہوئے بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے مگر کسی بھی وقت یہ احتیاط دھری کی دھری رہ سکتی تھی۔

سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں عمران کے راوی روڈ والے پرانے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور اسی گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں گے۔ اقبال بھی اب چھٹی گزار کر بالکل فٹ ہو چکا تھا اور سیٹھ سراج اینڈ کمپنی کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ایک دن میں، عمران اور اقبال خاموشی سے راوی روڈ والے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ جیلانی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ حفاظت کی غرض سے رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں ہی موجود رہے گا۔

جس روز ہم شفٹ ہوئے، اسی روز نصرت نے ثروت کے ہمراہ پیر احمد تھانوی صاحب سے ملاقات بھی کی۔ یہ ایک تفصیلی ملاقات تھی۔ یقیناً ثروت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ملاقات نصرت نے میرے ایما پر کرائی ہے اور نہ ہی اس کے گمان میں یہ بات تھی کہ چند روز پہلے اتفاقاً میری اور نصرت کی ایک نتیجہ خیز ملاقات ہو چکی ہے۔

جس وقت نصرت اور ثروت ایک مدکشے پر سوار ہو کر احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لیے آئیں، میں اور عمران بھی وہیں موجود تھے۔ تاہم ہم ان دونوں کے سامنے نہیں آئے۔ ثروت زرد پھولوں والی ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں... جیسے بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کا ایک روشن کنارہ۔ وہ جب چلتی تھی تو ایک عجب جاذبیت سی اس کے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی تھی۔ وہ انتظارگاہ میں چلی گئیں۔ ہم اس کمرے کے پہلو والے کمرے میں چلے گئے جہاں..... تھانوی صاحب اپنے مریضوں اور عقیدت مندوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ ایک قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے تھے۔ ان کے عقب میں ایک بہت بڑی الماری تھی جس میں یونانی طب کی مختلف دوائیں پڑی رہتی تھیں۔ وہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے تھے۔ بعض

لوگوں کا عقیدہ اتنا پختہ ہوتا تھا کہ دوا سے پہلے دعا ان پر اثر کر جاتی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ثروت کی باری بھی آگئی۔ نصرت باہر ہی رہی تھی۔ ثروت نے اکیلے میں احمد تھانوی صاحب سے ملاقات کی۔ ہم انہیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے مگر چونکہ دروازے کے بالکل قریب موجود تھے اس لیے مدھم آوازیں ہم تک ضرور پہنچ رہی تھیں۔ ثروت کے بیشتر حالات تو احمد تھانوی صاحب پہلے ہی جانتے تھے۔ ثروت نے کچھ مزید تفصیلات بتائیں۔ تاہم اس نے یہ بات احمد تھانوی صاحب پر ظاہر نہیں کی کہ وہ یوسف کی بیوی ہونے کے باوجود بیوی نہیں ہے۔

ساری باتیں سننے کے بعد احمد تھانوی صاحب نے شرعی صورتِ حال بیان فرمائی۔ انہوں نے کہا۔ ”ہمارے دین میں طلاق ۔۔ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور اس سے حتی الامکان بچنے کا حکم ہے۔۔۔بہر حال، یہ ایک جائز عمل ہے اور بعض صورتوں میں تو ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک نیک خصلت لڑکی بدقسمتی سے ایک ایسے شوہر کے پلے بندھ جاتی ہے جو بعد ازاں عادی شرابی، جواری نکل آتا ہے۔۔۔تو ساری زندگی اس شخص کے ساتھ برباد کرنے کے بجائے اور اپنے ہونے والے بچوں کا مستقبل بھی تاریک کرنے کے بجائے اس بی بی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ناپسندیدہ عمل کو اختیار کرلے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں بھی اگر کوئی کم فہم شخص اپنی بیٹی، بہن یا بچی سے یہ کہتا ہے کہ جس گھر میں اس کی ڈولی گئی ہے، اسی گھر سے اس کا جنازہ نکلنا چاہیے تو وہ بالکل غلط کہتا ہے۔“

ثروت نے دبی آواز میں کہا۔ ”حضرت! یہ حکم بھی تو ہے کہ اگر پہلی بیوی اپنے شوہر پر اپنا حق چھوڑ کر یا اس حق کو کم کرکے اس کے ساتھ رہنا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے؟“

”بالکل، ایسا کہا گیا ہے لیکن عام طور پر ان عورتوں کے لیے ہے جو بڑی عمر کی ہوں، بال بچے دار ہوں یا اس قسم کی کوئی اور وجہ ہو۔ لیکن بیٹی! جو صورتِ حال تم بتا رہی ہو، وہ اور طرح کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ شک بھی ہو رہا ہے کہ تم طلاق کے حوالے سے کسی طرح کے وہم میں بھی جکڑی ہوئی ہو۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے کھل کر بیان کرو۔“

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید ثروت اشک بار ہو گئی تھی۔ جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔ کوئی اڑتا اڑتا سا لفظ ہی ہمارے کانوں تک پہنچ پا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے والدین اور پھر ناصر بھائی کی موت کا ذکر کر رہی تھی اور احمد تھانوی صاحب کو بتا رہی تھی کہ ان پے در پے اموات نے اس کا دل بہت ہلکا کر رکھا ہے۔

یہی وقت تھا جب اچانک قریبی کمرے سے چلانے کی مردانہ آوازیں ابھریں۔ یہ چودھرانی کا بیمار بیٹا نیازا تھا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر تھا پھر بھی کسی وقت اس کا دیوانہ پن عود کر آتا تھا۔ اب بھی ہلکے ہلکے بادل موجود تھے۔ شاید اسے کہیں بجلی کی چمک نظر آئی تھی یا تھوڑی بہت گرج سنائی دی تھی۔ وہ پکار رہا تھا۔ ”یا اللہ کرم۔۔۔یا اللہ کرم۔۔۔حضرت جی بچاؤ۔۔۔حضرت جی کہاں ہو۔۔۔“

چودھرانی کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔۔۔”حضرت جی کہیں نہیں گئے۔ وہ یہیں ہیں۔ تم بس منہ میں پڑھتے رہو۔“

”کھڑکیاں بند کردو۔ برآمدے کی کھڑکیاں بھی بند کردو۔“ نیازا چلایا۔

میں اور عمران نیازے کے کمرے کی طرف گئے۔ یہاں کا منظر عبرت ناک تھا۔ نیازا پلنگ سے اتر آیا تھا اور اپنے لحاف سمیت کمرے کے ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ پورے کا پورا لحاف سے ڈھکا ہوا تھا اور لحاف کے اندر سے ہی واویلا کر رہا تھا۔ پورا لحاف لرز رہا تھا۔ چودھرانی نے لحاف سمیت نیازے کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ احمد تھانوی صاحب کا مرید خاص فرید بھی نیازے کو تسلی تشفی دینے لگا۔ کچھ دیر بعد نیازے کی بے چینی میں کمی آگئی۔۔۔ہم واپس پہلے والے کمرے میں آگئے۔ دروازے کی دوسری جانب ثروت اور احمد تھانوی صاحب میں گفتگو جاری تھی۔ احمد تھانوی صاحب قدرے بلند آواز میں بول رہے تھے۔ ان کے بیشتر الفاظ ہماری سماعت تک پہنچ رہے تھے۔۔۔وہ کہہ رہے تھے۔ ”۔۔۔سمجھو، وہم بس گھن کی طرح ہوتا ہے۔ یہ آوازیں جو تم ابھی سن رہی تھیں، یہ بھی ایک ”ضدی وہم“ کا شاخسانہ ہیں۔ اس بندے کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی اس کی جان لے لے گی۔ ذرا سے بادل آجائیں تو خوف سے اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ یہ وہم اسی طرح بندے کے ذہن کو جکڑتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طاقت اور شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اللہ پر اور اس کی قدرت پر ہمارا یقین جتنا پختہ ہوگا، ہمارے اندر واہموں اور وسوسوں سے لڑنے کی قوت اتنی ہی بڑھ جائے گی۔۔۔“

بے غیرتی

ایک شخص نے بھکاری سے نرمی سے پوچھا کہ وہ پیشہ در ہونے کے ناتے دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے۔

”پانچ، چھ سو تو آرام سے مل جاتے ہیں۔“ فقیر نے جواب دیا۔ ”لوگ یہ معاف کردو بابا والی بے غیرتی نہ کریں تو دیہاڑی ہزار روپے سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔“

کاشان یوسف، اسلام آباد

ثروت اور احمد تھانوی صاحب کے درمیان یہ گفتگو پانچ دس منٹ مزید جاری رہی پھر اگلے مریض کی باری آگئی۔

ہم شام کے بعد تک وہیں رہے۔ ثروت اور نصرت جا چکی تھیں۔ دیگر لوگ بھی رخصت ہو چکے تھے۔ احمد تھانوی صاحب رات کا کھانا بہت جلدی کھا لیتے تھے، یعنی شام کے فوراً بعد۔ انہوں نے مجھے اور عمران کو بھی کھانے میں شریک کیا۔ کھانا بالکل سادہ تھا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ احمد تھانوی صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس لڑکی کے دل میں کوئی گہرا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا شوہر یوسف بس اپنے مطلب کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ یوسف کے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ پھر بھی وہ اس سے علیحدہ ہونے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایسا کرکے وہ اپنے لیے کسی بہت بڑی مصیبت کو دعوت دے لے گی۔“

”حضرت! اپنے اس خوف کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ شاید وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ اس کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔“

”کیا ایسا تو نہیں کہ یوسف نے درپردہ اسے کوئی خطرناک دھمکی دے رکھی ہو یا کسی اور طرف سے اسے دھمکایا جا رہا ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ ہو بھی سکتا ہے لیکن بظاہر مجھے اس طرح کا امکان نہیں لگ رہا۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں جو تھوڑا بہت بتا رہی ہے، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ دھیمے مزاج کا شخص ہے۔ اپنی سوکن کے حوالے سے بھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔“

”اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے حضرت؟“

احمد تھانوی صاحب نے قہوے کا گھونٹ لے کر اپنی سفید براق داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ہولے سے بولے۔ ”کسی طرح اس خوف کا کھوج لگنا چاہیے جو اس کے اندر جگہ بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کوئی بہت قریبی عزیز اسے اپنے اعتماد میں لے اور اس کا اصل مسئلہ معلوم کرے۔۔۔“

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

ثروت سے رابطہ کرنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ میں نصرت کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ میرے پاس اس کا موبائل نمبر بھی موجود تھا۔ میں دو تین بار رازداری کے ساتھ اس سے بات چیت بھی کر چکا تھا۔ میں نے اس سے ثروت کا موبائل فون نمبر لے لیا اور پھر ایک رات اس سے رابطہ کیا۔

میں نے تین بار کال کی۔ تیسری مرتبہ اس نے کال اٹینڈ کرلی۔ ”ہیلو۔۔۔کون؟“ اس کی پریشان آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! میں تابش بول رہا ہوں۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔ مجھے تم سے ایک بہت خاص بات کرنی ہے۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر ثروت کی گمبھیر آواز ابھری۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ۔۔۔آپ مجھ سے رابطہ نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر بالکل قائم ہوں ثروت۔۔۔ لیکن ایک ایسی بات ہے جسے کیے بغیر چارہ نہیں۔ اگر میں یہ بات نہیں کروں گا تو تمہارا نقصان ہوگا اور یقین کرو ثروت۔۔۔میں تمہارا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”اس بارے میں بھی تمہیں بتا دوں گا۔۔۔بس ایک بار۔۔۔ایک آخری بار مجھ سے مل لو اور یہ ملاقات میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا رکھنا ثروت۔۔۔تمہاری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رہی ہے اور اب بھی ہے۔“

وہ جیسے سخت الجھن میں تھی۔ چند سیکنڈ بعد کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”تابش! آپ کو جو کہنا ہے فون پر ہی کہہ لیں...“

”اگر ایسی بات ہوتی ثروت تو میں تمہیں کبھی زحمت ہی نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں تم شادی شدہ ہو۔ تمہاری بہت سی مجبوریاں ہیں... لیکن ہمارا ایک بار ملنا بہت ضروری ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی تمہیں ایسی تکلیف نہیں دوں گا۔“

”یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے تابش! پلیز آپ مجھے کسی امتحان میں نہ ڈالیں۔ آپ عورت کی مجبوریوں کی بات تو کر سکتے ہیں مگر ان مجبوریوں کو سمجھ ایک عورت ہی سکتی ہے۔ میرے شوہر کو کسی طور قبول نہیں ہوگا کہ میں انہیں بتائے بغیر کسی شخص سے ملوں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔“

میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ آخر میرا دل بھر آیا۔ مجھے بڑا مان تھا اس پر۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں دل کی گہرائیوں سے کوئی التجا بھی اس کے سامنے کروں گا... وہ اسے رد نہیں کرے گی لیکن آج وہ رد کر رہی تھی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ؟ کتنی سخت دل ہو چکی تھی۔ میرے بغیر ایک پل نہ گزارنے والی، میری ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جانے والی، میری ایک آواز پر دس بار ”جی“ کہنے والی آج میرے کشکول میں ایک ملاقات کی خیرات بھی نہیں ڈال رہی تھی... حالانکہ وہ جانتی تھی، میں جو کچھ کہوں گا اس کے فائدے میں کہوں گا۔ میں اندر سے کراہ اٹھا۔ اپنی مجبوریوں کو جواز بنا کر کتنی جلدی اجنبی بنتی ہیں یہ عورتیں... کتنی سنگ دلی سے راہیں بدلتی ہیں... اور پھر مڑ کر بھی ان راہوں کی طرف نہیں دیکھتیں۔ میری آواز بھرا گئی اور میں نے فون بند کر دیا۔

ہم عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی تھے۔ یہ گنجان آبادی تھی۔ قریب کی تنگ سڑک سے موٹر سائیکلوں اور رکشاؤں وغیرہ کا ہلکا شور سنائی دیتا تھا۔ کبھی کسی خوانچے والے کی آواز ابھرتی تھی اور اس شور میں دور تک سرایت کر جاتی تھی۔ رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ عمران اور اقبال کافی دیر تک کارڈ کھیلنے کے بعد سو چکے تھے۔ بس میں جاگ رہا تھا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کہیں پڑوس کے کسی گھر میں ٹیپ ریکارڈر سے موسیقی کی لہریں ابھر رہی تھیں۔ سریلی آواز در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن... اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا...

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ یہ ثروت کا نمبر ہی تھا۔ ”ہیلو۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ثروت بول رہی ہوں۔“

”ترس آ گیا؟“

”لیکن آپ وعدہ کریں کہ... یہ آخری بار ہوگی۔“ وہ نمناک آواز میں بولی۔ ”اس کے بعد چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ رابطہ نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے ثروت۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اس کے بعد میں تمہیں ملنے پر مجبور نہیں کروں گا۔“

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ تب ثروت نے پوچھا۔ ”کہاں ملنا ہے؟“

”جہاں تمہیں آسانی رہے۔“

”میرے لیے تو گھر میں رہنے سے زیادہ آسانی کہیں نہیں ہے... آپ بتائیں۔“

”کینال روڈ کے ’کے ایف سی‘ کے سامنے آ جانا۔ میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں گا۔ اگر وہیں بیٹھنا ہوگا تو بھی ٹھیک ہے۔“

”وہیں بیٹھ جائیں گے۔“ ثروت نے کہا۔ ”میں تین بجے آ جاؤں گی اور... زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔ مجھے پانچ بجے تک گھر واپس پہنچنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ثروت۔“ میں نے کہا۔

اگلے روز تین بجے سے پہلے ہی میں ریسٹورنٹ کے سامنے موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس عمران والی مہران گاڑی تھی۔ میں اکیلا ہی آنا چاہتا تھا لیکن عمران اس پر ہرگز راضی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیٹھ سراج کے ہرکارے ہمارے اردگرد موجود ہیں، ان حالات میں وہ مجھے شہر کی سڑکوں پر تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ جیلانی والی کار میں میرے آس پاس موجود تھا۔ ہم موبائل پر کسی بھی وقت ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے تھے۔

تین بجے کے فوراً بعد ایک رکشا ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رکا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ثروت اس میں سے نکلی۔ حسب سابق وہ ایک طویل چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی دکھائی دیتی تھی۔ وہی بادلوں میں سے چاند کا روشن کنارہ۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”یہاں سے چلیں۔“

”خیریت تو ہے؟“ میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”بس چلیں آپ۔“ وہ دوبارہ بولی اور چہرے پر چادر کا نقاب کچھ اور اوپر کر لیا۔

میں نے گاڑی موڑی اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ ثروت نے کہا۔ ”وہاں چچا اختر گاڑی سے اتر رہے تھے۔“

”یہ تو پھر اچھا کیا کہ نکل آئے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل میرا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے گاڑی ضرور دیکھی تھی لیکن اس میں سے کسی کو اترتے نہیں دیکھا تھا۔

”اب کہاں جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ اس نے کہا اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

ایک دم میرے ذہن میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے پرانے گھر کی طرف موڑ دیا۔ ہمارا یہ آبائی مکان پچھلے تقریباً چار سال سے خالی ہی پڑا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد فرح یا عاطف کی کبھی یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس گھر کا رخ کر سکتے۔ ہاں، عاطف نے اتنا ضرور کیا تھا کہ عمران سے کہہ کر ایک ادھیڑ عمر بے اولاد میاں بیوی کو یہاں رہائش دلوا دی تھی... سات آٹھ ماہ پہلے، بیوی فوت ہو گئی اور ادھیڑ عمر شخص یہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت عمران تو یہاں موجود نہیں تھا تاہم جیلانی نے کوشش کی تھی اور ادھیڑ عمر شخص کو یہاں روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ یوں ہمارا یہ گھر... ہماری یادوں کا مرکز... بے آباد ہونے کے باوجود پوری طرح بے آباد نہیں ہوا تھا۔

میں ان گلی کوچوں میں داخل ہوا تو یادوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔ میں نے پی کیپ پہن رکھی تھی... سن گلاسز بھی لگا لیے۔ مجھے امید تھی کہ چلتی گاڑی میں سے کوئی فوراً ہی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ آخری بار ان گلی کوچوں میں میرے قدم کب پڑے تھے؟ آخری بار میرے قدم تب پڑے تھے جب میں سکون بخش دوا لیگزاٹانل کھا کر گھر سے نکلا تھا۔ ایک طرف ثروت کی یادوں نے مجھے بری طرح گھیرا ہوا تھا، دوسری طرف میری چچی کی بھتیجی آرسہ نے مجھ پر جذبات اور ہوس کا جال پھینکا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے دوپہر کو گیارہ بجے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور یہ عندیہ بھی دے رکھا تھا کہ اس فیصلہ کن ملاقات میں وہ اپنی ”خود سپردگی“ کے ضمن میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ میں گناہ کے اس ریشمی جال سے بچ کر نکلا تھا اور اس چلڈرن پارک کی طرف روانہ ہو گیا تھا جہاں سیٹھ سراج کی صورت میں میری زندگی کا بدترین المیہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب ماضی کی اس چمکیلی دوپہر میں میرے قدم اس تنگ سڑک پر پڑ رہے تھے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایک دو گھنٹے کے لیے نہیں، کئی برس کے لیے ان گلی کوچوں سے جدا ہو رہا ہوں... چلڈرن پارک میں وہی کچھ ہوا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں۔ سیٹھ سراج کے بے رحم گماشتوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کیا اور میں گھر لوٹنے کے بجائے کہیں کا کہیں نکل گیا۔

آج میں پھر اسی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا جس کی دوسری جانب میرا ماضی دفن تھا۔ ”یہاں کون رہتا ہے آج کل؟“ ثروت نے بے صدا اداس لہجے میں پوچھا۔

”ہیں ایک انکل۔“ میں نے مبہم جواب دیا۔

میں نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے دو تین بار ہارن دیا تو گھر کا چھوٹا گیٹ کھل گیا اور پچپن ساٹھ سال کا ایک شخص باہر نکل آیا۔ اس کی کھچڑی داڑھی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام حیات محمد تھا۔ چند دن پہلے جیلانی نے حیات کو فون پر بتا دیا تھا کہ اس گھر کا مالک گھر دیکھنے کے لیے آئے گا۔ حیات نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ یقیناً اس نے گھر کی دیوار پر میری تصویر دیکھی ہوگی۔ گھر کے کامن روم میں جو گروپ فوٹو تھا، اس میں بھی میں موجود تھا۔ حیات نے تھوڑی سی کوشش سے مجھے پہچان لیا اور فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری اور ثروت کی آنکھوں کے سامنے یادوں کا ایک جہان آباد ہو گیا۔ پچھلے چار ساڑھے چار سالوں میں گھر کے اندر بہت کم تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ حیات محمد اور اس کی مرحومہ بیوی نے بس ایک کمرا ہی اپنے استعمال کے لیے کھولا ہوا تھا۔ باقی کمرے مقفل رہتے تھے۔ ہاں، مہینے میں پانچ چھ بار ان کی صفائی ستھرائی حیات محمد اور اس کی بیوی ہی کیا کرتے تھے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ فرح کی الماری، اس کے لکھنے کی میز... عاطف کا کمرا۔ اس کا جہازی سائز ٹیپ ریکارڈر، دیواروں پر آویزاں ٹینس ریکیٹ... ماں جی کا کمرا، ان کا چوبی تخت جس پر جائے نماز بچھی تھی۔ قرآن مجید کے نسخے جو شیشے کی ایک الماری میں بڑی حفاظت سے رکھے تھے، بستر پر ان کا تہ کیا ہوا ایرانی کمبل اور پلنگ کے نیچے ان کی چپل اور جوتی۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ سب کچھ وہیں تھا لیکن ماں نہیں تھی۔ وہ آواز نہیں تھی جو بسم اللہ کہتی تھی اور وہ گود نہیں تھی جس میں، میں اپنا تھکا ہارا سر رکھتا تھا۔

ہم کمروں میں گھومتے رہے اور یادوں کو اپنے اندر

سمیٹتے رہے۔ حیات محمد نے ہماری کیفیت دیکھ کر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا اور باہر لان میں بیٹھ گیا۔

ہم کچن میں آگئے۔ کچن کی الماریوں کے خانوں میں سب کچھ ویسے کا ویسا دھرا تھا... چھوٹے چھوٹے خوش نما ڈبے... نمک، چینی، ہلدی، مرچیں، کالا زیرہ، سوکھا دھنیا... ان گنت پکوانوں کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ ہمارے لذیذ پکوان جو ہماری ماں نے اس کچن میں کھڑے ہو کر ہمارے لیے بنائے تھے اور پھر ہمیں کھاتے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئی تھیں... بہت سی گم شدہ آوازیں سماعت سے ٹکرائیں، چپاتیاں بنانے کی آواز... دیگچی میں چمچہ چلنے کی آواز، سلاد کاٹے جانے کی آواز... مجھے لگا، میری ماں یہیں کہیں ہے۔ وہ ابھی کسی اوٹ سے نکلے گی اور ڈانٹ کر کہے گی۔ اتنی دیر گھر سے باہر رہے۔ میں نے کوئی پچاس بار فون کیا ہے۔ ایسے نواب زادے ہو کہ فون ہی نہیں اٹھاتے۔

میں نے آنسو پونچھے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ صرف ماں کی یادیں ہی نہیں تھیں، ان گنت یادیں تھیں جو گوشے گوشے سے نکل کر دل و دماغ پر یلغار کر رہی تھیں۔

کھڑکی کے سامنے ہی سرخ گلاب کے وہ خوب صورت پودے تھے جو فرح نے بڑی چاہت سے لگائے تھے۔ ایک دفعہ ثروت ہمارے گھر آئی تو میں نے بہت سی کلیاں توڑ کر ثروت کو دیں پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فرح مصنوعی غصہ دکھاتی اور مجھ سے لڑا کرتی کہ اگر میں نے باجی سے اتنا زیادہ اور یوں بار بار اظہارِ محبت کرنا ہے تو پھر میں اپنے لیے لان میں ایک درجن علیحدہ پودے لگا لوں... اور سامنے ہی وہ گول ستون تھا جس کی اوٹ سے میں رات کے وقت کچن میں جھانکتا تھا۔ کچن میں روشنی ہوتی تھی۔ امی، فرح اور ثروت وہاں مصروف ہوتی تھیں اور صرف ثروت کو پتا ہوتا تھا کہ میں ستون کی تاریک اوٹ میں کھڑا ہوں اور اس کی ہر ہر حرکت دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ”ثروت! وہ اوپر والی بالکونی دیکھ رہی ہو؟“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”پتا ہے، ایک کٹی پتنگ پکڑنے کی کوشش میں تم یہاں گر پڑی تھیں۔ میں تمہیں اٹھانے آیا تھا اور خود بھی پھسل گیا تھا... اور گرا بھی تمہارے اوپر تھا۔ امی نے بہت ڈانٹا تھا کہ بیچاری کی کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی تو پھر...“

ثروت کی آبگینہ آنکھوں میں یادوں کی خوش نما چمک ابھری۔ یوں لگا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر فوراً ہی یہ چمک بجھ گئی۔ وہ رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ سنہرے ماضی کی جلترنگ جیسی گونج نے اس کے دل و دماغ میں بھی ارتعاش پیدا کیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ثروت کو یہاں لا کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ در و دیوار، یہ ماحول، یہ یادوں کا جھرمٹ، یہ سب کچھ اسے متاثر کر رہا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اس بات کے لیے بہت مناسب تھی جو میں اس سے کرنا چاہ رہا تھا۔

ہم کامن روم میں آکر بیٹھے تو حیات محمد نے کئی کھانے پینے کی اشیا لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ جوس، نمکو، چپس، کیک اور کوک وغیرہ۔ یقیناً یہ اشیا وہ ابھی سامنے والے جنرل اسٹور سے لے کر آیا تھا۔ وہ کچن میں چائے بنانے چلا گیا تو ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چھوٹی سی تمہید باندھنے کے بعد میں نے کہا۔ ”ثروت! تمہیں پتا ہے کہ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہم اسی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم ایک ایسے شیشے طرح ہو میں جس کے آر پار آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔ اور تمہیں پتا ہے کہ اس وقت میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! جب پچھلے ہفتے میں نے تمہیں اس شاپنگ مال میں پہلی دفعہ دیکھا تو تمہیں دیکھنے کے چند ہی منٹ بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم کسی بڑی الجھن میں گرفتا ہو۔ کوئی ایسی پریشانی ہے تمہارے ساتھ جو تمہیں مسلسل ایک تیز آنچ دے رہی ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں تو پھر؟“

”تم نے جتنی بار بھی یہ بات کہی ہے ثروت... مجھے تمہاری آنکھیں چہرے سے علیحدہ نظر آئی ہیں۔ اور تمہاری آنکھوں کی اس بے ساختہ ادا کو میں بہت اچھی طرح جانتا پہچانتا ہوں۔“

وہ بیزاری سے بولی۔ ”تابش! آپ ان باتوں کو چھوڑیں۔ آپ بتائیں کہ مجھے کیا خاص بات بتانا چاہ رہے تھے؟“

”وہ یہی بات تھی ثروت! میں پچھلے چند دنوں میں تمہارے لیے بہت پریشان رہا ہوں... اور میری نیت پر کسی طرح کا شک نہ کرنا۔ میں کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں

سکتا جس کی وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی اور تمہاری عزت پر ذرا سا بھی حرف آئے۔ لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میں تمہیں اس طرح کسی مصیبت میں دیکھوں اور منہ پھیر کر چلا جاؤں۔ ہمارے درمیان بس یہی ایک رشتہ تو نہیں تھا ثروت۔“

وہ بولی۔ ”ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتے جس کی وجہ سے میری عزت اور میری شادی شدہ زندگی پر کوئی حرف آئے اور دوسری طرف ایسا کر بھی رہے ہیں۔“

”کیا مطلب ثروت؟“

”اگر میرے شوہر مجھے اس طرح آپ کے ساتھ اس گھر میں بیٹھے اور اس کمرے میں باتیں کرتے دیکھ لیں تو کیا وہ اسے برداشت کر لیں گے؟“

”تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو ثروت! کیا ہمارے درمیان کوئی اور تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیا ہم نارمل انداز میں کوئی مسئلہ ڈسکس نہیں کر سکتے؟“

”بات پھر وہیں پر آجاتی ہے تابش۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”عورت بڑی کمزور شے کا نام ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ آپ وہ چار سال پہلے کے واقعات بھولے تو نہیں ہوں گے۔“

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ ”ثروت! پرانے زخموں کو چھیڑو گی تو خون رسے گا۔ تب جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میرا بھی نہیں تھا۔ اس واقعے نے تو ہم دونوں کو ڈسا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، میں تمہارے ساتھ تھا ثروت۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی پھر بھی میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے تم سے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی اور اس مہلت میں، میں نے امی کو بھی راضی کر لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا لیکن تم خاموشی سے سب کچھ چھوڑ کر چلی گئیں۔ تم نے مجھ پر بھروسا نہ کیا ثروت...“ میری آواز بھرا گئی۔

وہ خاموش رہی۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم مجھے معاف کر دو ثروت تو میں کہوں گا کہ تم نے اس وقت کم ہمتی کا مظاہرہ کیا... اور یہی کچھ تم اب بھی کر رہی ہو۔ ہاں ثروت! تم ایک بار پھر کم ہمتی دکھا رہی ہو۔ میں تمہارے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ تمہاری پُرسکون اور بہت خوش گوار ازدواجی زندگی کا سارا ماجرا مجھے پتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گھر میں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ ”آپ کو جس نے بتایا ہے تابش، غلط بتایا ہے۔ اور اگر... اگر یہ صحیح بھی ہوتا تو میں ہرگز نہ چاہتی کہ آپ میرے ذاتی معاملوں میں اس طرح دخل دیں۔“ اس کی آواز لرزنے لگی۔

”ثروت... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ میں تو...“

”پلیز تابش... پلیز!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ”میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں۔ آپ نے صرف مجھ سے ملنے کے لیے ایک بات گھڑی تھی... مجھے بہت افسوس ہے تابش... میں جا رہی ہوں...“

وہ تیزی سے واپس مڑی۔ ”ثروت! میری بات تو سنو۔“ میں نے اسے کندھوں سے تھاما۔

وہ ایک دم لرز گئی۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ”چھوڑ دیں مجھے۔ جانے دیں... جانے دیں۔“

”میری بات تو سن لو ثروت۔“

”نہیں۔“ اس نے مجھے زور سے جھٹکا۔ میرے گریبان کا بٹن ٹوٹ گیا۔ میں جو سخت ترین ضربیں سہہ لیتا تھا، بدترین درد بھی سہار لیتا تھا، اس نازک لڑکی کے دیے ہوئے جھٹکے سے اندر ہی اندر کراہ اٹھا۔ مجھے لگا جیسے میں مسمار ہو گیا ہوں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میرے بازو دو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح میرے اطراف میں جھول رہے تھے۔

اس نے اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر مڑی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ حیات محمد بھی ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ کھٹکے پر رکھا مگر اس کو کھولا نہیں۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے ماتھا دروازے (گیٹ) کی آہنی چادر سے ٹکا دیا اور اشک بہانے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ باہر نہیں نکلے گی۔ میں دھیمے قدموں سے اس کے پاس پہنچا... ”ثروت! پلیز ایسے مت کرو۔“ میرا لہجہ دھیما اور دل فگار تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر میرے ساتھ کامن روم میں بیٹھی تھی۔ حیات محمد اسے پانی کا گلاس تھما کر چلا گیا تو وہ اپنی تربتر پلکیں اٹھائے بغیر بولی۔ ”مجھے معاف کر دیں تابش...“

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں تمہیں زبردستی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے گداز لبوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن بات اس کے لبوں تک نہیں آئی۔ ہاں، آنسو اس کی بلوری آنکھوں تک ضرور آ گئے۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اپنا چہرہ آنچل میں چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل کا غبار تھوڑا کم ہوا تو بولی۔ ''تابش! میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے کہ... نصرت کو کچھ ہو جائے گا اور جو کچھ ہوگا اس کی ذمے دار میں ہوں گی... بس میں ہوں گی۔''

''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی... تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''نصرت... بیمار ہے تابش... مصیبت میں ہے... اور جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔''

''کیا ہے اسے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے کچھ پتا نہیں لیکن جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔ میں اس کی ذمے دار ہوں۔ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا بوجھ اس کے پیاروں پر ہی آتا ہے۔''

''تم نے کیا گناہ کیا ہے ثروت! تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم صرف وہم کر رہی ہو۔''

''گناہ نہیں کیا لیکن غلط سوچا تو تھا۔ ایسا خیال تو ذہن میں آیا تھا جو نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''کیا خیال ذہن میں آیا تھا؟'' میں نے اپنائیت بھرے نرم لہجے میں پوچھا۔

وہ آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ کر اس میں اپنے آنسو جذب کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ ''میں نے یوسف کو چھوڑنے کا سوچا تھا، ان سے طلاق لینے کا سوچا تھا... اور وہ سب کچھ سوچا جو مجھے نہیں سوچنا چاہیے تھا اور اس کی سزا مجھے فوراً ملی۔ میری نصرت...'' ثروت کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

چند لمحے توقف کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''نصرت کو کوئی تکلیف ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

''کس قسم کی تکلیف ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس کو جگر کی تکلیف ہے۔''

''لیکن ہے کیا؟''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں اور نہ پتا کرنے کی ہمت ہے۔ لیکن وہ بہت بیمار ہے۔ دیکھنے میں زندہ نظر... آتی ہے لیکن بیماری اس کے اندر تک اتری ہوئی ہے...''

میں نے طویل سانس لی۔ میرے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا آج کے دور میں علاج نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت نے بیماریاں بعد میں پیدا کیں، ان کے علاج پہلے بنائے۔ کیا تم نے اس کے کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرائے ہیں؟''

''ہاں... ٹیسٹ بھی ہوئے تھے۔''

''پھر؟''

''میری کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی... کہ ان کی رپورٹیں دیکھ سکوں۔ یہ رپورٹیں بس لفافوں میں بند پڑی رہ گئیں۔''

''یہ کیا بچپنا ہے ثروت! تم نے اس کے ٹیسٹ کرائے اور پھر رپورٹیں بھی نہیں دیکھیں اور کہہ رہی ہو کہ اسے جگر کی تکلیف ہے۔''

وہ سسک کر بولی۔ ''مجھے پتا ہے کہ تکلیف ہے... لیکن شاید میں اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی۔ میں سوچتی ہوں کہ جو کچھ ہے... کم ہے یا زیادہ ہے، یا بہت زیادہ ہے بس چھپا ہی رہے... اور قدرت اسی طرح نصرت کو صحت دے دے۔ میں اس کا روحانی علاج کروا رہی ہوں... رات دن دعائیں بھی کر رہی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اوپر والا یہ دعائیں ضرور سنے گا۔ وہ اب پہلے سے کافی بہتر نظر آتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ثروت... مجھے روحانی علاج سے ہرگز انکار نہیں لیکن دعا اور دوا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس دنیا کو اسی لیے دارالاسباب کہا جاتا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سبب مہیا کرتے ہیں... پھر اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔ رزق، شفا، خوشی، کامیابی ایسی سب چیزوں کے لیے دعا اور کوشش دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''لیکن... لیکن وہ تو قادرِ مطلق ہے نا۔ وہ تو سبب کے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔''

''اس کو معجزہ کہتے ہیں لیکن معجزے تو کبھی کبھی رونما ہوتے ہیں۔ اگر وہ عام ہو جائیں تو پھر معجزے ہی نہ رہیں۔ ہمیں معجزوں کی آس ضرور رکھنی چاہیے لیکن ہر وقت انہی کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیے۔ اب... اب تمہاری یہ منطق بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم نے جگر وغیرہ کی کسی تکلیف کے لیے نصرت کے ٹیسٹ تو کرائے ہیں لیکن رپورٹوں کو کھول کر ہی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے...''

''بس... میں خود کو کسی بڑے وہم میں ڈالنا نہیں

چاہتی۔“

”بڑے وہم میں تو تم خود کو اب ڈال رہی ہو۔ ہوسکتا ہے ثروت کہ وہ رپورٹیں صحیح ہوں یا اتنی خراب نہ ہوں، جتنا تم انہیں سمجھ رہی ہو۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہے بھی تو پھر وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ایسی بیماریوں کے علاج کے لیے وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ثروت! تمہاری یہ بات بھی بالکل منطق کے بغیر ہے کہ تم نے اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور اس کے نتیجے میں نصرت بیمار ہوگئی۔ یہی واہمے اور "ILLUSIONS" ہوتے ہیں جو ہمیں آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا سے بہت دور لے جاتے ہیں۔“

”ہر کام کا پھل تو ہوتا ہے نا۔“ وہ بدستور اٹک بار تھی۔

”بالکل ہوتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اور برے کا برا۔ لیکن تم نے ایسا کون سے برا کام کیا یا کرنے کا سوچا جس کے نتیجے میں نصرت پر کوئی بوجھ آیا۔ اگر تم نے بہ حالتِ مجبوری اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا تو یہ گناہ نہیں ہے۔ مذہب، معاشرہ، قانون سب تمہیں اس کا حق دیتے ہیں...“

”لیکن... یہ فیصلہ کرنا بھی تو آسان نہیں کہ کیا اس طرح کے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ میں ایسا سوچتی۔“

وہ اپنے موقف پر بہت مضبوط نظر آتی تھی... میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”ثروت! یہ ایک لمبی بحث ہے اور شاید ہم اس قابل بھی نہیں کہ اس پر کوئی بہت معتبر رائے دے سکیں۔ اب جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ نصرت بیمار ہے... زیادہ ہے یا کم ہے، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اگر ہم اس بیماری کی طرف سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے رکھیں گے تو یہ مسئلہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ تھوڑی سی ہمت دکھا کر تمہیں کم از کم وہ رپورٹس تو دیکھنی چاہئیں۔ کتنا عرصہ ہوا ہے وہ ٹیسٹ کروائے ہوئے؟“

”ایک سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ان دنوں ہم جرمنی میں ہی تھے۔ نصرت کو تیز بخار ہوا اور ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی۔ میں نے اسے معمول کا بخار سمجھا لیکن جب وہ جلد ٹھیک نہیں ہوئی تو ایک جرمن معالج کو دکھایا۔ وہ ہومیو پیتھک ٹائپ کے تھے اور جڑی بوٹیوں کے عرق سے علاج کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اکیلے میں بتایا کہ مریضہ کا جگر بہت زیادہ خراب ہو چکا ہے۔ وہ بظاہر اتنی بیمار نظر نہیں آ رہی، جتنی اصل میں ہے اور انہیں یہ بھی شبہ ہے کہ یہ جگر کا کینسر ہے۔ ڈاکٹر کی اس بات نے میری دنیا اندھیر کر دی۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی لیکن پھر کسی نہ کسی طرح میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جگر کا کینسر دنیا کے خطرناک ترین امراض میں سے ہے اور اس کے مریض شاذ و نادر ہی بچ پاتے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے، ہماری ممانی شفقت بھی دبئی میں اسی مرض کے ہاتھوں اپنی زندگی ہاری تھیں۔ ڈاکٹروں نے واحد حل یہ بتایا تھا کہ ان کے جگر کی پیوندکاری ہوگی لیکن اس سے بہت پہلے ہی ان کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، مجھے وہ واقعات یاد ہیں۔“

ثروت نے گمبھیر لہجے میں بات جاری رکھی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں... اس کے ساتھ ساتھ میرا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ قدرت مجھے اتنے سخت امتحان میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ناصر بھائی کے بعد نصرت بھی موت کے رستے پر چل پڑے۔ میں نے نصرت کو کچھ نہیں بتایا۔ اسے یہی معلوم ہے کہ اسے عام قسم کا یرقان ہے جو علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ دو ہفتے بعد میں... نصرت کو ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے ایک دو ابتدائی ٹیسٹ کرائے۔ اس کے بعد چند اہم ٹیسٹ لکھ کر دیے۔ یہ ڈاکٹر بھی ابتدائی ٹیسٹوں کی رپورٹ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ نئے ٹیسٹ کافی مہنگے بھی تھے۔ قریباً پانچ ہزار یورو میں ہوئے... ان دنوں میں دروازے بند کر کر کے روتی تھی اور کوئی غم دل کو آرے کی طرح کاٹتا رہتا تھا۔ انہی دنوں فرینکفرٹ کی ایک مسجد کے امام عبدالحمید صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہاں باقاعدہ مدرسہ بنایا ہوا تھا... اور درس وغیرہ دیتے تھے۔ ان کی عمر چالیس سال کے قریب ہے... بڑے پرہیزگار بندے ہیں۔ میں اکثر ان کو مدرسے کے لیے پیسے وغیرہ دیتی رہتی تھی۔ زکوٰۃ کے پیسے بھی ان کو ہی دیتی تھی۔ ان کو میری اس مصیبت کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دواؤں اور ڈاکٹروں وغیرہ کے چکر سے بچ جاؤں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ تو رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔ ایک بیماری ٹھیک کرتے ہیں تو ساتھ دس اور لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ وظیفے بتائے، اس کے علاوہ ایک خاص قسم کا معدنی پانی دم کر کے دیا۔ یہ پانی اردن اور فلسطین کے کچھ چشموں سے لایا جاتا ہے اور لوگ اس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ امام عبدالحمید صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے عجیب سا اطمینان حاصل ہوا۔ انہی دنوں نصرت کے ٹیسٹوں کی رپورٹس بھی آ گئی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں رپورٹس دیکھوں گی اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے ملوں گی... اب ان باتوں کو قریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ نصرت کا علاج اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح امام عبدالحمید صاحب نے کہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر بھی لگتی ہے لیکن کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ بیماری اس کے اندر ہے اور کسی وقت ابھر کر سامنے آ جائے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”ثروت! اپنی بیماری کا نصرت کو کہاں تک پتا ہے؟“

”اسے کچھ پتا نہیں۔“ ثروت نے بڑے دکھی انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ بس اتنا ہی جانتی ہے کہ اس کے معدے، جگر میں تھوڑا بہت نقص ہے جس کی وجہ سے کسی وقت ہاتھ پاؤں پر سوجن آتی ہے یا بخار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مصیبت سے بے خبر ہر وقت میری پریشانیوں میں گھری رہتی ہے۔ یہاں شاہ جمال کے علاقے میں ایک اللہ والے ہیں... پیر احمد تھانوی صاحب۔ تین دن پہلے مجھے ان کے پاس لے کر گئی ہوئی تھی۔ میرے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے اور میں اس کی صحت کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی رہتی ہوں۔“ ثروت کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

میں چند دن پہلے نصرت سے مل چکا تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت ہونے کے باوجود بجھی بجھی سی تھیں۔ رنگت بھی زردی مائل تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا پورا وجود کسی اضمحلال کی زد میں ہے۔

میں نے ثروت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ زیادتی تم اپنے ساتھ کر رہی ہو اور نصرت کے ساتھ بھی... اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا ثروت۔ اگر تم میں وہ رپورٹس دیکھنے کا حوصلہ نہیں تو وہ مجھے دے دو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو میں ہر چیز کا سامنا کروں گا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مصیبت دور نہیں ہوتی۔ اس کا ہمت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔“

ثروت شدید ترین تذبذب میں نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف اسے میرے بے لوث رویے اور جراُت مندانہ انداز سے کچھ حوصلہ بھی مل رہا تھا۔

آخر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تابش! میں آپ کو وہ رپورٹس دکھا دیتی ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ بھی برا سننے کا حوصلہ نہیں۔ آپ مجھے فوری طور پر ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ نہ اچھا، نہ برا۔“

”ٹھیک ہے ثروت! میں کچھ نہیں بتاؤں گا بلکہ میں نصرت کی پوری ذمے داری بھی لیتا ہوں۔ اگر مجھے ڈاکٹروں وغیرہ سے مشورہ کرنا پڑا تو خود ہی کروں گا۔ اور اگر نصرت کو علاج کی ضرورت ہوئی تو پھر بھی میں ہر طرح کے تعاون کو تیار ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے ثروت کے حالات اتنے برے نہیں جتنے تم نے سمجھ لیے ہیں۔ تم نے ایک امکان کو ٹھوس حقیقت کی شکل دی ہے اور پھر اس ”حقیقت“ کے خوف کو اپنے اندر بڑھاتی چلی گئی ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ نصرت کی تکلیف اتنی سنگین ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یوں چل پھر نہ رہی ہوتی۔“

”جی؟“ ثروت نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ثروت کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں نصرت سے ملا ہوں، نہ ہی نصرت نے اسے بتایا تھا۔ میں نے جلدی سے بات بدلی۔ ”تم نے خود ہی بتایا ہے نا کہ نصرت بظاہر ٹھیک ہے اور روزمرہ کے کام بھی کرتی ہے۔“

ثروت نے کہا۔ ”میں آپ کو وہ رپورٹس کس طرح پہنچاؤں؟“

”جیسے تم مناسب سمجھو۔ یہیں آ کر دے جاؤ یا پھر ٹی سی ایس کر دو۔ میں تمہیں ایڈریس لکھوا دیتا ہوں۔“

”میں ٹی سی ایس کر دوں گی۔“

”لیکن فون پر مجھ سے رابطہ ضرور رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ میں کال کرتا رہوں اور تمہاری طرف سے جواب ہی نہ ہو۔“

وہ خاموش رہی۔ پھر ہولے سے بولی۔ ”اگر بات کرنا ضروری ہو تو رات دس بجے کے بعد کال کیجیے گا۔“

ہمارے درمیان دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ میری حوصلہ افزا باتوں سے ثروت کو کافی ڈھارس ملی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نصرت کی رپورٹس ضرور بھجوائے گی۔

میرا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں، عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی موجود تھا۔ میں اور اقبال ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ عمران فون پر شاہین سے لڑائی کرنے میں مصروف تھا۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا۔ ثروت کی بھیجی ہوئی رپورٹس آ گئی تھیں۔

لفافہ میرے ہاتھ میں تھا اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اقبال اور عمران بھی اپنی اپنی مصروفیات چھوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ وہ دونوں بھی تمام تر صورت حال سے آگاہ تھے۔ پچھلے تین چار دن کی پریشانی اب نکتۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ یہ رپورٹس اچھی ہوں اور میں ابھی ثروت کو فون کر کے اسے خوش خبری سنا سکوں۔ ایسی سنگین نوعیت کی رپورٹس کو دیکھنا بھی کتنا اعصاب شکن عمل ہوتا ہے۔ میں نے لفافہ عمران کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

"تم کھولو۔"

وہ بولا۔ "یہ بھی تو ہم پرستی کی ایک قسم ہے۔"

بہرحال اس نے لفافہ کھولا۔ فرینکفرٹ کی کوئی لیب تھی۔ بہرحال رپورٹس انگلش میں تھیں۔ سب سے اوپر نصرت کا نام لکھا تھا... اور تاریخ درج تھی۔ نیچے دیگر CONTENTS تھے۔ اے سے زیڈ تک سارے حرف کاغذوں پر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے سیاق وسباق اور پس منظر کی وجہ سے یہ کبھی روشن پیشانیوں والے فرشتوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی زہریلے ناگ بن جاتے ہیں۔ نصرت کی میڈیکل رپورٹس پر نظر آنے والے حرف بھی زہریلے ناگوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ہمیں پہلی رپورٹ دیکھنے کے ساتھ ہی پتا چل گیا کہ نصرت کو جگر کا کینسر ہے اور یہ کافی پھیلا ہوا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عمران اور اقبال بھی گم صم نظر آرہے تھے۔ ہم نے دیگر رپورٹس بھی دیکھیں۔ ان میں سے کچھ خون اور پیشاب کے حوالے سے تھیں۔ ایک معدے کی کیسٹر یالوجی کا رزلٹ تھا۔ ایک دوسری رپورٹ سے پتا چل رہا تھا کہ نصرت کے جگر کا تقریباً تین چوتھائی حصہ اور جگر تک پہنچنے والی دو نالیاں متاثر ہوچکی ہیں اور یہ نتیجے قریباً ایک سال پہلے کے تھے۔ اب کیا پوزیشن ہے؟ یہ یقیناً ایک اور تشویشناک سوال تھا۔

عمران نے اپنے ایک واقف کار ڈاکٹر کو فون کیا۔ ان ڈاکٹر صاحب نے جگر کے ایک اسپیشلسٹ سرجن امتیاز علی سے عمران کی بات کرائی۔ عمران نے رپورٹس کے وہ حصے سرجن امتیاز کو پڑھ کر سنائے جن میں خاص میڈیکل اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں اور جن کو ہم سمجھ نہیں پارہے تھے۔

امتیاز علی صاحب نے یہ حصے سننے کے بعد ہم سے لیبارٹری اور پیتھالوجسٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد گمبھیر لہجے میں بولے۔ "دیکھیں بھئی، اگر یہ رپورٹس درست ہیں اور ایک سال پرانی بھی ہیں اور اس دوران میں مریضہ کا خاطر خواہ علاج بھی نہیں ہوا تو پھر اس کے لیے کافی مشکلات ہیں۔ وہ کسی بھی وقت COLLAPSE کرسکتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال جاننے کے لیے آپ کو نئے ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور فوری طور پر کسی اچھے اسپتال سے رجوع کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں آپ پہلے ہی کافی وقت ضائع کرچکے ہیں۔ اگر یہ رپورٹس آپ کے پاس موجود تھیں تو پھر آپ کو ہرگز تاخیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

اب میں سرجن صاحب کو کیسے بتاتا کہ یہ رپورٹس تو ابھی تک لفافے میں بند پڑی تھیں، انہیں پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔

اگلے روز میں اور عمران نصرت کی انہی پرانی رپورٹوں کے ساتھ سرجن امتیاز علی سے ملے۔ انہوں نے مزید تفصیل سے رپورٹس کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے بتایا۔ "یہ کینسر رسولیوں کی شکل میں ہے۔ قریباً سات سینٹی میٹر کی تین چار رسولیاں ہیں۔ جگر کا بہت تھوڑا حصہ کام کررہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے STAGING کرنا ہوگی۔"

"اس سے کیا مراد ہے جناب؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم اندازہ لگائیں گے کہ بیماری اب کس مرحلے میں ہے۔ کیا وہ صرف جگر تک محدود ہے یا قریبی اعضا معدے اور پھیپھڑے وغیرہ بھی متاثر کرچکی ہے۔ اس کے لیے ہمیں مریضہ کا سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ کرنا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ہم لیپرواسکوپی کے ذریعے جگر کا کوئی ٹشو بھی حاصل کریں اور اس کا معائنہ کریں۔"

"ان ٹیسٹوں پر اندازاً کتنا خرچ آئے گا؟" عمران نے پوچھا۔

سرجن امتیاز علی نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "یہ سارا علاج بہت مہنگا ہے۔ اگر آپ سارے ضروری ٹیسٹ کرائیں تو میرے اندازے کے مطابق ان ٹیسٹوں پر ہی چھ سات لاکھ روپیا خرچ ہوگا۔ پھر کچھ چیزیں بیماری کی نوعیت پر بھی منحصر ہیں۔ کئی صورتوں میں علاج پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر امتیاز سے ملاقات کے بعد ہم گھر واپس آئے اور تادیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ صورتِ حال ازحد تشویشناک تھی۔ میری نگاہوں میں نصرت کا خوب صورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ بے چاری اپنی حالت سے بے خبر تھی۔ اپنی تکلیف کو معمولی تکلیف سمجھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار احمد تھانوی صاحب سے ملی تو اس نے دیگر پریشانیوں کے علاوہ اپنے رشتے کی بات بھی کی اور تھانوی صاحب سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے اچھے بر کی دعا کریں۔

رات کے دس بجے تو میں نے، عمران اور اقبال کے مشورے کے مطابق ثروت کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ اس سے چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے اس سے نصرت کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "ثروت! میں نے ساری رپورٹس دیکھ لی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو بھی دکھا دی ہیں۔ تم یقین رکھو، سب اچھا ہوجائے گا اور بہت جلدی ہو جائے گا۔ نصرت ایک دم فٹ ہوجائے گی۔"

"کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"نصرت کے ایک دو مزید ٹیسٹوں کی ضرورت ہے۔ عام سے ٹیسٹ ہیں۔ وہ چند گھنٹوں میں فارغ ہوجائے گی۔"

"کہاں... جانا ہوگا؟"

"یہیں لاہور میں۔ جیل روڈ پر ایک کلینک ہے۔"

"کتنے پیسے لگیں گے؟"

"کچھ زیادہ نہیں ثروت... آٹھ دس ہزار میں کام ہو جائے گا۔ ایک دوست سے بات کی ہے میں نے۔ وہ رعایت سے کام کروادے گا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"لیکن... نصرت کو تو کل سے بخار ہے۔ کوئی چیز ہضم بھی نہیں کررہی ہے۔"

"ایسا تکلیف کی وجہ سے ہے۔ علاج شروع ہوگا تو دنوں میں بہتر نظر آنے لگے گی۔"

ثروت شروع میں تو متذبذب نظر آئی لیکن پھر آمادہ ہوگئی۔ اس کا شوہر یوسف لاہور سے باہر تھا۔ طے ہوا کہ کل سہ پہر چار بجے وہ نصرت کو لے کر جیل روڈ کے پرائیویٹ کلینک میں پہنچ جائے گی۔

وہ اسی سوئفٹ کار میں آئی جس پر میں نے اسے پہلی بار گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا... گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ دونوں بہنیں پچھلی نشست پر موجود تھیں۔ ثروت کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ نصرت واقعی لاغر نظر آرہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اور نصرت نے ثروت کے سامنے بالکل ظاہر نہیں کیا کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ نصرت نے جذباتی انداز میں میرا حال احوال پوچھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھوڑی بہت اداکاری کرنا پڑی۔ میری اور اپنی ملاقات کے بارے میں ثروت اسے بتا ہی چکی تھی۔ اس جدید کلینک میں نصرت کے مختلف ٹیسٹ شروع ہوئے تو ثروت کے چہرے پر نظر آنے والی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ٹیسٹ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ سی ٹی اسکین، ایم آر آئی اور لیپرواسکوپی وغیرہ کو عام ٹیسٹ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں نے ثروت سے کہا۔ "آج کل یہی طریقۂ کار ہے۔ ڈاکٹر صاحبان علاج شروع کرنے سے پہلے ہر طرح کی تسلی کرلیتے ہیں۔"

"میرے اندازے کے مطابق تو یہ کافی مہنگے ٹیسٹ ہوں گے۔" ثروت منمنائی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ سارا کام عمران اپنے کسی ریفرنس سے کروا رہا ہے۔"

ثروت کا رنگ زرد ہورہا تھا۔ شاید وہ جان رہی تھی کہ صورتِ حال وہ نہیں جو اسے بتائی جارہی ہے۔ لیکن وہ اس حوالے سے میرے ساتھ کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس خشک لبوں پر زبان پھیرتی چلی جارہی تھی۔ میں اس کی ہر ہر ادا کو جانتا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج کو اتنی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے ٹیلی پیتھی سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ وہ میرے اندر رہتی تھی۔ میری روح میں مدتوں سے بستی تھی اور وہ ان گھڑیوں میں بے حد پریشان تھی۔

نصرت کے ٹیسٹ وغیرہ مکمل ہونے میں قریباً پانچ گھنٹے لگ گئے۔ وہ خود بھی کافی الجھن میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں زردی سی اتری ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ "تابش بھائی! آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کیا میں زیادہ بیمار ہوں؟"

میں نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "نصرت! اپنی حالت کا پتا مریض سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتا۔ کیا تم خود کو بہت زیادہ بیمار محسوس کرتی ہو؟"

"بس... بھوک آج کل کم لگتی ہے اور دو چار دن سے بخار ہے۔"

"تو پھر وہم کیوں کررہی ہو؟ تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ معدے کا پرابلم ہے تمہیں، یا پھر جگر کی معمولی سوزش ہے۔ یہ لیب عمران کے ایک دوست کی ہے۔ اس لیے احتیاطاً سارے ٹیسٹ کروالیے ہیں۔"

"کتنا خرچ ہوا ہے؟" ثروت نے مجھ سے پوچھا۔

"بس سمجھو... نہ ہونے کے برابر۔"

"نہیں، اس طرح نہیں ہوگا تابش! آپ بتائیں کتنے پیسے لگے ہیں۔"

میں نے نہیں بتایا لیکن جب ان دونوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے ان سے پچیس ہزار روپے لے لیے۔ اصل خرچہ ڈھائی لاکھ کے قریب تھا۔

ثروت اس ساری صورتِ حال سے مطمئن نظر نہیں آتی تھی، بہرحال خاموش تھی۔ اس پرائیویٹ اسپتال کے "فوڈ ایریا" میں بیٹھ کر ہم نے قریباً ایک گھنٹا گفتگو کی۔ دس پندرہ منٹ کے لیے عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہوا۔ عمران کی شخصیت اور اس کے مخلص و بے لوث انداز نے ثروت اور نصرت کو متاثر کیا۔ عمران کے جانے کے بعد بھی

میں ثروت اور نصرت سے باتیں کرتا رہا۔ ثروت نے نصرت کو سب بتا دیا تھا کہ مجھ سے اس کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی لیکن نصرت نے مجھ سے ملاقات کے بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایسا اس نے میرے کہنے پر ہی کیا تھا۔ بہرحال، ثروت کے ذہن میں ابھی تک یہ الجھن موجود تھی کہ میرے پاس اس کا موبائل فون نمبر کیسے پہنچا۔

وہاں فوڈ ایریا میں ہماری گفتگو زیادہ تر نصرت کی تکلیف اور اس کے علاج کے گرد ہی گھومتی رہی۔ میں نے ثروت اور نصرت سے کہا کہ وہ بے شک روحانی علاج بھی جاری رکھیں مگر اس کے ساتھ اگر ڈاکٹر کچھ دوائیں تجویز کرتا ہے تو نصرت انہیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرے۔ نصرت اس پر آمادہ تھی۔

ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی۔

...اگلے چند روز سخت کشمکش کے تھے۔ نصرت کی کچھ رپورٹس کا نتیجہ کراچی سے بھی آنا تھا۔ ثروت دن رات دعاؤں میں مصروف تھی۔ وہ احمد تھانوی صاحب کے پاس بھی دو چکر لگا چکی تھی۔ میں، عمران اور اقبال راوی روڈ والے مکان میں تھے۔ گنجان آبادی میں گھرا ہوا یہ گھر ہماری دھینگا مشتیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا لیکن نصرت والی پریشانی کے سبب آج کل ہم سب سنجیدہ تھے۔ ہاں، عمران کسی وقت ضرور شاہین سے چونچ لڑا لیتا تھا۔ شاہین، رائے ونڈ روڈ والی شان دار کالونی میں فرح اور عاطف کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھی۔ اب بھی فون پر عمران اور شاہین میں کشمکش جاری تھی۔ عمران اسے بتا رہا تھا کہ اسے ایک فلم میں اسسٹنٹ مین کا کام ملا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ سیکنڈ ہیرو کا کردار بھی کرے گا۔ یہ فلم ریما پروڈیوس کر رہی ہے اور اس کی ہیروئن بھی وہی ہے۔

شاہین نے جواباً اسے چڑانے کے لیے کہا۔ "مجھے بھی اکشے کمار کا فون آیا تھا۔ اس نے انڈیا میں ہمارا شو دیکھا تھا۔ وہ سرکس کے موضوع پر فلم بنا رہا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ ہیروئن لینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔"

"لیکن اکشے تو پیسے والا بندہ ہے۔ اسے گھٹیا اور زہریلی شراب پینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا مطلب؟" شاہین کی آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔

"بھئی زہریلی شراب پینے سے ہی تو لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اندھا ہوا ہے تو اس نے تمہیں ہیروئن کاسٹ کرنے کا سوچا ہے نا۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے، ریما اور نرگس کی آنکھیں سلامت ہیں جو وہ تم پر سو جان سے فدا ہوئی پڑی ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے پاس اب ایسی باتوں کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہوں بالکل جیسے رنبیر کپور انڈیا میں ہے۔ ہم دونوں کے شیڈول آج کل بڑے ٹائٹ ہیں۔ باقی فلم میں میرے کاسٹ ہونے کی اطلاع بالکل سچی ہے۔ اگر یقین نہیں تو کل کے اخبارات میں نیوز دیکھ لینا۔"

شاہین نے کہا۔ "اگر ایسا ہے بھی تو... تم مجھے کیا بتانا چاہتے ہو؟"

"دیکھو، جو درمیانی عمر کا "لڑکندہ" میں نے تمہارے لیے دیکھا ہے، لاکھوں میں ایک ہے۔ نیوز چینل میں ملازم ہے۔ تم دولت میں کھیلو گی اور رعب دبدبہ علیحدہ۔ پلیز، میرا خیال دل سے نکال دو۔ ہمارے ستارے کبھی نہیں ملیں گے۔"

وہ جل کر بولی۔ "اللہ نہ کرے ہمارے ستارے ملیں۔ اس سے تو اچھا ہوگا کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں۔"

"دقیانوسی باتیں مت کرو۔ آج کل کنوئیں کہاں ہوتے ہیں۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں ٹرین کے نیچے سر رکھ کر یا خود پر پیٹرول چھڑک کر یا بجلی کا جھٹکا کھا کر مر جاؤں گی۔" اس نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ویسے یہ سارے طریقے بھی کافی محال ہیں۔ یہ چیزیں اب ملتی ہی کہاں ہیں۔"

"جس نے مرنا ہو وہ کوئی نہ کوئی رستہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔"

"اسٹیج ڈراموں میں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مرجانا پر کسی غریب کے کام نہ آنا۔ اچھے لوگ اپنے اعضا عطیہ کر جاتے ہیں... تم تو پوری کی پوری عطیہ ہو۔ یہ خوب صورتی، یہ شباب، یہ چمک دمک... ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرو گی تو یہ سخت قسم کا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اگلی دنیا میں جاتے ساتھ ہی تمہاری مرمت شروع ہو جائے گی۔ فلمسٹار زینت امان کا ایک مشہور فرانسیسی شعر ہے۔ اس کا ترجمہ فراق گورکھ پوری نے کچھ اس طرح کیا ہے، اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جاویں گے... مر کے بھی شانتی نہ پائی تو کدھر جاویں گے۔ شاہین! میں تو اب بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ وہ لڑکندہ..."

اس نے فون بند کر دیا۔ عمران کے چہرے پر شریر مسکراہٹ تھی۔

اقبال نے آنکھیں اوپر چڑھا کر کہا۔ "یا اللہ... یہ کیسے کیسے انکشاف ہو رہے ہیں۔ فلمسٹار زینت امان شعر کہتی

تھی اور ان کا ترجمہ بھی ہوتا تھا۔"

عمران بولا۔ "تمہیں اعتراض کس پر ہے، زینت امان پر یا ترجمے پر؟"

"ہمیں تم پر اعتراض ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ خدا کا خوف کرو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو... اور آتے ساتھ ہی اسے گھر سے بے گھر بھی کر دیا ہے۔ اب اسے ستانے پر تلے ہوئے ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ چلو، اس کی محبت کا اقرار نہ کرو مگر اس طرح اس کی توہین تو نہ کرو۔"

"اس وقت تو بالکل شاہین کے بڑے بھائی لگتے ہو تم۔" وہ مسکرایا۔

"چلو بڑا بھائی ہی سمجھ لو لیکن اگر میں نے عقل کی بات کی ہے تو اس پر غور کرو۔"

اسی دوران میں عمران کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے چہرے پر پھر شرارت کی چمک نمودار ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پھر شاہین کا فون آیا ہے لیکن دوسری طرف اس کا دوست ڈاکٹر فہد تھا۔ اس نے عمران کو بتایا کہ نصرت کی رپورٹس آگئی ہیں... اور یہ بھی بتایا کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں۔

وہ جو ماحول میں تھوڑی سی خوش گواری آئی تھی، ایک دم کافور ہوگئی۔ میں اور عمران ڈاکٹر فہد کے کلینک پہنچے اور وہاں سے سرجن ڈاکٹر امتیاز علی کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز صاحب نے ساری رپورٹس اور پرنٹ آؤٹ وغیرہ دیکھنے کے بعد چشمہ اتار کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ "اب سب کچھ سامنے ہے اور ایک مکمل تصویر بن رہی ہے... اور یہ تصویر اچھی نہیں ہے۔"

ہم سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سی ٹی اسکین کا ایک پرنٹ ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "جگر تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ پچھلے ایک سال کی تاخیر نے بیماری کو بہت پھیلا دیا ہے۔ یہ دیکھیں... یہ سارا ایریا متاثر ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ متاثرہ حصے کو فریز کرنے سے یا پھر یہاں جراحی کے عمل سے کچھ فائدہ ہو جائے گا۔"

"تو پھر جناب؟"

انہوں نے طویل سانس لی۔ وہی سانس جو کوئی گمبھیر بات کہنے سے پہلے اعصاب کو کمپوز کرنے کے لیے لی جاتی ہے۔ نشست سے ٹیک لگا کر بولے۔ "اگر کوئی چانس نظر آتا ہے تو وہ ٹرانسپلانٹیشن میں ہی ہے... جگر کی تبدیلی... اور یہ کوئی معمولی طریقۂ کار نہیں ہے۔ یہ ہر لحاظ سے مشکل ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے، جگر بیکار ہو چکا ہے؟"

"تقریباً ہو چکا ہے۔ بہت تھوڑا حصہ کام کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مریضہ کی ظاہری حالت اس کی اندرونی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن یہ زیادہ دیر بہتر نہیں رہے گی۔ اچانک ہی بریک ڈاؤن ہوگا۔ ایسے بریک ڈاؤن میں دو چار دنوں میں ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے..."

"او گاڈ۔" عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑنے لگی۔ جواں سال نصرت کا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

امتیاز صاحب نے کہا۔ "اس بدترین صورتِ حال میں اگر کوئی اچھا پہلو ڈھونڈا جا سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ بیماری ابھی جگر سے باہر نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے اردگرد کے ٹشوز اور BLOOD VESSELS کو ٹچ کیا ہے۔ یہ صورتِ حال جگر کی ٹرانسپلانٹیشن کے لیے بہترین سمجھی جاتی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اس کام پر کیا کاسٹ آسکتی ہے؟"

امتیاز صاحب بولے۔ "یہ آپریشن انڈیا میں ہو تو رہے ہیں اور وہاں کاسٹ بھی نسبتاً کم ہے لیکن وہاں باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہاں پہنچنے کا "پروسیجر" بھی لمبا ہے جبکہ مریضہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر کسی مغربی ملک میں یہ آپریشن ہو سکے تو مناسب ہے۔ لیکن وہاں اخراجات بہت ہوں گے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ جگر کا عطیہ مل جائے۔"

"کیا اس کے لیے پورا جگر درکار ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دو طرح کے آپریشن ہوتے ہیں۔ ایک کو جگر کی پیوندکاری کہہ سکتے ہیں، دوسرے کو جگر کی تبدیلی۔ یہ تو جگر کی حالت پر منحصر ہوتا ہے کہ کون سا آپریشن ہوگا..."

وہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ خاصی پریشان کن اور گمبھیر تھی۔ ایک بہت بڑا امتحان تھا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ نصرت کی زندگی خطرے میں تھی۔

ہم گھر واپس آئے تو چونک گئے۔ اندر کوئی مہمان موجود تھا اور اقبال سے مصروفِ گفتگو تھا۔ یہ ثروت تھی۔ وہ بذریعہ رکشا یہاں پہنچی تھی اور برقع میں آئی تھی۔ اس گھر کا ایڈریس اسے میں نے ہی بتایا تھا۔

"تم کب آئیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس ابھی پانچ منٹ پہلے پہنچی ہوں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟ اقبال صاحب کہہ رہے تھے کہ کچھ بتا کر نہیں گئے۔"

"فرح کی طرف گئے تھے پھر راستے میں ایک دوست کے پاس ٹھہر گئے۔" میں نے بہانہ بنایا۔ "اور تم کہاں سے آرہی ہو؟"

"یہاں بھاٹی گیٹ کی طرف ایک خیراتی اسپتال ہے، وہاں کچھ پیسے دینے آئی تھی۔ سوچا آپ کی طرف سے بھی ہو جاؤں۔"

"نصرت اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے، بخار تو اترا ہوا ہے لیکن بھوک بالکل نہیں لگ رہی۔ بڑی مشکل سے ایک دو لقمے کھلاتی ہوں۔" اس نے ذرا توقف کیا اور پھر بولی۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ جمعرات تک سب رپورٹیں آجائیں گی۔"

"ہاں میرا خیال ہے، آج شام یا کل دوپہر تک پہنچ جائیں گی۔"

"زیادہ فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں ثروت! تکلیف تو ہے لیکن اگر ہم ہمت سے کام لیں گے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

اقبال چائے بنانے چلا گیا۔ میں اور عمران کمرے میں رہ گئے۔ ثروت نے اپنے برقع کے اندر سے ایک سبز شاپر نکالا اور کانپتے ہاتھ سے میری طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے شاپر تھامتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میری کچھ جیولری ہے تابش! ناصر بھائی نے بنوا کر دی تھی۔ آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ نصرت کے علاج کا خرچہ اس سے کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا اچھا علاج ہو اور وہ جلد سے جلد ٹھیک ہوجائے۔"

میں نے زیورات لوٹاتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کی ضرورت نہیں ثروت! اگر ہوئی تو پھر میں بتادوں گا۔۔۔"

وہ مصر رہی کہ میں زیورات اپنے پاس رکھوں۔ میرے مسلسل انکار کے باوجود وہ نہیں مانی۔ وہ بہت دل گرفتہ ہورہی تھی۔ اس نے ہمارا دل رکھنے کے لیے بس چائے کے بھی ایک دو گھونٹ ہی لیے۔ اس نے کہا کہ نصرت کی دوا کا وقت ہورہا ہے۔ اسے جلدی واپس جانا ہے۔ اقبال اس کے لیے رکشا لے آیا۔ وہ چلی گئی۔

وہ جو جیولری دے کر گئی تھی، ساری کی ساری طلائی تھی۔ مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت چھ سات لاکھ سے کم نہیں تھی۔ لیکن جو مصیبت آئی تھی، وہ ثروت کے اندازے سے بہت بڑی تھی۔ نصرت کے علاج کے حوالے سے تو یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرے جیسی تھی۔

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔ "عمران! ہم ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کرسکے گی۔ میرے دل میں آرہا ہے کہ میں اپنا مکان بیچ دوں۔ تم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرو۔"

وہ بولا۔ "اتنی تیزی مت دکھاؤ۔ بریک پر تھوڑا سا پاؤں رکھو۔ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ ویسے بھی وہ مکان تمہارے اکیلے کا نہیں ہے۔ عاطف اور فرح بھی اس میں حصے دار ہیں اور شاید تمہاری ایک پھوپی جان کو بھی کچھ حصہ دینے کے بارے میں تمہارے والد وصیت کرکے گئے ہوئے ہیں۔"

"یار! میں بعد میں دے دوں گا ان لوگوں کو حصہ لیکن اس وقت تو ایک انسانی زندگی کا معاملہ ہے۔"

"جب چیز اس طرح بیچی جاتی ہے تو لوگ کوڑیوں کے بھاؤ خریدنا چاہتے ہیں۔ تم اتنی جلدی مت دکھاؤ۔ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔"

میں کمرے میں بند ہوکر دیر تک سوچتا رہا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ لیور کی ٹرانسپلانٹیشن کوئی معمولی آپریشن نہیں تھا۔ انڈیا میں بھی اس کے مکمل علاج پر پچاس لاکھ کے قریب خرچہ آرہا تھا۔ کسی مغربی ملک میں تو یہ دوگنا سے بھی زیادہ ہوجانا تھا۔۔۔ عمران کی مالی حالت کا مجھے پتا تھا۔ وہ ایک پرندے جیسی زندگی گزارتا تھا۔ آج جو کچھ ہے، وہ خرچ کرڈالو۔۔۔ کل کی فکر نہ کرو۔ پیسا اس کے پاس آتا تو تھا لیکن ٹکتا نہیں تھا۔۔۔ آج کل بھی نصرت کے ٹیسٹوں کا بل دینے کے بعد وہ تقریباً قلاش تھا۔

اگلے روز میں، عمران کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنے آبائی گھر پہنچا۔ وہاں سے مکان کی رجسٹری لی۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کرائی اور علاقے کے ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس پہنچ گیا۔ اس شخص نے مجھے فوراً پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں کچھ بھولے بسرے منظر اور کچھ سوال ابھر آئے۔ ان مناظر اور ان سوالوں کا تعلق یقیناً اسی تاریک دن سے تھا جب مجھے ایک قریبی پارک میں سراج کے غنڈوں نے لہولہان کیا تھا اور میں چہرہ چھپا کر ہر شناسا نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اس نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ "تم۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ آپ۔۔۔ وہی۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں وہی ہوں۔۔۔ میں نے ایک سیٹھ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور اس نے مار مار کر

میرا حشر خراب کردیا تھا۔۔۔ بہت سے لوگوں نے تماشا دیکھا تھا۔ شاید تم بھی ان میں شامل ہوگے۔ اب پلیز۔۔۔ مزید کوئی سوال نہ کرنا۔۔۔ یہ میرے مکان کے کاغذات ہیں۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

پراپرٹی ڈیلر نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر بند کرلیا۔

میں نے اسے مکان کی فروخت کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور واپس آگیا۔

ایک عجیب سی پریشانی نے مجھے گھیر رکھا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ عمران پریشان ہے۔ اس کی یہی ادا تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔ وہ دوسرے کی پریشانی کو اپنی پریشانی بنالیتا تھا اور پھر تن من دھن سے اسے رفع کرنے کی کوششوں میں لگ جاتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو جان محمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ عمران ان سے گفتگو میں مصروف تھا۔ عمران رات کو بھی اسسٹنٹ منیجر عباس کے ساتھ دیر تک ٹیلی فون پر بات کرتا رہا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید وہ ایک بار پھر کسی خطرناک "سرکس شو" کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ میرے ذہن میں اسٹار سرکس کے وہ اسپیشل شو گھومنے لگے جن میں عمران اور اس کے ساتھی نہایت خطرناک کرتب دکھاتے تھے۔ بغیر حفاظتی جال کے جھولوں پر بازی گری، آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی زندہ ہدف پر چاقو زنی، اپنے پہلو یا پھر کنپٹی پر ریوالور وغیرہ رکھ کر گولی چلنے یا نہ چلنے والا رسک۔ اور ایسے بہت سے دیگر کام۔۔۔ عمران ایسی خطرناک حرکات کو کبھی کبھی پیسا کمانے کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔

بہرحال، میرا یہ شک۔۔۔ شک ہی رہا۔ مجھے اس بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں مذکورہ پراپرٹی ڈیلر سے ملا۔ اس نے مجھے یہ مایوس کن خبر سنائی کہ میرے مکان کی فوری فروخت ممکن نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے مکان کا رقبہ ان رقبوں میں شامل ہے جس کا ریکارڈ کچھ عرصہ پہلے جل کر ضائع ہوگیا تھا۔ اب میرے مکان کی "فرد" نہیں نکل سکتی اور فروخت کے لیے فرد کا ہونا بہت ضروری ہے۔

"اب کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نئے سرے سے کاغذات کا ریکارڈ بنوانا ہوگا۔"

"اس میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر آپ خود بنوائیں گے تو کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر دے دلا کر کام کرائیں گے تو بھی ڈھائی تین مہینے تو کہیں نہیں گئے۔ اخبار میں اشتہار وغیرہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ بھی قانونی کارروائی ہوتی ہے۔ شاید آپ کو ڈی پی او کے سامنے بھی پیش ہونا پڑے۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

رات کو میں گھر واپس گیا تو میری توقع کے خلاف عمران بازار کے کسی تھڑے پر محلے داروں سے گپ شپ نہیں کررہا تھا بلکہ کمرے میں خاموش بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کی گمبھیر خاموشی کے بعد عمران نے کہا۔ "تم اپنا موبائل، گھر چھوڑ گئے تھے۔ ابھی ثروت کا فون آیا تھا۔"

"خیریت ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"نصرت کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ رات سے اسے تیز بخار ہے۔ پیٹ میں دائیں طرف درد بھی ہوتا ہے۔"

"ثروت کیا کہہ رہی تھی؟"

"اس کا خیال ہے کہ شاید کھانے پینے میں کچھ بدپرہیزی ہوئی ہے لیکن اصل بات وہی ہے جس کا ہمیں پتا ہے۔ بیماری تیزی سے اسے جکڑ رہی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمران بھی خاموش رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ گھر سے باہر بازار سے معمول کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ رکشے کا شور۔۔۔ خوانچے والے کی صدا، بچوں کی چہکار۔ میوزک سینٹر سے بلند ہونے والے نغمے کی آواز "موسم حسیں ہے لیکن تم سا حسیں نہیں ہے۔۔۔ میری نظر سے پوچھو، تم سا کہیں نہیں ہے۔۔۔"

لیکن موسموں کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ انسان خوش ہو تو اسے چلچلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ غمگین اور پریشان ہو تو چاندنی بھی جھلسانے لگتی ہے۔

اچانک عمران کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جان محمد صاحب تھے۔ انہوں نے کہا۔ "عمران! کوئی تم سے ملنے آیا ہے، یہاں میرے دفتر میں۔"

"کون؟" عمران نے پوچھا۔

"لو خود ہی بات کرو۔" جان صاحب کی آواز موبائل کے اسپیکر میں سے ابھری۔

چند سیکنڈ بعد کوئی انگلش میں بولا۔ "ہیلو ایمران! کیسے ہو؟ کہاں چھپے بیٹھے ہو برادر۔"

میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ بھاری بھرکم آواز مسٹر ریان ولیم کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ عمران بولا۔ "گڈ ایوننگ مسٹر ریان! آپ کب آئے؟"

”میں نے کہا تو تھا کہ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ تم سے ملنے کے لیے... میں اور مسٹر رچی بہت بے چین تھے۔“

”یعنی مسٹر رچی بھی آئے ہیں؟“

”بالکل، وہ بھی موجود ہیں۔ انہیں بھی تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو یہاں؟“

”آپ دونوں اس وقت ہیں کہاں؟“

”جان محمد کے آفس میں۔ اگر تمہیں مشکل ہے تو ہم خود آجاتے ہیں۔“

”نہیں، نہیں۔ ایسی بات تو نہیں۔ کیا میں... ابھی آجاؤں؟“

”بالکل ابھی... یہاں ایک دلچسپ معاملہ تمہارا انتظار کررہا ہے...“ ریان ولیم نے کہا۔

”ٹھیک ہے جی، میں لباس تبدیل کر کے تیس چالیس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔“

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم جان محمد صاحب کے دفتر واقع میکلوڈ روڈ پر موجود تھے۔ گوشت کے پہاڑ مسٹر ریان ولیم نے بڑی گرم جوشی سے عمران کا استقبال کیا۔ پروفیسر رچی بھی ہم دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے۔ پروفیسر رچی کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سرخ وسپید تھا اور نفیس سی عینک لگا رکھی تھی۔

چائے کی میز پر ہماری گفتگو شروع ہوئی۔ پہلے تو ان حیران کن واقعات کا ذکر ہوتا رہا جو چند ہفتے پہلے پیش آئے تھے۔ سوال و جواب کا وہ بے نظیر مقابلہ جس کی انعامی رقم ایک سو بیس کروڑ کے قریب تھی۔ اس انعامی مقابلے میں عمران اور ہیری کا ہارنا لیکن پھر اس ہار میں سے سلامتی اور جیت کا پہلو نکل آنا۔ ایک طرف تقریباً ایک سو بیس کروڑ روپے مالیت کے شان دار ”فیلکن 900 سی“ طیارے کا تباہ ہو جانا اور دوسری طرف ہیری کا لاٹری کے ذریعے ایک معقول رقم جیت جانا۔ یہ سارے واقعات زیادہ پرانے نہیں تھے اور ابھی تک ہمارے ذہنوں میں تازہ تھے۔

پروفیسر رچی تو پہلے ہی عمران کا گرویدہ تھا، اب ریان ولیم بھی نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے عمران کی ذہانت اور ”لک“ پر ایک وجدانی قسم کا بھروسا... ہو چکا ہے۔ اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ایمران! میں اور رچی ایک بہت اہم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور پتا نہیں کیوں ہمیں یقین ہے کہ یہ کام تم بہت آسانی سے کرسکتے ہو۔“

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں۔“ عمران نے رسمی انداز میں کہا۔

پروفیسر رچی اور مسٹر ریان کی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ پھر ریان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ایمران! یہاں ہمارا واسطہ ایک عجیب سے کریکٹر سے پڑا ہوا ہے۔ ایک ایسا بندہ جسے ہینڈل کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ایک ایسا پیچیدہ بندہ ہے جو لالچ میں آرہا ہے، نہ پیار سے رام ہو رہا ہے، نہ سختی سے۔“

پروفیسر رچی نے اپنی گھنی بھوری مونچھوں کے پیچھے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آنجہانی ہٹلر نے کہا تھا، جارحیت کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے۔ جو کام پیار محبت کے ساتھ برسوں میں نہیں ہوسکتا، وہ میں طاقت کے استعمال سے چند گھنٹوں میں بخوبی کرسکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہٹلر بھی ہوتا تو یہاں آکر ناکام ہو جاتا۔“

”کوئی بہت سخت جان بندہ ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں... اس کے الٹ ہے۔“ مسٹر ریان نے جواب دیا۔ ”سمجھو کہ سرکنڈے میں جان پھنسی ہوئی ہے۔ بالکل دبلا پتلا۔ عمر اسی سال سے اوپر ہے۔ بیماریوں نے گھیرا ہوا ہے۔“

جان محمد صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ”وہی جو کہتے ہیں نا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔“

”لیکن جناب! ہم اس سے حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ ایک اہم سوال ہے مگر فی الحال اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے یا کہہ لو کہ مکمل جواب نہیں ہے۔“ مسٹر ریان ولیم نے کہا۔

”آپ کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے؟“ عمران نے سوال کیا۔

مسٹر ریان ولیم نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”کچھ لوگ ہم سے یہ کام معاوضے پر کروا رہے ہیں ایمران۔ خاصا معقول معاوضہ دے رہے ہیں۔ ہمیں ابھی تک صرف اتنا ہی پتا ہے کہ کوئی بہت خاص چیز ہے جو کسی غلطی سے یا پھر اتفاقاً اس سنکی بڈھے کے قبضے میں آگئی ہے۔ وہ یہ ”چیز“ واپس کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس پر بہت سختی بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ کئی طرح کی بیماریوں کا شکار ہے۔ تین دفعہ تو اس کا بائی پاس ہی ہو چکا ہے۔ کسی بھی جسمانی صدمے کی وجہ سے اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ سکتی

ہے۔ شاید تمہیں تھوڑا بہت اندازہ ہو کہ ایسے لوگ جو بالکل قریب المرگ ہوتے ہیں، اپنی زندگی موت کی طرف سے خاصے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ یہ بڈھا بھی ان میں سے ایک ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”جناب! آپ کی بات ٹھیک ہے کہ ایسے کچھ لوگ اپنی زندگی کی طرف سے بے پروا ہو جاتے ہیں مگر ان کو کسی بات پر مجبور کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے قریبی عزیز... ان کے پوتے پوتیاں، ان کی ان محبتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔“

ریان ولیم نے کہا۔ ”یہاں اس معاملے میں یہی تو مصیبت ہے، یہ بالکل لنڈورا شخص ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بیوی پچیس تیس سال پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ دو بیٹے تھے، وہ برسوں پہلے ”اباجی“ کی سخت مزاجی کی وجہ سے ان کو چھوڑ کر بیرون ملک جاچکے ہیں اور وہیں پر آباد ہیں۔ ان سے بزرگوار کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہے۔ ایک بیٹی تھی، اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی کوئی بیس برس پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب جناب اکیلے ہیں اور اپنے پانچ ایکڑ کے فارم ہاؤس میں تن تنہا رہتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی تھوڑی بہت دلچسپی ہے تو وہ پرندوں اور جانوروں میں ہے۔ انہوں نے فارم ہاؤس میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا ہے۔ اس چڑیا گھر کی دیکھ بھال کے لیے کچھ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ اپنی دیکھ بھال کے لیے ایک ڈاکٹر ہے اور دو تین ملازمائیں ہیں۔ خاصے امیر کبیر ہیں۔ چاہیں تو نئے ماڈل کی دو تین گاڑیاں رکھ سکتے ہیں مگر ایک ستر ماڈل کی شیورلیٹ رکھی ہوئی ہے اور اگر کہیں آنا جانا ہو تو اسی پر سفر کرتے ہیں۔“

عمران نے ریان ولیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب! آپ کے ذہن میں یہ بات کیوں آئی ہے کہ میں اس شخص کو ہینڈل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہوں؟“

ریان ولیم نے طویل کش لے کر سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور کہا۔ ”اس کی دو وجوہات ہیں ایمران۔ پہلی وجہ تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ میں تمہاری ”لک“ پر بہت بھروسا کرنے لگا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جس کام میں ہاتھ ڈالو گے، اس کا کوئی اچھا نتیجہ ہی نکلے گا اور دوسری وجہ تمہیں رچی بتائے گا۔ بتاؤ رچی۔“ ریان نے پروفیسر رچی کی طرف دیکھا۔

رچی نے اپنے سرخ وسپید چہرے پر نفیس عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ”ایمران! جیسا کہ تمہیں مسٹر ریان نے بتایا ہے... اس سنکی بوڑھے کا ایک ہی شوق ہے اور وہ

ہیں جانور۔ وہ دن رات ان میں گم رہتا ہے۔ اگر ملک کا صدر یا وزیراعظم بھی اس کے فارم ہاؤس پر چلا جائے تو وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دے گا جتنی اس عام شخص کو دے گا جو کسی جانور کی کسی خاص بیماری کے بارے میں اسے کچھ بتا سکتا ہو۔ وہ جانوروں سے پیار کرتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو جانوروں سے پیار کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے میرا ذہن تمہاری طرف گیا ہے ایمران... تم جانوروں سے بہت جلد ناتا جوڑ لیتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ خاص صلاحیت اس سنکی کو ضرور متاثر کرے گی بلکہ حیران بھی کرے گی۔ تم ضرور اس کے قریب جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”جناب! آپ نے ابھی تک اس بزرگ کا نام نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ رہتے کہاں ہیں؟“

مسٹر ریان نے کہا۔ ”یہاں لاہور کے قریب ہی کوئی قصبہ ہے، شاید شیکاڈپورہ۔“

”شیکاڈپورہ نہیں... شیخوپورہ۔“ جان محمد صاحب نے تصحیح کی۔ ”اور باباجی کا نام سہراب جلالی ہے۔ بڑے مشکل سے بندے ہیں۔ اب عمر رسیدہ ہونے کے بعد مزید مشکل ہو گئے ہیں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کچھ عرصہ انگریز کی فوج میں بھی رہ چکے ہیں۔ یہ پاکستان، ہندوستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ ملازمت کے دوران میں ایک انگریز کرنل کا جبڑا توڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے۔ ہم نے جلالی صاحب سے اپنے سرکس کے لیے ریچھ کا ایک بچہ حاصل کیا تھا۔ تب ان سے واسطہ پڑا اور ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ بڑے سیلانی قسم کے بندے ہیں۔“

عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”ریان صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ اگر ہمیں کوئی غیر قانونی یا ناجائز کام نہیں کرنا پڑے گا تو ہم حاضر ہیں لیکن ہمیں تھوڑا بہت اندازہ تو ہو جائے کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا؟“

”سب سے پہلے تو اس گھر میں داخل ہونا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہاں کس قسم کی سرگرمی ہے۔ اگر اگلے چھ سات روز میں یہ پہلا مرحلہ طے ہو گیا تو پھر تمہیں مزید ہدایات دے دی جائیں گی۔ باقی رہی کام کے جائز یا ناجائز ہونے کی بات تو یقین رکھو کہ یہ سو فیصد جائز کام ہے۔ وہ خبطی بڈھا ایک ایسی چیز پر قبضہ جمائے ہوئے ہے جو ہرگز اس کی نہیں ہے اور جس کا اس کے پاس رہنا اس کے اپنے لیے بھی

خطرناک ہے۔ انڈر ورلڈ کے کئی لوگ ایسے ہیں جو اس شے کی خاطر اس کے جانی دشمن ہو سکتے ہیں۔''

اس انوکھے اور پُراسرار موضوع پر ریان ولیم اور پروفیسر رچی سے ہماری گفتگو قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ ریان ولیم کہنے کو تو یہی کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ناجائز کام کروانا نہیں چاہ رہا لیکن اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ یہ کام ناجائز بھی ہو سکتا تھا، غیر قانونی اور خطرناک بھی۔

ہماری بات اختتام پذیر ہوئی تو ریان ولیم نے ایک چیک کاٹ کر عمران کے حوالے کیا۔

''یہ کیا ہے جناب؟'' عمران نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارا حصہ۔''

''کس چیز میں؟''

''اسی کوئز شو کے انعام میں جس میں تم نے حصہ لیا تھا۔'' ریان مسکرایا۔

''لیکن وہ تو ہم ہار گئے تھے۔''

''مگر ہمیں بنیادی انعام کی تھوڑی سی رقم تو ملی تھی۔ اس رقم سے جو لاٹری خریدی گئی، اس نے ہیری کو قریباً 8 ملین ڈالرز دلا دیے۔ یہ سب قسمت کی کرشمہ سازی ہے۔ اس رقم میں سے یقیناً تمہارا بھی تھوڑا بہت حصہ بنتا ہے۔''

عمران انکار کرتا رہا لیکن ریان نے چیک زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے چیک پر ایک ترچھی سی نظر ڈالی۔ یہ پچاس لاکھ روپے کا تھا...

اس چیک کے بعد ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے ایک اور چیک کاٹا۔ یہ پانچ لاکھ روپے کا تھا۔ ریان ولیم نے کہا۔ ''یہ اس کام کے لیے تمہارے ابتدائی اخراجات کے لیے ہے۔''

اس کے انداز سے اشارہ مل رہا تھا کہ اگر عمران کسی طرح ریان اور پروفیسر رچی کی توقعات کے مطابق کام کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ خاصی بڑی رقم حاصل کر سکے گا۔

☆☆☆

اگلے دو تین روز میں کچھ واقعات تیزی سے رونما ہوئے۔ یہاں وہی محاورہ صادق آرہا تھا کہ قدرت جب دیتی ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ چند ہفتے پہلے کی کارکردگی کی بنیاد پر ایک معقول رقم عمران کے ہاتھ آگئی تھی... بلکہ آگے کے لیے بھی اچھے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ''تابش! یہ پچاس لاکھ روپے نصرت کا علاج شروع کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند ہفتوں میں مزید انتظام ہو جائے گا۔ تم ثروت سے بات کرو اور پروگرام طے کر لو۔''

''لیکن عمران! میں یہ رقم نہیں لے سکتا اور شاید ثروت بھی خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکے۔''

''میں مکا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دوں گا۔ تکلفات میں مت پڑو۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔ تم ابھی بات کرو ثروت سے۔''

''لیکن میں کس حیثیت سے اسے یہ رقم دوں اور وہ کس حیثیت سے قبول کرے گی؟ وہ اپنے شوہر کو کیا بتائے گی اس بارے میں؟''

''اس کا کوئی حل تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔''

''لیکن عمران... یہ رقم...''

''دیکھو تابی! زیادہ ''تکلف حسین خاں'' مت بنو۔ اگر زیادہ بات ہے تو اسے ادھار سمجھ لو۔ جب تمہارا مکان فروخت ہوگا، مجھے لوٹا دینا۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس نے حسبِ عادت اپنی ہتھیلی سے میرا منہ ڈھانپ دیا اور تب تک نہیں چھوڑا جب تک میں ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔

رات کو میں دیر تک سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں ایک ہی طریقہ آرہا تھا۔ میں اپنے چچا احمد کو اس کام کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ آج کل ''ویانا'' میں رہائش پذیر تھے۔ آرسہ ان کی بیوی سلطانہ کی بھتیجی تھی۔ یہ آرسہ وہی کزن تھی جو مجھے شادی کے لیے گھیرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جب ثروت مجھ سے جدا ہو کر بھائی ناصر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تو آرسہ نے کئی طرح سے مجھ پر جال پھینکنے کی کوشش کی۔ اب قریباً ڈھائی سال پہلے آرسہ کی شادی ہو چکی تھی۔ چچا احمد اور چچی سلطانہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ دو سال پہلے ویانا چلے گئے تھے۔

اگلے روز میں نے ثروت کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ راوی روڈ والے گھر پر آجائے مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ ثروت خاصی ذہین تھی۔ بے شک میں نے اسے نصرت کی حالت کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا مگر وہ جان چکی تھی کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں اور شاید وہ خدشے بھی درست ثابت ہوئے ہیں جو نصرت کے بارے میں شروع میں ظاہر کیے گئے تھے۔

وہ سہ پہر کے وقت آئی۔ میں اس سے اکیلے میں اور تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا عمران اور اقبال اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ ثروت نے کبھی برقع نہیں پہنا تھا لیکن آج کل وہ اپنی آمد و رفت کو چھپانے کے لیے برقع استعمال کر رہی تھی۔ ہر لباس کی طرح برقع بھی اس کے جسم پر بہت جچتا تھا۔ حالانکہ وہ زینت کے لیے نہیں پردے کے لیے تھا۔ نقاب میں سے بس اس کی خوب صورت آنکھیں ہی نظر آتی تھیں اور یہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ آج کل دکھ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! آنکھیں بند کرنے سے حقیقت اوجھل نہیں ہو جاتی۔ اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب بندہ ایک بار حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتا ہے تو پھر بڑے بڑے مسئلوں کا حل بھی نکل آتا ہے۔ ہمیں اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نصرت بیمار ہے... اور خاصی بیمار ہے...''

ثروت نے ایک سرد آہ بھری اور دل کڑا کر کے پوچھا۔ ''رپورٹس کیا کہتی ہیں؟''

''جگر کا کینسر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرتے رہے...

میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''ثروت! ہم نصرت کا علاج کروا رہے ہیں اور تم دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

''کیا دوائیوں سے علاج ہو جائے گا؟'' اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔

''نہیں ثروت! اس کے لیے سرجری کی ضرورت پڑے گی اور یہ سرجری باہر کے ملک میں ہو تو زیادہ اچھا ہے۔''

''ل... لیکن اس پر تو بہت زیادہ خرچہ آئے گا۔''

''خرچے کی فکر نہ کرو۔ جس طرح فرح میری چھوٹی بہن ہے، اسی طرح نصرت بھی ہے۔ ہم اس کی بیماری سے لڑیں گے اور اللہ نے چاہا تو جیت کر دکھائیں گے۔''

''لیکن یہ کس طرح سے ہوگا تابش! میں یوسف کو کیا بتاؤں گی۔ میں تو پہلے ہی بہت ڈر رہی ہوں۔ میں یوسف کو بتائے بغیر آپ سے مل رہی ہوں۔ انہیں پتا چل گیا تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں گے۔''

''میں اس سارے معاملے میں نہیں آؤں گا ثروت... یہ سب کچھ کسی اور طرح سے ہوگا۔ میں نے طریقہ سوچ لیا ہے۔''

''کیسا طریقہ؟''

''چچا احمد اور چچی جان آج کل آسٹریا میں ہیں۔ شاید ویانا میں ہی رہ رہے ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ہم نصرت کو علاج کے لیے بھی ویانا ہی لے جائیں گے۔ میں چچا احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری پوری پوری مدد کریں گے۔ ویسے بھی وہ تم دونوں بہنوں سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ یہی ظاہر کریں گے کہ وہی نصرت کو علاج کے لیے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اور وہی اخراجات میں بھی تعاون کریں گے۔ بس یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب کچھ ارینج کر لوں گا۔''

ثروت نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور جیسے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے پلکیں جھکا لیں۔

اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی مجھ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر حیران ہے۔ میں جو ماضیِ قریب میں ہر طرح سے ایک ناتواں اور دبا ہوا شخص تھا، اب مشکل حالات کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور میرے لب و لہجے کا اعتماد ثابت کرتا تھا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔

مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ میرا اعتماد ثروت کو بھی اعتماد بخش رہا ہے۔ وہ جو نصرت کی بیماری کے متعلق بات کرنے سے بھی خوف زدہ رہتی تھی، اب بات کر رہی تھی۔ مجھ سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھی۔ میں نے بجلی کی کیتلی کے ذریعے اسے چائے بنا کر دی۔ میرے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے اس کی نازک انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ اس مختصر سے لمس نے مجھے سر تا پا ہلا دیا اور میرے ذہن میں یادوں کے ان گنت دریچے وا ہو گئے۔ جب ہم قریب تھے، یک جان دو قالب کی طرح... شب و روز میں ایک جادو تھا۔ موسم حسین تھے۔ کانوں میں ہر وقت نغمے گونجتے تھے اور دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی لے پر رقص کرتی تھیں۔

میں نے سوچا... کیا ثروت کو بھی وہ سب کچھ یاد ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یاد نہ ہو؟ انسان کتنا بھی بدل جائے، رسم و رواج، مذہب اور معاشرے کے بندھن اسے کتنا بھی جکڑ لیں، دل و دماغ میں نقش ہو جانے والی سنہری یادوں کو کھرچا تو نہیں جا سکتا۔ ذرا سی ہوا چلے تو ماہ و سال کے در کھل جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ جنہیں کوئی گریز، کوئی وجہ روک نہیں سکتی۔

رات کو فون پر چچا احمد سے میری طویل بات ہوئی۔ میں نے انہیں ساری صورتِ حال بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میں

کیا کرنا چاہتا ہوں...

نصرت کی بیماری کے معاملات نے چچا احمد کو بھی بہت پریشان کیا۔ وہ آبدیدہ ہوگئے۔ وہ ویانا کی کسی الیکٹرک کمپنی میں درمیانے درجے کی ملازمت کرتے تھے۔ چار پانچ افراد کی فیملی تھی۔ بس گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں نے چچا احمد کو ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں بھی تھوڑا بہت بتایا اور انہیں آگاہ کیا کہ نصرت کے علاج کا کام ہمیں کس طرح کرنا ہوگا۔ اس سارے کام میں میرا نام نہیں آنا تھا۔ چچا احمد کو خود ہی ثروت سے رابطہ کرنا تھا اور پھر نصرت کے علاج معالجے کی بات آگے چلانا تھی...

ایک دن بعد چچا احمد سے میری ایک اور ٹیلی فونک گفتگو ہوئی۔ اس میں مزید تفصیلات طے کی گئیں۔ میں نے قریباً پچاس لاکھ روپے ویانا میں چچا احمد کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا انتظام بھی کر دیا۔

ایک طرف یہ کام ہو رہا تھا، دوسری طرف عمران مسٹر ریان ولیم کی ہدایت کے مطابق شیخوپورہ کے قریب سہراب جلالی کے فارم ہاؤس میں پہنچ چکا تھا۔ وہ وہاں باورچی کے روپ میں داخل ہوا تھا اور اس طرح مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ جہاں اور بہت سے کام کر لیتا ہے، وہاں کھانا پکانا بھی جانتا ہے۔ رات کو اس نے جلالی کے فارم ہاؤس سے ہی مجھے فون کیا۔ "جگر! اب آجاؤ تم بھی۔ مجھ سے اکیلے یہ سارا کام نہیں سنبھالا جا رہا۔ پیاز کاٹ کاٹ کر میں نابینا ہونے والا ہوں۔"

"ایسے کام تو مجھ سے بھی نہیں ہوں گے۔"

"لیکن کچھ ایسے کام بھی ہیں جو تم کر لو گے۔ بس اب آجاؤ فٹافٹ۔ میں نے جلالی صاحب سے کہہ رکھا ہے کہ میرا اسسٹنٹ بھی ایک دو دن میں آنے والا ہے۔ پرسوں یہاں ایک دعوت بھی ہے۔ میں تو پیاز چھیل چھیل کر مینا کماری بن جاؤں گا۔"

"مینا کماری کیوں؟"

"بھئی میں رونے دھونے کی بات کر رہا ہوں۔ باقی یہاں کے حالات واقعی گڑبڑ ہیں۔ اندر خانے کچھ نہ کچھ ہے۔ ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں جان کر میری کھوپڑی فیل ہو گئی ہے۔ تم آؤ گے تو کچھ مشورہ بھی ہو جائے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں، ایک ایک اور دو گیارہ۔"

"کس قسم کی باتیں ہیں؟"

"بس کچھ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لگتا ہے کہ یہاں کوئی فلم چل رہی ہے۔ تو پھر کب پہنچ رہے ہو تم؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ثروت اور نصرت یہاں سے علاج کے لیے روانہ ہو جائیں تو پھر آؤں۔"

"جگر! وہ کام تو اب ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی جیلانی کا فون آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آٹھ دس روز تک ویزا لگ جائے گا۔ اب وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم بس آنے والی بات کرو۔"

"ٹھیک ہے، کل شام تک پہنچ جاؤں گا... لیکن آنا کس حیثیت سے ہے؟"

"تمہیں بتایا تو تھا، تم میرے معاون ہو۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے ہندوستانی صنعت کار نے لاہور میں ہمارے ہاتھ کا کھانا کھایا اور ہمیں اپنے ساتھ انڈیا لے گیا۔ انڈیا میں ہم دونوں کئی کھاتے پیتے گھرانوں میں خدمات انجام دے چکے ہیں جن میں مشہور فلمی ستارے بھی شامل ہیں۔ مثلاً راج کپور، سمیتا پاٹیل، امجد خان، دیویا بھارتی۔"

"جن ستاروں کے تم نے نام لیے ہیں، وہ سارے کے سارے دارِفانی سے کوچ کر چکے ہیں۔"

"تو یار! انہوں نے ہمارے کھانوں کی وجہ سے تو کوچ نہیں کیا ہے۔ اور اگر کیا بھی ہے تو اس میں اچھائی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ہمارے پکائے ہوئے کھانے اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ بندہ ان پر اپنی جان لٹا دیتا ہے۔"

"اچھا زیادہ زبان مت چلاؤ۔ مجھے وہاں کس نام سے پہنچنا ہے اور تمہیں کس نام سے بلانا ہے؟"

"تم اپنے اصلی نام سے ہی آؤ گے اور مجھے جس طرح کی عزت چاہے دے لینا۔ استاد جی کہہ لینا، ماسٹر جی، جناب، سر، وغیرہ وغیرہ۔"

...وہ ایک شفق رنگ شام تھی جب میں ایک دیہاتی تانگے سے اترا اور فارم ہاؤس کے مین دروازے کی طرف بڑھا۔ میں عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس وسیع فارم ہاؤس کو ایک دس فٹ اونچی پختہ دیوار سے محفوظ کیا گیا تھا۔ دیوار سے اوپر خاردار تار بھی تھے۔ گیٹ پر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ انہیں میری آمد کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا لہٰذا مجھے گیٹ سے گزرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک محافظ نے پکار کر کہا۔ "فتح محمد! ان بھائی صاحب کو باورچی خانے میں عمران صاحب کے پاس پہنچا دو۔"

فتح محمد گھنی مونچھوں اور گہری رنگت والا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ ہونٹ سگریٹ نوشی کے سبب سیاہ تر تھے۔ اس کے کندھے سے پستول کا سیاہ

ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے پرکھنے والی نظروں سے دیکھا پھر ایک لفظ کہے بغیر میرے آگے آگے چل دیا۔ فارم کی زمین کے بیچوں بیچ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ عمارت کا رقبہ قریباً دو کنال ہوگا۔ عمارت تک ایک طویل ڈرائیو وے جاتا تھا۔ اس کی دونوں طرف کیاریاں تھیں اور سفیدے کے درخت تھے۔ سورج کا سرخ تھال ان درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ دائیں طرف ٹیڈی بکریوں کا ایک بہت بڑا باڑا نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف ایک فش فارم تھا جس کے کنارے پر خشک گوبر وغیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم ڈرائیو وے پر چلتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ اس پیدل سفر کے دوران میں نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا رہا کہ کچھ نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ پورچ میں جلالی صاحب کی پرانی شیورلیٹ ایک نئی شان کے ساتھ موجود تھی۔ جلد ہی میں کوٹھی کے وسیع باورچی خانے میں عمران کے ساتھ موجود تھا۔

فتح محمد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "تم بڑے وقت پر آئے ہو تابی... یہاں زبردست مار کٹائی ہونے والی ہے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ۔"

"کیا مطلب؟"

اس نے کھڑکی میں دور کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک کوتاہ قامت شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے انداز اور حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ "یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں کا بڑا ویٹرنری ڈاکٹر۔ اس نے یہاں کے سارے جانوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"لیکن یہ تم سے کیوں جھگڑے گا؟"

"بس اس کی دم پر میرا پاؤں آگیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں مرچیں بھری گئی ہیں۔"

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے وسیع باورچی خانے پر ایک نظر ڈالی۔ تین، چار دیگچوں میں کھانا پک رہا تھا۔ عمران بڑی مہارت سے باری باری ان میں چمچہ چلا رہا تھا۔ خوشبو مزے دار تھی اور اس بات کا پتا دیتی تھی کہ وہ اس کام میں اناڑی نہیں ہے۔ باورچی خانے میں تمام جدید اور مہنگی سہولتیں موجود تھیں۔ ایک طرف ماضی کی مشہور فلم اسٹار جین لونڈا کی ایک بڑی تصویر لگی تھی۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں فلم اسٹار "کک" کا لباس پہنے کچھ پکانے میں مصروف تھی۔ ایک الماری میں کوکنگ سے متعلق بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔

"لو جی، وہ بھڑ ہے باز اسی طرف آ رہا ہے۔" عمران نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص غصے میں تپا ہوا باورچی خانے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا انداز تشویشناک تھا۔

عمران نے دو چولہے بند کیے اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ مار کھانے کے لیے یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! دیکھو یہاں اتنی خوب صورت فلم اسٹار کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ کیسی LIVE تصویر ہے۔ لگتا ہے وہ باقاعدہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ اتنی حسین عورت کے سامنے بے عزت ہونے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔"

وہ نکلا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مار کھانے کی باتیں جان بوجھ کر کر رہا ہے۔ ایک ویٹرنری ڈاکٹر بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہیں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو، تم صرف خانساماں ہو اور وہ بھی اسسٹنٹ خانساماں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند سیکنڈ بعد ہٹا کٹا شخص دندناتا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوا۔ پھر ہمیں ساتھ والے کمرے میں دیکھ کر ہماری طرف چلا آیا۔ اس کی عمر پینتیس سال ہوگی۔ ناک چوڑی اور پھولی ہوئی تھی۔ ماتھے پر کٹ کا پرانا نشان اس کی تند مزاجی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

وہ عمران کو دیکھ کر پھنکارا۔ "میں نے کل کیا کہا تھا تم سے؟ کیا کہا تھا؟ میں نے بکواس کی تھی کہ میرے کام میں دخل مت دو۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! وہ اتنی مہنگی بلی... وہ مر رہی تھی اور آپ لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے اندر کچھ نہ گیا تو وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔"

"وہ مر جاتی۔ ساری بلیاں مر جاتیں لیکن تم حرامزادے کون ہوتے ہو میرے معاملوں میں ٹانگ اڑانے والے۔ کون سی ڈگری ہے تمہارے پاس؟ کیا کوالیفکیشن ہے تمہاری؟ کس باغ کی مولی ہو؟"

اس نے عمران کو زور سے دھکا دیا۔ عمران دیوار سے ٹکرایا پھر غصے میں بولا۔ "دیکھو ڈاکٹر راشد! زبان سے بات کرو، ہاتھ مت چلاؤ۔ ورنہ..."

اس نے ہاتھ گھما کر عمران کو تھپڑ مارا۔ ”ورنہ کیا... ورنہ کیا... کیا کرلے گا تو... کتے کے بچے... دو ٹکے کے باورچی... میں دانت توڑ دوں گا تیرے۔“ وہ عمران پر پل پڑا۔ عمران گر گیا۔ اس نے لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

میں نے عمران کو چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی۔ اس کوشش میں مجھے بھی ایک دو گھونسے پڑے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عمران کی کوئی پلاننگ ہے۔

عمران پر غصہ اتارنے کے بعد ڈاکٹر راشد پھنکارتا اور گالیاں بکتا ہوا واپس چلا گیا۔ عمران کی ایک باچھ سے خون رسنے لگا تھا۔ رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔

عمران واپس باورچی خانے میں آگیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کسی صابر شاکر بیوی کی طرح پھر سے کھانا پکانے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ پچھلے چار پانچ دنوں میں اس ڈاکٹر راشد سے کافی یاد اللہ ہوگئی ہے تمہاری۔“

”تمہیں پتا ہے، اڑیل بندوں سے یاد اللہ ہو ہی جاتی ہے میری۔ یہاں جلالی صاحب کے چڑیا گھر میں ایک بڑی قیمتی ایرانی بلی ہے۔ دس پندرہ دن میں اس نے بچے بھی دینے ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ دو ہفتے سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی ”ٹریٹ منٹ“ اس پر الٹا اثر کر رہی ہے۔ میں نے بلی کو پیار محبت سے سمجھایا۔ اسے گانا سنایا... کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے... بلی کا دل پسیج گیا۔ اس نے آج میرے ہاتھوں سے قریباً ایک پاؤ دودھ پیا ہے۔ بس اسی بات سے ڈاکٹر صاحب کو تپ چڑھ گئی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں ”کارِ سرکار“ میں مداخلت کر رہا ہوں۔“

”لیکن اس اچھے کام کے لیے تمہیں اس ڈنگر ڈاکٹر سے مار کھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بس یہ معرفت کی باتیں ہیں۔“ اس نے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے باورچی خانے کے چوبی اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”فون پر تم نے بتایا تھا کہ یہاں فارم ہاؤس میں کچھ الٹی سیدھی باتیں ہو رہی ہیں۔“

”یار! تم بڑے گھامڑ ہو۔ ابھی جو کچھ تم نے دیکھا ہے، کیا وہ الٹا سیدھا نہیں ہے؟ ایک سانڈ نما ڈاکٹر نے تمہارے سامنے تمہارے یار کو مارا پیٹا ہے اور دندناتا ہوا واپس چلا گیا ہے۔ اور کیا یہ الٹا سیدھا نہیں ہے کہ تمہاری شکل میں ایک ایسا شخص یہاں باورچی کی خدمات انجام دینے آیا ہے جسے انڈا تلنا بھی نہیں آتا۔ اور اگر اس کے علاوہ بھی کچھ الٹا سیدھا دیکھنا چاہتے ہو تو وہ بھی دیکھ لینا۔ ابھی رات ہونے والی ہے۔“

”کیا مطلب، رات ہونے والی ہے؟“

”یار! اکثر الٹی سیدھی باتیں رات ہی کو تو ہوتی ہیں۔“ اس نے آنکھ میچی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس نے ایک نیپکن کی گدی بنائی اور اسے چولہے پر گرم کر کر کے اپنے رخسار کی چوٹ کی ٹکور کرنے لگا۔

میں عمر رسیدہ سہراب جلالی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر رات گئے تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے جلالی کے پرائیویٹ چڑیا گھر کا ایک حصہ ضرور دیکھا۔ وہ یقیناً جانوروں میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ان کی رہائش اور خوراک وغیرہ کا بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً اس کام پر لاکھوں خرچ ہو رہے تھے۔ اس نے بعض جانوروں کی ملکیت کے لیے باقاعدہ لائسنس لے رکھے تھے۔ کئی قسم کے ہرن، سانپ، ریچھ اور زیبرے وغیرہ اس کی کلیکشن کا حصہ تھے۔ حال ہی میں اس نے تیندوے کا ایک جوڑا بھی حاصل کیا تھا۔ ابھی وہ عارضی قیام گاہ میں تھا۔ اب اس جوڑے کے لیے ایک شایانِ شان رہائش گاہ تیار ہو رہی تھی۔ اس رہائش گاہ کے عقب میں نایاب اور کم یاب پرندوں کے بہت سے پنجرے تھے۔

عمران کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ جانوروں کا ایک ڈاکٹر چوبیس گھنٹے یہاں فارم میں رہتا ہے۔ اس کے ساتھ دو اسسٹنٹ بھی ہیں۔ سینئر ڈاکٹر راشد ایک دن چھوڑ کر یہاں وزٹ کرتا ہے۔ سہراب جلالی کی دو ذاتی معالج ہیں۔ دونوں نوجوان ڈاکٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ فارم ہاؤس میں ملازمین کا ایک دستہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ مرد ملازم فارم ہاؤس میں خدمات انجام دیتے ہیں جبکہ ملازمائیں کوٹھی کے اندر ہوتی ہیں۔

رات سکون سے گزری۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سہراب جلالی سے میری پہلی ملاقات اگلے روز صبح سویرے ہی ہوگئی۔ عمران بڑی چابک دستی سے ناشتا تیار کر رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھا۔ جیسے انڈا پھینٹنا، ٹماٹر اور پیاز کاٹنا، آئل گرم کرنا۔ اچانک ایک چھوٹے سے ٹیڈی کتے کی باریک آواز سنائی دی۔ کتا تیزی سے کچن کی طرف آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت اسٹریپ تھا۔ یہ اسٹریپ جس شخص کے ہاتھ میں تھا، وہ سہراب جلالی تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کا وزن بمشکل پچاس کلوگرام رہا ہوگا۔ اس نے نیکر پہن رکھی تھی جس میں سے اس کی سوکھی سڑی ٹانگیں دو چوبی بیساکھیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ چہرہ جھریوں بھرا، مونچھیں سفید اور گھنی، آنکھیں گدلی تھیں۔ اپنے نیم گنجے سر کو اس نے پی کیپ سے چھپا رکھا تھا۔ عمران نے مجھے بتایا تھا کہ جلالی کا دل ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس کے سینے میں دل کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے ”پیس میکر“ لگا ہوا ہے۔ اس پیس میکر کے علاوہ بھی جلالی کی ”بے مثال صحت“ کی کچھ نشانیاں اس کے لاغر جسم پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی ایک کلائی پر انجکشن وغیرہ لگانے کے لیے ”کینولا“ لگا ہوا تھا۔ جسم سے کسی فاسد مادے کے اخراج کے لیے لگائی جانے والی تھیلی بھی کمر سے جھول رہی تھی۔

ان ساری صعوبتوں کے باوجود وہ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے عمران کے رخسار کی چوٹ پر ہی پڑی۔ ”یہ کیا ہے بھئی؟“ اس نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔

”بس جی... کل کھڑکی کا پٹ لگ گیا تھا...“

جلالی بولا۔ ”کھڑکی کا پٹ لگنے سے ایسی چوٹ تو نہیں آتی۔ یہ تو لگتا ہے کہ کسی نے گھونسا مارا ہے۔ نیچے ٹھوڑی پر بھی نیل نظر آرہا ہے۔“

”نن... نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”ڈاکٹر راشد سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا؟“

”نہیں جی۔ ان سے جھگڑا کیوں ہوگا؟“

”وہ اپنے کام میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا اور تم تین دن سے ایرانی بلی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو۔“ جلالی کا لہجہ تھوڑا سا سخت تھا۔

”غلطی ہوگئی تھی جی... اب ایسا نہیں کروں گا۔“

”کیوں نہیں کرو گے تم ایسا؟ تم ایسا کرو گے بلکہ آج سے چاروں ایرانی بلیوں کی خوراک کی ذمے داری تمہاری ہے۔“

”مم... میں سمجھا نہیں جی۔“

”تمہیں پتا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ ایرانی بلیوں کا وزن مسلسل کم ہو رہا ہے۔ انہیں کھانا کھلانا تمہاری ذمے داری ہے۔“

”لیکن... جناب... ڈاکٹر راشد صاحب؟“

”ڈاکٹر راشد ملازم ہے، مالک نہیں ہے۔ مالک میں ہوں۔ اور تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور اس کو تم سے معافی بھی مانگنی پڑے گی۔“

”معافی... کس بات کی جی؟“

”زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ میں جانتا ہوں یہاں کل جو کچھ ہوا ہے۔ اور اب اپنی چونچ بند کرو۔ وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ جلالی نے جیسے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولا۔ ”اور یہ کون ہے؟“

”تابش نام ہے جی اس کا۔ میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔“

جلالی نے ایک مرتبہ پھر مجھے گھورا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، اسے یہاں کے اصول قاعدے اچھی طرح سمجھا دو۔“

”جو حکم جناب۔“ عمران نے ادب سے سر جھکایا۔ میں نے بھی گردن کو خم دیا۔ سہراب جلالی نے ٹیڈی کتے کے اسٹریپ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ شتابی سے واپس مڑا... سہراب جلالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

سہراب جلالی کے جانے کے بعد عمران نے دائیں بائیں دیکھا پھر جلالی کی نقل اتارتے ہوئے اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ آنکھوں پر خیالی چشمے کو درست کیا... نیکر کے ”گیلوز“ کو اوپر کی طرف کھینچا اور بولا۔ ”برخوردار! دوپہر کا کھانا ٹھیک بارہ بجے اور رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے کھایا جاتا ہے۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ کم۔ سونے کا وقت دس بجے ہے۔ دس بجے تک ساری روشنیاں بجھ جانی چاہئیں۔ سگریٹ نوشی ایک دم ممنوع ہے... بلکہ ہر طرح کی تمباکو نوشی۔ کوئی ملازم یا اس کا کوئی ملاقاتی ایسا کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے سزا کے طور پر فارم کے دو چکر دوڑ کر لگانے پڑیں گے اور تنخواہ کا چوتھائی حصہ کاٹ لیا جائے گا۔ ٹی وی دیکھنا بھی منع ہے... موسیقی دھیمی آواز میں سنی جاسکتی ہے لیکن وہ بھی پرانی۔ ”ویڈیو“ پر پرانی انگلش اور اردو فلمیں دیکھی جاسکتی ہیں... اسی کی دہائی سے بعد کی فلمیں دیکھنے پر بھی خاطر خواہ جرمانہ ہوگا... اور تم... تم ایسے مسکرا کیوں رہے ہو؟ میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو؟ مذاق سمجھ رہے ہو؟“

اس نے غصے میں آکر کچن کی میز پر زور سے مکا مارا۔ جلالی کے انداز میں عینک کو درست کیا اور پھنکارا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے... دور ہو جاؤ میری نظروں سے... تمہاری

تنخواہ تمہارے ایڈریس پر بھیج دی جائے گی۔ گیٹ آؤٹ۔'' اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ جلالی کے انداز میں اپنی ذاتی ڈاکٹر کو آواز دیتے ہوئے بولا۔ ''مہناز... گولی لاؤ... سانس ٹھیک کرنے والی گولی لاؤ۔''

''یہ ڈراما بند کرو۔ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ جلالی صاحب کس ٹائپ کی چیز ہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب کو کل والے واقعے کا پتا کیسے چلا؟ یہاں بھی حکم جی کے دربار کی طرح کوئی جادو وغیرہ تو نہیں چلتا؟'' میرا اشارہ کل ہونے والی مار پٹائی کی طرف تھا۔

''جادو تو ہر جگہ چلتے ہیں پیارے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جدید جادو ہیں۔ انٹرنیٹ بھی ایک جادو ہے۔ یہ سیلائٹس بھی جادو ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر باسی کے گھر کا صحن تک دیکھ سکتے ہیں...''

''یہاں کون سا جادو ہے... انٹرنیٹ یا سیلائٹ؟''

''یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں۔''

''بہت خوب! مجھے لال کوٹھیاں یاد آ گئیں۔ وہاں بھی تو میڈم صفورا نے خفیہ نگرانی کا نظام قائم کیا ہوا ہے... لیکن... ایک بات کی وضاحت فرما دو۔''

''ارشاد۔''

میں نے کچن میں دائیں بائیں دیکھا پھر ہولے سے کہا۔ ''اگر یہاں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں تو پھر ابھی تم نے جلالی صاحب کی جو بھونڈی نقل اتاری ہے اور ان کے اسٹائل کی مٹی پلید کی ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''اتنی کچی گولیاں میں نے نہیں کھیلی ہوئیں... بلکہ میں نے تو سرے سے گولیاں ہی نہیں کھیلیں... کیمرے ہر جگہ نہیں ہیں۔ بس خاص خاص جگہوں پر ہیں...''

''یعنی کل جس کمرے میں ڈاکٹر راشد نے تمہیں تھپڑ اور ٹھڈے وغیرہ مارے وہاں کیمرا نصب تھا؟''

''عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کل جب عمران نے ڈاکٹر راشد کو غصے کی حالت میں کچن کی طرف آتے دیکھا تھا تو یہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں کیوں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا... یار، یہاں پری چہرہ جبین فونڈا کی تصویر لگی ہوئی ہے، یہاں مار کھاتے اچھا لگوں گا۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کے پیچھے اکثر کوئی وجہ ہوتی تھی۔

شام کے ٹھیک چار بجے جب میں اور عمران کچن میں چائے کی تیاری کر رہے تھے، میں نے ڈرائنگ روم میں سہراب جلالی کو دیکھا۔ وہ گداز صوفے میں دھنس کر بیٹھے ہوئے تھے اور صوفے کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ ڈاکٹر راشد سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ان کا انداز سمجھانے بجھانے والا تھا۔ آج وہ بڑے تحمل سے بات کرتے نظر آ رہے تھے۔ گرانڈیل ڈاکٹر راشد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ موضوعِ گفتگو یقیناً کل والا واقعہ ہی تھا۔ شاید جلالی صاحب، ڈاکٹر راشد کو آمادہ کر رہے تھے کہ وہ اپنی جارحیت پر عمران سے معذرت کر لے۔

جب ملازم ان دونوں کو چائے سرو کر کے آیا، تب تک سب ٹھیک تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے اچانک جلالی صاحب ہتھے سے اکھڑ گئے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آواز سنی۔ ڈرائنگ روم میں جھانکا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے چٹاخ سے ایک زوردار تھپڑ ڈاکٹر راشد کے منہ پر مارا پھر ایک چھتری پکڑ لی۔ وہ بڑی تیزی سے اسے پیٹنے لگے۔ وہ ہکا بکا تھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن جلالی صاحب اسے موقع ہی کہاں دے رہے تھے... وہ الٹے پاؤں چلتا چلتا پشت کے بل گرا۔ جلالی صاحب نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ ڈاکٹر کبھی شدید غصہ دکھاتا تھا، کبھی معذرت کا انداز اختیار کرتا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔ ''نکل جاؤ یہاں سے۔ اور یہ کپڑے بھی اتار دو۔ یہ وردی میری دی ہوئی ہے... اتارو یہ وردی بھی۔''

جلالی صاحب نے ڈاکٹر راشد کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اس کی شرٹ اتارنے کی کوشش کی۔ جلالی صاحب کا مُنہ نظر سمجھ کر گارڈز ڈاکٹر راشد کی طرف لپکے۔ جلالی صاحب ڈاکٹر راشد کو مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کے کپڑے اتارنے کا حکم بھی دے رہے تھے۔ دو منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر راشد کے جسم پر چڈی اور بنیان کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ جلالی صاحب دہاڑے... ''دو منٹ کے بعد تمہیں فارم کے اندر نظر نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ کتے چھوڑ دوں گا...''

ہم نے ڈاکٹر راشد کو بڑی بے توقیری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے اور راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا۔ جلالی صاحب کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ایک طرف سے نوجوان لیڈی ڈاکٹر مہناز اپنے سفید کوٹ میں دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک ملازم وہیل چیئر لایا۔ جلالی صاحب بے دم ہو کر اس پر بیٹھ گئے۔ یہ قریباً ویسا ہی نقشہ تھا جو آج سویرے عمران نے مذاق مذاق میں کھینچا تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر فوراً انہیں ایک گولی کھانے کے لیے دی۔

وہ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون ہونے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ جلالی صاحب کا پارا بدستور چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل فون نکالا اور اپنے سیکریٹری ندیم سے کہا کہ وہ ڈاکٹر عقیل کا نمبر ملائے۔ ڈاکٹر مہناز اپنا خوب صورت ہاتھ جلالی صاحب کے سینے پر چلا رہی تھی اور انہیں آمادہ کر رہی تھی کہ وہ ابھی کسی سے بات نہ کریں۔ لیکن جلالی صاحب کی تیوریاں بتا رہی تھیں کہ وہ اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں۔

سیکریٹری ندیم نے نمبر ملایا تو انہوں نے فون پر گرجتے ہوئے کہا۔ اسے باریک آواز میں گرجنا کہا جا سکتا تھا۔ "ڈاکٹر عقیل! کہاں ہو تم؟... ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ فوراً لاہور واپس آؤ... اور شیخوپورہ پہنچو۔ میں تمہیں ابھی اسی وقت اس بدمعاش راشد کی جگہ پراپائنٹ کر رہا ہوں... ابھی اسی وقت... نہیں... نہیں... یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم ابھی شیخوپورہ پہنچو۔ یہ حکم ہے میرا۔"

جلالی کے مزاج کا یہ رخ دیکھنے کے بعد ان کی شخصیت کے بارے میں کافی کچھ پتا چل رہا تھا۔ جو ایک دوسری بات معلوم ہو رہی تھی، وہ یہ تھی کہ جلالی صاحب خوب صورتی کو پسند کرتے تھے۔ ان کی دونوں ذاتی معالج نوجوان اور خوب صورت تھیں۔ خاص طور سے مہناز۔ وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کی عمر اور صحت تو ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ ایک مرد کی حیثیت سے خواتین کی خلوت سے روایتی فائدہ اٹھا سکتے۔ تاہم جس طرح خوب صورت پھولوں کی موجودگی طبع میں خوش گواری پیدا کرتی ہے، اسی طرح عین ممکن تھا کہ خوب صورت خواتین کی موجودگی سے جلالی صاحب کے دل و دماغ پر اچھے اثرات پڑتے ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ فارم ہاؤس میں موجود بیشتر ملازمائیں جوان اور خوش شکل تھیں یا کم از کم قبول صورت تھیں۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ایک شان دار ہنڈا اکارڈ پورچ میں آ کر رکی۔ اس میں سے اترنے والی ایک جواں سال خاتون تھی۔ عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ شہد رنگ خوب صورت بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک درمیانے قد کاٹھ کا سفید فام بھی اس کے ساتھ تھا۔ خاتون کے ہاتھ میں اسٹیل کا بنا ہوا ایک نہایت نفیس و دیدہ زیب پنجرہ تھا۔ اس پنجرے میں بالکل چھوٹے سائز کی دو رنگین چڑیاں تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خاتون اور اس کا ساتھی چڑیوں کا یہ جوڑا جلالی صاحب کے لیے بطور تحفہ لائے ہیں۔

جلالی صاحب سے ان دونوں مہمانوں کا وقت طے تھا، اس لیے وہ سیدھے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا، جواں سال عورت بڑی عاجزی اور لگاوٹ سے جلالی صاحب سے باتیں کر رہی تھی۔ جلالی صاحب نے نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ان کے سوکھے سڑے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگاتی تھی۔ نایاب چڑیوں والا پنجرہ شیشے کی تپائی پر رکھا تھا۔

میں کچن میں پہنچا۔ میں عمران کو ان مہمانوں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر وہ بڑے انہماک سے ایک دیگچے میں چمچہ چلانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کچن کیبنٹ کے اندر رکھا ہوا ریڈیو بھی سن رہا تھا۔ میں نے سمجھا شاید وہ "ایف ایم" سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی" کی آواز نکالی۔

اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیو نہیں سن رہا۔ یہ کوئی نئی طرز کا ڈکٹا فون تھا۔ ڈکٹا فون کا ریسیور بڑی صفائی سے ایک ڈیکوریشن پیس میں چھپایا گیا تھا۔ یہ ڈیکوریشن پیس کچن کیبنٹ کے اندر پڑا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو کی آوازیں وضاحت سے مجھ تک پہنچنے لگیں۔

عورت کی دلکش آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "بس جی، وہ خود بھی اپنی غلطی مان رہا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ آپ کا سامنا کر سکے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو وہ خود بھی آپ کے پاس حاضر ہو جائے گا۔"

"نہیں، کوئی ضرورت نہیں اس کے آنے کی۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا... اگر وہ آئے گا تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اور ایک بات تم دونوں بھی اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ پیار محبت جتا کر اور نرم رویہ دکھا کر مجھے کسی غلط کام پر آمادہ کر لو گے تو یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔ وہ باکس تمہارا نہیں اور نہ میرا ہے۔ ہم میں سے کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ میرے پاس بھی وہ بس امانت کے طور پر ہے۔ اس کا اصل مالک مل جائے گا تو میں اسے ایک منٹ بھی اپنے پاس رکھنا بہت بڑا گناہ سمجھوں گا۔"

"پلیز سر... پلیز، اب اس کا ذکر مت چھیڑیں۔ وہ چیپٹر کلوز ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر یہاں آئی ہوں۔ یقین کریں آپ کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی شان دار لائبریری میں بہت سا وقت گزارا ہے۔"

"لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے لائبریری سے کتابیں چوری کرنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔" جلالی صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

جواں سال عورت نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھی نوجوان کا قہقہہ بھی اس میں شامل تھا۔

نوجوان نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "انکل! خدا کرے باکس کا مالک مل جائے۔ آپ اس کے لیے پورا پورا انتظار کریں۔ دو مہینے، چار مہینے، چھ مہینے لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر وہ چیز آپ کے لیے تو بالکل بیکار ہوگی لیکن ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود آپ اس بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے، وہ ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا۔ اور اگر..."

"تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" جلالی نے نوجوان کی بات کاٹتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

"مائیکل جناب۔"

"مائیکل صاحب! کیا میرے ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ میں الو کا پٹھا ہوں...؟"

"جج... جی... میں سمجھا نہیں۔"

"میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ کھڑے ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں کھڑے ہو جاؤ۔"

جواں سال عورت نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز جلالی کی پرجلال آواز میں دب گئی۔ وہ چلائے۔ "تم بھی کھڑی ہو جاؤ۔ نیچے رکھو یہ چائے کا کپ... نیچے رکھو۔"

جلالی کی متلون مزاجی ایک بار پھر کام دکھا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی صورتِ حال ڈرامائی ہو گئی تھی۔ جلالی کی کڑکتی آواز سنائی دی۔ "تم لوگ کیا سمجھتے ہو؟ جو کام مجھ پر سختی کرنے سے نہیں ہو سکا، وہ مجھے بہلا پھسلا کر اور بے وقوف بنا کر کروا لو گے...؟ تمہارے جیسے لونڈے لونڈیوں کو اپنے ازاربند سے باندھ کر رکھتا ہوں میں... میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ اب پھر وہی بکواس کر رہے ہو تم؟"

جلالی صاحب کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ جواں سال خاتون گھبرا کر بولی۔ "جلالی صاحب! مائیکل کا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ تو..."

"بند کرو بکواس۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے... فوراً نکلو۔" غالباً جلالی صاحب نے جواں سال خاتون کو دھکا دیا تھا۔

نوجوان بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مسٹر جلالی! ہم تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے لیکن تم خود مشکل کو دعوت دے رہے ہو۔ اس طرح سے نہیں چلے گا۔"

"آ گئے ہو نا اپنی اصلیت پر۔ تم گینگسٹر ہو، حرامزادے ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا، جان سے مار دوں گا۔"

"اپنے بڑھاپے پر رحم کھا جلالی۔ مرنا مشکل ہو جائے گا تیرا..."

"تو کر دو مشکل۔ الٹا لٹکا دو اپنے اس باپ کو... لیکن اس باپ نے تمہیں کچھ بتا کر نہیں دینا۔ آخری دم تک نہیں۔" جلالی صاحب اتنے زور سے بولے تھے کہ انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ صورتِ حال دھماکا خیز ہوتی جا رہی تھی۔

عمران نے ڈکٹا فون کا ریسیور آف کر کے کچن کیبنٹ کا پٹ بند کیا اور مجھے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف آیا۔ تب تک جلالی صاحب جواں سال عورت اور اس کے سخت گیر ساتھی کو دھکے مار کر ڈرائنگ روم سے باہر نکال چکے تھے۔ ہمارے سامنے ہی رنگین چڑیوں والا قیمتی پنجرہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر گرا اور پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ جلالی صاحب گرجے... "آئی سے گیٹ آؤٹ... جسٹ ناؤ... یو باسٹرڈ... یو راسکل۔"

پھر ہم نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا۔ جلالی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور جھکتے جھکتے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا رنگ زردی مائل ہو رہا تھا۔ "ڈاکٹر مہناز!" کسی نے زور سے پکار کر کہا۔

اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ ڈاکٹر مہناز بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ اس نے جلدی سے جلالی صاحب کو صوفے پر لٹایا۔ ان کی زبان کے نیچے ایک اسپرے کیا۔ پھر ایک انجکشن بھرنے لگی۔ جلالی صاحب نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر مہناز نے جلدی جلدی ان کی وین میں دوا انجیکٹ کی۔

میں نے دیکھا، جواں سال عورت کا چہرہ پریشانی اور گھبراہٹ کی آماجگاہ تھا۔ وہ اپنے ساتھی سفید فام نوجوان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے غصہ تھا کہ اس کی تلخ کلامی کی وجہ سے جلالی کا پارا چڑھا تھا اور اب وہ سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے۔ جواں سال عورت نے آگے بڑھ کر جلالی کی حالت کا اندازہ لگانا چاہا۔ ڈاکٹر

مہناز طیش سے بولی۔ ”پلیز! آپ لوگ باہر چلے جائیں... آپ ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو پتا بھی ہے سب کچھ۔“

جواں سال عورت باہر آگئی اور بے قراری سے ہاتھ ملنے لگی۔ ڈاکٹر مہناز کی ساتھی ڈاکٹر لائبہ بھی گھبرائی ہوئی پہنچ گئی۔ مہناز کی ہدایت پر ڈاکٹر لائبہ موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ غالباً اپنے کسی سینئر سے ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز ہی کی ہدایت پر سیکریٹری ندیم بھاگا ہوا گیا اور آکسیجن کا سلنڈر اور ماسک وغیرہ لے آیا... جلالی صاحب کو فوراً آکسیجن چڑھا دی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں نے جلالی صاحب کو HOSPITALIZE کرنے کا بیشتر انتظام گھر پر ہی کر رکھا ہے۔

اس ساری افراتفری کے دوران میں ہی جواں سال عورت اور اس کا ساتھی، فارم ہاؤس سے کھسک گئے۔ میں نے ان کی نئی ہنڈا اکارڈ کو بیرونی گیٹ کی طرف جاتے دیکھا... ...لی صاحب مسلسل آنکھیں بند کیے لیٹے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی رہے تھے۔ ان کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز انہیں طبی امداد دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون رہنے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ لیکن ”جلالی“ تو ماننے والے شخص کا نام ہی نہیں تھا۔ آخر ڈاکٹر مہناز نے انہیں ایک اور انجکشن دے دیا۔ غالباً یہ انہیں پُرسکون کرنے کے لیے تھا۔

میں اور عمران کچن میں واپس آگئے۔ ”یہ کیا گورکھ دھندا ہے یار! یہ کس باکس کی بات ہو رہی ہے یہاں؟“

”یہی معلوم کرنے کے لیے تو ہم یہاں ہیں۔“

”پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اندازہ لگایا ہوگا تم نے... آخر جیمز بانڈ کے ہم زاد ہو تم۔ یہاں تم نے ڈرائنگ روم میں باقاعدہ ڈکٹافون چسپاں کیا ہوا ہے۔“

خلاف توقع عمران سنجیدہ رہا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس چیز کا باکس ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، خاصا قیمتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں رقم وغیرہ ہو یا کوئی قیمتی دھات، یا پھر نوادر قسم کی چیز۔ یہ باکس اتفاقاً ہی جلالی کے ہاتھ لگا ہے اور انہوں نے اسے کسی کی امانت کے طور پر سنبھال لیا ہے۔ جلالی صاحب سنکی شخص ہیں۔ ایسے لوگوں کے ذہن میں ایک بار جو بات بیٹھ جائے، وہ آسانی سے نکلتی نہیں۔ وہ اب اس باکس کو ایک امانت کا درجہ دے چکے ہیں اور اس سے پیچھے ہٹنے کو ہرگز تیار نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شروع میں انہوں نے اس باکس کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی ہو لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اس کو کہیں چھپا دیا۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے اور اس کا پتا جلالی صاحب کے سوا اور کسی کو نہیں۔ اب جلالی صاحب سے اس باکس کو برآمد کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مشہور جاپانی فلاسفر میر تقی میر نے اپنی ”انگریزی کتاب“ میں محمد خان جونیجو والے باب میں لکھا ہے۔ کبھی کبھی انسان کی کمزوری ہی اس کی طاقت بن جاتی ہے... یہاں حضرت جلالی صاحب کی ناتوانی ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار بنی ہوئی ہے۔ درحقیقت جلالی صاحب پاکستان میں دوسرے نمبر کے اڑیل اور ضدی شخص ہیں۔“

”اور پہلے نمبر پر کون ہے؟“

”میں بتاؤں گا تو تم مجھ سے مارشل آرٹ شروع کر دو گے۔ یہ موضوع پھر کبھی سہی۔“ وہ شرارت سے بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”چند دن پہلے جلالی صاحب نے اپنی ان صلاحیتوں کو پوری طرح ثابت بھی کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، کم از کم دو خطرناک پارٹیاں ایسی ہیں جو اس باکس کے پیچھے ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی تو وہی ہے جس کے دو ”معزز“ ممبران ابھی تھوڑی دیر پہلے جلالی صاحب سے مل کر گئے ہیں۔ کچھ دن پہلے یہ لوگ جلالی صاحب کو اپنا انتہائی خطرناک روپ بھی دکھا چکے ہیں۔ انہوں نے جلالی صاحب کے گھر میں ہی ان پر سختی کی بلکہ باقاعدہ تشدد کیا۔ جلالی صاحب کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اپنی زندگی موت کی طرف سے بھی وہ تقریباً بے پروا ہو چکے ہیں۔ سو وہ اس بدمعاشی کے خلاف ڈٹ گئے۔ تشدد کے دوران میں جب ان کی حالت خراب ہوئی تو تشدد کرنے والے خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے بجا طور پر سوچا کہ اگر باباجی کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تو وہ باکس ہمیشہ کے لیے ”گمشدہ“ ہوسکتا ہے۔ وہ لوگ اس کوٹھی اور فارم ہاؤس کا چپا چپا چھان چکے ہیں۔ باباجی سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو بھی نچوڑ چکے ہیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔“

”اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اب باکس میں ہے کیا بلا؟ اور شاید اس سے بھی اہم یہ کہ وہ باباجی یعنی جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟“

عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس سلسلے میں ہماری کچھ نہ کچھ مدد کرسکتی ہے مگر وہ بھی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت

...ی یہ فارم ہاؤس چھوڑ چکی ہوتی۔ یہ جلالی صاحب سے اس کا ...گاؤ ہے جس نے اب تک اسے یہاں روکا ہوا ہے۔“

”لگاؤ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا وہ انہیں ایک بزرگ کی حیثیت دیتی ہے؟“

”نہیں یار! خود کو بزرگ کہنے والے کا تو جلالی صاحب منہ توڑ دیتے ہیں۔ یہ وہی ”لگاؤ“ ہے جو میر تقی میر کے شعروں میں ہوتا ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”فضول بول بول کر تمہارا دماغ چکرا گیا ہے۔ ابھی تم فرما رہے تھے کہ میر تقی میر ایک مشہور جاپانی فلاسفر کا نام ہے۔“

”میر تقی میر کے ننھیالی جاپان میں تھے اور ہر شاعر پارٹ ٹائم فلسفی بھی ہوتا ہے۔ تم بال کی کھال مت اتارا کرو۔ بس یہ بتاؤ کہ تم کسی طرح ڈاکٹر مہناز سے کچھ سن گن لے سکتے ہو یا نہیں؟“

”سن گن لینے والے کام تم مجھ سے بہتر کر لیتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہاں گڑبڑ ہے۔ پرسوں باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحبہ سے ذرا نوک جھونک ہوگئی تھی۔ وہ میری طرف سے ذرا بدگمان سی ہیں، تم کوشش کرو تو شاید بات بن جائے۔“

”کیا کیا تھا تم نے؟“

”بس وہی یار! زبان میں کھجلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا بول دیا۔ ان کو برا لگ گیا۔“ وہ معصومیت سے ...لا۔

”یہ کھجلی کسی دن تمہیں بے طرح پٹوائے گی۔ ہر لڑکی کو ناہین سمجھنا چھوڑ دو۔“

”اچھا چچا جان! لیکن اب کیا کرو گے؟ مہناز سے ...ت کرنے کے لیے کوئی طریقہ ڈھونڈو۔“

... مجھے مہناز سے بات کرنے کا موقع اگلے روز نو ...ے کے لگ بھگ مل گیا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا کرنے کے ...عد جلالی صاحب اپنی چمچماتی شیورلیٹ گاڑی میں لاہور چلے گئے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ عمران (باورچی) بھی ان کے ساتھ تھا۔ جلالی صاحب بہترین سبزی کے علاوہ بہترین دیسی ...ل کے گوشت کے بھی شوقین تھے۔ ان چیزوں کے انتخاب ...لیے وہ اپنی بیماری کے باوجود لاہور کی ٹولنٹین مارکیٹ ...جاتے تھے اور باورچی بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں ...ا تھا۔ ذہن ثروت کی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ نصرت کی ...ال کے حالات بھی پریشان کر رہے تھے۔ وہ ثروت کے ساتھ چچا احمد کے پاس آسٹریا پہنچ رہی تھی مگر علاج شروع ہونے تک ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔ اتنے میں ملازم وحید نے آکر بتایا کہ مہمان آئے ہیں۔ دو کپ چائے کی ضرورت ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ انہیں ”ٹی بیگ“ والی چائے کی ضرورت تھی ورنہ میں کوئی ایسی خاص چائے بنانے کے قابل نہیں تھا۔ ”کون آیا ہے؟“ میں نے رسمی انداز میں وحید سے پوچھا۔

”ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔“

کچھ دیر بعد وحید چائے لے کر چلا گیا تو میری رگِ تجسس پھڑکی۔ ڈاکٹر مہناز اور اس کی والدہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں تھیں اور یہی وہ جگہ تھی جہاں عمران نے سینٹر ٹیبل کے نیچے ایک نہایت حساس مائیکروفون نصب کر رکھا تھا۔ میں نے کچن میں رکھے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ تھوڑی سی کوشش کی اور ریسیور کو آن کرنے میں کامیاب رہا۔ ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں چائے کے برتن کھڑکھڑانے کی آوازیں بھی تھیں۔ میں نے ڈیکوریشن پیس کو کچن کیبنٹ کے اندر رکھا اور آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کرلیا۔ ایک بڑی عمر کی عورت کی آواز ابھری۔ ”مہناز! سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی بھی وقت دوبارہ مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ تمہیں کچھ ہوگیا تو میں کیا کروں گی؟ میرا اور کون ہے تمہارا سوا؟“

”کچھ بھی ہے امی! میں ان حالات میں جلالی صاحب کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ انہیں میری ضرورت ہے۔“

”لیکن مہناز! یہ ضرورت کوئی اور ڈاکٹر بھی پوری کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر لائبہ یہاں موجود ہے۔ وہ اپنی مدد کے لیے کسی اور سینئر ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر کو یہاں بلا سکتی ہے۔“

”مگر امی! جس طرح میں ان کی طبیعت کو سمجھتی ہوں، کوئی اور نہیں سمجھے گا۔ اسے سمجھنے میں کافی وقت لگے گا۔“

بڑی عمر کی عورت کی تپی ہوئی آواز ابھری۔ ”کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ ٹھیک ہیں جو کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ”انوالو“ ہو چکی ہو... کچھ رحم کرو ہم پر مہناز... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ چپکائے رکھتا ہے۔ وہ تمہارے...“

”پلیز امی... پلیز... خاموش ہو جائیں۔ میری اور اپنی توہین مت کریں۔ کیا مرد عورت کا بس ایک ہی تعلق ہوتا

ہے... ایک ہی رشتہ ہوتا ہے...؟"

"میں کب کہتی ہوں ایک ہی ہوتا ہے۔ بہت سے ہوتے ہیں لیکن تم اس رشتے کو کیا نام دو گی؟" مہناز کی والدہ بھی بپھری ہوئی تھی۔

"ضروری نہیں کہ ہر رشتے کو نام ہی دیا جائے... اس کو کسی خودساختہ خانے میں ہی "فٹ" کیا جائے۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں، ان کی عزت کرتی ہوں... اور وہ محبت اور عزت کے قابل ہیں بھی۔ وہ ایک الگ طرح کے انسان ہیں۔ ان میں ایسی خوبیاں ہیں جو عام لوگوں میں نہیں ہوتیں..."

"یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی عینک لگاتی ہو تم یہ خوبیاں دیکھتے ہوئے۔ ہمیں تو اس کھوسٹ میں رنگ برنگی بیماریوں، اکڑفوں اور غصے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

"پلیز امی... ان کے بارے میں ایسا مت بولیں۔ پلیز۔" پھر ڈاکٹر مہناز شاید رونے لگی تھی۔

اس کی والدہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھ مہناز! اگر تو نے میری بات نہیں مانی نا... تو پھر مجھے امی بھی مت کہنا۔ سمجھ لینا... کہ مر گئی ہے تمہاری امی... وہ بھی تمہارے باپ کے پاس چلی گئی ہے۔ میں جارہی ہوں۔ اب نہیں آؤں گی..." وہ بات کرتے کرتے مائیکروفون سے دور چلی گئی تھی لہٰذا اس کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ میں نے پلٹ کر کچن کی ایک کھڑکی کھولی۔ مجھے چھوٹے ڈرائنگ روم میں سے ایک درمیانی عمر کی صحت مند عورت نکلتی نظر آئی۔ اس نے براؤن چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ غصے میں دکھائی دیتی تھی۔ تب ڈاکٹر مہناز دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو روکنا چاہا... لیکن اس نے مہناز کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا اور کچھ کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

مہناز ہچکیوں سے روتی ہوئی جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف واپس چلی گئی۔ عورت پورچ میں کھڑی ایک گرے رنگ کی سوئفٹ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ کار میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا، وہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عورت بھی مسلسل رو رہی ہے۔

میں کچھ دیر بعد چائے کے برتن لینے کے بہانے چھوٹے ڈرائنگ روم میں گیا تو ڈاکٹر مہناز کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے بالوں کی دو لٹیں سرخی مائل چہرے پر جھول رہی تھیں۔ ایک سوگوار سی دلکشی نے اس کے نقوش کو ڈھانپا ہوا تھا۔

"کسی چیز کی ضرورت ڈاکٹر صاحبہ؟" میں نے آنکھیں ملائے بغیر پوچھا۔

"تابش! ایک گلاس پانی لے آؤ ــــ مجھے گولی کھانی ہے۔"

"لیکن... آپ نے تو ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ خالی پیٹ گولی؟"

"اوہ۔" ڈاکٹر مہناز نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اچھی ڈاکٹر ہوں میں۔"

"کچھ لے آؤں؟"

"چلو، ڈبل روٹی کے دو پیس سینک لاؤ اور پانی۔"

میں دو تین منٹ میں پیس سینک کر لے آیا۔ میں نے پلیٹ میز پر رکھی تو وہ غور سے میرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاہٹ کے انداز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحبہ! اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک سوال پوچھوں؟"

"ہاں کہو؟"

"مجھے یہاں آئے ہوئے بس دو چار دن ہی ہوئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کچھ گڑبڑ ہے سارے ملازم کچھ ڈرے ڈرے سے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ بات بھی نہیں کرتے؟"

"بس اس جگہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ یہاں بڑا سکون تھا، ہر چیز ایک روٹین کے مطابق تھی۔ پھول، پرندے، خوب صورت جانور، موسیقی، مزیدار کھانے سب کچھ تھا یہاں... لیکن اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ کسی ان دیکھے سے خوف نے ہر چیز کو جکڑ لیا ہے۔"

"خوف کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے ڈاکٹر صاحبہ؟"

"کوئی ایک وجہ تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر مہناز نے گول مول سا جواب دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ابھی آپ نے کہا ہے کہ یہاں بہت سی اچھی چیزیں تھیں۔ پرندے، پھول اور مزیدار کھانے وغیرہ۔ آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے پکائے ہوئے کھانے مزیدار نہیں ہوتے۔"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "سچ پوچھو تو یہی مطلب ہے پہلے دونوں باورچی بہت اچھے تھے۔"

"لیکن وہ چھوڑ کیوں گئے؟"

"اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔" مہناز کا جواب پھر گول مول تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا ڈرائیور بھی نیا ہے اس کے علاوہ دو مالی بھی موجود نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں لوگ یہاں کے حالات کی وجہ سے ملازمتیں چھوڑ گئے ہوں؟"

یکا یک ڈاکٹر مہناز کو احساس ہوا کہ وہ میرے ساتھ ایک غلط موضوع چھیڑ بیٹھی ہے۔ میں ملازم کی حیثیت سے یہاں نیا نیا آیا تھا۔ وہ بولی۔ "تم لوگوں نے جلالی صاحب کو بتایا ہے کہ تم اس سے پہلے انڈیا میں کام کرتے رہے ہو لیکن مجھے تم دونوں کے ہاتھوں میں کوئی خاص انڈین ذائقہ نظر نہیں آیا۔ اور سچ پوچھو تو..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی؟" میں نے کہا۔

"سچ پوچھو تو مجھے تمہارا یہ استاد باورچی لگتا ہی نہیں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔"

میں اندر سے چونک گیا مگر تاثرات کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ "کیا کھانوں کے ذائقے میں کمی کی وجہ سے آپ کو ایسا لگ رہا ہے؟"

"یہ بات بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ باورچی اور خانساماں اس طرح کے نہیں ہوتے۔ یہ گہرا شخص لگتا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ کام کرتے شاید زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔"

"نہیں جی... چھ سات سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"تم نے کچھ محسوس نہیں کیا؟"

"نہیں جی۔" میں نے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے کہا۔ "ویسے... میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں بھی استاد عمران ہی کی طرح لگتا ہوں؟"

اس نے اپنی دھلی دھلائی آنکھوں سے مجھے سرتا پا دیکھا اور بولی۔ "سچ بات یہ ہے کہ باورچی تو تم بھی نہیں لگتے۔ یا پھر یہ ہے کہ ماڈرن لوگوں کے ساتھ کام کر کر کے تم ذرا ماڈرن ہو چکے ہو۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ ان کی کھال بہت سخت ہے۔ جیسے ہاتھ..."

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے دروازے کی نچلی درز میں سائے کی حرکت سی نظر آئی۔ یوں لگا کہ کوئی دروازے کے بالکل پاس موجود ہے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈاکٹر مہناز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستگی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھول دیا۔ ایک تنومند شخص شاید "کی ہول" سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہکا بکا رہ گیا۔ غالباً اس نے دروازے سے ٹیک بھی لگا رکھی تھی... اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور لڑکھڑا کر ایک قدم اندر آیا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا مگر اس نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے سیاہ پسٹل نکالا اور پھنکارا۔ "خبردار! گولی ماردوں گا۔"

اس کے گول چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوکھلاہٹ میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر مہناز کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔ میں بھی جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس شخص نے ڈرائنگ روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا لیکن وہ ایک چیز بھول گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر مہناز کے کافی پاس آ گیا۔ ڈاکٹر خوف کے پہلے شدید حملے سے سنبھل چکی تھی۔ اس نے دلیری دکھائی اور تیزی کے ساتھ ماربل کے گل دان سے تنومند شخص کے ہاتھ پر چوٹ لگائی۔ گل دان ٹوٹ گیا اور پسٹل بھی حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتنی مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں نے حملہ آور کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ وہ صوفے پر گرا اور اسے الٹتا ہوا قالین پر لڑھک گیا۔ میں اس پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی بریک لگانے پڑے۔ اس شخص کے ہاتھ میں قریباً ایک فٹ لمبے پھل والا خوفناک چھرا دکھائی دیا۔ وہ برق کی طرح مجھ پر آیا۔ اس نے پہلا وار گردن پر کیا۔ میں نے سرعت سے پیچھے ہٹ کر یہ جان لیوا وار بچایا۔ دوسرا وار پیٹ پر تھا۔ میں یہ وار بچانے میں بھی کامیاب رہا۔ میری کڑی مشقیں کام آرہی تھیں، ورنہ میں ایسے بے رحم "لڑاکوں" کے مقابلے کی سکت کہاں رکھتا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر مہناز دروازہ کھولنے کے لیے لپکی مگر قالین کے کنارے سے الجھ کر الٹے پڑے صوفے پر گری۔ حملہ آور کے قاتل چھرے کا تیسرا وار بچانے کے بعد مجھے جوابی حملے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس کی ناف میں ٹانگ رسید کی۔ وہ ڈکرایا اور تکلیف کی شدت سے جھکا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑا۔ اسے نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور دیوار سے دے مارا۔ یہ بڑا شدید تصادم تھا بلکہ میری توقع سے بھی شدید تھا۔ تنومند حملہ آور کا سر یقیناً پھٹ گیا تھا۔ وہ اوندھے منہ قالین پر گرا۔ چھرا اس کے ہاتھ سے نکل کر میز کے نیچے چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر زوردار ٹھوکر رسید کرنے کے لیے پاؤں کو پیچھے کی طرف حرکت دی لیکن یہ حرکت وہیں رک گئی۔ حملہ آور کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے لگا وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ لیڈی

ڈاکٹر لائبہ کی آواز آئی۔ ''ڈاکٹر مہناز! کیا ہے؟ کون ہے اندر؟''

میرے اشارے پر ڈاکٹر مہناز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر لائبہ اندر آئی تو میں نے دروازہ جلدی سے دوبارہ لاک کر دیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر نوجوان ڈاکٹر لائبہ کا رنگ بھی سفید پڑ گیا۔ صوفے پر گرنے سے ڈاکٹر مہناز کے بازو پر چوٹ آئی تھی اور اس کی پھول دار قمیص کا گریبان الٹے ہوئے صوفے کے پائے سے الجھ کر پھٹ گیا تھا۔ اس کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک نظر آ رہا تھا۔ اس نے اوڑھنی سے اپنے جسم کو ڈھانپا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور حملہ آور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی ناک اور دائیں کان سے خون رسنے لگا تھا۔ یہ تشویشناک علامت تھی۔

اس کے جسم نے ایک خفیف سی جھرجھری لی اور ساکت ہو گیا۔ مجھے لگا وہ مر گیا ہے۔ صرف تین چار سیکنڈ بعد ڈاکٹر مہناز نے بھی دہشت زدہ انداز میں تصدیق کر دی۔ حملہ آور کی ایک کنپٹی پر نہایت سنگین چوٹ آئی تھی۔ ''اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا؟'' ڈاکٹر مہناز لرزاں آواز میں بولی۔ لائبہ بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''کون تھا یہ؟'' میں نے ان دونوں سے پوچھا۔

''فارم کی ٹریکٹر ٹرالیاں چلانے والوں میں سے ہے۔ آٹھ دس دن پہلے ہی ملازم ہوا تھا۔'' ڈاکٹر مہناز نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''اب کیا ہو گا؟'' ڈاکٹر لائبہ روہانسی ہو کر بولی۔

''کچھ نہیں ہو گا۔ اس شخص نے ہماری جان لینے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ ملازم کے بھیس میں کوئی خطرناک مخبر تھا۔ لیکن... لیکن ابھی ہم نے اس خبر کو عام نہیں ہونے دینا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

ڈاکٹر مہناز ٹکٹکی ہوئی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اب اس کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ میں صرف ایک باورچی ہوں۔

میں نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اتفاقاً اردگرد کوئی اور ملازم موجود نہیں تھا۔ نہ ہی ڈاکٹر لائبہ کے علاوہ یہاں کسی کو ڈرائنگ روم میں ہونے والی دھینگا مشتی کی خبر ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کا صوفہ الٹا ضرور تھا مگر اس کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صوفے کو سیدھا کر کے رکھا۔ باقی بے ترتیبی کو بھی درست کیا۔ پھر ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ اپنی اوڑھنی کو درست کر کے اپنے کمرے میں جائیں اور یہ قمیص بدل لیں۔ کسی کو ابھی کچھ نہیں بتانا۔ ہمارا مؤقف ہے کہ یہ بندہ ڈرائنگ روم کے سامنے والی سیڑھیوں سے گر کر مرا ہے۔ وہاں اوپر کسی نے پانی پھینکا ہوا تھا۔ یہ تیزی سے آیا اور لڑھک گیا... آپ دونوں میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟''

ڈاکٹر مہناز اور لائبہ جیسے ہپناٹائز ہو چکی تھیں۔ دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے حملہ آور کا پسٹل اور چھرا دونوں کپڑے میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیے۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے ایک بار پھر کہا کہ وہ حملہ آور کو چیک کرے۔ قریباً ایک منٹ بعد ڈاکٹر مہناز اور لائبہ دونوں نے تصدیق کی کہ وہ ''ایکسپائر'' ہو چکا ہے۔

''ٹھیک ہے، آپ دونوں جائیں۔ میں اس کی باڈی کو سیڑھیوں کے پاس رکھ دیتا ہوں۔ ایک بار پھر گزارش ہے کہ آپ ابھی اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ نہ جھوٹ بولیں، نہ سچ بولیں...''

ڈاکٹر مہناز بدستور مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں کون ہیں؟''

''میں وعدہ کرتا ہوں، میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو اور جلالی صاحب کو ہم سے فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں...''

''کہیں تم... خفیہ پولیس سے تو...'' ڈاکٹر لائبہ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں نے کہا ہے نا۔ موقع ملتے ہی میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال صرف یہ گزارش ہے کہ مجھے دوست سمجھیں اور چند گھنٹے کے لیے مکمل خاموشی اختیار کریں۔''

دونوں ڈاکٹرز حواس باختہ تھیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر لائبہ۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں تو میں نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ متوفی کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے موبائل فون کے علاوہ ڈھائی تین ہزار کی نقدی، ٹریکٹر کی چابیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ میں نے صرف موبائل فون نکالا۔ باقی ساری چیزیں دوبارہ اس جیبوں میں رکھ دیں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر میں نے دھیان دائیں بائیں دیکھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے لاش کو گھسیٹا اور سیڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ڈال دیا... اس بعد میں نے کچن تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

قریباً پانچ چھ منٹ مکمل خاموشی سے گزرے۔ بس فارم ہاؤس کے چڑیا گھر کی طرف سے بندروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں یا طوطے ٹیں ٹیں کرتے رہے... کوٹھی کے اندر کسی کمرے میں دھیمی آواز سے ''ٹی وی'' بول رہا تھا۔ اچانک ایک ملازمہ سیڑھیوں کے قریب زور سے چلائی۔ اس کی آواز پوری کوٹھی میں گونجی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہرام سا مچ گیا۔

☆☆☆

فارم ہاؤس میں اگلے آٹھ دس گھنٹے ہنگامہ خیز تھے۔ ڈاکٹر مہناز میری توقعات پر سو فیصد پوری اتری تھی۔ اس نے اور اس کے کہنے پر ڈاکٹر لائبہ نے بھی اپنی زبان بالکل بند رکھی تھی۔ اس ''حادثے'' نے وقتی طور پر جلالی صاحب کو بھی خاصا پریشان کیا۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ ہلاک ہونے والے اس مختار نامی شخص کے سر کے علاوہ کہیں کوئی اور زخم نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس کے کپڑے پھٹے تھے، نہ ہی کسی طرح کی زمینی شہادت تھی۔ فارم ہاؤس میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ شخص ایک خطرناک قاتل ہے اور اپنے ایک خطرناک کرتوت کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترا ہے۔ اس کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی ڈرائیور ہے۔ محنتی ہے اور ایک قریبی مزار پر حاضری بھی دیتا ہے۔ کسی کو اس کے مہلک پسٹل کا پتا تھا اور نہ ایک فٹ لمبے چھرے کا۔ اس کا پورا نام مختار ملک تھا۔

عمران کی واپسی کے آدھ گھنٹے بعد ہی میں نے اسے اس واقعے کی پوری تفصیل بتا دی تھی۔ عمران کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ فارم ہاؤس میں حملہ آور کا کوئی اور ساتھی بھی موجود ہو سکتا ہے۔

''ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''گھبراؤ مت۔ اللہ بخشے ''مختار ملک'' کا بھرا ہوا پسٹل میرے پاس ہے... اور اب مجھے ٹریگر دبانا بھی بڑی اچھی طرح آ گیا ہے۔ کہو تو تمہارے پاؤں کی طرف دبا کر دکھاؤں؟''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''بڑے پرزے نکل رہے ہیں تمہارے؟''

''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''ایک تو جارج گورا نے تمہارے ہاتھوں مار کھا کر میرا مستقبل تاریک کر دیا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ہمارا اندازہ تھا کہ مختار کا تعلق لاہور سے تھا اور یہ بھی قیافہ تھا کہ چار پانچ بجے تک اس کے ورثا لاش وصول کرنے کے لیے پہنچ جائیں گے مگر شام کے بعد تک بھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمیں جلالی صاحب کے سیکریٹری ندیم کے ذریعے پتا چلا کہ مختار کو جس شخص کی ضمانت اور سفارش پر نوکری دی گئی تھی، وہ کوئٹہ میں ہے... اور فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتا۔ مختار کی بیوی اور بھائی سے رابطہ ہو گیا ہے۔ ان کی خواہش پر میت کو بذریعہ گاڑی لاہور پہنچایا جا رہا ہے۔ ان اطلاعات سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید پوسٹ مارٹم وغیرہ کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔ فارم ہاؤس میں بھی اس واقعے کو حادثاتی ہی سمجھا جا رہا تھا۔ اگر کسی کو کوئی شبہ تھا بھی تو اس نے زبانی اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں، میں نے ایک چیز نوٹ کی۔ کچھ ملازم اس واقعے کو پُراسرار رنگ بھی دے رہے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایسے توہمات عام پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایک ملازم کو یہ کہتے سنا کہ ان سیڑھیوں پر پہلے بھی ایک حادثہ رونما ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جلالی صاحب کا ایک مہمان تیورا کر نیچے گرا تھا اور سر پر چوٹ لگنے سے اپنی یادداشت مکمل طور پر کھو بیٹھا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ایک پرائیویٹ ایمبولینس پر مختار کی لاش لاہور کے لیے روانہ کر دی گئی۔ جلالی صاحب کا سیکریٹری ندیم اور ملازم خاص فتح محمد ایمبولینس کے ساتھ گئے۔

لاش کی روانگی کے بعد کوٹھی میں قدرے سکون ہو گیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے سیل فون سے ریان ولیم سے بھی بات چیت کی اور انہیں فارم ہاؤس کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے نئی ہدایات طلب کیں۔

عمران سے مشورہ کر کے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے چائے تیار کی اور چائے دینے کے بہانے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ سے ضروری بات کرنی ہے... اگر آپ چھت پر آ سکیں۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

میں چھت پر چلا گیا۔ صاف ستھری وسیع چھت پر خوب صورت اور آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف فوم کا بیڈ پڑا تھا۔ اوس اور ہلکی پھوار سے بچانے کے لیے اس پر

ایک چھپر کٹ تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خوش گوار خنکی تھی۔ جھونکوں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ٹریکٹر چلنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھی۔ چھت پر بھی پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ان کیاریوں کے درمیان چہل قدمی کے لیے ایک طویل روش تھی۔ دو دودھیا بلب اس وسیع چھت کو نیم روشن کر رہے تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی ایک شال اوڑھے وہاں پہنچ گئی۔ صبح والے سنگین واقعے کے اثرات ابھی تک اس پر عیاں تھے۔

ہم دونوں پاس پاس کھڑے ہوگئے۔ "یہ سب کیا ہے تابش! آپ دونوں کون ہیں؟" وہ تقریباً روہانسی آواز میں بولی۔ وہ مجھ سے واضح طور پر مرعوب بھی نظر آتی تھی۔

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا لیکن آپ کو بھی کچھ بتانا پڑے گا۔ ہمارے درمیان یہ دوطرفہ انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تو یقین کریں کہ ہم سب کے لیے بہت اچھا ہوگا۔ جلالی صاحب بھی اس بحران سے صاف نکل آئیں گے جس نے ان کا جینا مشکل کر رکھا ہے۔"

"لیکن مجھے پتا تو چلے کہ میں دراصل کس سے بات کر رہی ہوں۔ ابھی تک تو سب کچھ اندھیرے میں ہے۔ جس طرح مجھے مختار ڈرائیور کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ اصل میں کون ہے، اس طرح آپ دونوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کوئی شخص بھی اپنے اصل چہرے کے ساتھ نہیں ہے۔"

... اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان تفصیل سے بات ہوئی۔ اس گفتگو میں ہمارے درمیان اجنبیت کی کئی دیواریں گر گئیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو یہ باور کرا دیا کہ ہم یہاں صرف جلالی صاحب کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں اس باکس سے کوئی غرض نہیں جو جلالی صاحب کے پاس ہے اور جس کے پیچھے کچھ خطرناک لوگ دیوانے ہو رہے ہیں۔

مہناز کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں یہاں بھیجنے والا کون ہے؟

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر مہناز! وقت آنے پر میں اس کا جواب بھی پوری وضاحت سے آپ کو دے دوں گا۔ فی الحال آپ مجھے اس حوالے سے خاموش رہنے کی اجازت دے دیں۔ آپ کی الجھن کم کرنے کے لیے میں آپ کو صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ ہمیں یہاں بھیجنے والے جلالی صاحب کے نہایت مخلص دوست بلکہ پرستار ہیں۔ کسی وجہ سے وہ فی الوقت سامنے آنا نہیں چاہ رہے۔"

پتا نہیں کہ میری باتوں پر ڈاکٹر مہناز نے کتنے فیصد بھروسا کیا۔ تاہم اس کی چھٹی حس کافی توانا لگتی تھی۔ اس کے علاوہ شاید مردم شناسی کا قدرتی وصف بھی اس کے اندر موجود تھا۔ اس نے میرے کچھ اہم سوالوں کے جواب دیے جس سے صورتِ حال کی نہایت دھندلی تصویر قدرے وضاحت سے دکھائی دینے لگی۔

میرا سب سے اہم سوال اس باکس کے متعلق ہی تھا میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟"

مہناز نے صاف گوئی کے انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "نہیں تابش صاحب! اس بارے میں جلالی صاحب نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے دو بار پوچھا تھا۔ اب تیسری بار پوچھنے کی ہمت نہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ غصے میں آنے سے ان کی طبیعت تیزی سے بگڑتی ہے اور پھر سب کچھ مجھے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔"

"آپ کا اپنا اندازہ کیا ہے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز ہی ہے۔ نقدی یا پھر جم اسٹون یا قیمتی دھات وغیرہ۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق باکس کا سائز زیادہ بڑا نہیں اور نہ وہ زیادہ وزنی ہے۔ ورنہ اسے چھپانے یا کہیں لے جانے کے لیے جلالی صاحب کو کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ اور اب تک جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں جلالی صاحب نے ندیم اور فتح محمد سمیت کسی کی مدد بھی نہیں لی ہے۔"

"کیا وہ کسی وقت گاڑی خود بھی ڈرائیو کر لیتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ موڈی بندے ہیں انہیں کوئی کسی کام سے روک نہیں سکتا۔"

"آپ بھی نہیں؟" میں نے ذرا معنی خیز انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ "نہیں، جب ان کی مرضی نہ ہو تو وہ میری بھی نہیں سنتے۔ حالانکہ طبیعت بگڑنے پر مجھے ہی آوازیں دی جاتی ہیں۔"

"اگر وہ کسی وقت خود بھی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ باکس فارم ہاؤس کے اندر ہی کہیں موجود ہو۔"

"بالکل... یہ ضروری نہیں۔"

"ڈاکٹر مہناز! ایک اہم سوال ہے۔ اگر ممکن ہے تو پلیز، اس کا جواب ضرور دیجیے... یہ باکس جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟"

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر تھوڑی دیر کے لیے ہچکچاہٹ نظر آئی۔ پھر اس نے اس ہچکچاہٹ پر قابو پایا اور بولی۔ "یہاں پاس ہی ایک نہر ہے۔ جلالی صاحب کبھی کبھی چاندنی رات میں نہر کنارے جانا پسند کرتے ہیں۔ اس رات بھی وہ گاڑی پر وہاں گئے۔ ڈرائیور ریاض ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ..." وہ ذرا توقف سے بولی۔ "میں بھی تھی۔ ہم کوئی دو گھنٹے وہاں رہے۔ پھر بادل آگئے اور چاندنی ختم ہوگئی۔ ہم واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک کھلی چھت والی ایک جیپ بڑی تیزی سے آئی۔ وہ کچے راستے پر ہمارے سامنے سے گزری اور آگے نکل گئی۔ ڈرائیور ریاض نے اس میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گرتے دیکھی۔ کوئی آدھ منٹ بعد ایک اور گاڑی کی آواز آئی۔ یہ ایک ٹویوٹا 86 ماڈل تھی۔ وہ بھی اندھادھند آرہی تھی اور کچے راستے پر بری طرح اچھل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ ڈرائیور ریاض نے جلالی صاحب کو بتایا کہ آگے جانے والی جیپ میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گری ہے۔ میں تو گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہی۔ ریاض اور جلالی صاحب آگے جنتر کی جھاڑیوں میں گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا، وہ اندھیرے میں واپس آرہے تھے۔ ریاض کے ہاتھ میں ایک بڑا تھیلا سا تھا جس میں کوئی چوکور شے تھی۔ انہوں نے ڈکی کھولی اور تھیلا وہاں رکھ دیا۔ اس کے فوراً بعد ہم فارم ہاؤس واپس آگئے... راستے میں جلالی صاحب نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک باکس ہے جسے لوہے کی پتریاں لگا کر سیل بند کیا گیا ہے..."

میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔ "جلالی صاحب کا کیا خیال تھا... یہ باکس جیپ میں سے اتفاقاً...... گرا یا گیا تھا؟"

"دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں۔ بہر حال، یہ بات تو بالکل صاف تھی کہ پچھلی گاڑی جیپ کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈرائیور ریاض کا اندازہ تھا کہ اگلی گاڑی میں صرف ایک یا دو بندے تھے جبکہ ٹویوٹا کار میں زیادہ افراد تھے۔"

"اس کے بعد جلالی صاحب نے آپ سے باکس کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟"

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں نے دو بار اس حوالے سے بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ پھر بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ تیسری بار پوچھنے کی مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہاں، اس بات کا اندازہ مجھے دو چار دن کے بعد ہی ہو گیا تھا کہ وہ کوئی بہت خاص قسم کا باکس ہے۔ جلالی صاحب بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ پھر یہ پریشانی اس وقت مزید بڑھ گئی جب فارم ہاؤس میں کچھ اجنبی لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ پہلے دو مقامی بندے آئے، ان کے ساتھ ایک سفید پوش بھی تھا اور میرے خیال میں وہ مقامی پولیس کا کوئی بندہ تھا۔ اگلے روز ایک بہت بڑی لگژری جیپ میں ایک سیاست داں ٹائپ شخص آیا۔ اس کے ساتھ دو سوٹڈ بوٹڈ بندے تھے اور وہ نوجوان عورت بھی تھی جو کل جلالی صاحب کے لیے رنگین چڑیوں کا تحفہ لائی ہے اور ذلیل ہو کر واپس گئی ہے۔ دو دن بعد پھر دو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان لوگوں نے قریباً تین گھنٹے تک بڑے ڈرائنگ روم میں جلالی صاحب اور ندیم سے بات چیت کی۔ ان میں سادہ کپڑوں والا وہی پولیس افسر بھی شامل تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ جان چکے تھے کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے... اب وہ انہیں باکس کی واپسی پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن جلالی صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اپنے انکار پر اڑ گئے تھے۔"

"ڈاکٹر! ان لوگوں کو معلوم کیسے ہوا کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے؟"

"میں صرف قیافہ ہی لگا سکتی ہوں... اور قیافہ یہ ہے کہ جس جگہ باکس گرا، یا گرایا گیا وہ بالکل کچی زمین تھی۔ وہاں کچھ نشانات رہ گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باکس کے ساتھ کوئی اور چھوٹی موٹی چیز بھی وہاں گری ہو جس کی وجہ سے تلاش کرنے والوں کو کوئی سراغ ملا ہو۔ اس جگہ کے قریب ہی شیورلیٹ گاڑی کے پہیوں کے نشان ملے ہوں گے جو فارم ہاؤس تک آئے ہوں گے..."

"آپ بتا رہی تھیں کہ سادہ کپڑوں والے پولیس افسر اور دیگر دو بندوں نے قریباً تین گھنٹے تک جلالی صاحب سے بات چیت کی... اس کے بعد کیا ہوا؟"

ڈاکٹر مہناز کی شربتی آنکھوں میں دکھ آمیز خوف کے سائے لہرائے۔ وہ بولی۔ "اس کے بعد یہاں فارم ہاؤس میں سب سے بری رات آئی۔ کچھ مسلح لوگوں نے پورے فارم ہاؤس کو یرغمال بنا لیا۔ پہلے جلالی صاحب سے بدتمیزی کی گئی پھر ان کی عمر اور بیماری کی پروا کیے بغیر ان پر بے رحمی سے تشدد کیا گیا۔ سب مرد عورت ملازمین کو دو کمروں میں بند کر دیا گیا اور ان کے ساتھ بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی گئی..."

بات کرتے کرتے اچانک ڈاکٹر مہناز کو خاموش ہونا پڑا۔ میں بھی چونک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ شاید ایک بار پھر کوئی ہمارے آس پاس موجود تھا۔ میں اس قسم کی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ مختار ملک کا پسٹل ابھی تک میری قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ میں پسٹل کی موجودگی کو کنفرم کرنے کے بعد جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل چونکی ہوئی نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے مطمئن نظر آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ”تابش! میرے خیال میں جلالی صاحب ہیں۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے اوپر آرہے ہیں۔ آپ اس کونے میں چلے جائیں اور جب جلالی صاحب اوپر آجائیں تو آپ احتیاط سے سیڑھیاں اتر جائیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پانچ دس سیکنڈ بعد قدموں کی چاپ واضح ہوگئی۔ کوئی سست روی سے اوپر آرہا تھا۔ وہ جلالی صاحب ہی تھے۔ چھت پر نمودار ہوتے ہی انہوں نے آواز دی۔ ”مہناز... کہاں ہو مہناز؟“

مہناز تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ اس نے انہیں کندھوں سے تھاما۔ ”سر! آپ اوپر کیوں آگئے؟ آپ کو سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہئیں۔“

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولے۔ ”تم نے بتانا تو تھا کہ چھت پر ہواخوری کرنے جارہی ہو۔“

”میں نے سمجھا آپ سو رہے ہیں۔“

”پریشانی میں اتنی جلدی نیند کہاں آتی ہے۔“ وہ ڈگمگا رہے تھے۔ مہناز انہیں سہارا دیتی ہوئی چھپرکٹ تلے لے آئی۔ وہ فوم کے بیڈ پر لیٹ گئے۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا... میں زینون پر آگیا لیکن نیچے اترنے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔ جلالی صاحب اپنا بایاں بازو دائیں ہاتھ سے دبا رہے تھے۔ ”درد ہو رہا ہے؟“ مہناز نے پوچھا۔

”تھوڑا تھوڑا۔“

”آپ سیدھے لیٹ جائیں۔ آپ کو اس طرح سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہیے تھیں۔“ مہناز نے کہا۔ وہ چست انداز میں بھاگتی ہوئی نیچے گئی اور میڈیکل باکس لے آئی۔ اس نے بی پی آپریٹس سے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ انہیں کھانے کے لیے ایک گولی دی اور بیڈ پر دوزانو بیٹھ کر ان کا بازو دبانے لگی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جلالی صاحب اپنے دوسرے ہاتھ سے مسلسل مہناز کے بالوں اور رخساروں کو سہلا رہے ہیں۔ یہ ایک میکانکی سی حرکت تھی۔ اس کو کوئی معنی دینے مشکل تھے۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھے، ان سے کسی شدید جذباتی کیفیت کی توقع تو نہیں کی جاسکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہیں دوزانو بیٹھے بیٹھے مہناز نے اپنا سر جلالی صاحب کے سینے پر ڈال دیا۔ جلالی صاحب نے اپنا بازو مہناز کے کندھوں پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے۔ اس سے اگلا منظر اس سے بھی تعجب خیز تھا۔ مہناز اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بالوں کو سمیٹا اور سیڑھیوں کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر دیا۔ میں نے کوشش کی اور چند سیکنڈ بعد چوبی دروازے کی سائڈ میں ایک باریک جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ جواں سال ڈاکٹر مہناز، عمر رسیدہ سہراب جلالی کے ساتھ ہی فوم کے بستر پر لیٹ گئی ہے۔ جلالی صاحب نے آہستگی سے کروٹ بدلی اور اپنا رخ مہناز کی طرف کر لیا۔ اس نے کمال مہربانی سے جلالی صاحب کو اپنے جوان بازوؤں کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

میں مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ دو تین منٹ بعد یوں لگا جیسے جلالی صاحب سو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کی ٹھوڑی ان کے نیم گنجے سر پر ٹکی ہوئی تھی اور ان کا چہرہ مہناز کے جسمانی گداز میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ سکڑے سمٹے کسی بچے کی طرح لگ رہے تھے۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ وہ جلالی صاحب ہیں، جن کے غصے سے بے شمار لوگ خوف کھاتے ہیں اور جن کو ان کی مرضی کے خلاف چلانا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بظاہر تو یہ روحانی تعلق تھا لیکن اگر یہ واقعی رومانی یا جنسی تعلق تھا تو پھر یوں سرِعام کیوں تھا؟ اس چھت پر کسی وقت کوئی بھی آسکتا تھا۔ جس طرح میں نے بند دروازے میں سے جھانکا تھا، کوئی دوسرا بھی جھانک سکتا تھا۔ برساتی میں ایک کھڑکی بھی موجود تھی جس کی چٹخنی کو تھوڑی سی کوشش سے کھولا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر مہناز کی والدہ کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ”کبھی تو مجھے لگتا ہے، لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ”انوالو“ ہو چکی ہو۔ کچھ رحم کرو ہم پر مہناز... کیوں ہما تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے...“

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

سوغات

بابر نعیم

کام... مسلسل کام ذہن و دل پر مضر اثرات مرتب کرتے ہیں... تبدیلی اور تفریح... زندگی کے بوجھل و خشک لمحات کو خوشگواریت سے ہمکنار کرتے ہیں... اور ان کی تازگی و شگفتگی کا احساس تادیر زندگی کو معطر رکھتا ہے... ایک ایسی ہی یادگار تفریح کا قصہ...

ڈیڈی کو مچھلی کے شکار سے بہت دلچسپی ہے اور وہ موقع ملنے پر اپنا یہ شوق ضرور پورا کرتے ہیں۔ عموماً ہم لوگوں کو بھی وہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ اسی بہانے سب کی تفریح ہو جائے اور انہیں بھی تنہائی محسوس نہ ہو۔ جس ویک اینڈ کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس پر بھی ڈیڈی پوری فیملی یعنی

ممی، چھوٹی بہن ماریہ اور مجھے ہمراہ لے کر مچھلی کے شکار کے لیے گئے تھے۔ اس بار انہوں نے ٹراسک دریا کا رخ کیا جہاں بقول ان کے مچھلی کا شکار کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے لیکن میں پہلی بار اس جگہ آیا تھا۔ مجھے ویسے بھی کیمپنگ یا پکنک پر جانا پسند نہیں۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ اپنے گھر کا آرام اور سکون چھوڑ کر ویران اور سنسان جگہوں پر خانہ بدوشوں کی طرح خیمے گاڑ دو..... لیکن آہستہ آہستہ میں اس کا عادی ہوتا جارہا تھا اور مچھلی کے شکار میں میری بھی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ بس مجھے تھوڑی سی گھبراہٹ صبح جلدی اٹھنے میں ہوتی تھی کیونکہ مجھے دیر تک سونے کی عادت تھی۔

رینگنے والے کیڑے پکڑنا میرا مشغلہ ہے اور میں اسی لیے کیمپنگ پر جاتا تھا کہ وہاں اس طرح کے کیڑے بہ آسانی مل جاتے تھے جبکہ پورٹ لینڈ کے علاقے میں جہاں ہماری رہائش تھی، اس طرح کے کیڑے ناپید تھے۔ کبھی کبھی مجھے اپنے گھر کے قریب کالی مکھیاں یا گرمی کے موسم میں نمودار ہونے والے کھٹمل نظر آجاتے لیکن مجھے ان کی سستی اور کاہلی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کے برعکس چیونٹیاں مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی اور ان کے لیے یہ موضوع اکتاہٹ کا سبب بن سکتا ہے لیکن میں یہ بات بلاوجہ نہیں کہہ رہا۔ میرے پاس اسے ثابت کرنے کے لیے معقول اسباب موجود ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ چیونٹیاں اپنی جسامت کے مقابلے میں انتہائی مضبوط ہوتی ہیں اور جس طرح وہ ایک بڑے خاندان کی طرح ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں، وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔

ٹراسک دریا کے باہر میں نے تقریباً سبھی اقسام کے کیڑے دیکھے۔ ان میں ایک بہت بڑی جسامت کا کن کھجورا بھی تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس قسم کا کیڑا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دھڑ لمبا اور سیاہ تھا اور لاتعداد متحرک ٹانگیں تھیں۔ میں نے انہیں گننا شروع کیا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی یہ کوشش ترک کرنا پڑی کیونکہ ایک مقام پر پہنچ کر میری گنتی ختم ہوگئی لیکن اس کی ٹانگوں کا شمار ممکن نہ رہا۔ وہاں میں نے بڑی بڑی مکڑیاں بھی دیکھیں جو عام کیڑوں سے مختلف تھیں۔ مجھے وہ کسی اجنبی مخلوق کے مانند معلوم ہوتیں کیونکہ ایسی مکڑیاں میں نے کبھی اپنے گھر کے باہر نہیں دیکھیں۔

ہم جب بھی کیمپنگ کے لیے جاتے تو ہمارا قیام کرائے کے ایک ٹریلر میں ہوتا کیونکہ مما کھلی فضا میں نہیں سو سکتی تھیں۔ ان کے خیال میں سردی اور بارش سے بچنے کے لیے ٹریلر میں سونا بہتر تھا۔ میری بہن ماریہ بھی ان کے ساتھ ہی سوتی تھی جبکہ میں اور ڈیڈی ٹریلر کے باہر خیمہ زن ہوتے۔ ہمارے پاس نرم، آرام دہ اور گرم بستر تھے جو ہمیں سردی سے محفوظ رکھتے۔ مجھے ٹریلر میں بند ہونا پسند نہیں تھا۔ خیمے میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہاں رات کی خاموشی میں دریا کا شور صاف سنائی دیتا تھا جس میں ایک عجیب سی پُراسراریت پنہاں تھی پھر جب بارش ہوتی تو خیمے پر پڑنے والی بوندوں کی ٹپ ٹپ سے سماں بندھ جاتا اور ہم اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتے۔ میرے خیال میں مما بدنصیب تھیں جو گھر سے باہر نکل کر بھی ٹریلر میں قید ہو جاتیں اور قدرت کی اس فیاضی سے محروم رہتیں۔

کبھی کبھی میں اور ڈیڈی خیمے کے باہر آگ جلا کر اپنے لیے ہاٹ ڈاگ گرم کرتے۔ سرد موسم میں اس کا ذائقہ کچھ اور ہی مزہ دیتا جبکہ مما ٹریلر میں موجود مائیکروویو میں کھانا گرم کرتیں۔ ایک رات انہوں نے ہمارے لیے پنیر پیزا بنایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بیکار ہی یہ محنت کی کیونکہ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاٹ ڈاگ زیادہ بہتر ہوتے تھے لیکن میں نے مما کی دل شکنی کے خیال سے کچھ نہیں کہا۔

دن بھر میں کیڑوں کی تلاش میں رہتا۔ مجھے وہاں ہر طرح کے بھونرے نظر آئے لیکن دریا کے کنارے پائی جانے والی چیونٹیاں سب سے بہترین تھیں اور جسامت میں پورٹ لینڈ کی چیونٹیوں سے کہیں زیادہ بڑی تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ اور چمک دار تھا۔ میں نے ان میں کچھ سرخ چیونٹیاں بھی دیکھیں۔ میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ایسی چیونٹیاں خطرناک ہوتی ہیں البتہ میں نے کالی چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ کس طرح قطار میں لگ کر ایک پل بنا لیتی تھیں تاکہ دوسری چیونٹیاں ان کی پشت پر چلتے ہوئے اس چٹان تک پہنچ سکیں جہاں ایک مری ہوئی مچھلی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس مچھلی کے ٹکڑے لے کر واپس آئیں تاکہ دوسری چیونٹیوں کے ساتھ مل کر اسے کھا سکیں۔ اگر قطار میں کھڑی کوئی چیونٹی تھک جاتی تو اس کی جگہ دوسری چیونٹی آجاتی۔ اس طرح وہ سب ایک دوسرے کی اس طرح مدد کرتیں جیسے ان کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہو۔ میں ان چیونٹیوں کو دیکھ کر سوچتا کہ کاش انسان بھی اسی طرح اپنے خاندان والوں کے کام آسکیں۔

مجھے یاد تھا کہ ایک مرتبہ کچھ چیونٹیاں ہمارے کچن کے عقبی دروازے کے پیچھے رینگ رہی تھیں۔ میں نے

شرارتاً اپنی انگلی وہاں پھیر دی اس طرح ان کی قطار ٹوٹ گئی اور وہ تیزی سے اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ ڈیڈی کا کہنا تھا کہ میری اس حرکت سے وہ پریشان ہو گئیں اور انہوں نے اپنے بچاؤ کا راستہ اختیار کیا۔ یہ سن کر مجھے بڑی ندامت ہوئی کیونکہ میرا مقصد انہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ ایسی حرکت نہیں کی۔ مجھے چیونٹیوں کا اس طرح قطار میں چلنا اچھا لگتا تھا۔ یہ ان کے اتحاد اور نظم و ضبط کی علامت تھی۔ میرے خیال میں تمام خاندانوں کو اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

کیڑوں کی تلاش اور ڈیڈی کے ساتھ مل کر مچھلیاں پکڑنا واقعی ایک دلچسپ مشغلہ تھا اور میں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم نے کچھ ٹراؤٹ مچھلیاں بھی پکڑیں اور انہیں خیمے کے باہر آگ لگا کر پکایا لیکن مما نے وہ ڈش نہیں کھائی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح آگ پر پکائی جانے والی مچھلی صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے اور ماریہ کے لیے اوون میں برگر بنا لیے۔ میرے خیال میں یہ ایک اور حماقت تھی کہ آپ کیمپنگ کے دوران میں بھی دریا کے کنارے وہی کھانا کھائیں جو گھر اور ہوٹلوں میں کھاتے ہیں لیکن میں نے مما سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھیں اور میرے کچھ بولنے سے ان کا موڈ خراب ہو سکتا تھا، البتہ ہم نے کافی ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑیں تاکہ واپسی پر اپنے ساتھ گھر لے جا سکیں۔

ہمیں وہاں قیام کیے ہوئے دوسرا دن تھا کہ انکل ارل اور آنٹی ہیش بھی ہم سے ملنے آگئے۔ وہ اپنی بڑی سی سبز رنگ کی کیڈی لاک کار میں آئے تھے۔ آنٹی ہیش، مما کی بہن تھیں اور کیمپنگ کے دوران میں ان کا رویہ بھی مما کی طرح بہت خراب ہوتا تھا۔ وہ بڑی عجیب و غریب حرکتیں کرتی تھیں۔ مثلاً وہ اپنے ساتھ سامان سے بھرے ہوئے تین سوٹ کیس لے کر آئی تھیں جبکہ انہیں وہاں صرف دو دن ٹھہرنا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اس طرح کا لباس پہن رکھا تھا جیسے وہ کیمپنگ کے بجائے کسی پارٹی میں شرکت کرنے آئی ہوں۔ انہوں نے اونچی ایڑی کے سینڈل پہن رکھے تھے۔ گلے میں قیمتی اسکارف اور کلائی پر نازک سا بریسلیٹ چمک رہا تھا۔ انہوں نے آتے ہی شکایتوں کا دفتر کھول دیا جبکہ انکل خاموش رہے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا جو مجھے اچھا لگا۔ آنٹی نے بھی محبت جتاتے ہوئے میرے گال پر بوسہ دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ممی سے بات کرنے کے لیے ٹریلر میں چلے گئے۔ ڈیڈی بھی ان کے ساتھ چل دیے اور مجھے باہر رہنے کی تاکید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہ جانے ان کے درمیان ایسی کیا بات ہو رہی تھی۔ میں نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور معمول کے مطابق کیڑے تلاش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور سورج بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔

اندھیرا ہونے کے بعد میں یونہی بے خیالی میں ٹہلتا ہوا ٹریلر کی طرح چلا گیا۔ اس کی کھلی کھڑکی سے روشنی باہر آرہی تھی۔ میں وہاں کھڑے ہو کر زمین پر کیڑے دیکھنے لگا۔ مجھے اندر ہونے والی باتوں اور قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور میں گلاسوں میں برف کے ٹکڑے گرنے کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اندر شراب کا دور چل رہا ہوگا۔ ماریہ غالباً سو چکی تھی۔

میں نے کیڑوں کی تلاش چھوڑ کر ٹریلر کی کھڑکی سے کان لگا دیے۔ اب قہقہوں کی آوازیں نہیں آرہی تھیں اور لگتا تھا جیسے وہ دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے ڈیڈی کو کہتے ہوئے سنا کہ وہ چھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہیں اور یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس پر انکل ارل نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ ان کا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ کسی کی تفریح میں خلل ڈالیں لیکن انہیں مجبوراً یہاں آنا پڑ گیا۔ اس کے برعکس آنٹی ہیش کا رویہ خاصا جارحانہ تھا۔ انہوں نے انکل کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ وہ رقم تحفتاً نہیں بلکہ قرض کے طور پر دی گئی تھی اور اب اس کی ادائیگی کا وقت آگیا ہے۔ مما نے انہیں چپ کرانے کی کوشش کی مگر آنٹی اسی طرح اونچی آواز میں بولتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ممی اور ڈیڈی نے ان سے جو قرض لیا تھا، وہ فوراً واپس کر دیں کیونکہ انہیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہیں، انہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی تو وہ کیڈی لاک کار میں نہ گھوم رہی ہوتیں اور نہ ہی قیمتی کپڑے پہن کر تین بھاری بھرکم سوٹ کیس سمیت کیمپنگ کے لیے آتیں۔

میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کھڑکی میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا پھر میں نے اپنا کان بالکل کھڑکی کے ساتھ لگا دیا تاکہ اندر ہونے والی گفتگو صاف طور پر سن سکوں کیونکہ اب وہ نیچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ اب صرف آنٹی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کافی غصے میں تھیں اور کچھ اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں

کہ ..... یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ ہم نے کوئی بینک نہیں کھول رکھا۔ اور یہ کہ اب ہمیں ان پیسوں کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ ممی اور ڈیڈی نے ایک پرامس نوٹ پر دستخط کیے تھے جس کے مطابق انہیں ایک مقررہ تاریخ تک یہ رقم واپس کرنا تھی اور اب وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جواب میں ممی نے کچھ کہا جو میں نہ سن سکا پھر ان کے درمیان بحث ہونے لگی اور آنٹی نے غصے میں آکر گلاس ٹریلر کی دیوار پر دے مارا۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور دریا کی جانب دوڑ پڑا۔

جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیمے تک آیا اور بستر میں گھس گیا مگر کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی۔ میرے دماغ میں آنٹی کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میری مما ان سے عمر میں بڑی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان سے بدتمیزی کر رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ بڑوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔ ڈیڈی کافی دیر بعد آئے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے یوں ظاہر کیا جیسے سو رہا ہوں۔ وہ کافی غصے میں تھے۔ لگتا تھا کہ آنٹی ہیش کی باتوں نے انہیں برہم کر دیا ہے۔ اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو شاید میری بھی یہی کیفیت ہوتی۔

اگلے روز صبح سویرے میں اور ڈیڈی مچھلیاں پکڑنے چلے گئے۔ اس وقت تک سب لوگ سو رہے تھے۔ میں نے ڈیڈی کو گزشتہ رات ملنے والے کیڑوں کے بارے میں بتایا تو وہ صرف مسکرا دیے جس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے میری بات دھیان سے نہیں سنی ورنہ وہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے۔ میں ان سے گزشتہ شب ہونے والی گفتگو کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے ایسا کہنا مناسب نہ سمجھا، یہ بڑوں کی باتیں تھیں اور اگر میں کچھ پوچھتا تو ڈیڈی جواب میں یہی کہتے کہ تم نہیں سمجھو گے۔ حالانکہ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ کسی غیر ملکی زبان میں بات نہیں کر رہے تھے کہ میں سمجھ نہ پاتا۔ آنٹی نے بڑے واضح الفاظ میں اس رقم کی واپسی کا تقاضا کیا تھا جو ممی، ڈیڈی نے ان سے بطور قرض لی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ آنٹی کو ان پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اگر چاہتیں تو ممی، ڈیڈی کو کچھ اور مہلت دے سکتی تھیں۔

اس روز ہم صرف دو مچھلیاں ہی پکڑ سکے۔ جب ڈیڈی انہیں دریا کے کنارے بیٹھے صاف کر رہے تھے تو میں نے ٹریلر کی جانب سے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ میں اس طرف گیا اور دیکھا کہ ممی اس کی عقبی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر انہوں نے آنکھیں پونچھ لیں مگر میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہی رو رہی تھیں کیونکہ اس وقت وہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور میرے کانوں نے کسی کے رونے کی آواز واضح طور پر سنی تھی۔ جب میں نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں کہ کوئی خاص بات نہیں اور مجھے اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر آنٹی ہیش بھی باہر آ گئیں اور کہنے لگیں کہ ممی کو کچھ نہیں ہوا۔ مجھے اس بارے میں فکر مند ہونے کے بجائے اپنے مشغلے پر توجہ دینی چاہیے۔ وہ کافی بدتمیزی سے بات کر رہی تھیں لیکن میں نے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا کیونکہ وہ بڑی تھیں اور میں ان کے سامنے بچہ تھا۔ ممی نے ہمیشہ یہی سکھایا تھا کہ بڑوں کے ساتھ ادب سے پیش آنا چاہیے اگر ان کی کوئی بات ناگوار گزرے، تب بھی خاموش رہنا چاہیے۔ میں اسی لیے آنٹی کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی کہ وہ میری ممی کو رلا رہی تھیں۔

مما نہیں چاہتی تھیں کہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو کسی بات کا علم ہو، لہٰذا انہوں نے کہا کہ میں ماریہ کے ساتھ کھیلوں البتہ انہوں نے زیادہ دور جانے سے منع کیا۔ میں، عام طور پر ماریہ کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا۔ ایک تو وہ لڑکی ہے اور دوسرے بہت چھوٹی بھی۔ کھیل میں چھوٹی موٹی لڑائیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو وہ رونے بیٹھ جاتی ہے اور میں کھیل کود بھول کر اسے بہلانے پھسلانے میں لگ جاتا ہوں لیکن اس وقت مجھے مما کا حکم ماننا پڑا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اور ماریہ کچھ دیر کے لیے ٹریلر سے دور چلے جائیں تاکہ آنٹی ہیش کی باتیں ہمارے کانوں میں نہ پڑیں۔

میں نے ماریہ سے پوچھا کہ کیا اس نے گزشتہ شب ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی کہ وہ لوگ اتنی بلند آواز میں بول رہے تھے کہ اس کی نیند غائب ہو گئی۔ اس نے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ آنٹی ہیش طیش کے عالم میں تھیں اور غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پہلے وہ زور زور سے بولتی رہیں پھر ہاتھا پائی پر اتر آئیں۔ انہوں نے مما کے بال پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچا۔ اس پر ڈیڈی کو بھی غصہ آ گیا اور انہوں نے آنٹی ہیش کو دھکا دے کر ایک طرف کیا۔ ماریہ نے بتایا کہ مما

بُری طرح رو رہی تھیں اور انہیں دیکھ کر اسے بھی رونا آ گیا لیکن وہ ضبط کیے لیٹی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے رونے کی آواز سنے۔

ماریہ کی زبانی یہ باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ رشتے داروں کے درمیان بھی اس طرح کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ اگر آنٹی اور انکل کو رقم کی واپسی کا تقاضا کرنا تھا تو اس کے لیے زبان سے کہہ دینا کافی تھا۔ اس طرح بچوں کی طرح ہاتھا پائی کرنا انہیں بالکل زیب نہیں دیتا۔ گزشتہ برس میں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ماریہ کے بال پکڑ لیے تھے۔ اس پر مجھے دو ہفتے کے لیے گھر سے باہر نکلنے اور کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہاں تک کہ میں اپنی پسندیدہ فلم دیکھنے بھی نہ جا سکا۔ بچے اگر ہاتھا پائی یا مار پیٹ کریں تو انہیں سزا ملتی ہے لیکن ان بڑوں کو سزا کون دے گا؟

دوپہر کے کھانے تک موسم کافی بہتر ہو چکا تھا۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں بادل روئی کے گالوں کی طرح تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور سورج پوری طرح نکلا ہوا تھا جس کی وجہ سے فضا میں حدت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لیے ہم نے صرف ٹی شرٹس اور شارٹس پہن رکھے تھے۔ ہم نے زیادہ وقت دریا کے کنارے گزارا جہاں نسبتاً خنکی تھی۔ مما نے بھی مختصر لباس پہن رکھا تھا اور اس میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ کھلی فضا میں آنے کے بعد ان کے چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی تھی اور وہ مسکرا رہی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے کیا پریشانی چھپی ہوئی ہے۔ آنٹی ہیش اس موقع پر بھی بہروپ بھرنے سے باز نہ آئیں۔ انہوں نے سر پر ایک بڑا سا ہیٹ اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور اپنے آپ کو کسی فلم اسٹار کی طرح سمجھ رہی تھیں جبکہ وہاں ان کا کوئی پرستار موجود نہ تھا۔ انکل ارل بھی سوانگ بھرنے میں ان سے کم نہ تھے۔ انہوں نے آدھی آستینوں کی قمیص پہن رکھی تھی جس پر سامنے کی طرف ایک بڑا سا مگرمچھ بنا ہوا تھا۔ اس قمیص کو پہننے کے بعد وہ مگرمچھ ہی لگ رہے تھے۔

ان سب نے دوپہر کے کھانے میں باربی کیو کا فیصلہ کیا۔ میں اور ماریہ بھی اس سے متفق تھے۔ ڈیڈی نے چولہا جلایا اور ٹریلر سے سیخیں نکال کر لے آئے۔ انکل ارل نے اپنی گاڑی سے ایک کولر نکالا جس میں گوشت کے بڑے بڑے پارچے رکھے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بہت مہنگے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ممی اور ڈیڈی انہیں خریدنے

آزادی کی سخت کمی ہے

چین میں چار ہفتے کے قیام کے دوران میں ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ چین میں آزادی کی سخت کمی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پان لے کر گئے تھے، بار بار فرماتے تھے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سڑکوں پر تھوک بھی نہیں سکتے۔ زیادہ دن رہنا پڑ جائے تو زندگی حرام ہو جائے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ یہاں کوئی ایسی دیوار نظر نہیں آئی جس پر لکھا ہو کہ "یہاں پیشاب کرنا منع ہے" جو اس امر بلیغ کا اشارہ ہوتا ہے کہ آئیے آپ کے حوائج ضروریہ اور غیر ضروریہ کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ایک صاحب شاکی تھے کہ یہاں خریداری کا لطف نہیں۔ دکاندار بھاؤ تاؤ نہیں کرتے ہر چیز کی قیمت لکھی ہے۔ کم کرنے کو کہیں تو مسکرا کر سر ہلا دیتے ہیں۔

بسوں اور کاروں کے اختیارات بھی محدود ہیں۔ آپ اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے۔ نہ کسی مسافر کے اوپر سے گزار سکتے ہیں اور تو اور بجلی کے کھمبے تک سے ٹکرانے کی آزادی نہیں۔

اقتباس: چلتے ہو تو چین کو چلیے، از ابن انشا
مرسلہ: ماہ تاب گل رانا، ضلع راجن پور

مردہ گدھے کا سر

ایک دیہاتی کا گدھا مر گیا تو اس نے نظر بد سے بچنے کے لیے اس کا سر انگوروں کی بیل پر لٹکا دیا۔ ایک بوڑھا وہاں سے گزرا اور باغ کے مالی کو ہنس کر کہا۔ "اے جان من! جو بے چارہ اپنے سر کو ڈنڈوں سے نہ بچا سکا، تیرے باغ کو نظر بد سے کیا بچائے گا؟ جو حکیم خود تکلیف سے مر رہا ہو وہ دوسرے کی تکلیف کیا رفع کرے گا؟"

شیخ سعدیؒ کی کتاب "بوستان سعدی" کے ترجمہ مولانا غلام حسن قادری سے اقتباس
مرسلہ: محمد مجید ارشد خان، لیہ

کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انکل ارل اور آنٹی ہیش کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں اور وہ ہمارے مقابلے میں بہتر اور خوش حال زندگی گزار رہے تھے پھر انہوں نے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کر کے ممی اور ڈیڈی کو کیوں پریشان کر رکھا تھا؟

ڈیڈی نے باورچی کے فرائض سنبھالتے ہوئے ان پارچوں کو سیخ پر چڑھایا اور انہیں بھوننے لگے جبکہ انکل ارل نے اس کام میں ان کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ وہ ساتھ کھڑے ہو کر بیئر پیتے اور زور زور سے باتیں کرتے رہے اور آنٹی ہیش اپنے حسن کا جائزہ لیتی رہیں۔ وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھیں کہ گزشتہ بار انہوں نے کس پارلر سے اپنے ناخن ترشوائے تھے اور وہاں کام کرنے والی لڑکی کو کتنی ٹپ دی تھی۔ مما خاموشی سے ان کی لن ترانیاں سنتی رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آلو کی سلاد بھی بنا رہی تھیں۔ بظاہر وہ چاروں آپس میں ہنس بول رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ڈراما کر رہے ہیں۔ میں اور ماریہ جان چکے تھے کہ ان کے دل آپس میں صاف نہیں ہیں اور یہ سب محض دکھاوا ہے لیکن وہ اس طرح ہم دونوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے تھے۔

کھانے کے دوران میں بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ انکل ارل بتا رہے تھے کہ ان دنوں کاروبار کی صورتِ حال بڑی خراب ہے۔ وہ پرانی کاروں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے اور حال ہی میں انہوں نے کاروں کی ایک بڑی کھیپ خریدی تھی لیکن گیس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور خراب معاشی صورتِ حال کے باعث وہ کاریں فروخت نہیں ہو رہی تھیں اور اس طرح ان کی ایک بڑی رقم اس کاروبار میں پھنس گئی تھی۔ آنٹی ہیش بھی خاموش رہنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ کاروبار مندا ہونے کے سبب انہیں پیسوں کی شدید ضرورت ہے اور اسی لیے وہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ انہوں نے ہماری موجودگی کا خیال کرتے ہوئے مکمل کر یہ بات نہیں کہی بلکہ اشارتاً جتا دیا کہ گزشتہ شب جو بات ہوئی تھی، اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ ممی نے انہیں یقین دلایا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکا، وہ یہ کام کر دیں گی۔ ممی کا لہجہ انتہائی نرم اور دوستانہ تھا لیکن آنٹی ہیش نے انہیں طعنے دینا شروع کر دیے۔ شاید انہیں یہ بھی اچھا نہیں لگا کہ ممی اور ڈیڈی ہم لوگوں کو لے کر پکنک منانے آئے۔ اس کے بجائے انہیں اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے تھی تاکہ رقم کا انتظام کر سکیں۔

مجھے ان کی پوری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ صرف ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ اپنی لتھڑی ہوئی انگلیاں ہونٹوں سے صاف کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ آلو کی سلاد کے ٹکڑے بھی منہ میں ٹھونستی جا رہی تھیں۔ مجھے ان کی شکل دیکھ کر کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ بالآخر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں ڈیڈی سے معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ میں نے باتھ روم جانے کا بہانہ بنایا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں آنٹی کا بدصورت چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

میں ٹہلتا ہوا وہاں سے دور چلا گیا اور ساحل پر کیڑے تلاش کرنے لگا۔ کچھ دور جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سب کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور ممی میز کی صفائی کر رہی تھیں جبکہ آنٹی نے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ عام طور پر طریقہ یہی ہے کہ ایسے موقع پر سب مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں چیونٹیوں کی مثال آئی۔ ہم انسانوں سے تو وہ لاکھ درجے بہتر ہیں، وہ سب ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ ان میں کوئی بھی آنٹی ہیش کی طرح سست اور کام چور نہیں ہوتی۔ آنٹی ہیش کو ان چیونٹیوں سے ہی سبق سیکھ لینا چاہیے تھا۔

آنٹی ہیش کو بھی معلوم ہوگا کہ ایسے موقع پر انہیں کیا کرنا چاہیے لیکن وہ ایک طرح کے احساسِ برتری میں مبتلا تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ انہوں نے ممی ڈیڈی کو کچھ رقم ادھار دے کر انہیں خرید لیا ہے اور وہ ان کے مقابلے میں کم تر ہو گئے ہیں۔ یہ رویہ ان کی گندی ذہنیت اور گھٹیا سوچ کی عکاسی کرتا تھا۔ خاندان میں کوئی امیر ہوتا ہے اور کوئی غریب..... لیکن اس سے رشتوں کے احترام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آنٹی ہیش، ممی سے عمر میں چھوٹی تھیں اس لیے ان پر لازم تھا کہ وہ ممی کی عزت کریں لیکن انہیں اپنی امارت کا زعم تھا۔ رہی سہی کسر ممی ڈیڈی نے ان سے ادھار لے کر پوری کر دی تھی۔

اس سہ پہر انکل ارل اور آنٹی ہیش کو شہر واپس جانا تھا جو میرے خیال میں بہت اچھی بات ہوتی لیکن مسئلہ یہ ہو گیا کہ انکل نے کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی کچھ زیادہ ہی پی لی تھی اس لیے وہ گاڑی چلانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ آنٹی کو گاڑی چلانا آتی تھی لیکن وہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں لیکن وہ سوائے چیخنے چلانے کے اور کچھ نہ کر سکیں۔ انہیں اس بات پر غصہ تھا کہ جب انکل کو معلوم تھا کہ کھانے کے بعد واپس جانا ہے تو انہوں نے بے

تحاشا کیوں پی۔ انکل ارل پر ان کی چیخ و پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ٹہلتے ہوئے ٹریلر میں گئے اور اس جگہ لیٹ گئے جہاں مما اور ماریہ سوتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں مزید ایک روز آنٹی ہیش کو برداشت کرنا تھا۔

ڈیڈی کا مزید مچھلیاں پکڑنے کا ارادہ نہیں تھا اور ماریہ سارا دن مما کے ساتھ چپکی رہی لہٰذا میں بھی اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر مختلف کام کرتا رہا۔ میں نے اپنے جوتے اتار دیے اور دریا کے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا لیکن مجھے اس میں پاؤں لٹکانا اچھا لگ رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو دریا میں غوطہ لگا کر پورے جسم کو ٹھنڈا کرتا لیکن ممی ڈیڈی کی سختی سے ہدایت تھی کہ کنارے پر رہوں کیونکہ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا اور دریا میں کبھی بھی پانی کا بہاؤ تیز ہو سکتا تھا۔

مجھے دریا کے کنارے ایک بڑی سی شاخ پڑی ہوئی ملی۔ وہ کافی بھاری تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے آنٹی ہیش کا خیال آیا۔ جی چاہا کہ یہ شاخ لے جا کر ان کے سر پر مار دوں۔ میں نے وہ شاخ اٹھائی اور اسے زمین پر مارنے ہی والا تھا کہ کسی اندرونی جذبے کے تحت میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے سوچا کہ اس طرح زمین پر رینگنے والی چیونٹیوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ پھر میں نے سوچا کہ اسے کسی درخت پر ماروں لیکن وہاں بھی بہت سے کیڑے رینگتے رہتے تھے اور اس ضرب سے انہیں نقصان پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس شاخ کو باسکٹ بال کے بیٹ کی طرح فضا میں گھمایا۔ ایک زوردار شوں کی آواز آئی اور میرا رواں رواں مسرت سے جھوم اٹھا۔ کچھ دیر بعد مجھے تھکن کا احساس ہونے لگا تو میں نے وہ شاخ وہیں ایک درخت کے پاس پھینک دی۔

میں نے تھکن دور کرنے کے لیے اپنے پاؤں دوبارہ دریا کے پانی میں ڈبو دیے۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ٹریلر سے کسی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ آنٹی ہیش ہی تھیں۔ ان کی آواز مجھے اس بندر کی طرح لگ رہی تھی جسے کچھ عرصہ پہلے میں نے ڈسکوری چینل پر دردناک آواز میں چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ممی انہیں دھیمی آواز میں بولنے کے لیے کہہ رہی تھیں لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ میں نے غور سے سنا تو وہ پیسوں کی ہی بات کر رہی تھیں۔ پھر میں نے ٹریلر کا دروازہ کھلنے اور مما کو روتے ہوئے باہر آتے دیکھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تاکہ ان کے رونے کی آواز نہ سن سکوں۔ وہ مجھے روتے ہوئے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس وقت مجھے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ کاش میں ان کے لیے کچھ کر سکتا۔

اچانک میری نظر زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹیوں پر گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے ذرّے لے کر اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے نگاہ دوڑائی تو مجھے اس جگہ تک چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار نظر آئی جہاں ہم نے باربی کیو لگایا تھا۔ اب چیونٹیاں وہاں سے چھوٹے چھوٹے ذرّے سمیٹ کر لے جا رہی تھیں تاکہ سب مل کر انہیں کھا سکیں۔

میں چاہتا تھا کہ آنٹی ہیش بھی یہ منظر دیکھیں۔ شاید اسی سے وہ کچھ سبق سیکھ سکیں۔ میں ان سے براہِ راست یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا ورنہ مجھے بے بھاؤ کی سننا پڑتیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں کسی بہانے سے بلا کر یہ منظر دکھانا چاہیے۔ چنانچہ میں ٹریلر کی طرف چلا گیا۔ دیکھا کہ آنٹی اپنی کار کی ڈکی سے کچھ سامان نکال رہی تھیں۔ رات کو رکنے کے لیے انہوں نے نائٹ گاؤن، ٹوتھ برش، تولیا اور نہ جانے کیا کچھ نکال لیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ وہ اپنے ساتھ سامان سے بھرے ہوئے تین سوٹ کیس لائی تھیں، شاید بڑی اسپیئر یا کوئی اور بڑی اداکارہ بھی اتنے تام جھام کے ساتھ کہیں نہ جاتی ہوگی۔

وہ ابھی تک غصے کی کیفیت میں تھیں اور ان کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ میں ان سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس وقت انہیں دیکھ کر ایسے مسکرایا کہ میرے سارے دانت نمایاں ہو گئے۔ میں نے نرم لہجے میں کہا کہ انہیں دریا کے کنارے ایک دلچسپ منظر دکھانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔

”دیکھ نہیں رہے، میں کام کر رہی ہوں۔ بعد میں دیکھ لوں گی۔“

”ہو سکتا ہے کہ بعد میں ایسا منظر دیکھنے کو نہ ملے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔ ایسے مواقع بار بار نہیں ملتے۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا حالانکہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ ان کا موٹا اور بھدا ہاتھ پکڑوں۔ میرے انداز میں کچھ ایسی معصومیت اور لجاجت تھی کہ ان کا دل پسیج گیا اور انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تاکہ میں انہیں دریا کے کنارے تک لے جاؤں۔ میں نے جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کیا تاکہ کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے۔ ویسے بھی اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ انکل ارل، مما اور ماریہ، ٹریلر میں جا چکی تھیں جبکہ ڈیڈی بھی اپنے

خیمے میں آرام کر رہے تھے۔
سارے راستے میں نے آنٹی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ دریا کے کنارے کی مٹی گیلی تھی اور آنٹی نے اونچی ایڑی والے جوتے پہن رکھے تھے جو بار بار کیچڑ میں دھنس جاتے تھے اور آنٹی لڑکھڑا جاتیں۔ اگر میں نے انہیں مضبوطی سے نہ پکڑا ہوتا تو وہ کیچڑ میں گر چکی ہوتیں۔ اس وقت مجھے آنٹی پر بہت غصہ آیا۔ آخر انہیں پکنک پر ایسے جوتے پہن کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں انہیں کنارے کے بالکل قریب لے گیا جہاں چیونٹیوں کی لمبی قطار موجود تھی۔ میں انہیں دکھانا چاہتا تھا کہ یہ چیونٹیاں کس طرح قطار بنا کر اپنے کھانے کا سامان لے کر جاتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ پارچے کے بچے ہوئے ٹکڑے لے کر حرکت کر رہی تھیں جو ہم لوگوں نے وہاں چھوڑ دیے تھے۔ میں انہیں دکھانا چاہ رہا تھا کہ یہ چیونٹیاں کس طرح ایک خاندان کی طرح آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں اور ہم انسانوں کو بھی ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اس وقت دریا چڑھا ہوا تھا اور پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ بس مجھے اتنا ہی یاد ہے۔

☆☆☆

جب میں اس واقعے کے بارے میں پوری تفصیل کاغذ پر لکھ چکا تو پولیس والوں نے مجھے، ممی اور ڈیڈی کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ وقوعہ کے بارے میں میرا تحریری بیان لینا چاہ رہے تھے کیونکہ جب یہ حادثہ پیش آیا، اس وقت میں ہی وہاں موجود تھا۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد میری انگلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ مجھے لکھنے کی عادت جو نہیں تھی اور اس سے پہلے میں نے کبھی اپنی اسکول کی کاپی میں اتنے زیادہ الفاظ نہیں لکھے تھے۔ میں نے چاہا کہ وہ زبانی مجھ سے پوچھ گچھ کر لیں لیکن ان کا اصرار تھا کہ قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے میرا تحریری بیان ضروری ہے۔

اس شام انکل ارل جب گہری نیند سے بیدار ہوئے تو انہیں آنٹی جیش کہیں نظر نہیں آئیں۔ اس وقت انہیں کافی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ اگر آنٹی آس پاس موجود ہوتیں تو وہ ان سے کہہ کر اپنے لیے کافی بنوا سکتے تھے۔ وہ کافی دیر بستر میں پڑے پڑے آنٹی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ نہیں آئیں تو انہیں حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی ہونے لگی۔ آنٹی کبھی اتنی دیر تک انہیں تنہا نہیں چھوڑتی تھیں۔ سورج غروب ہونے کو تھا اور آنٹی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر ٹریلر سے باہر آئے اور آنٹی کو تلاش کرنے لگے۔ وہ انہیں آوازیں دیتے ہوئے دریا کے کنارے کی طرف بڑھنے لگے اور کچھ دور چلنے کے بعد انہیں آنٹی نظر آ گئیں۔ وہ منہ کے بل زمین پر اوندھی لیٹی ہوئی تھیں اور ان کی بے نور آنکھیں زندگی کی چمک سے محروم ہو چکی تھیں۔

میں نے گھر آنے کے بعد ممی اور ڈیڈی کو اس حادثے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ پولیس والوں کا خیال تھا کہ اونچی ایڑی کے جوتوں کی وجہ سے آنٹی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور دریا میں جا گریں۔ انہوں نے بھاری بھرکم لباس پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کا وزن زیادہ ہو گیا اور وہ پانی کی تہ میں ڈوبتی چلی گئیں۔ البتہ انہیں اس بات پر حیرانی تھی کہ انہوں نے پھسل جانے کے بعد باہر آنے کی کوشش کیوں نہیں کی کیونکہ کنارے پر پانی کا بہاؤ اتنا تیز نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ ان کا پاؤں کسی چٹان میں پھنس گیا ہو یا ان کا سر کسی چیز سے ٹکرا گیا ہو اور پانی میں دیر تک رہنے کی وجہ سے ان کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا ہو۔ بہرحال، وہ اس بارے میں کوئی قطعی بات کہنے سے قاصر تھے۔

ممی اور ڈیڈی کو ان کی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ اندر ہی اندر وہ اطمینان بھی محسوس کر رہے ہوں گے۔ مجھے تو ویسے بھی ان کی شکل سے نفرت تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنا منحوس چہرہ لے کر اس دنیا سے چلی گئیں۔ مجھے اس عورت سے کس طرح ہمدردی ہو سکتی تھی جس نے میری ماں کو رلایا اور باپ کی راتوں کی نیند چھین لی۔

پکنک سے واپس آنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا۔ میں اپنے ساتھ بہت سے کیڑے لے کر آیا تھا جنہیں میں نے کئی بوتلوں میں سنبھال کر رکھ دیا ہے اور میں اس بل کھاتی مضبوط شاخ کو بھی اپنے ساتھ لانا نہیں بھولا جسے پہلی بار دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اسے آنٹی کے سر پر دے ماروں۔ مجھے بہت سے الفاظ کے ہجے نہیں آتے اس لیے میں نے اپنے تحریری بیان میں اس شاخ کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہے اور وہ شاخ مجھے ایک سوغات کی طرح عزیز ہے۔

بگلا بھگت

محمد اختر بیگ

پانی کی سطح پر گھومتے سفید ملائم بگلے ماحول کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں... اس کی معصومیت اپنی جگہ... مگر شکاری صفت رکھنے والے اس پرندے کی چالاکی... اور زیرک نگاہی پوشیدہ نہیں... اپنے شکار کو دیکھ کر جھپٹنا، لپکنا اور پھر اسی سادگی سے اپنی جگہ کھڑے ہو جانا... اس معصوم شکاری کی سی صفت رکھنے والے ایک ہوشیار کا قصہ جس نے بڑی باریک بینی سے اپنا جال بچھایا تھا۔

دشوار گزار مراحل سے گزرنے والے سراغرساں کی بادہ پیمائی

گیرک اور اونیل اپنی کار سے باہر آئے اور جہاز نما کشتی پر نظر پڑتے ہی اونیل نے کہا۔ ''اگر اس کشتی کو ساؤتھ کی جانب کروز ٹرمینل پر کھڑا کیا جاتا تو وہاں بہتر حفاظتی انتظامات مکمل ہو سکتے تھے۔''
گیرک نے بندرگاہ کی طویل پٹی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ خود بھی کروز سے کم نہیں ہے۔''
بندرگاہ پر پولیس افسروں، اخباری نمائندوں اور... ٹی وی کیمرامینوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اونیل نسبتاً جوان اور بے صبرا تھا۔ اس نے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے کہا۔

''کمشنر کا کیا کہنا ہے؟''

گیرک منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سب اسے ایک حادثاتی موت ہی سمجھ رہے ہیں۔''

''یہ تو میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔'' اوڈنل نے کہا۔

پلیٹ فارم پر مزید پولیس والے جہاز کے محافظوں کے ساتھ کھڑے ہوئے نظر آئے۔ جیسے ہی وہ وہاں پہنچے تو انہیں دور کہیں سے پٹاخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جشنِ آزادی کی تقریبات جاری تھیں اور منچلے، پٹاخے چھوڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

جہاز کے محافظ مستعد مگر کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ گیرک نے اپنا کارڈ نکال کر انہیں دکھایا تو ایک سینئر محافظ بولا۔ ''میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ اوپر چلے جاؤ۔ سب لوگ اپے ڈیک پر موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔'' گیرک نے سیڑھیوں کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم پہلے بھی یہاں آ چکے ہو؟'' اوڈنل نے پوچھا۔

''ہاں، میں گزشتہ ہفتے یہاں آیا تھا۔ فریکسٹن کے آنے سے پہلے وی آئی پی سیکیورٹی کے انتظامات کو آخری شکل دینے کے لیے انہوں نے مجھے بلایا تھا۔''

''اوہ۔'' اوڈنل نے اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' گیرک نے سر ہلایا۔ ''اس ارب پتی کی موت پر کوئی بھی خوش نہیں تھا اور لوگوں نے اپنے غم و غصے کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ کمشنر کا خیال ہے کہ ہمارے حفاظتی انتظامات میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔''

عرشے پر ہاربر یونٹ کا سارجنٹ سب مشین گن لیے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گیرک نے پوچھا۔

''کیا دہشت گردی کا خطرہ ہے؟''

اس سے پہلے کہ سارجنٹ کوئی جواب دیتا، اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔ ''یہی بات میں نے بھی کہی تھی۔'' ایک نوجوان عورت ننگے پیر آگے بڑھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ بہت دیر سے روتی رہی ہو۔

''جیک مر چکا ہے اور ان سپاہیوں نے یہاں اس طرح چڑھائی کر دی ہے جیسے یہ جنگ کا محاذ ہو۔''

''ہمیں یہی ہدایات ملی ہیں۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ کب کیا واقعہ پیش آ جائے۔''

''سراغ رساں گیرک۔'' اس نے عورت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔''

''میرا نام بلیکی ہے۔'' وہ نوجوان عورت اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''ہم مختص...''

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایک اور شخص اس کے عقب سے نمودار ہوا۔ وہ تقریباً اس عورت کا ہم عمر ہی تھا۔ ''ہمیں پاپا کے وکیل کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''جیک مر چکا ہے... ہیریسن۔'' اس عورت نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

''تم کون ہو؟'' گیرک نے پوچھا۔ وہ شخص بھی بلیکی کی طرح ننگے پاؤں ہی تھا۔

''جیک فریکسٹن کا بیٹا ہیریسن۔''

''اوہ۔'' گیرک نے سر ہلایا اور بولا۔ ''کیا ہوا تھا؟''

بلیکی پھر زور زور سے رونے لگی۔ ہیریسن نے اسے ناگواری سے دیکھا اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہاں چلتے ہیں۔''

ان کے وہاں پہنچتے ہی شیشے کا دروازہ خودکار طریقے سے کھل گیا۔ گیرک نے مڑ کر اوڈنل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا جو بلیکی کو گارڈ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی رپورٹر نے انہیں آپس میں الجھتے ہوئے دیکھ لیا تو ایک اور کہانی اخبارات کی زینت بن جائے گی۔ اندر کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ قیمتی فرنیچر، دیواروں پر لکڑی کا کام اور نادر تصاویر آویزاں تھیں۔ گیرک اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں اکثر مہنگے ترین ہوٹلوں میں جاتا رہتا تھا اس لیے اس کمرے کی شان و شوکت سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوا۔

''وہ لفٹ میں ہے۔'' ہیریسن کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

بائیں جانب ایک لفٹ تھی جس کی دیواریں اور دروازے شیشے کے بنے ہوئے تھے۔ گیرک کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا قریب جا کر اس نے دیکھا کہ لفٹ کے فرش پر ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور اس کے اردگرد خون کے دھبے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

گیرک نے جائے واردات کا معائنہ کیا پھر اس کی نگاہ خون کے دھبوں پر گئی جو.......فرش پر نظر آ رہے تھے۔ اس نے ہیریسن سے پوچھا۔ ''لاش کے قریب کون گیا تھا؟''

''جہاز کے عملے کا ایک فرد۔ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ پاپا واقعی مر چکے ہیں۔'' ہیریسن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے اسے باورچی خانے میں ہی ٹھہرنے کے لیے کہا ہے۔''

فریکسٹن کے بائیں ہاتھ کے پاس ہی ریوالور پڑا ہوا تھا۔ لاش کی پوزیشن سے لگ رہا تھا کہ وہ آگے کی جانب گرا اور اس کا سر فرش سے ٹکرا گیا۔ گیرک اور زیادہ قریب ہو کر لاش کو دیکھنا چاہ رہا تھا لیکن عدالتی عملے کی آمد سے پہلے یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ہیریسن کو وہاں سے کچھ فاصلے پر لے گیا اور بولا۔

''کیا تم مجھے اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟'' ہیریسن اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''کیا وہ اس وقت تنہا تھا؟''

''ہاں، وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ بلیکی بھی موجود تھی پھر کہنے لگے کہ وہ اپنے دفتر جا رہے ہیں۔ وہ اندر آ گئے اور ہم دونوں باہر بنے ہوئے تیراکی کے تالاب کی طرف جانے لگے۔''

''دفتر...'' گیرک نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا اس جہاز پر بھی اس کا کوئی دفتر ہے؟''

''ہاں، وہ اپنا بیشتر کام یہیں بیٹھ کر نمٹاتے تھے۔ وہ بالکل نارمل تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اندر جاتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو گولی مار لی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں یہ حادثہ پیش آ گیا۔''

ہیریسن بظاہر پُرسکون نظر آ رہا تھا لیکن اس کی آواز میں ہلکی سی بے چینی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے پھر انہیں نیچے گرا دیا۔ اس کی نظریں مسلسل اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے والد بالکل ٹھیک تھے؟'' گیرک نے پوچھا۔

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟'' ہیریسن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھا نہیں کہ تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟''

''تم یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ انہوں نے خودکشی کی ہے؟''

''لیکن... انہیں کون قتل کر سکتا ہے؟''

''گولی اس کی گردن کے نیچے پشت پر لگی ہے۔ کسی بھی شخص کے لیے خود کو اس طرح نشانہ بنانا ممکن نہیں۔''

ہیریسن کا منہ حیرت سے کھل گیا لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔

''اب تم بتاؤ۔'' گیرک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کیا دیکھا؟''

''ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور وہ لفٹ کی جانب چل دیے۔ میں اور بلیکی باہر جا رہے تھے اس لیے میں نے انہیں لفٹ میں سوار ہوتے نہیں دیکھا۔ البتہ لفٹ اوپر جانے کے لیے تیار تھی۔ پھر میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ ہم اندر کی جانب بھاگے اور دیکھا کہ لفٹ آدھا راستہ طے کر چکی تھی۔ شاید زمین سے بیس فٹ اوپر۔''

''ایک منٹ۔'' گیرک بولا۔ ''کیا وہ لفٹ میں اکیلا تھا؟''

''ہاں۔''

''درمیانی منزلوں سے کوئی شخص اس میں سوار نہیں ہوا؟''

''نہیں کیونکہ یہ لفٹ صرف چوتھی اور پانچویں منزل پر ہی رکتی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا۔'' گیرک لفٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ شیشے کی لفٹ میں اکیلا تھا جس کا دروازہ بند تھا اور کسی نے اسے گولی مار دی۔''

''بشرطیکہ انہوں نے خودکشی نہ کی ہو۔''

''کیا تم نے کسی کو لفٹ سے باہر آتے دیکھا؟''

''نہیں، یہ کیسے ممکن تھا؟ لفٹ تو چل رہی تھی۔''

''اور اس کے اندر کوئی نہیں تھا۔''

''یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔'' ہیریسن جذباتی انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں غصہ، دکھ اور درد سب کچھ شامل تھا اور گیرک کے طویل تجربے کی روشنی میں اس طرح کا ردِعمل ایک عام سی بات تھی۔

گیرک نے اس کے ردِعمل کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔ ''فائر کی آواز سننے کے بعد تمہیں یہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگا؟''

''بہ مشکل چند سیکنڈ۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

گیرک نے ایک بار پھر لفٹ کی طرف دیکھا۔ اس کا کوئی شیشہ ٹوٹا ہوا نہیں تھا اور دروازے کے علاوہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور وہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔

''یہ ناممکن ہے۔'' اس نے خودکلامی کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''تم جیک فریکسٹن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' گیرک نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے طویل قامت شخص سے پوچھا۔ ''میرے پاس اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں اور تم اس کے وکیل ہونے کی حیثیت سے میری مدد کر سکتے ہو۔''

''شاید میں تمہیں کچھ زیادہ نہ بتا سکوں۔'' کلیٹن نے کہا۔ ''موکل کے مر جانے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے پیشے کی اخلاقیات کو نظرانداز کر دوں۔''

''کیا میں یہ سمجھوں کہ تم ہماری تحقیقات کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے ہو؟'' گیرک نے ناگواری سے کہا۔

''میں کئی مقدمات میں سرکاری وکیل رہ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ استغاثہ سے کس حد تک تعاون کیا جا سکتا ہے۔''

گیرک نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''کیا فریکسٹن کی کمپنی تمہاری بہت بڑی مؤکل ہے؟''

''کہہ سکتے ہو۔ میں کئی سالوں سے جیک کے معاملات دیکھ رہا ہوں۔''

''پھر تو تمہاری رائے ہمارے لیے بہت مفید ہو سکتی ہے۔'' گیرک سمجھ گیا تھا کہ دھونس اور دھمکی سے اس وکیل کو قابو کرنا مشکل ہے لہٰذا وہ خوشامد پر اتر آیا۔ ''کیا تمہارے خیال میں اس کو قتل کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟''

''اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔'' کلیٹن ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے پندرہ سال پہلے ایک چھوٹے سے گیراج سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا تھا اور اس دوران میں تین بلین ڈالرز کمپنی کا مالک بن گیا۔ اس نے کمپنی کے حصص فروخت کیے اور نہ ہی کسی کو اپنے کاروبار میں شریک کیا۔ پوری زندگی عاجزی و انکساری سے گزاری۔ وہ کئی فلاحی اداروں کو باقاعدگی سے عطیات دیا کرتا تھا اور کئی ضرورت مندوں کی خاموشی سے مدد کرتا رہتا تھا۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا امیر آدمی بے رحمانہ موت مارا گیا جس سے لوگ محبت کرتے تھے۔'' گیرک نے مضطرب انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے کیا کچھ چھوڑ کر گیا ہے؟''

''ایک بہت بڑی جائداد جس کے معاملات بھی کافی پیچیدہ ہیں۔''

''اس جائداد کی مالیت اندازاً کتنی ہوگی؟''

''ٹھیک سے نہیں بتا سکتا لیکن اس کے اثاثوں کی مالیت اربوں میں ہوگی جس کا بڑا حصہ کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بہرحال، وہ اتنا کچھ چھوڑ گیا ہے جس سے اس کی سابق بیویوں اور بیٹے کو اچھی خاصی مدد ملتی رہے گی۔ جب تک وصیت سامنے نہ آجائے، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''اور اس کی بیٹی... اسے کچھ نہیں ملے گا؟'' گیرک نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹی۔'' کلیٹن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔''

''پھر یہ بلیکی کون ہے؟''

کلیٹن نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''وہ اس کی دوسری بیوی ہے جس سے اس کی علیحدگی ہو چکی تھی۔''

گیرک کے لیے یہ ایک حیران کن انکشاف تھا کیونکہ بلیکی دیکھنے میں فریکسٹن کی بیٹی ہی لگتی تھی اس لیے وہ بے یقینی کے انداز میں بولا۔ ''بیوی؟''

''ہاں اور اس وقت اس کی پوزیشن سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''حال ہی میں ہیریسن اور بلیکی نے اپنے تعلق کا اعلان کیا ہے اور جون میں ان کی شادی متوقع ہے۔''

گیرک نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''ہیریسن اپنی سوتیلی ماں سے شادی کر رہا ہے؟''

''لگتا ہے کہ ان دونوں کے مفادات ملتے جلتے ہیں اور ویسے بھی ان کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔''

''فریکسٹن کا اس بارے میں کیا خیال تھا؟''

''اسے یہ سب کچھ عجیب اور ناگوار سا لگا تھا۔''

گیرک نے جیب سے اپنی نوٹ بک نکالی اور اس پر بے معنی سے تبصرے لکھنے لگا۔ لگتا تھا کہ اس جوڑے کے بارے میں وہ کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کر پایا پھر اس نے نگاہ اوپر اٹھائی اور بولا۔ ''آخری بار فریکسٹن نے کب اپنی وصیت پر نظرثانی کی تھی؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

''وہ شخص مر چکا ہے۔'' گیرک نے کہا۔ ''ہماری تحقیقات میں رکاوٹ ڈالنا ایک ناپسندیدہ فعل سمجھا جائے گا۔''

''دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں۔'' کلیٹن بے خوف لہجے میں بولا۔ ''جیک نے حال ہی میں مجھ سے ایک وصیت نامہ تحریر کرنے کے لیے کہا تھا۔ گو کہ ابھی اس کا اطلاق نہیں ہوا تھا اور آج میں اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔''

''پھر؟'' گیرک بولا۔

''بلیکی کو اس کی طلاق کے موقع پر معقول رقم ادا کر دی گئی تھی، اس طرح ہیریسن ہی اپنے باپ کے اثاثوں کے بڑے حصے کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے لیکن نئے وصیت نامے میں اس حوالے سے کچھ تبدیلی کر دی گئی تھی۔ آج جو کچھ پیش آیا ہے، اس میں اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''بہت خوب۔'' گیرک نے دوبارہ نوٹ بک پر کچھ لائنیں کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اخبار والے تمہارے بہت شکرگزار ہوں گے کیونکہ اس کہانی کی بدولت وہ کئی ہفتوں تک سنسنی پھیلاتے رہیں گے۔''

کلیٹن نے بے چینی سے اپنی کرسی میں پہلو بدلا اور بولا۔ ''وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہیریسن کا اپنے باپ کی موت میں کوئی ہاتھ ہے۔''

''بظاہر تو اس کے پاس ایسا کرنے کی معقول وجہ تھی۔ تم جانتے ہو کہ یہ اربوں کا معاملہ ہے۔''

''وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔''

''اور اس کی بیوی؟''

''سابقہ بیوی۔'' کلیٹن نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری کلائنٹ نہیں ہے۔ ہاں اگر ہیریسن سے اس کی شادی ہو گئی، تب صورتِ حال بدل جائے گی۔''

''تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟''

''اسے ہیریسن کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں۔''

''تاہم انہیں مشتبہ افراد کی فہرست سے خارج نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ سرِفہرست ہیں۔''

کلیٹن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''مشتبہ افراد... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''اسے قتل کیا گیا ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ جب لفٹ روانہ ہوئی تو وہ تنہا تھا۔ اگر کوئی دوسرا شخص وہاں موجود ہوتا تو شیشے میں سے نظر آجاتا۔ میرے خیال میں تو جیک نے خودکشی ہی کی ہے۔''

''یہ میں نہیں جانتا۔'' گیرک اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا جیک یوگا کی مشق کیا کرتا تھا؟''

''ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''صرف وہی شخص اپنی پشت میں گولی مار سکتا ہے جو یوگا کا ماہر ہو۔'' گیرک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں مزید چند گھنٹے یہاں پر رکنا ہوگا۔''

کلیٹن کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی جھلک نمودار ہوئی اور وہ بولا۔ ''تم مجھے یہاں زبردستی نہیں روک سکتے۔''

''ہاں لیکن کیا تم چاہتے ہو کہ اخباری نمائندے تمہارا گھیراؤ کر لیں؟ تمہیں کم از کم اتنی دیر تو رکنا ہوگا جب تک وہ یہاں سے چلے نہیں جاتے۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کلیٹن کچھ نرم پڑتے ہوئے بولا۔

''ویسے بھی ہمیں دوبارہ بات کرنا ہوگی۔'' گیرک نے کہا۔ ''یہ کیس ابھی تک بالکل اوپن ہے۔''

☆☆☆

ساس نامہ

☆ اس نے اپنی بیوی کی وفات پر سالی سے شادی کر لی، وہ نئی ساس کا رسک لینے کو تیار نہ تھا۔

☆ میاں بیوی میں جھگڑا ہوا تو بیوی نے اپنی ماں کو فون کیا اور کہا۔ ''میں آپ کے ہاں آرہی ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''اسے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے تم وہیں ٹھہرو۔ میں تمہارے ہاں آرہی ہوں۔''

☆ یار کمال ہے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔ تم نے یہی کہا ہے نا کہ تمہاری شادی کو ایک سال ہو چکا ہے اور تمہاری ساس اس دوران صرف ایک بار تم سے ملنے آئی ہے۔''

''ہاں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ شادی کے بعد دوسرے دن ہم سے ملنے آئی تھیں، اس کے بعد وہ گئی ہی نہیں۔''

ماہا ایمان کے چٹکلے

بیوی

ڈاکٹر نے اپنی پرانی مریضہ کے شوہر سے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کن الفاظ میں آپ کو اپنی بات سمجھاؤں... مجھے یہ بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ آپ کی بیوی اگلا ہفتہ بھی مشکل سے گزار سکے گی''

''یع... یعنی وہ اگلے ہفتے مرجائے گی!'' شوہر نے ہکلاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

ڈاکٹر کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا ''پھر تو میں بھی مرجاؤں گا!''

''وہ کیوں؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا ننھا سا دل اتنی بڑی خوشی کیسے برداشت کر سکے گا ڈاکٹر!''

کراچی سے امتیاز احمد کی حیرانی

گیرک بڑے ہال میں واپس آیا جہاں اونیل پہلے سے موجود تھا۔ وہ دونوں فارنسک اہل کاروں کو کام کرتے دیکھنے لگے۔ ان میں سے دو افراد نے پیلے رنگ کے سوٹ پہن رکھے تھے اور وہ جائے وقوعہ کی صفائی، پیمائش اور چیزیں اکٹھا کرنے میں مصروف تھے جبکہ ایک عورت ہاتھ میں ویڈیو کیمرا لیے کھڑی ہوئی تھی جبکہ چوتھا شخص نوٹس لینے میں مصروف تھا اور ساتھ ساتھ اپنے سیل فون پر کسی سے ہدایات بھی لے رہا تھا۔

''اس اسٹیوارڈ کا کیا کہنا ہے جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی؟'' گیرک نے پوچھا۔

''وہ سیکنڈ میٹ ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس جہاز پر سترہ افراد کا عملہ ہے۔''

''ممکن ہے کہ ان میں سے کسی نے کچھ دیکھا ہو؟''

''شاید... لیکن اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ دوڑتا ہوا اندر گیا۔ اس نے بارود کی بو محسوس کی۔ لاش کو دیکھا اور بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔''

''بارود؟'' گیرک نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اونیل نے کہا۔ ''میں نے اس کے سیل فون پر خون کے دھبے دیکھے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اس نے لاش کو ہاتھ لگایا ہوگا۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک تھیلا نکالا اور لاش کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

''میرا خیال تھا کہ بلیکی نے پولیس کو فون کیا ہوگا۔''

''ہاں، اسی نے فون کیا تھا۔''

''اوہ۔'' گیرک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میٹ کے ذہن میں کوئی اور بات ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''لگتا ہے کہ اس نے نصف درجن فون کیے ہیں... اس کہانی کو بیچنے کے لیے۔''

''تمہارے خیال میں اسے کتنے پیسے مل جائیں گے؟'' گیرک نے پوچھا۔

''فی الحال کچھ نہیں۔'' اونیل نے وہ تھیلا کیمرے والی عورت کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بعد میں وہ اندرونی کہانی بیچنے کے بارے میں ضرور سوچ رہا ہوگا۔ کم ازکم چند ہزار ڈالرز تو مل ہی جائیں گے۔''

اونیل نے وہ تھیلا عورت کے حوالے کیا اور جب وہ چلی گئی تو وہ ایک بار پھر لفٹ کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

''بدقسمتی سے یہاں کوئی نگرانی کرنے والا کیمرا بھی نہیں لگا ہوا۔''

''یہ کوئی عام جگہ نہیں ہے۔'' گیرک بولا۔ ''کیا تم اپنے لیونگ روم میں ایسا کیمرا لگانا پسند کرو گے؟''

''میں نے اپنے بیڈروم میں یہ کیمرا لگا رکھا ہے۔''

''اس ریوالور کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو جس سے گولی چلائی گئی؟''

''فریکسٹن کے پاس ہتھیاروں کا ذخیرہ تھا جو اس کے اسٹیٹ روم کی الماری میں رکھا ہوتا ہے۔ کپتان کا کہنا ہے کہ ان میں سے ایک ریوالور غائب ہے۔''

''کیا اس میں تالا لگا ہوا تھا؟'' گیرک نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''پھر تو ہمیں لائسنس ڈپارٹمنٹ سے معلوم کرنا ہوگا۔''

اونیل چند لمحے خاموش رہا پھر لفٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ یہ قتل ہے کیونکہ کوئی شخص خود اپنی پیٹھ میں گولی نہیں مار سکتا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ قاتل کہاں سے آیا اور کہاں چلا گیا؟''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے لیکن ہمارے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں۔''

☆☆☆

بلیکی کو انہوں نے لائبریری میں تلاش کیا جو جہاز کی پہلی منزل پر واقع تھی۔ وہاں بڑی تعداد میں کتابیں موجود تھیں اور دیوار پر اڑتالیس انچ کا فلیٹ اسکرین ٹی وی نصب تھا جس پر اس وقت کوئی دستاویزی فلم چل رہی تھی۔ بلیکی ایک کرسی پر بیٹھی خاموشی سے ویڈیو دیکھ رہی تھی۔

''میں تمہیں ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔'' گیرک نے کہا۔ اونیل پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

''نہیں نہیں۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر اچانک ہی رونا شروع کر دیا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' گیرک نے قریب رکھی ہوئی میز پر سے ٹشو پیپر کا ڈبا اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔'' بلیکی نے ٹشو سے اپنی ناک پونچھتے ہوئے کہا۔

''جب تمہاری آخری بار اس سے بات ہوئی تو وہ دیکھنے میں کیسا لگ رہا تھا؟'' گیرک نے پوچھا۔

''جیسا ہمیشہ نظر آتا تھا۔'' بلیکی دوبارہ ٹی وی اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''ہیریسن نے مجھے ہفتے کے اختتام پر آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے بلایا تھا۔ میں اس خیال سے آ گئی کہ یہ جہاز کافی بڑا ہے اور یہاں ہم دونوں کا آمنا سامنا ہونے کا زیادہ امکان نہیں تھا۔''

''تمہارا اشارہ فریکسٹن کی جانب ہے؟'' گیرک حیران ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بلیکی واقعی اتنی احمق تھی یا جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔

اس نے گیرک کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''بظاہر تو وہ نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''کیا تمہاری علیحدگی کو کافی عرصہ ہو گیا ہے؟''

''ہمارے درمیان گزشتہ برس طلاق ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے بور ہو گیا تھا۔ کم از کم میں ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے میں خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل گئی۔ شاید وہ مجھ سے بھی زیادہ کم عمر لڑکی چاہتا تھا۔''

''ہیریسن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ بہت اچھا انسان ہے۔ ہم کسی بھی موضوع پر بہ آسانی گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ مجھے اچھی طرح سمجھتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''آج صبح تم ہیریسن سے کیا باتیں کر رہی تھیں؟'' گیرک نے پوچھا۔

''کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ ہم شاید کل ہونے والی بارش کے بارے میں بات کر رہے تھے جس کی وجہ سے آتش بازی کا پروگرام متاثر ہو سکتا ہے۔''

''اور یہ گفتگو باہر عرشے پر ہو رہی تھی؟''

''ہاں، میں اور ہیریسن پول کی طرف جا رہے تھے کہ جیک باہر آتا ہوا دکھائی دیا اور تم تو جانتے ہی ہو کہ ہم ایک دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ پھر میں سیڑھیوں کی جانب چلی گئی۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔''

''اور تم نے ہیریسن کو اس کے پاس چھوڑ دیا؟'' گیرک آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔'' بلیکی منمناتے ہوئے بولی۔ ''ہم سب ایک ساتھ ہی وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ ہیریسن اسٹیوارڈ کو تولیے کے لیے فون کرنے جا رہا تھا۔''

''کیا تم نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی؟''

''ہاں، میں پہلے سے ہی ڈیک پر تھی لیکن کھڑکی سے اندر کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ میں دھماکے کی آواز سنتے ہی نیچے کی طرف بھاگی۔ وہاں فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور لفٹ گراؤنڈ فلور سے اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' گیرک بولا۔

''تمہارے علاوہ وہاں اور کون تھا؟''

''ہیریسن... وہ مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹیوارڈ بھی آ گئے جو بٹن دبا کر لفٹ کو نیچے لا رہے تھے۔''

''اس کے علاوہ بھی وہاں کوئی اور تھا؟'' گیرک نے پوچھا۔ ''اوپر عرشے پر یا ہال کے اندر؟''

''نہیں... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں واقعے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور میری نظریں لفٹ پر جمی ہوئی تھیں۔''

گیرک فوری طور پر اس کی ہر بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تجربہ کار سراغ رساں ہونے کے ناتے وہ جانتا تھا کہ ہر شخص تھوڑا بہت جھوٹ بولتا ہے اور ہر ایک کے غم کی نوعیت مختلف ہوتی ہے لہٰذا اسے بلیکی کو مزید کریدنے کی ضرورت تھی۔

''فریکسٹن سے ملنے سے پہلے کیا تم کہیں ملازمت کرتی تھیں؟''

''میں میساچوسٹس بے فاؤنڈیشن میں کام کرتی تھی۔ وہیں ایک چندہ جمع کرنے کی تقریب کے دوران ہماری ملاقات ہوئی۔ اس نے انہیں دس لاکھ ڈالرز کا عطیہ دیا تھا۔''

وہ بولتے بولتے ایک بار پھر جذباتی ہو گئی۔ ''گو کہ ہمارے درمیان طلاق ہو گئی لیکن وہ بہت ہی خاص شخص تھا۔ میں اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

گیرک جانتا تھا کہ اگر فریکسٹن کے بارے میں براہ راست کوئی سوال کیا گیا تو وہ ایک بار پھر رونا شروع کر دے گی لہٰذا اس نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ ''فریکسٹن کا خاندانی وکیل مسٹر کلیٹن بھی یہاں موجود ہے۔ کیا تم نے صبح میں دیکھا تھا؟''

''ہاں، وہ جیک سے ملنے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔''

''کہاں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ شاید عرشے پر۔''

''کیا تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

گیرک نے بلیکی کے چہرے کی جانب غور سے دیکھا تو وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''کیا طلاق کے بعد مسٹر کلیٹن نے تمہاری کوئی مدد کی تھی؟''

''وہ میرا نہیں، جیک کا وکیل ہے۔''

''پھر بھی شاید...'' گیرک نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھتی تھی کہ جیک اس سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا لیکن ہم زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ طلاق کے بعد۔''

...ک کو حیرانی اس بات پر تھی کہ وہ سب جہاز پر چلے آئے تھے؟ لیکن اسے اس سوال کا جواب کہیں ...ل رہا تھا۔ اس نے بلیکی سے پوچھا۔ ''ہیریسن کیا کر ...''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''تم ...ل تو ہمیں آپس میں بات کرنے سے منع کیا تھا۔''

''مجھے افسوس ہے۔ ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ فی الحال وہ کوئی بھی زیر حراست نہیں ہے۔''

''وہ یہیں کہیں ہو گا۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو فون کر رہا ...''

''ہمیں اس سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔'' گیرک نے ''لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس بات کو بھی یقینی ...دں گا کہ اس کے بعد وہ تمہیں ڈھونڈتا پھرے گا۔''

''جیک کو اسکیٹنگ سے بھی دلچسپی تھی۔'' وہ ٹی وی ...ین پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''وہ اگلے ہفتے نیوزی ...جانے والا تھا۔ وہاں برف باری شروع ہو چکی ہے۔''

☆☆☆

جیسے ہی ہیریسن کی نظر ان پر پڑی، وہ قریب آتے ...بولا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ سب سے پہلے میں اس جہاز کو ...وقف کر دوں گا۔''

''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔'' گیرک سر ہلاتے ...ے بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اس واقعے کے بعد لوگوں کی ...دلچسپی کم ہو گی یا بڑھ جائے گی؟''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

ہیریسن کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ اس ...جیب سے اپنا فون باہر نکال کر اسے سائلنٹ پر کیا اور ...ا وہ جیب میں رکھ لیا۔

''کیا تم اپنے باپ سے بہت قریب تھے؟'' گیرک ...وال کیا۔

''یقیناً۔''

''میں معافی چاہتا ہوں لیکن اس کی سابقہ بیوی کے ...تمہارا تعلق کچھ لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے۔''

''ان کا دماغ خراب ہے۔'' ہیریسن آنکھیں ملتے ...بولا۔ ''پاپا نے بھی کسی کے کہنے کی پروا نہیں کی اور نہ ...یا کرتا ہوں۔''

''کیا آج صبح تمہاری مسٹر کلیٹن سے کوئی بات ہوئی

مختصر مختصر

☆ میں قرضوں کی وجہ سے بالکل پریشان نہیں ہوتا میں تو قرض خواہوں کی وجہ سے پریشان ہوتا ہوں۔

☆ میں کتاب پر تبصرہ لکھنے میں اتنا مصروف رہا کہ مجھے کتاب پڑھنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔

☆ رشید صاحب، آج آپ کا سر عجیب سا لگ رہا ہے۔ لگ رہا ہے جیسے آپ نے وگ لگائی ہو۔

جی ہاں وگ ہی ہے۔

اچھا......؟ بھئی کمال ہے...... بالکل پتا نہیں چل رہا۔

☆ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف منگنی توڑ دی بلکہ اپنی منگیتر کو تیس مرتبہ کے ہوم وزٹ کا بل بھی بھیج دیا۔

☆ ڈاکٹر صاحب نے حسین مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

آپ صحیح خوراک نہیں کھا رہی ہیں آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔

☆ ڈاکٹر صاحب! میں اپنی زیادہ دولت کی وجہ سے پریشان رہتا ہوں۔

آپ باقاعدگی سے میرے پاس آتے رہیں میں آپ کی یہ پریشانی کافی حد تک کم کر دوں گا۔

☆ ڈاکٹر صاحب کیا میرا آپریشن کامیاب رہے گا؟

یہی دیکھنے کے لیے تو آپریشن کر رہا ہوں۔

☆ پروفیسر صاحب نے زیر تربیت ڈاکٹر سے پوچھا۔

''اگر کوئی بچہ حلق میں سکہ پھنسا لے تو آپ کیا کریں گے؟''

''سر! میں کسی پولیس والے کو بلواؤں گا، وہ لوگ ہر جگہ سے پیسا نکلوا سکتے ہیں۔''

☆ سنیے...... رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ نے مجھے نئے کپڑے خریدنے کے لیے دو ہزار روپے دیے ہیں آپ یقیناً خود کو اتنا ہی فراخ دل ثابت کریں گے جتنا میں نے آپ کو خواب میں دیکھا۔

ہاں بیگم ... تم وہ دو ہزار روپے اپنے پاس ہی رکھو جو میں نے تمہیں خواب میں دیے ہیں۔

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

''نہیں، شاید اسے پاپا سے ملنا تھا کیونکہ وہ صبح سے ہی سیلون کے باہر پاپا کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی کیونکہ میرا خیال تھا کہ پاپا اپنی قانونی فرم تبدیل کر رہے ہیں۔''

''کیا واقعی؟'' گیرک نے تعجب سے پوچھا۔

''ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ تم نے غور کیا ہوگا کہ مسٹر کلیٹن بہت شائستہ گفتگو کرتے ہیں لیکن ان کی فیس بہت زیادہ ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد کے قانونی معاملات کافی پیچیدہ ہوں گے۔''

''اتنے بھی پیچیدہ نہیں ہیں کہ ان کے لیے منہ مانگی فیس طلب کی جائے۔''

''میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔'' گیرک نے کہا۔ ''صبح جب تم نے وقوعہ کی تفصیلات بیان کیں تو میں یہی سمجھا کہ والد سے بات کرنے کے بعد تم اور بلیکی ایک ساتھ وہاں سے چل دیے تھے۔''

''کیا؟'' ہیریسن اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں... بلیکی سوئمنگ پول کی طرف جا رہی تھی جبکہ مجھے ایک ڈرنک کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ تولیے بھی درکار تھے لیکن میں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ شاید میں نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہوگا جب مجھے گولی چلنے کی آواز آئی۔''

''اور تم واپس اس جانب بھاگے؟''

''بالکل۔''

''تم جانتے ہو کہ باپ کی موت کی وجہ سے اس کے اثاثوں کی منتقلی کا عمل غیر یقینی ہو سکتا ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ بلیکی اور میں، دونوں ہی اس کے وارث ہیں۔'' ہیریسن کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے بہت پیسا چھوڑا ہے اور ہم تو اس جہاز کو بیچ کر ہی ساری زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''شاید ایسا نہ ہو سکے۔''

''کیا اب میں جا سکتا ہوں؟'' ہیریسن نے کہا۔ ''مجھے تجہیز و تکفین کے سلسلے میں بھی بات کرنا ہے۔''

''یقیناً۔'' وہ اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکال لیا تھا اور چلتے چلتے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ اونیل نے اس کے جانے کا انتظار کیا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کبھی فون پر اتنی باتیں نہ کرتا۔''

''اب کسی کی کال کو ٹریس کرنا اتنا مشکل نہیں۔''

وہ دونوں باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے۔ اونیل پہلے نکل گیا۔ گیرک نے اپنا موبائل فون نکالا۔ ''کمشنر بار بار فون کر رہا ہے۔ اسے نتیجہ چاہیے۔''

گیرک نے اسے نظرانداز کر دیا۔ اونیل نے سیڑھیوں سے جھانک کر دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''آجاؤ۔'' گیرک نے کہا۔ ''شاید ہمیں کہیں اور جانا پڑ جائے۔''

☆☆☆

انہیں اپنا مطلوبہ کمرا ڈھونڈنے میں دس منٹ سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔ یہ مرکزی عرشے پر واقع ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک پن بال مشین رکھی ہوئی تھی جبکہ دائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک قدیم طرز کی لکھنے کی میز اور چمڑے کی گدی والی کرسی بھی موجود تھی۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' گیرک نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ یہاں ہمیں کسی سے بحث کرنے کا موقع مل سکے گا۔''

اس کی نظر میز کے ساتھ رکھے چمڑے کے بریف کیس پر گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے جبکہ اونیل موبائل فون سے اس کی تصویریں لینے لگا۔

''اس میں تو تالا بھی نہیں لگا ہوا۔''

''ہم اتنے خوش قسمت نہیں ہو سکتے۔'' اونیل نے کہا۔ ''ضرور کوئی ہمارے ساتھ ڈبل گیم کر رہا ہے۔''

''ممکن ہے۔'' گیرک نے آہستہ سے بریف کیس کھولتے ہوئے اندر جھانکا۔ ''اوہ۔''

اس نے کیس میں سے ایک ریوالور برآمد کیا۔

''تمہارا خیال درست تھا۔'' اونیل خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

''اب تک تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' گیرک نے جواب دیا۔

☆☆☆

گیرک کی اگلی فون کال کا کسی نے جواب نہیں دیا تو مجبور ہو کر اس نے جہاز کے کپتان سے مدد مانگی جس نے اپنے عملے کو حکم دیا کہ وہ سب لوگوں کو تلاش کر کے لے آئے۔ بلیکی اور کلیٹن تو پہلے کمرے میں ہی مل گئے اور کچھ ہی دیر بعد ہیریسن بھی آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر گیرک بولا۔

''تم سب کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں تو صرف...''

''کوئی بات نہیں۔'' ہیریسن اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''اسٹیوارڈ نے مجھے بتایا کہ سارا عملہ

اٹ کر رہا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ ہمیں کیوں بلایا گیا ہے؟''

''بہت خوب۔'' گیرک ایک سائڈ ٹیبل کی طرف ـ ہوئے بولا جبکہ اونیل دروازے پر ہی کھڑا رہا۔

''یہ قتل کا کیس ہے۔'' اس نے ایک نظر سب کے ان پر ڈالتے ہوئے کہا۔

بیک وقت تین آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔

''کیسے؟''

''کیوں؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

گیرک نے کلیٹن کی جانب دیکھا اور بولا۔ ''تمہارے پاس آتش بازی کا سامان رکھنے کا اجازت نامہ ہے؟''

''یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہ میرے ریکارڈ پر موجود ہے۔''

''فیساچوسٹس میں اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے.... بہت ہی مشکل۔''

''اس کے لیے باقاعدہ ٹریننگ لینا ہوتی ہے اور کافی چھان بین کے بعد یہ اجازت نامہ جاری کیا جاتا ہے۔''

کلیٹن نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دے رہا ہو۔

''کیا واقعی وہ بارود کی بو تھی کیونکہ بلیکی اور ہیریسن اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' گیرک نے کہا۔

''اس کا یہ مطلب نہیں...''

گیرک اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ اس بارے میں نہیں جانتے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس قتل کا کوئی محرک نہیں تھا۔''

کلیٹن کے جواب سے پہلے ہیریسن بول پڑا۔ ''... بک کو کیوں مارے گا؟''

''تم نے ہی مجھے بتایا تھا۔'' گیرک اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جیک فریکسٹن کا ارادہ کلیٹن کو فارغ کرنے کا تھا کیونکہ اس کی فیس اور دیگر اخراجات ناقابلِ برداشت ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے درمیان کچھ مسائل تھے جن کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں۔''

''یہ ایک بے بنیاد اور مضحکہ خیز الزام ہے۔'' کلیٹن ملں بہ جبیں ہوتے ہوئے بولا۔

''ریوالور پر بھی تمہاری انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔'' گیرک نے ایک اور پتا پھینکا۔

''ناممکن۔'' کلیٹن اپنی جگہ سے اچھل پڑا لیکن فوراً ہی

خواهش

زندگی کو ضرورت تک محدود رکھو، خواہش کی طرف نہ لے جاؤ...... کیونکہ ضرورت فقیروں کی بھی پوری ہو جاتی ہے اور خواہش بادشاہوں کی بھی ادھوری رہ جاتی ہے۔

مرسلہ: جنید نواز، بہاولپور

ٹیکنالوجی کی جنگ

گوگل نے کہا: ''ایک لفظ لکھو، ہزاروں رزلٹ دوں گا۔''

وکی پیڈیا بولا: ''ایک لفظ لکھو ہزاروں پیجز دوں گا۔''

انٹرنیٹ بولا: ''میرے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔''

کمپیوٹر بولا: ''تو کون سا میرے بغیر چل سکتا ہے؟''

یہ سب سن کر بجلی ہنسی اور بولی۔

''اپنی اپنی ہانکتے رہو، میں تو چلی۔''

کائنات کی تعریف

مشہور فلسفی خلیل جبران نے اپنی محبوبہ سے سوال کیا جو پینٹنگ میں مصروف تھی۔

''اس پوری کائنات کی سات لفظوں میں تعریف کرو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''خدا، محبت، امن، زندگی اور زمین۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

خلیل جبران نے پوچھا۔ ''باقی کے دو الفاظ؟''

''باقی دو لفظ ''تم اور میں'' ہیں۔ اگر یہ لفظ نہ ہوں تو باقی کے پانچ لفظوں کی کوئی معنوی حیثیت نہ ہو گی۔''

پنجاب سے ماہا ایمان کا مطالعہ

سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ میں نے اس وقت کسی ہتھیار کو اٹھالیا ہو جب فریکسٹن مجھے اپنے ہتھیاروں کا ذخیرہ دکھا رہا تھا۔ یہ وہی نشانات ہوسکتے ہیں۔ ان سے کوئی اور نتیجہ اخذ کرنا فضول ہے۔''

بلیکی اپنی جگہ سے اٹھی اور ہیریسن کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''لفٹ کا دروازہ بند تھا اور وہ گراؤنڈ فلور سے اوپر کی جانب جارہی تھی۔ ایسی صورت میں جیک کے ساتھ لفٹ کے اندر کون ہوسکتا ہے؟''

''وہاں کوئی نہیں تھا۔'' گیرک نے کہا تو سب کی نظریں اس کے چہرے پر جم کررہ گئیں۔

''لیکن تم نے تو ابھی کہا کہ ڈیڈی کو قتل کیا گیا ہے۔'' ہیریسن بولا۔

''ہاں۔'' گیرک نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''بارود کی بو، دھواں... اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔''

اونیل نے سر کو جھٹکا دیا اور کلیٹن کے چہرے پر نظریں گاڑدیں۔

''سب لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ جب وہ فائر کی آواز سن کر ہال میں آئے تو اس وقت بھی لفٹ حرکت میں تھی اور اس کا دروازہ بند تھا۔ اگر گولی لفٹ کے اندر چلائی گئی تھی تو اس کا دھواں بھی اندر ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''لیکن شیشے میں کوئی سوراخ نظر نہیں آرہا۔'' ہیریسن نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ گولی لفٹ کے اندر ہی چلی تھی۔''

''تم جانتے ہو کہ چار جولائی کے موقع پر ہر جانب سے پٹاخوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں؟'' گیرک نے کہا۔

بلیکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اب بھی نہیں سمجھی۔''

گیرک میز سے دور ہٹتے ہوئے بولا۔ ''کلیٹن اپنی پوزیشن سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے فریکسٹن کی اربوں روپے کی جائداد اور اثاثوں کی دیکھ بھال سے معقول آمدنی ہورہی تھی۔ آج صبح وہ فریکسٹن سے ملنے آیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر آئے۔ پھر اس نے موقع ملتے ہی فریکسٹن کی الماری سے اس کا ریوالور نکالا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ لفٹ کی گراؤنڈ فلور پر موجودگی اس کے منصوبے کا حصہ تھی یا اسے محض اتفاق سمجھا جائے۔ بہرحال فریکسٹن سے باتیں کرنے کے بعد ہیریسن اور بلیکی وہاں سے چل دیے اور جیسے ہی فریکسٹن نے لفٹ میں قدم رکھا تو کلیٹن نے پیچھے سے جا کر اس پر فائر کردیا اور لفٹ کے چلتے ہی وہاں سے غائب ہوگیا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک تھیلی نکالی جس میں ریوالور...... رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے کلیٹن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے سوٹ کیس سے ملا ہے۔ تمہیں شاید لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے اسے ضائع کرنے کا موقع نہیں ملا۔''

کلیٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گیرک اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب لفٹ تقریباً بیس فٹ اوپر چلی گئی تو اس نے ایک پٹاخہ چھوڑ دیا۔ جب لوگ وہاں پہنچے اور انہیں جو بو محسوس ہوئی، وہ اسی پٹاخے کی تھی۔''

ہیریسن اپنی جگہ سے اچھلا اور اس نے کلیٹن پر چھلانگ لگادی۔ اونیل ان دونوں کو الگ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی دوران گیرک نے فون کرکے ہاربر پولیس کو بلالیا جنہوں نے منٹوں میں وہاں پہنچ کر صورتِ حال کو قابو کرلیا۔

وہ دونوں عرشے پر کھڑے کلیٹن کو پولیس والوں کے ساتھ وین کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اخباری نمائندوں اور ٹی وی رپورٹرز کو اس واقعے کی بھنک مل چکی تھی لیکن پولیس نے انہیں نزدیک نہیں آنے دیا اور وہ پچاس گز کے فاصلے پر کھڑے اپنے طاقت ور کیمروں کی مدد سے ویڈیو بنا رہے تھے۔ پندرہ منٹ میں ہی کلیٹن میڈیا کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

''مجھے اس شخص پر حیرت ہورہی ہے۔'' اونیل نے کہا۔ ''وکیل ہوتے ہوئے اس نے ایسی احمقانہ حرکت کی۔ فریکسٹن کی موت سے اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟''

''کوئی بھی شخص اپنے فائدے سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔'' گیرک نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ جانتا تھا کہ ہیریسن ناتجربہ کار ہے اور فریکسٹن کے مرنے کے بعد کمپنی کے قانونی معاملات سنبھالنے کے لیے وہ اسی کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہوگا۔''

''لیکن وہ بھول گیا تھا کہ یہ جال اس کے لیے چوہےدان بھی ثابت ہوسکتا ہے۔'' اونیل نے کہا۔

ایک سمندری بگلا فضا میں پھڑپھڑاتا ہوا آیا اور عرشے کی ریلنگ پر بیٹھ کر اطراف کا جائزہ لینے لگا لیکن سطح بالکل صاف تھی اور وہاں اس کے لیے خوراک کا کوئی سامان نہیں تھا۔ چند لمحے بعد پرندے نے زوردار آواز نکالی اور اڑگیا۔

''یہ پرندہ دیکھنے میں کتنا معصوم نظر آرہا ہے لیکن اپنے شکار پر جھپٹنے میں دیر نہیں لگاتا۔'' گیرک نے کہا۔ ''چلو، ہم بھی اپنی دنیا میں واپس چلتے ہیں۔''

دوراندیش

سلیم انور

صحرا میں ہوا کا بگولا اس قدر اچانک اٹھتا ہے کہ سوچنے سمجھنے کی مہلت.... صلاحیت سلب ہوکر رہ جاتی ہے.... اس کے تیز رفتار کمپوٹر ذہن میں بھی ایک بگولا اٹھا اور اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا...

وقت سے پہلے خطرہ بھانپ لینے والے دوراندیش کی [illegible]

میری توجہ کا پہلا مرکز وہ لڑکی تھی۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی کہ وہ جہاں جائیں... تو سب کی نگاہیں خود بہ خود ان کی جانب اٹھ جاتی ہیں اور لوگ انہیں دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آپ انہیں نظر انداز کر ہی نہیں سکتے۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔

میں اس وقت تک اسے تکتا رہا جب تک وہ لیڈیز روم کے باہر جا کر دروازے کے پیچھے غائب نہیں ہوگئی۔

اس لڑکی کے منظر سے اوجھل ہوتے ہی مجھے کسی کی نظریں اپنے اوپر جمی محسوس ہوئیں... میں نے گردن گھما کر اس کی سمت دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔

اس کا وزن چند پونڈ بڑھ گیا تھا اور اس کی مونچھیں اور چھوٹی داڑھی میرے لیے نئی تھیں... لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

میں ان سیاہ آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اور بھلا آپ اس شخص کو کیسے فراموش کرسکتے ہیں جس نے آپ کو قتل کرنے کا عہد کیا ہو۔

میرے ہاتھ کانپنے لگے اور جام سے مشروب چھلکنے لگا۔

''کیا بات ہے، جیمسن؟'' میرے ساتھ میز پر بیٹھے ہوئے ساتھیوں میں سے ایک نے پوچھا۔ ''یوں لگ رہا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔''

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ساتھیو! میں معذرت چاہوں گا۔ مجھے واش روم جانا ہے۔" میں نے میز پر چند نوٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ یہ ان ساتھیوں کے لیے مشروب کے ایک اور راؤنڈ کے لیے کافی تھے۔

میں تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل دیا۔ مجھے اس شخص کی نظریں اپنی پشت میں ڈرل کے مانند سوراخ کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں کمرے سے باہر نکل گیا، تب بھی میرے جسم کی کپکپاہٹ ختم نہیں ہوئی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا لفٹ تک پہنچا اور لفٹ میں سوار ہو کر اپنے فلور پر اترا تو تب کہیں جا کر میری حالت قدرے بہتر ہوئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں خود کو بڑی حد تک محفوظ سمجھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میری بے چینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسی ہوٹل میں اس قاتل کے مقابلے میں کسی بھوت کو دیکھ لینا میرے لیے زیادہ خوشی کا باعث ہوتا۔ میں اسے زندگی میں دوبارہ پھر کبھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے اس کی توقع تھی... خاص طور پر یہاں نہیں۔

میں ایک سافٹ ویئر انجینئر ہوں اور یہ ہوٹل مجھ جیسے دیگر انجینئرز سے بھرا ہوا تھا۔ ہم سب ایک کنونشن کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے جو اسی ہوٹل میں منعقد ہو رہا تھا۔

اور یہ شخص اس مجمع میں کسی طرح کہیں بھی فٹ نہیں ہو رہا تھا۔

عراق میں، میں نے بہت کچھ دیکھا تھا لیکن یہ شخص ان سب میں سب سے بدترین ثابت ہوا تھا۔

یہ بغداد میں لگ بھگ چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ دن میں کبھی بھی فراموش نہیں کر پاؤں گا۔ اور کیوں؟ اس کی وجہ یہی شخص تھا۔ میری کمپیوٹر کی مہارت نے عراق میں میرے بیشتر دوروں کو گرین زون میں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ عراق میں قیام کا عرصہ ختم ہونے میں صرف ایک مہینا یا اس کے لگ بھگ باقی رہ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کامیابی میرے قدم چوم چکی ہے۔

تب وہ شخص میری زندگی میں داخل ہوا۔

اس ناموافق مقام پر ناموافق وقت پر اس نے جو کچھ کیا، میں اس کا عینی گواہ تھا۔ وہ مجھے قتل کر سکتا تھا لیکن اپنی کسی ذاتی غیر معمولی وجہ سے اس نے مجھے قتل نہیں کیا۔ "تم نے زبان سے کچھ کہا تو اگلی باری تمہاری ہوگی۔" اس نے کہا تھا۔

میں نے جو کچھ دیکھا، اس کے بعد مجھے معلوم تھا کہ یہ گفتگو بے مصرف نہیں تھی۔

فوج میں رضاکارانہ طور پر خود کو پیش کرنا کسی بھی ہوش مند فرد کی آخری خواہش ہوتی ہے۔ مجھے پاگل کہہ لیں لیکن اس سفاک قاتل سے بچ نکلنے کی خاطر میں نے فوری طور پر خود رضاکارانہ طور پر انتہائی مخدوش علاقے میں، بہت خطرناک ڈیوٹی کے لیے پیش کر دیا۔

یہ میری خوش قسمتی رہی کہ میری تعیناتی کی بقیہ مدت کو خراش آئے بغیر اطمینان اور خیریت سے گزر گئی۔

پھر میں واپس امریکا چلا آیا اور اپنی پرانی آرام دہ زندگی بسر کرنے لگا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اور زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی... تبھی وہ مجھے کنونشن میں دکھائی دے گیا۔

میں نے پوری رات بے چینی سے گزاری لیکن صبح ہونے پر میرا حوصلہ لوٹ آیا۔ بھلا مجھے کس بات کا خوف ہے؟ میں نے اس کے ساتھ کوئی وعدہ خلافی نہیں کی، اس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا۔ ویسے بھی وہ لوگوں کے بھرے مجمع میں سب کے سامنے میرے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟

کنونشن میں شریک ہونا میری جاب کا ایک اہم حصہ تھا۔ میں کسی صورت اس سے کنارہ کش ہو کر اپنے کمرے تک محدود نہیں رہ سکتا تھا۔

کنونشن شروع ہوا تو میں وہاں موجود تھا۔ کنونشن میں لوگوں کا ازدحام تھا لیکن پورا دن گزرنے کے باوجود وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس کے باوجود بھی جب ساتھیوں نے اس رات مجھے بار میں چلنے کو کہا تو میں نے ان کا ساتھ دینے سے معذرت کر لی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اپنی رپورٹیں تیار کرنی ہیں تاکہ بروقت انہیں پیش کر سکوں اور مجھے اس تیاری کے لیے لازی اپنے کمرے میں جانا ہوگا۔ جہاں تک میرا مشروب پینے اور ساتھیوں کے ہمراہ وقت گزارنے کی خواہش کا تعلق تھا تو میں نے محسوس کیا، بہتر یہی ہوگا کہ میں اپنے کمرے میں موجود منی بار اور ٹیلی ویژن پر انحصار کر دوں۔

ساتھیوں سے رخصت ہو کر میں لفٹ کی جانب چل دیا۔

میں نے لفٹ کا بٹن دبا دیا اور اس کے نیچے سے اوپر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

لفٹ آ کر رکی اور اس کا دروازہ کھل گیا۔ اندر لفٹ میں وہی لڑکی کھڑی تھی جو گزشتہ شب بار میں اس قاتل کے ساتھ موجود تھی۔

میں لفٹ میں داخل ہوا تو وہ ایک کونے میں کھسک گئی۔ اس نے ہاتھ میں اپنا پرس مضبوطی سے دبوچ لیا اور اسے اس طرح تھام کر کھڑی ہو گئی جیسے یہ اس کی ڈھال ہو۔ اس کی

...علاوہ ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ بار ...اں پر زبان بھی پھیر رہی تھی۔

...ال زدہ مت ہو۔" میں نے اس سے مخاطب ہو کر ...ہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

...مجھے اترنے دو۔" وہ لجی لہجے میں بولی۔ "پلیز!"

...ٹھیک۔" میں نے اسے نکلنے کا راستہ دیتے ہوئے ...الہ میں نے کہا ہے کہ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی قطعی ...نہیں ہے۔ ڈرنا تو تمہیں اس سے چاہیے۔"

"...کس سے؟"

"اس شخص سے جو رات تمہارے ساتھ تھا۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور سر کو قدرے ...تے ہوئے بولی۔ "وہ میرا شوہر ہے۔ مجھے بھلا اس سے ...کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا، مجھے نہیں معلوم کہ اس نے اپنے ماضی کے ...میں تمہیں کیا بتایا ہے لیکن وہ ایک جنونی شخص ہے۔ اگر تم ...کمرے تک ساتھ چلو تو میں تمہیں اس کے بارے میں ...بتا دوں گا۔ وہ بے حد خطرناک شخص ہے۔ تمہیں اس ...ساتھ قیام نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے اسے ہوشیار کرتے ...ہوئے کہا۔

...وہ کوئی جواب دیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی لفٹ سے ...نکل گئی۔

"کمرہ نمبر سات سو ستاسی... سی۔" میں نے لفٹ کا ...بند ہونے سے پہلے چیخ کر کہا۔

پھر لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔

"شٹ!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اگر وہ جاننا ...چاہتی تو یہ اس کی بدبختی ہے۔ میرا کام اسے خبردار کرنا تھا ...میں نے اپنا فریضہ سرانجام دے دیا ہے۔"

☆☆☆

مجھے اپنے کمرے میں آئے پندرہ منٹ ہی ہوئے ... میں نے صرف اپنی جیکٹ اتاری، ٹائی ڈھیلی کی اور ایک طرف پھینکنے کے بعد اپنے لیے ایک جام تیار کیا تھا۔ ابھی میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا کہ میرے ...ے کے دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ میرے چہرے ...ہٹ پھیل گئی۔ میں اپنا جام ہاتھ میں لیے کمرے کے ...ے تک پہنچا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ یقیناً ...پر اس لڑکی نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔

...لیکن دروازے پر وہ لڑکی نہیں تھی۔

میرے سامنے وہی قاتل کھڑا تھا۔

"تم نے میری بیوی سے کس قسم کی بکواس کی ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تاکہ دروازہ بند کر سکوں لیکن وہ آگے بڑھ آیا۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی میرے سینے میں چبھوتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیوی کا پیچھا چھوڑ دو۔ تم نے اسے بلاوجہ ڈرا دیا ہے۔ وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔"

میں بہادر شخص نہیں ہوں۔ میں پہلے ہی اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہوں۔ اس شخص کی دھمکی نے مجھے ہراساں کر دیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں مسلسل پیچھے ہٹتا رہا۔

اچانک میں نائٹ اسٹینڈ سے ٹکرا گیا اور میرے قدم رک گئے۔ وہ بدستور آگے بڑھ رہا تھا... میری جانب!

میں نے ہاتھ پیچھے لے جا کر کچھ ٹٹولنا چاہا۔ میرا ہاتھ ٹیلی فون سیٹ سے ٹکرایا۔ میں نے بنا سوچے سمجھے فون اٹھایا اور اس کے چہرے پر ایک زوردار ضرب لگا دی۔

وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے دوبارہ اس کے چہرے پر وار کیا تو وہ جھکتا چلا گیا۔ میں نے فون سیٹ کو اور مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں پکڑا اور اس کے سر کو نشانہ بنایا۔ پھر اس کی کھوپڑی پر وار کرتا چلا گیا۔

☆☆☆

لوگوں کا کہنا تھا کہ میں نے لگاتار زوردار ضربیں لگاتے ہوئے اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا تھا اور اس کا چہرہ ناقابل شناخت ہو گیا تھا۔

لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نے غلط آدمی کو قتل کیا تھا۔

لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ تو مجھے اپنی بیوی کو ستانے سے روکنا چاہتا تھا اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ میں آئندہ اسے تنگ نہ کروں۔

ویل، میں تو جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ میں ان آنکھوں کو بہ خوبی شناخت کر سکتا ہوں۔ خاص طور پر ان قاتل آنکھوں کو جنہوں نے عراق میں بے شمار بے گناہوں کو قتل کیا تھا...

سرد سیاہ اور... خون کی پیاسی آنکھوں والے اس شخص کے بارے میں یہ بھی پتا چلا کہ وہ کبھی امریکا سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ البتہ اس نے فوجی رضاکاروں میں حال ہی میں اپنا اندراج کرایا تھا اور افغانستان میں شدت پسندوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا شدت سے خواہش مند تھا۔

□

اسما قادری

قسط : 35

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو - محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیر داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible] ان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پر جوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر تحصیل ضلع کے سب گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیر دار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان [illegible] ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پا کر عمل [illegible] پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری [illegible] ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں [illegible] ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے [illegible] ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ ماہ بانو آرمی [illegible] میں پہنچ جاتی ہے۔ شہر یار، ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آجاتے ہیں۔ عبدالمنان شہر یار کو بتاتا ہے کہ ماہ [illegible] ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہر یار، عمار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو [illegible] شہر یار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے [illegible] ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی [illegible] سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو [illegible] اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی [illegible] جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے [illegible] ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر

چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور تقی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جمرد پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جمرد کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ تقی اس تصادم میں جمرد کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرد، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر پولیس والے شبانہ کے ذریعے آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کرلیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آجاتے ہیں۔ ادھر شہر یار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچوں کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیر تے ہیں۔ پھر وہاں دو بدو مقابلہ شروع ہوجاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہوجاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشابرم خان شہر یار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہر یار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ تالی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کر جاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر ویرانے میں آجاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کر کے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ دونوں شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر شہر یار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کرلی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہر یار کو مشابرم خان کے ذریعے تالی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہر یار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ تالی والا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جارہی ہے وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں مل جاتی ہے۔ شہر یار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہر یار مشابرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہر یار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کرلیتا ہے اور اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہاں بلا لیتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں راء کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہر یار اس لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سلطیا جوزف بیٹی کی موت پر شدید غم و غصے کا شکار ہوتی ہے اور رو رما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ ادھر شہر یار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ مشابرم خان اس نے کوئی دوسری ذمے داری سونپ رکھی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ وہ دوسرے ڈرائیور کے ساتھ نکلتا ہے۔ راستے میں گاڑی خراب ہوجاتی ہے۔ ڈرائیور قریبی ٹیوب ویل سے پانی لانے کے لیے گاڑی سے اترتا ہے۔ وہ کھیتوں میں پہنچتا ہے تو ایک کان پھاڑ دھماکا سنائی دیتا ہے۔ وہاں اب شہر یار کی گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بیچ راستے میں خراب ہونے والی گاڑی نے شہر یار کو سخت کوفت میں مبتلا کر دیا۔ ڈرائیور کی غفلت پر برہم ہونے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا تھا اور خود اس کی گوشمالی کرنے کے بجائے واپس جانے کے بعد یہ کام عبدالمنان کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہی مناسب تھا کہ عملے کی کارکردگی کو عبدالمنان خود منظم کرے، چنانچہ ڈرائیور کو خاموشی سے پانی لانے کی اجازت دے دی اور خود اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جس کوفت کا شکار ہوا تھا، اس کے باعث زیرِ مطالعہ فائل پر سے بھی فی الحال توجہ ہٹ گئی تھی اس لیے اردگرد کے مناظر کا جائزہ لینے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا کام تھا ہی نہیں۔ اس کی گاڑی جس کچی پکی سڑک پر رکی تھی، اس کے دونوں طرف کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا ڈرائیور پانی لینے کے لیے بائیں طرف کے کھیت میں گیا تھا۔ اس خاموش اور پُرسکون مقام پر پھیلے ان ہرے بھرے کھیتوں کا نظارہ آنکھوں کو عجیب سی ٹھنڈک اور تازگی کا احساس بخش رہا تھا۔

بے ساختہ ہی اس کا دل مچلا کہ وہ گاڑی میں ائرکنڈیشنر کی مصنوعی خنکی سے نکل کر آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس بخشتی کھیتوں کی ہریالی میں اتر جائے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی اور اتنی تیزی سے اس کے اندر پیدا ہوئی تھی کہ وہ اسے نظرانداز نہیں کرسکا اور گھٹنوں پر رکھی فائل کو سیٹ پر رکھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دائیں طرف پھیلے کھیتوں کا رخ کیا۔ ائرکنڈیشنر گاڑی کو چھوڑ کر باہر نکلنے کی صورت اسے اپنے چہرے پر گرم ہوا کا تھپیڑا سا لگتا ہوا محسوس ہوا لیکن اے سی کی مصنوعی ٹھنڈک کے مقابلے میں یہ گرم ہوا ز

تھی۔ وہ دل ہی دل میں قدرت کی بالادستی کو تسلیم کرتا کھیتوں میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب تک اسے وہاں کوئی شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ اسے مدھم انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سماعت پر زور دے کر آوازوں کو سننے لگا۔ وہ مرد و زن کا کوئی جوڑا تھا جو کھیتوں میں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھا۔

”چھوڑو نا کمال! کیا کرتے ہو۔ مجھے گھر جانے میں دیر ہوگئی تو تیری اماں کی دس باتیں سننی پڑیں گی۔ پہلے ہی وہ کہتی ہے کہ میں نے اُلّو کا گوشت کھلا کر اس کا پتر اس سے چھین لیا ہے۔“ اسے عورت کی ناز بھری آواز سنائی دی۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اتنی صاف تھی کہ اسے ایک ایک لفظ صاف سنائی دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں اس کے قریب ہی موجود ہیں۔ اس نے کھڑی فصل کے دو نازک پودوں کو ہاتھوں سے دائیں بائیں کرتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا۔ اسے وہ دونوں نظر آگئے۔ عورت نے زرد رنگ کی شلوار قمیص پر کئی رنگوں پر مشتمل دوپٹا اوڑھ رکھا تھا جبکہ مرد کے جسم پر نیلا کرتہ اور سفید دھوتی تھی۔ دھوتی کی سفیدی پر مٹی کے دھبے نمایاں تھے۔

”میری اماں غلط تو نہیں بولتی۔ تُو نے اس کا پتر تو واقعی چھین لیا ہے۔ اب تیرے سوا میرا کسی چیز میں جی ہی نہیں لگتا۔“ مرد شوخی پر مائل تھا۔ بولتے بولتے اس نے عورت کے ”نہ نہ“ کرنے کے باوجود اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ یہ دیکھ کر شہر یار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ مرد اور عورت دونوں ہی نوجوان تھے جس سے اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی نو بیاہتا جوڑا ہے۔ اس پریمی جوڑے کی خلوت میں مخل نہ ہونے کا سوچ کر اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے نازک تنوں کو چھوڑ دیا۔ عین اسی لمحے فضا میں ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا۔ ساتھ ہی اسے عورت کی دہشت میں ڈوبی سریلی چیخیں بھی سنائی دیں لیکن اس کی توجہ پوری طرح آگ کا گولہ بنی اپنی گاڑی کی جانب مبذول تھی۔ مشکل سے دو ڈھائی منٹ پہلے وہ اس گاڑی میں موجود تھا۔ اگر اپنے اندر پیدا ہونے والی شدید خواہش پر اس نے گاڑی نہ چھوڑی ہوتی تو خود بھی یقیناً اس گاڑی کا ایک حصہ ہوتا۔ شدید شاک میں ہونے کے باوجود اسے احساس ہوا کہ گاڑی سے اتر کر کھیتوں میں آنے کی خواہش درحقیقت غیبی مدد تھی۔ وہ جو زندگی اور موت کا مالک ہے، اسے ابھی اس کی موت منظور نہیں تھی۔ جب ہی ایک معمولی سی خواہش کے ذریعے اس کے جینے کی سبیل پیدا کردی تھی۔

دل ہی دل میں وہ ربِ کائنات کا شکر ادا کرتا ہوا پنجوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں قطعی دیر نہیں لگی کہ جو کچھ ہوا، وہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے اور اس سازش میں اس کے ڈرائیور کے بھی شامل ہونے کا قوی امکان تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ ڈرائیور کی نظروں میں نہ آئے اور وہ یہی سمجھتا رہے کہ دھماکے سے اڑنے والی گاڑی کے ساتھ ساتھ اے سی شہر یار عادل کے بھی پرخچے اڑ گئے ہیں اور اب آگ میں اس کی باقیات جل رہی ہیں۔

وہ بیٹھے بیٹھے ہی کھیت میں پیچھے کی طرف سرکنے لگا۔ اتفاقاً اس کا رخ اسی طرف تھا جہاں وہ پریمی جوڑا موجود تھا۔ دھماکے نے ان دونوں کو خاصا خوف زدہ کر دیا تھا۔ اب جو انہوں نے کھیتوں میں سے ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو برآمد ہوتے دیکھا تو اور بھی متوحش ہوگئے۔

”شش... شور مت کرنا۔ مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔“ اس نے نوجوان عورت کو ایک بار پھر چیخنے کے ارادے سے منہ کھولتا دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو اس نے اپنا کھلا ہوا منہ سختی سے بند کرلیا اور پھر یوں مرد کی طرف دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس صورتِ حال سے تم ہی نمٹ سکتے ہو۔ میرے دماغ نے تو کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

”آپ کون ہو باؤ جی؟ ادھر کھیتوں میں کیا کر رہے ہو؟“ مرد ہمت کر کے دو قدم آگے بڑھا اور اس سے دریافت کرنے لگا۔

”یہ جو گاڑی تباہ ہوئی ہے، میری ہی ہے اور میرے دشمنوں نے تباہ کی ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں اپنے دشمنوں سے بچ کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔“ اس نے مختصراً الفاظ میں کمال نامی اس مرد کو بتایا تو وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دینے لگا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شہر یار نے گردن موڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ اس کی گاڑی اب تک آگ کا گولہ بنی ہوئی تھی۔ البتہ اب وہ اس آگ کے گولے کے پس منظر میں اپنے ڈرائیور اور کچھ کھیت مزدوروں کو دیکھ سکتا تھا۔ ان سب کے چہروں پر تشویش تھی لیکن وہ جلتی ہوئی گاڑی کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے میں سے کوئی جلتا ہوا ٹکڑا ان کے اوپر نہ آگرے۔ گاڑی جس طرح

جل رہی تھی، یہ امکان کم ہی تھا کہ آگ جلد بجھ سکے گی۔ جب تک آگ جلتی رہتی اور کوئی قریب سے آکر جلی ہوئی گاڑی کا جائزہ لینے کے قابل نہ ہوتا، یہ بات صیغۂ راز میں رہ سکتی تھی کہ وہ حادثے کے وقت گاڑی میں موجود نہیں تھا اور اسے اسی غیر یقینی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس کا جائے حادثہ سے جلد از جلد دور نکل جانا سب سے زیادہ ضروری تھا چنانچہ اس نے مرد کو تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

''کیا تم مجھے کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنے گاؤں سے باہر نکال سکتے ہو؟''

''نکال تو سکتا ہوں باؤ جی... پر راستہ بہت لمبا ہے۔ پیدل آپ کو دیر بھی لگے گی اور تھکن بھی بہت ہو جائے گی، پر مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔'' مرد نے جواب دیا تو اس کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ پیدل چلنا یا تھکن ہو جانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود وہ شروع ہی سے ایسی عادات کو اپنائے ہوئے تھا کہ اس کا اسٹیمنا خاصا مضبوط ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے دور میں اس نے کرکٹ، فٹ بال، ٹینس اور گھڑ سواری سمیت ایسے ہر کھیل میں حصہ لیا تھا جس میں جسمانی مشقت کے بغیر کامیابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی واقف تھا اور آج بھی پابندی سے ورزش اور جاگنگ کو اپنا معمول بنائے ہوئے تھا۔ لیکن اس وقت اس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت وقت کی تھی۔ اسے یہاں سے نکلنے میں جتنا کم وقت لگتا، اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوتا۔

''سواری تو مل سکتی ہے کمال... تو میرے ابا سے جا کر ان کا تانگا مانگ لے۔'' اب تک خاموش کردار بنی عورت نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔ لگتا تھا، وہ دھماکے کے اثر سے نکل آئی ہے اور اب گفتگو میں حصہ لینے کے قابل ہے۔

''تیرا ابا اتنی آسانی سے تانگا دینے والا نہیں ہے۔ پہلے دس سوال کرے گا فیر ہی گل مانے گا۔'' کمال نامی مرد نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''تو اس سے کہنا کہ شاہدہ کی طبیعت خراب ہے، اسے اسپتال لے کر جانا ہے۔ وہ میری طبیعت کا سنے گا تو فوراً راضی ہو جائے گا۔'' اس کے لہجے میں وہی مان تھا جو ایک بیٹی کو اپنے میکے پر ہوتا ہے۔

''چل ٹھیک ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ تو باؤ جی کو لے کر ادھر پرلی طرف آجانا۔ میں تانگا لے کر ادھر ہی آؤں گا۔'' کمال نہ صرف راضی ہو گیا بلکہ فوراً ہی وہاں سے روانہ بھی ہو گیا۔

''آجاؤ باؤ صاحب! کمال ابھی تانگا لے کر آجائے گا۔ میرا ابا مجھے بہت چاہتا ہے۔ میری طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ تانگا ضرور دے گا۔'' تیقن سے بولتے ہوئے اس نے شہر یار کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تو وہ خودکار انداز میں اس الھڑ مٹیار کے ساتھ چل پڑا جو شاید خود بھی اپنے وجود کی سحر سامانیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھی۔ مناسب مقامات سے بھرے ہوئے جسم کے ساتھ لچکیلی پتلی کمر اور اس کمر کے دائیں بائیں گھڑی کے پینڈولم کی طرح جھولتی اس کی سیاہ موٹی سی چٹیا میں ایسا جادو تھا کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جائے۔ لیکن وہ مکمل طور پر بے نیاز تھی اور ہرے بھرے کھیتوں میں اپنے زرد لباس کے ساتھ سرسوں کے پھول کی شبیہ بنی متحرک تھی۔ وہ شاید عورتوں کی اس قسم میں سے تھی جنہیں اپنے خاوند کے علاوہ نہ تو کسی دوسرے مرد کی ستائش کی چاہت ہوتی ہے، نہ وہ کسی کی للچائی نظروں سے خوف کھاتی ہیں۔ جن کے لیے اپنے کردار کی مضبوطی ہی سب سے بڑی حفاظتی ڈھال ہوتی ہے اور انہیں یقین ہوتا ہے کہ کتنا ہی بڑا سورما مقابل آجائے، انہیں زیر نہیں کر سکے گا۔ ایسی عورتوں میں اپنی جان دے کر بھی اپنی عزت کی حفاظت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

وہ تیزی سے سوچتا ہوا شاہدہ کے رحم و کرم پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کھیت کے جس حصے سے وہ اسے گزار کر لے جا رہی تھی، وہاں کھڑی فصل کی قامت اتنی بلند تھی کہ سیدھے کھڑے ہو کر چلنے کے باوجود دور سے انہیں دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔

''آپ ادھر ہی رکو باؤ جی، میں ابھی آئی۔'' چلتے چلتے شاہدہ نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب جو بھی تھا اسے ان دونوں میاں بیوی پر ہی تکیہ کرنا تھا۔

انتظار کے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ شاہدہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھام رکھا تھا۔

''میں آپ کے لیے یہ کپڑے لائی ہوں۔ کمالے کی دھوتی اور کرتہ ہے۔ میں نے ادھر نہر پر دھو کر کھیتوں میں سوکھنے کے لیے ڈالا تھا۔ آپ یہ بدل لو۔ کوٹ پینٹ پہن کر نکلو گے تو فوراً ہی سب کی نظروں میں آجاؤ گے۔'' اس نے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کپڑے اس کی طرف بڑھائے ا،

الٹ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ شہر یار نے دیکھا۔ وہ سبز رنگ کا ...ھائی والا کرتہ اور خوب اجلی سفید دھوتی تھی۔ کپڑوں کی ... سے ظاہر تھا کہ وہ کئی بار کے پہنے اور دھلے ہوئے ہیں ... ان کا اجلا پن شاہدہ کے نازک ہاتھوں کی محنت کا منہ بولتا ... تھا۔ شاہدہ کی دلیل کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس ... وہ لباس پہننے کا فیصلہ کر لیا۔ کوٹ، ٹائی اور شرٹ اتار کر ... پہننے کا مرحلہ تو آسانی سے طے ہو گیا لیکن دھوتی کو پینٹ ... جگہ دینا دشوار تھا۔ دھوتی پہننے کا تجربہ اسے تو کیا شاید اس ... آباؤ اجداد میں سے بھی کسی کو نہ تھا۔ وہ جتنا اس نامعقول ... کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس کے ہاتھ ... نکلی جا رہی تھی۔

''جلدی کریں باؤ صاحب! کمال تانگا لے کر پہنچتا ہی ... گا۔'' تاخیر ہوئی تو پیٹھ موڑ کر کھڑی شاہدہ نے اسے پکارا۔

''کیا کروں، یہ دھوتی کسی طرح بندھ کر ہی نہیں دے ... رہی۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا تو شاہدہ کی کھنکناتی ہوئی ... نے فضا میں جلترنگ سا بکھیر دیا پھر وہ آہستہ سے اس کی ... طرف پلٹی۔

''لائیں میں آپ کی مدد کروں۔'' اس نے خود ہی آگے بڑھ کر قرینے سے اس کی دھوتی باندھنی شروع کر دی۔ ... جھینپا ہوا سا اس کی کارگزاری دیکھتا رہا۔ شاہدہ تر و تازہ ... کھلے ہوئے گلاب کی طرح بڑے بھرپور شباب کی مالک تھی ... اس کی قربت کسی بھی مرد کو مسحور کر سکتی تھی۔ لیکن اپنی ازلی ... شرافت کے باعث شہر یار نے اسے کسی بُری نیت سے نہیں ... دیکھا۔ وہ خود ہی اپنا کام مکمل کر کے ذرا پیچھے ہٹی اور تحسین ... بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''واہ باؤ جی! اپنے ... کمالے کے بعد آپ دوجے مرد ہو جس پر میں نے یہ لباس اتنا ... جچتا ہوا دیکھا ہے۔''

شہر یار اس کے ریمارکس پر مسکرا دیا۔ دیکھا جائے تو ... اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ کمال اس کی نسبت ... ڈھلتی ہوئی شخصیت کا مالک تھا لیکن وفا شعار شاہدہ نے ... شوہر کو ہی پہلا نمبر دیا تھا... یا شاید یہ اس محبت کا کمال ... نظروں میں بھر کر وہ کمال کو دیکھتی ہوگی اور وہ اسے دنیا ... سب سے خوب رو مرد دکھائی دیتا ہوگا۔

''بڑی محبت کرتی ہو تم کمال سے؟'' اس نے انتظار ... کاٹنے کے لیے شاہدہ سے پوچھا۔

''بالکل جی! پیدا ہوتے ہی چاچا نے مجھے کمال کے ... لیے مانگ لیا تھا۔ آپ یوں سمجھو کہ کمال کا نام سن سن کر ہی ... بڑی ہوئی ہوں۔ ابھی چار ماہ پہلے ہی ہمارا ویاہ ہوا ہے۔ کمال بھی مجھ سے وڈی محبت کرتا ہے، پر چاچی کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ سمجھتی ہے میں نے اس سے اس کا پتر چھین لیا ہے۔ گھر میں ہمیں دو گھڑی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیتی۔ میں کمال کو روٹی دینے ادھر آتی ہوں تو ہم تھوڑی دیر دل کی بات کر لیتے ہیں۔ چاچی کے گوڈوں گٹوں میں اتنی دور چل کر آنے کے لیے دم ہوتا تو وہ مجھے روٹی بھی نہیں لانے دیتی۔ بس گھر بیٹھ کر ایک ایک منٹ گنتی رہتی ہے۔ ہور جو مجھے کچھ دیر زیادہ لگ جائے تو خوب منہ بھر کے گالیاں دیتی ہے، پر میں برا نہیں مانتی جی۔ میرے لیے میرے کمال کی محبت کافی ہے۔ باقی چاہے بھلے کوئی کچھ کہتا رہے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس کے پوچھنے کی دیر تھی، وہ فوراً شروع ہو گئی اور اس کے سامنے اپنی زندگی کا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا۔ باوجود پریشانی میں مبتلا ہونے کے، وہ اس کی بے ساختگی پر مسکرا دیا۔ وہ بڑی زندہ دل لڑکی تھی جس کی آواز میں زندگی کی چہکار اور سرمستی بھری ہوئی تھی۔

''آج تو تمہاری چاچی بہت ناراض ہوگی۔ میری وجہ سے تمہیں یہاں بڑی دیر لگ گئی ہے۔'' اس نے مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے چھیڑا۔

''کوئی گل نہیں جی! کسی کے کام آنا بھی نیکی ہے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اسی وقت انہیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

''لو جی کمال آگیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ میرا ابا مجھ سے وڈی محبت کرتا ہے۔ میری بیماری کا سن کر وہ فوراً اپنا تانگا دے دے گا۔'' شاہدہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی جس سے اس کی گندمی رنگت کچھ اور بھی دمکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ان دونوں نے آواز کی سمت جھانک کر دیکھا۔ وہ واقعی کمال تھا جو تانگے میں سوار اس طرف آرہا تھا۔

''چلو باؤ جی، ادھر سے نکلتے ہیں۔'' شاہدہ جوش سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں وہ گٹھڑی بھی تھام رکھی تھی جس میں اس نے باتوں کے دوران اس کا پینٹ کوٹ اور شرٹ وغیرہ تہ کر کے باندھ دیا تھا۔ گٹھڑی باندھنے کے لیے اس نے کندھے پر ڈالے جانے والے بڑے سے مردانہ رومال کو استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کمال نے تانگے کو روکا تھا۔ تانگے کے پچھلے حصے میں چادر لگا کر پردہ سا باندھ دیا گیا تھا جسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اب اس کے لیے کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل جانا مزید آسان ہو گیا تھا۔ وہ اور شاہدہ دونوں تانگے کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے اور

کمال نے تانگا آگے بڑھا دیا۔

''چاچا روٹی کھانے گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے تانگا مانگا تو تیری طبیعت کی خرابی کا سن کر خود بھی ساتھ آنے کے لیے اٹھنے لگا۔ میں نے دلاسا دیا کہ زیادہ پریشانی کی گل نہیں ہے۔ تو آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا، میں اور شاہدہ چار چھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔'' وہ تانگا بھگاتے ہوئے بلند آواز میں اپنی بیوی کو حالات سے باخبر کرنے لگا۔

''میرے خیال میں یہاں سے پکی سڑک پر پہنچنے کے لیے اتنا زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ تانگے میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔

''وہ تو آپ اپنے حساب سے سوچ رہے ہو باؤ جی! مجھے اسپتال میں لگنے والے وقت کا بھی تو حساب رکھنا تھا اس لیے اتنی دیر کا بولا ہے۔ آپ کو لاری اڈے پر چھوڑ کر ہم دونوں کہیں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور تھوڑی گپ شپ کر لیں گے۔'' شہریار نے دیکھا کہ اس کی بات پر اس کے ساتھ بیٹھی شاہدہ کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی ہے۔ یقینی طور پر کمال نے اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی تھی جس سے کچھ دیر قبل وہ اسے کھیتوں میں مستفید کر رہا تھا۔ اس نے دونوں میاں بیوی کے نجی معاملے پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''دھماکے کی آواز تمہارے گاؤں میں نہیں سنی گئی کیا؟''

''نہیں جی، گاؤں کی آبادی ذرا دور ہے اس لیے وہاں اتنی زور کی آواز نہیں گئی۔ البتہ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں نے ضرور آواز سنی ہوگی۔ میں نے کئی لوگوں کو بھاگ کر ادھر سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا اسی لیے میں آپ کو پرلی طرف سے گھما کر لے جا رہا ہوں۔ ادھر سے راستہ تھوڑا لمبا تو ضرور ہو جائے گا لیکن آپ حفاظت سے نکل جاؤ گے۔'' کمال نے اسے بتایا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ کمال! مجھے تم دونوں میاں بیوی کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہوسکا تو میں کبھی تم سے ملنے یہاں ضرور آؤں گا، ورنہ یہ تو مجھے ہمیشہ یاد ہی رہے گا کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک ہنسوں کا پیارا سا جوڑا تھا جس نے صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ اپنے وطن پر بھی ایک احسان کیا ہے۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے بولا۔

''احسان وحسان کی کوئی گل نہیں جی۔ بندہ بندے کے کام آتا ہے تو دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم آپ کے کام آئے۔ باقی آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہم سے ملنے آؤ یا نہ آؤ۔ اگر آئے تو ہمیں آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی ورنہ تو کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا تو شہریار دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آج کے دور میں اس طرح کے بے غرض لوگ تقریباً ختم ہی ہوتے جا رہے تھے لیکن بہرحال اس دنیا میں موجود تھے جب ہی اب تک دنیا سلامت تھی ورنہ شاید قیامت ہی برپا ہو چکی ہوتی۔

''میں ایک بار پھر تمہارا شکر گزار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح تم مجھے رازداری سے یہاں سے نکال رہے ہو اسی طرح آگے بھی یہ راز اپنے سینوں میں ہی رکھو گے کہ تم نے مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد دی تھی۔ اس میں تمہاری اور میری دونوں کی بھلائی ہے، ورنہ ہوسکتا ہے کہ میرے دشمن اپنی ناکامی پر جھلا کر تم دونوں کو سزا دینے کے لیے کچھ الٹا سیدھا کر گزریں۔'' اسے افسوس تھا کہ وہ اس سادہ لوح جوڑے کو ڈرا رہا ہے لیکن اپنے یہاں سے نکلنے کی بات کو راز میں رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

''ٹھیک ہے باؤ جی! آپ کو لاری اڈے چھوڑنے کے بعد ہم ایسے آپ کو بھول جائیں گے جیسے کبھی آپ سے ملے ہی نہیں تھے۔'' کمال نے اس سے فوراً ہی وعدہ کر لیا۔ جب سے اس کے اور شہریار کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے تھے، شاہدہ نے گفتگو میں قطعی دخل نہیں دیا تھا۔ خاموشی سے بیٹھی اپنی لمبی چوٹی کو ہاتھوں سے بل دیتی رہی تھی۔ باقی کا راستہ بھی چھوٹی موٹی باتوں میں گزرتا چلا گیا۔ ان باتوں سے شہریار کے علم میں ان کے سارے حالات آگئے۔ وہ غریب لوگ تھے۔ شاہدہ کا باپ تانگا چلاتا تھا جبکہ کمال، اس کا باپ اور بھائی کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کھیت ان کی ملکیت نہیں تھے اس لیے محنت کے مقابلے میں انہیں بہت کم آمدنی ہوتی تھی۔ کم آمدنی کے باوجود وہ گھر قناعت وصبر کی وجہ سے شکر گزاری سے زندگی گزار رہا تھا۔ انہیں کاتبِ تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں مست تھے۔ خصوصاً کمال، شاہدہ سے شادی کے بعد بہت خوش تھا۔ یہی حال شاہدہ کا تھا۔ اپنی گھر ذمے داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ معاوضے پر کشیدہ کاری وغیرہ کرتی تھی تاکہ شوہر کی ذمے داریوں میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔

اسے یہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگے۔ تانگے کے تھکا دینے والے سفر کو ختم کر کے وہ لوگ لاری اڈے

پہنچے تو اس کے دل پر ان دونوں کا بہت خوب صورت تاثر ثبت ہو چکا تھا۔ ''میرے لیے یہاں سے لاہور تک کا کرایہ ادا کر دو۔'' اس نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے ہی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس باہر نکالا اور اس میں سے ایک نوٹ نکال کر کمال کے حوالے کیا۔ موجودہ حالات میں اسے براہِ راست نورکوٹ واپس جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور جانے کے متعلق بھی اس نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ سوچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے کے لیے اس نے ٹکٹ منگوایا تھا۔ اس موقع پر وہ ذیشان سے مشاورت کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذیشان نے پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کرنل توحید کے بعد ان کا دوسرا نشانہ خود اس کی اپنی ذات ہوسکتی ہے۔ ماریا کی موت کے بعد وہ دونوں ہی ممکنہ ہدف تھے جو دشمن کے نشانے پر تھے اور جنہیں انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ کرنل توحید ذیشان کی بہتر حکمتِ عملی اور سیکیورٹی کی وجہ سے خود پر ہونے والے حملے سے محفوظ رہے تھے جبکہ وہ ماضی کی طرح اب بھی صرف اور صرف اپنی خوش قسمتی کے بل بوتے پر زندہ تھا اور ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ قدرت کو اس سے کچھ اہم کام لینے منظور ہیں، جب ہی اس کی زندگی کی حفاظت کا انتظام خود بخود ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

تانگے کے سفر کے دوران میں وہ مسلسل اپنے موبائل پر سگنل بھی چیک کرتا رہا تھا لیکن کہیں بھی اسے سگنلز نہیں ملے تھے۔ لاری اڈے پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر اپنا موبائل چیک کیا تو یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ کمزور ہی سہی لیکن سگنلز ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی ذیشان کا نمبر ٹرائی کیا۔ بیل کی مخصوص آواز سنائی دی پھر کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف سے ذیشان کی بہت دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''تمہارا اندیشہ درست ثابت ہوا ہے۔ مجھ پر بھرپور قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور میری گاڑی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔'' ذیشان کی آواز سنتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا لیکن جب ردِعمل میں مسلسل ذیشان کی ''ہیلو ہیلو'' ہی سنائی دی تو سمجھ گیا کہ کمزور سگنلز کی وجہ سے اس کی آواز اس تک نہیں پہنچ پا رہی۔ مایوس ہو کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ذیشان کو کچھ دیر بعد دوبارہ کال کرنے کا ٹیکسٹ میسیج کر دیا۔ اس دوران میں کمال اس کے لیے ٹکٹ لے آیا تھا اور اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ دس منٹ بعد لاری وہاں سے روانہ ہوجائے گی۔ اس نے ٹکٹ شہریار کے حوالے کرنے کے ساتھ باقی ماندہ رقم بھی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

''رہنے دو یار! یہ تم رکھ لو بلکہ یہ کچھ رقم اور بھی ہے میرے پاس۔ یہ بھی تم لے لو۔'' اس نے انکار کرتے ہوئے اپنا پرس نکالنا چاہا۔

''معاف کرنا باؤ جی! ہم کوئی اسٹیشن پر مزدوری کرنے والے قلی نہیں ہیں جو صاحب لوگوں سے بخشش لے کر خوش ہوں۔ آپ کو ہم نے اپنا پروہنا سمجھا تھا اور پروہنے کی ہم خدمت کرتے ہیں، ان سے کچھ لیتے نہیں۔'' کمال اس کی بات کا اچھا خاصا بُرا مان گیا تو اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا اور اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر اس غریب لیکن خوددار دیہاتی سے باقی رقم واپس لے لی۔ اگر غربت کے باوجود اس کی خودداری سلامت تھی تو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اسے اس نعمت سے محروم کرے۔

''آپ ٹھہرو، میں ذرا گنے کے رس والے سے تین گلاس پکڑ لاؤں۔ حلق خشک ہو گیا ہے، رس پی کر ذرا سکون ملے گا۔'' کمال نے بھی اس کے رقم واپس لینے کو کافی جانا اور فوراً ہی بولتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ شہریار ابھی تک تانگے کی پچھلی نشست پر ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاہدہ بھی موجود تھی۔

''اچھا کیا کہ آپ نے روپے واپس لے لیے۔ ویسے تو کمال وڈا چنگا بندہ ہے لیکن کسی گل وچ مزاج بگڑ جائے تو فیر کسی کے قابو میں نہیں آتا۔'' کمال کے جاتے ہی شاہدہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اگر تم مناسب سمجھو تو میں روپے تمہیں دے دیتا ہوں۔ بہت زیادہ نہیں ہیں پھر بھی تم لوگوں کے کام آسکتے ہیں۔'' اس نے شاہدہ کو پیشکش کی۔

''توبہ کریں جی۔ میں کوئی ایسی زنانی تھوڑی ہوں جو اپنے شوہر کے پیٹھ پیچھے غیر مردوں سے روپے لیتی پھروں۔'' اس نے باقاعدہ اپنے کال پیٹ ڈالے اور تھوڑی ناراض نظر آنے لگی۔ اس دوران کمال گنے کے رس سے لبالب بھرے کنگ سائز کے گلاس لے کر واپس آچکا تھا اس لیے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے کمال کا بڑھایا ہوا گلاس تھام لیا۔ کھانے پینے کے معاملے میں بے حد کا حساس ہونے کے باوجود وہ اس کے خلوص کی وجہ سے کسی صورت انکار نہیں کر سکا تھا ورنہ یوں راہ چلتے ایسی کسی جگہ سے کچھ لے کر کھانا یا پینا اس کی فطرت وتربیت دونوں ہی کے سخت خلاف تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ گنے کا رس سچ مچ بہت مزے دار تھا یا اسے پیاس ہی شدید لگ رہی تھی کہ وہ تین چار منٹ میں پورا گلاس خالی کر گیا۔ کمال نے اس سے بھی زیادہ پھرتی

کا مظاہرہ کیا تھا البتہ ناراض سی شاہدہ کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اس نے بھی اپنا گلاس خالی کرلیا تو کمال پھرتی سے گلاس سمیٹ کر واپس کر آیا۔ اب گاڑی روانہ ہونے کا بھی وقت ہو گیا تھا اس لیے کمال نے اسے تانگے سے اترنے کو کہا اور شاہدہ کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

"اپنی بیوی کی ہمیشہ بہت قدر کرنا کمال۔ اس جیسی مخلص اور نیک عورت تمہیں دوسری نہیں مل سکتی۔ مجھے جب بھی موقع ملا، میں اپنی اس چھوٹی بہن کا حال معلوم کرنے ضرور تمہارے پنڈ کا چکر لگاؤں گا۔" تانگے سے اترنے سے قبل اس نے کمال سے کہا اور شاہدہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے الفاظ و انداز نے شاہدہ کی ناراضی دور کردی اور اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

"اللہ کی امان میں جاؤ بھرا۔ تمہاری بہن تمہارے لیے دعا کرتی رہے گی۔" اس نے اسے دعاؤں سے نوازتے ہوئے رخصت کیا۔ گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو بھی اس کا ذہن اپنی زندگی میں آنے والے ان دو کرداروں میں الجھا ہوا تھا جنہیں مشکل گھڑیوں میں اس کا مددگار بنا کر بھیجا گیا تھا۔ بہت معمولی حیثیت رکھنے والے ان دو کرداروں نے اسے باور کروایا تھا کہ را اور موساد جیسے طاقتور ادارے کتنی ہی کوشش کرلیں، اللہ کو جب تک اس کی زندگی منظور ہے وہ اسی طرح اس کی مدد کرتا رہے گا۔ وہ بھی ان لوگوں کے ذریعے جن کی اتنی بڑی قوتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کیونکہ کوئی انسان بظاہر کتنا بھی قوی نظر آئے، اس ہستی کے سامنے ہرگز نہیں ٹھہر سکتا جو طاقت و قوت کا اصل سرچشمہ ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں عزت، ذلت، موت، زندگی سمیت ہر ہر شے موجود ہے۔

☆☆☆

قیمتی فرنیچر اور نازک آرائشی اشیا کی نہایت توجہ سے جھاڑ پونچھ کرتی شہزادی کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے بے آواز قدموں سے اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھا دی۔ وہ کرسٹل کے ایک نازک سے گل دان کو اچھی طرح چمکانے کے بعد تپائی پر رکھنے کے لیے پلٹی تو اس درشت چہرے والے مرد کو دیکھ کر بری طرح چونک گئی اور... گل دان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ سامنے موجود شخص اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ کئی بار اسے بالے کے ساتھ دیکھ چکی تھی جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ چودھری کا ہی نمک خوار ہے اور چودھری کے کسی نمک خوار کی فاریسٹ آفیسر کے بنگلے میں موجودگی خاصی معنی خیز تھی۔ شہریار نے اس کے ذمے کام بھی یہی لگایا تھا کہ وہ کسی طرح چودھری اور فاریسٹ آفیسر کے گٹھ جوڑ کی وجہ کا کھوج لگا کر بتائے۔ خوش قسمتی سے اس کی درخواست پر منشی اللہ رکھا نے اسے نوکری دلائی بھی تو فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر... ورنہ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے حویلی میں کوئی کام مل جائے گا اور اسے وہاں رہ کر شہریار کی سونپی گئی ذمے داری اٹھانی پڑے گی. لیکن بنگلے پر کام ملنے سے جہاں اس کی راہیں آسان ہوگئی تھیں، وہیں یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ بظاہر چودھری سے الگ نظر آنے والے عابد انصاری کے حویلی والوں سے خصوصی مراسم ہیں ورنہ منشی اللہ رکھا اتنی آسانی سے اسے یہاں کیونکر ملازمت دلا پاتا۔ چودھری کے ایک نمک خوار کی یہاں موجودگی نے اس تعلقِ خصوصی کو مزید ثابت کر دیا تھا لیکن فی الحال وہ ان معاملات پر نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت تو ایک عورت کی حیثیت سے بند کمرے میں کسی آدمی کے ساتھ موجودگی نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا اور وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

"جی لگ گیا تیرا یہاں؟ کام زیادہ مشکل تو نہیں ہے؟" اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے وہ لطف اندوز ہونے والے انداز میں مسکرایا تو اس کا کریہہ چہرہ کچھ اور بھی کریہہ لگنے لگا۔

"جی سب ٹھیک ہے، کام بھی صحیح ہے۔" اس عجیب سی گھٹن محسوس ہونے کے باوجود شہزادی نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا کہ اس قسم کے سوال جواب کو با اختیار بندہ ہی کرسکتا تھا۔

"میرا نام بہرام ہے۔ میں یہاں کا سپروائزر ہوں۔ تو نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ادھر کام کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن میں نے منشی جی کے کہنے پر صاحب سے تیری خاص سفارش کر کے تجھے ادھر رکھوایا ہے... اور میں جب چاہوں تجھے یہاں سے نکلوا بھی سکتا ہوں اس لیے ذرا ہوشیار رہنا، مجھے تجھ پر غصہ نہ آئے۔" وہ گویا اسے دھمکا رہا تھا۔

"چنگا جی۔" اس نے مختصر جواب دے کر اپنی جان چھڑانا مناسب سمجھا پھر اجازت طلب کرنے والے انداز میں بولی۔ "میں ادھر باورچی خانے میں جا کر خانساماں پوچھتی ہوں کہ اسے کوئی کام تو نہیں کروانا۔"

"ادھر کا کام بعد میں دیکھ لینا، پہلے یہ پھیلاوا سمیٹ۔ ملوم ہے تُو نے کتنا قیمتی گل دان توڑ ڈالا ہے؟ سارا بھر بھی تیری تنخواہ سے کٹوتی کرواؤں تو قیمت ادا نہیں ہوگی پر جانے دے، تیری خاطر میں صاحب سے شکایت نہیں

کروں گا۔" وہ اطمینان سے ایک صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

"شکریہ جی۔" شہزادی نے اس کا احسان تسلیم کرتے ہوئے نیچے بیٹھ کر ٹوٹ جانے والے گل دان کی کرچیاں سمیٹنی شروع کر دیں۔

"تیرا حال دیکھ کر و ڈا جی کڑھتا ہے۔ بالے سے تیرا ویاہ ہوا تھا جب تُو کتنی سوہنی کڑی تھی لیکن بدبخت نے تیرا سارا حسن ہی برباد کر ڈالا۔ میں نے پہلی واری تجھے دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ہور سچ بولوں تو اگر بالے کی جگہ تُو مجھے ملی ہوتی تو میں تجھے سچ مچ کی شہزادی بنا کر رکھتا۔ خیر، اب تو مجھے موقع مل گیا ہے۔ تُو یہاں آرام سے رہ۔ چنگی طرح کھا پی۔ کام کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا بہت بھی کرلے گی تو کافی ہوگا۔ میں نے سب کو سمجھا دیا ہے کہ تیرے ساتھ کوئی زور زبردستی نہ کریں۔ تُو دیکھنا، یہاں کے آرام اور کھلائی پلائی سے تیرا حسن چند دن میں ہی دوبارہ واپس آجائے گا۔" بظاہر تو وہ اس سے بڑی نرمی سے بات کر رہا تھا لیکن ایک عورت کی جبلت اسے بتا رہی تھی کہ یہاں اس کی عزت خطرے میں ہے اور بہرام شاید قربانی کے بکرے کی طرح اسے کھلا پلا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ موقع ملتے ہی وہ اسے ذبح کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ کسی عورت کے لیے اپنی عزت کا گوہر کھو دینا ذبح ہونے کے برابر ہی ہوتا ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

"آپ کا شکریہ جی، پر میں نے نوکری کی ہے تو حلال کر کے ہی کھاؤں گی۔ بڑے صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔" اس نے ایک ہی جملے میں واضح کر دیا کہ اس کے لیے بہرام کی پیشکش میں کوئی کشش نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ خود کو بہرام کی نہیں بلکہ فاریسٹ آفیسر کی ملازمہ سمجھتی ہے۔

"ادھر تھوڑے دن رہے گی تو حلال حرام سب بھول جائے گی۔ یہ فاریسٹ آفیسر صاحب کا بنگلا ہے اور وہ ادھر جنگل کا قانون ہی چلاتے ہیں۔ جنگل کا قانون تو تجھے ملوم ہی ہوگا۔ جس میں دم ہوتا ہے، وہ اپنے سے کمزور کو شکار کر کے کھا جاتا ہے۔" وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کھڑا ہوا اور اس کے عین سامنے آ کر رک گیا۔

"ساری فکریں دکریں چھوڑ دے۔ موج سے رہ۔ بے فکری سے رہے گی تو پھر سے پہلے والی گلاب سی شہزادی بن جائے گی۔ ہور مجھے اسی وقت کا انتظار ہے۔" اس کی کلائی پکڑ کر اسے جھٹکے سے اپنے قریب کرتے ہوئے اس نے کہا اور پھر اس کے ہونٹوں کو اپنی کھردری انگلیوں سے چھوتے ہوئے گویا افسوس کا اظہار کیا۔

"کم بخت نے تیرا سارا رس ہی چوس لیا ہے، پر کوئی گل نہیں، ادھر رہے گی تو تھوڑے دن میں فیر دوبارہ نکھر جائے گی۔" اس بار وہ اپنی بات کہہ کر وہاں مزید رکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہزادی اپنی جگہ سن سی کھڑی رہ گئی۔ بہرام کے الفاظ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن ظاہر ہے بالے کو چودھری کے نزدیک جو مقام حاصل تھا، اس کے باعث وہ کبھی اپنی بدنیتی کو ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اب بالے کی موت اور اسے یہاں ملازمت دلانے کے بعد وہ اسے اپنے لیے تر نوالہ سمجھ رہا تھا اس لیے فوری طور پر جھپٹ پڑنے کے بجائے انتظار کے لیے بھی راضی تھا۔ وہ خوف زدہ سی سمیٹی ہوئی کرچیاں ہاتھ میں لیے کمرے سے باہر نکل آئی۔ کرچیاں کچرے کے ڈبے میں ڈالنے کے بعد اس نے سیدھا اس کمرے کا رخ کیا جو بنگلے کی مرکزی عمارت سے ذرا ہٹ کر اسے رہائش کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اس بچے کے لیے اس نے خصوصی اجازت حاصل کی تھی جبکہ باقی بچے اپنی دادی کے ساتھ گاؤں میں ہی رہ رہے تھے۔ بچے کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگی۔ شہریار نے اسے جو کام سونپا تھا، وہ ابتدا میں ہی اس کے لیے خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ بس اطمینان تھا تو اتنا کہ بہرام فوری طور پر اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ چاہتی تو اپنی کارکردگی کی رفتار تیز رکھتے ہوئے جلد اصل مقصد حاصل کرسکتی تھی۔ مقصد کے حصول کے بعد اسے مزید یہاں رکنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جب چاہتی، آرام سے نوکری چھوڑ جاتی کیونکہ مالی مسائل حل کرنے کا تو شہریار نے وعدہ کر ہی رکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسے سی ایک ایمان دار آدمی ہے جو اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

اپنے حالات کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد اس نے فی الحال پریشان کن سوچوں کو جھٹک دیا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگی۔

☆☆☆

"خوش آمدید... خوش آمدید۔ تمہیں اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ کر جو دلی خوشی ہو رہی ہے اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔" وہ ذیشان کے دفتر میں داخل ہوا تو اس

نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا والہانہ استقبال کیا اور پھر مزید پیش رفت کرتے ہوئے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کا یہ انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ شہریار کو اپنا دل گداز ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والدین کی وفات کے بعد ماموں، ممانی نے پرورش کی اور سجاد رانا کزن سے بڑھ کر بڑے بھائی کی حیثیت سے محبت و شفقت سے نوازتے رہے۔ سجاد رانا کی موت کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا تھا لیکن آج ذیشان کی بے ساختگی دیکھ کر اسے بالکل ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کا سگا بھائی ہو... جسے اپنے بھائی کے کسی مصیبت سے صحیح سلامت بچ نکلنے کی اتنی بے تحاشا خوشی تھی کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

شاہدہ اور کمال کی معاونت سے ان کے گاؤں سے نکلنے کے بعد اس نے راستے میں ایک بار پھر ذیشان سے رابطہ کیا تھا اور اس نے اسے سیدھا لاہور آنے کے بجائے فیصل آباد چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ فیصل آباد کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لیے بازار سے ایک سلا سلایا شلوار قمیص کا جوڑا خریدا اور خود کو دھوتی کرتے سے نجات دلائی۔ عادی نہ ہونے کے سبب وہ لباس اس کے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاہدہ نے اسے یہ لباس فراہم کر کے اس پر بڑا احسان کیا تھا اور وہ دیہاتی ماحول میں اپنے پینٹ کوٹ کی وجہ سے نمایاں ہونے سے بچ کر آسانی سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کمال کا دھوتی کرتا اس نے احتیاط سے تہ کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا تاکہ اگر کبھی اس کے گاؤں جانے کا موقع ملے تو اس کی امانت واپس کر دے۔ فیصل آباد کے ہوٹل میں اسے زیادہ دیر قیام نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ذیشان کو اپنے پتے ٹھکانے سے آگاہ کر دیا تھا اور ذیشان نے فوراً ہی کچھ ایسا بندوبست کر دیا تھا کہ ایک آرام دہ گاڑی ڈرائیور سمیت اسے لینے کے لیے پہنچ گئی تھی اور اسی گاڑی کی مدد سے وہ لاہور میں واقع سی ایف پی کے دفتر پہنچ گیا تھا جہاں ذیشان کھلی بانہوں سے اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔

"تمہارے خلوص کا شکریہ یار! موت اور زندگی کی یہ آنکھ مچولی تو ہمارے ساتھ چلتی ہی رہتی ہے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے، موت کو اسی طرح شکست ہوتی رہے گی ورنہ وقت پورا ہو گیا تو پھر کوئی بھی معمولی سا سبب موت کا بہانہ بن جائے گا۔" اس نے ذیشان سے علیحدہ ہو کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی اپنے جذبات پر قابو پا کر مسکرا دیا اور بولا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگیاں ذرا زیادہ قیمتی محسوس ہوتی ہیں۔ کرنل توحید اور تمہارا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں ہی پے در پے ہونے والے حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہو اور یقیناً دشمن اس وقت اپنی ناکامیوں پر اپنے سر کے بال نوچ رہا ہوگا۔"

"دشمن کی ناکامی کی خوشی اپنی جگہ لیکن ہمارے لیے اصل لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ ہمارا دشمن اتنا مضبوط ہے کہ ہمارے گھر میں ہی گھس کر ہم پر حملے کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ کسی خاص فرد کا خوش قسمتی سے بچ نکلنا باعثِ خوشی سہی لیکن قوم کی تقدیر پر تو سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ ہم کب، کہاں اور کس نوعیت کا نقصان اٹھا بیٹھیں، ہمیں معلوم ہی نہیں ہے جبکہ دشمن یقیناً مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ میدان میں اترا ہوا ہے۔" اس نے نہایت تفکر سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد بھی ماضی کی طرح ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آسکا ہے حالانکہ میں فوری طور پر حرکت میں آ گیا تھا اور خوش قسمتی سے ہم نے تمہارے ڈرائیور کو بھی گرفتار کر لیا ہے لیکن حسب معمول وہ صرف کرائے کا آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس سے تفتیش کے نتیجے میں ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق کسی اجنبی نے اس سے ملاقات کر کے ایک بڑی رقم کے عوض اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اسے ایک پیکٹ دیا گیا تھا کہ جب بھی مشابرم خان کی غیر موجودگی کے باعث وہ تمہاری گاڑی ڈرائیو کرے تو یہ پیکٹ گاڑی کی ڈکی میں رکھ دے اور پھر موقع دیکھ کر کسی مناسب جگہ پر گاڑی روک کر خود دور جا کر ریموٹ کنٹرول کی مدد سے بم بلاسٹ کر دے۔ ہم نے اس سے ریموٹ کنٹرول برآمد کر لیا ہے اور ساتھ ہی ہمارے آدمیوں نے موقع کا جائزہ بھی لیا ہے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ تمہاری گاڑی کے پرخچے اڑ گئے ہیں اور زمین پر کئی فٹ گہرا گڑھا بن گیا ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر تم گاڑی میں موجود ہوتے تو تمہارا کیا حشر ہوتا۔ میرے خیال میں تو ہمارے لیے تمہارے سارے ٹکڑوں کو یکجا کرنا بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔" ذیشان نے اس کے سامنے صورتِ حال واضح کی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ قائم کر چکا تھا۔ البتہ اس وقت اسے ذیشان کی ٹیم کی کارکردگی نے خوش کیا تھا کہ ایک طرف انہوں نے اسے سہولت سے فیصل آباد سے لاہور پہنچا دیا تھا تو دوسری طرف جائے وقوعہ پر بھی کام کرتے رہے تھے۔

"چلو، یہ اچھا ہوا کہ میں نے بم کے ساتھ پھٹنے سے بچ کر تمہیں زحمت سے بچا لیا ورنہ واقعی اس وقت تم میرے ٹکڑے جمع کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہوتے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مذاق کیا۔

"بکواس مت کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اگر سچ مچ ایسی نوبت آجاتی تو مجھ پر کیا گزرتی۔" ذیشان نے اسے تنبیہہ کی اور پھر فوراً ہی دستک کی آواز کے ساتھ کمرے میں آنے والے ملازم کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے حکم پر ہی چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے لیے وہاں پہنچا تھا۔ ملازم چائے تیار کر کے ان کے سامنے پیالیاں رکھ کر واپس چلا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

"میں نے کرنل توحید کو بھی اس واقعے کی رپورٹ دے دی تھی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم جیسے ہی پہنچو، انہیں اطلاع دی جائے۔ وہ خود تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہاری گاڑی دفتر کے سامنے پہنچتے ہی انہیں اطلاع کر دی تھی اور انہوں نے جو وقت دیا تھا، اس کے مطابق وہ ٹھیک دس منٹ بعد یہاں موجود ہوں گے۔ اس دوران میں تم چائے وغیرہ پی کر فارغ ہو جاؤ تاکہ ان سے اطمینان سے ملاقات کر سکو۔"

ذیشان کی دی ہوئی اطلاع اس کے لیے اہم تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس پر شدید قاتلانہ حملہ ہوا تھا لیکن وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کرنل توحید اس سے بنفسِ نفیس ملاقات کے لیے کیوں تشریف لا رہے ہیں۔ فی الحال وہ ذیشان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چائے اور اسنیکس سے مستفید ہونے لگا۔ لاری اڈے پر کمال کے پلائے ہوئے گنے کے رس کے بعد کھانے پینے کی کوئی شے اس کے حلق سے نیچے نہیں اتری تھی۔ وہ اتنی بُری طرح الجھ گیا تھا کہ کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ پھر یوں بھی اسے فیصل آباد کے ہوٹل میں کچھ دیر کے قیام کے سوا کہیں سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا ہی کب تھا۔ زیادہ تر وقت تو سفر میں ہی گزر گیا تھا چنانچہ اس وقت جو کچھ سامنے تھا، اس سے فیض یاب ہونا مناسب تھا۔ دس منٹ کا دورانیہ کھانے پینے اور ذیشان سے گفتگو کرنے میں تیزی سے گزر گیا۔ ذیشان کو خود بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کرنل توحید اس سے کس مقصد کے تحت ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود اپنی جگہ شدید تجسس کا شکار تھا۔

دسواں منٹ گزرتے ہی کرنل توحید وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بلیک ٹراؤزر پر سرمئی اور نیلی دھاریوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور شہریار اپنے دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ اگر وہ بلتستان میں اسے فل فوجی یونیفارم میں بہت باوقار لگے تھے تو اس رف سے حلیے میں بھی شاندار ... لگ رہے تھے۔ یقینی طور پر وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر جچنے لگتا ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ جو لباس پہن لیں، اس لباس کی شان بڑھ جاتی ہے۔ ان دونوں نے اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور ذیشان نے فی الفور اپنی نشست ان کے لیے خالی کر دی۔

"اوہو، تو یہاں چائے کا دور چل رہا تھا... بہت خوب۔" انہوں نے نشست پر براجمان ہوتے ہوئے ایک نظر میز پر ڈالی اور بے تکلفی سے بولے۔ سی ایف پی کے اس دفتر آتے ہوئے وہ صرف اپنی فوجی یونیفارم ہی نہیں چھوڑ کر آئے تھے بلکہ لہجے کا وہ کلف بھی غائب تھا جو ایک فوجی افسر کی شان کا اظہار کرتا ہے۔

"جی سر! اصل میں شہریار کافی لمبا سفر کر کے آیا تھا تو میں نے اسے ریفریش کرنے کے لیے یہ بندوبست کروا دیا۔ آپ پسند کریں تو میں آپ کے لیے چائے منگوا لوں۔" ذیشان نے انہیں جواب دیتے ہوئے فوراً پیشکش کی۔

"نہیں بھئی۔ میرا اس وقت چائے کا موڈ نہیں ہے۔ میرے لیے تم لائم جوس منگوا دو۔" انہوں نے اسی بے تکلفی سے جواب دیا جسے سن کر ذیشان فوراً ہی انٹرکام پر مصروف ہو گیا۔

"اور ینگ مین! تم سناؤ... کیسا لگ رہا ہے ایک اور قاتلانہ حملے سے بچ نکلنا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے براہِ راست شہریار سے سوال کیا۔

"تھوڑی سی الجھن کا شکار ہوں۔ میری فیملی یہ خبر سن کر بُری طرح ڈسٹرب ہو گئی ہو گی۔ دفتر میں بھی ہلچل مچی ہوئی ہو گی لیکن میں نے ذیشان کی ہدایت پر اب تک کسی سے رابطہ کر کے تسلی نہیں دی ہے اور اپنا موبائل فون بھی آف کر دیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ ضروری تھا۔ دشمنوں کو اس الجھن میں رہنے دو کہ تم کہاں ہو اور خود فی الحال یہاں آرام سے رہو۔ رہی تمہاری فیملی کی بات تو انہیں اطمینان دلا دیا جائے گا۔ دفتر کے عملے کو مطمئن کرنا اتنا ضروری نہیں ہے۔" انہوں نے دوٹوک لہجے میں اسے جواب دیا۔

"اوکے... ایز یو وش۔" شہریار نے شانے اچکا کر بے فکری کا اظہار کیا اور مؤدبانہ بولا۔ "میرے لیے مزید کیا حکم ہے؟"

جواب میں کرنل توحید اسے بغور دیکھنے لگے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اندر تک کھنگال لینا چاہتے ہوں۔

اپنے اس جائزے سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر اچانک ہی بولے۔ "تمہارے لیے اے سی شہریار عادل کی کتنی اہمیت ہے؟"

سوال عجیب تھا اور وہ اس سوال کا مقصد بھی نہیں سمجھ سکا تھا لہٰذا الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہر انسان کے لیے اس کی شخصیت اہم ہوتی ہے کیونکہ وہ اسی حوالے سے پہچانا اور شناخت کیا جاتا ہے۔ میرے والدین نے میرا نام شہریار عادل رکھا تھا اس لیے مجھے یہ نام دل و جان سے عزیز ہے۔ رہی اے سی کے عہدے کی بات تو یہ عہدہ میں نے رعب داب یا افسری کی چاہ میں حاصل نہیں کیا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر صورت کوشاں رہوں گا۔ اب چاہے میں ترقی پا کر اے سی سے ڈی سی بن جاؤں یا اس عہدے سے محروم ہو کر کوئی نچلے درجے کا کام کرنے لگوں... میرا مقصد کسی صورت تبدیل نہیں ہو گا۔"

"مجھے تم سے اسی جواب کی امید تھی اور اس جواب کو ذہن میں رکھ کر میں تمہارے سامنے دو تجاویز لے کر آیا ہوں۔" کرنل توحید اپنی نشست پر کچھ اور اطمینان سے بیٹھ گئے لیکن شہریار مسلسل ان کی نظروں کے حصار میں تھا۔ اسی وقت ملازم دستک دے کر اندر آیا اور ان کا فرمائش کردہ لائم جوس کا گلاس ان کے سامنے لا کر رکھا۔ ملازم کی واپسی تک کمرے میں خاموشی رہی پھر شہریار نے اس خاموشی کو توڑا۔

"آپ نے مجھے بے حد تجسس میں مبتلا کر دیا ہے سر۔"

جواباً کرنل توحید دھیرے سے مسکرائے اور پھر بولے۔ "بات یہ ہے ینگ مین کہ تمہاری کارگزاریاں دیکھتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ تم بیوروکریسی کے گورکھ دھندے کو چھوڑو اور ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ لیکن اس کے لیے تمہیں شہریار عادل کی شناخت سے محروم ہونا پڑے گا کیونکہ تم پیچھے جو کچھ کر چکے ہو، اس کے نتیجے میں دشمنوں کے براہِ راست نشانے پر ہو۔ شخصیت کی تبدیلی سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تم ان کے سامنے سے غائب ہو جاؤ گے اور دوسرے کھل کر ملک کی سلامتی کے لیے کام کر سکو گے۔ تمہارے جذبے کو دیکھتے ہوئے مجھے اتنا تو یقین ہے کہ تم ہم میں شامل ہونے سے انکار نہیں کرو گے اسی لیے میں نے دو تجاویز کا ذکر کیا ہے۔" وہ ایک بار پھر اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں سر۔" اس نے ایک طرح سے ان کے یقین کو پختگی بخشی۔

"ایک تجویز تو یہ ہے کہ تم حالیہ واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منظر سے غائب ہو جاؤ اور دشمن کو اس الجھن میں رہنے دو کہ تم کہاں گئے؟ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم خود کو منظر پر لا کر یہ بیان دو کہ کچھ نامعلوم افراد کی طرف سے تم پر مسلسل قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے تمہیں اپنی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ تمہارا یہ بیان ریکارڈ پر آجانے کے بعد ہم تم پر ایک جعلی قاتلانہ حملہ کروائیں گے اور اس کے بعد یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ ہم تمہیں مردہ ظاہر کر دیں یا یہ اعلان کر دیں کہ حملے میں تمہیں کچھ ایسے کاری زخم آئے ہیں جن کے باعث تم کومے میں چلے گئے ہو۔ تمہارے نام پر کوئی بھی مریض اسپتال میں زیرِ علاج رہے گا اور تم اپنا کام کرتے رہو گے۔ یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنے میں تمہیں یہ ایڈوانٹیج حاصل ہو گا کہ تم جب بھی منظر پر آنا چاہو گے، تمہارے ہوش میں آنے اور تندرست ہونے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولتے جا رہے تھے اور شہریار ان کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا ذہن بھی حساب کتاب کرنے میں لگا ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی موجودہ پوزیشن میں وہ دشمنوں کے لیے ایک کھلا نشانہ بنا ہوا تھا اور اس کے لیے آنے والے دنوں میں آزادی سے کام کرنا مزید دوبھر ہو جاتا۔ اس لیے اگر وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا تو سی ایف پی میں شمولیت کی پیشکش بے حد پُرکشش تھی، صرف اسے طریقۂ کار کا انتخاب کرنا تھا۔ پہلی صورت میں اس کے دشمن کسی طور چین سے نہیں بیٹھتے اور مسلسل اس تگ و دو میں لگے رہتے کہ اگر وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر جلنے سے بچ گیا ہے تو کہاں ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کے پیچھے اس کا وجود تلاشنے کی کوشش کرتے۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس طریقے کو استعمال کر کے دشمن کو ہر لمحہ اپنی کھوج میں لگائے رکھنے سے گریز کرے۔ دوسرا طریقہ منظر پر آ کر دوبارہ کسی حادثے میں مرنے یا کومے میں چلے جانے کا ڈراما کرنا تھا۔ فطری طور پر اسے مرنے والی بات پسند نہیں آئی کیونکہ اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہریار عادل کو کھو بیٹھتا۔ البتہ کومے میں چلے جانے کا ڈراما کرنے کی صورت میں اس کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ کسی ایسے موقع پر جب اسے محسوس ہوتا کہ سی ایف پی کو اس کی ضرورت نہیں رہی، یا وہ اب مزید ان کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں رہا، اپنی اصل حیثیت سے منظر پر آسکتا تھا۔

"مجھے آپ کی سب سے آخری تجویز منظور ہے۔" اس

نے بہت تیزی سے اپنا تجزیہ مکمل کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کے فیصلے کو سن کر کرنل توحید کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جاگی جبکہ ذیشان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"مجھے یقین ہے کہ سی ایف پی میں تمہارا اضافہ بڑا خوش آئند ثابت ہوگا اور ہم مل کر دشمن کے دانت کھٹے کردیں گے۔" ذیشان نے بے ساختہ ہی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"تمہاری خوش امیدی واقعی سچ ثابت ہوئی تو میں اسے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھوں گا لیکن بہرحال ہمارا دشمن بھی کم نہیں ہے۔ چالاکی اور عیاری کے ساتھ ساتھ اسے ٹیکنالوجی میں بھی ہم پر فوقیت حاصل ہے۔ خصوصاً موساد کے بارے میں تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ وہ ہمارے لیے کتنا سخت حریف ثابت ہوگا۔" وہ بہت سنجیدہ تھا چنانچہ ذیشان کی بات کا جواب دے کر ایک بار پھر کرنل صاحب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"میرے خیال میں آپ میرے گھریلو حالات سے واقف ہوں گے۔ سجاد بھائی اور ان کی بیٹی شمینا کی ڈیتھ کے بعد ماموں اور ممانی میں اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ وہ کوئی اور صدمہ برداشت کرسکیں۔ ان کی زندگی کا محور و مرکز میری ذات ہی ہے۔ میری زندگی میں ایک بڑا حادثہ ماریا کی صورت میں گزر چکا ہے جس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوں گے۔ ایسے میں اگر کوئی ڈراما پلے کرنے سے پہلے انہیں قبل ازوقت مطلع نہیں کیا گیا تو خدانخواستہ صدمے سے خود انہیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے تمام تر رازداری کے باوجود ہمیں انہیں لازماً شریکِ راز کرنا ہوگا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ رانا صاحب اور ان کی مسز کو میں پرسنل جانتا ہوں۔ رانا صاحب کا شمار گنتی کے ان چند سیاست دانوں میں ہوتا ہے جو خوش قسمتی سے محبِ وطن ہیں اور میں ان سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ اس اہم ملکی راز کو راز ہی رکھیں گے لیکن ساتھ ہی میرے کچھ تحفظات بھی ہیں۔ نمبر ایک یہ کہ تم انہیں سی ایف پی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے اور دوسرے یہ کہ تمہیں آپس میں آزادانہ رابطے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ہم رانا صاحب کی فیملی کی خیر خبر رکھیں گے اور موقع اور وقت کی مناسبت سے تمہاری آپس میں بات چیت یا ملاقات کا بندوبست کروادیں گے۔" کرنل توحید بھی اب ہلکے پھلکے موڈ کو بھول کر پوری سنجیدگی اختیار کرچکے تھے اور اسے شرائط و ضوابط سے آگاہ کررہے تھے۔ یہ شرائط سخت ہونے کے باوجود غلط اس لیے نہیں تھیں کہ ایک اہم قومی ادارے کا تحفظ اسی میں تھا۔ شہریار نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور ہامی بھرلی۔

"مجھے منظور ہے لیکن ساتھ ہی میں ایک دوسرا مسئلہ بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ بطور اے سی میں نے اپنے علاقے کے کئی دیہاتوں میں ترقیاتی پروجیکٹس شروع کر رکھے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحبِ حیثیت شخص نے اپنی ساری پراپرٹی مرنے سے قبل میرے اختیار میں دے دی تھی اس لیے مجھے اپنے منصوبوں پر کام کرنے کے لیے حکومتی فنڈ کے علاوہ بھی کافی سہولت حاصل تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد یہ سارے منصوبے کھٹائی میں پڑ جائیں اس لیے آپ کو یہ بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ میری جگہ جو دوسرا شخص تعینات ہو، وہ اتنا مخلص ضرور ہو کہ ان منصوبوں کو جاری رکھ سکے۔ نیز آپ کو وقتاً فوقتاً اس کی کارکردگی کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ کام بھی ہوجائے گا... اور کچھ؟" انہوں نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"نہیں بس اتنا ہی۔ آگے میں آپ کے حوالے ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"اعتماد کے لیے شکریہ۔ اب سب سے پہلے تو تمہیں یہ کرنا ہے کہ میڈیا والوں سے رابطہ کرو اور اپنے زندہ ہونے کا اعلان کردو کیونکہ تمہاری گاڑی کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر میڈیا پر آچکی ہے اور ہر چینل تمہاری پُراسرار گمشدگی کے بارے میں اپنی اپنی قیاس آرائیاں کررہا ہے۔ تم سامنے آکر حقائق بیان کردو گے تو سب اپنی اپنی بولیاں بند کردیں گے۔ اس دوران میں ہمارے سادہ پوش آدمی تمہاری حفاظت کرتے رہیں گے۔ اس مرحلے کے بہ خیر و خوبی طے ہوجانے کے بعد اس ایکسیڈنٹ کا بندوبست کیا جائے گا جس میں تمہارا انتہائی خراب حالت میں ہاسپٹل پہنچنا شو کیا جاسکے۔ پھر دو ایک روز میں تمہارے کومے میں چلے جانے کا اعلان کردیا جائے۔ اس دوران میں تم بالکل انڈر گراؤنڈ رہو گے اور پلاسٹک سرجری اور کاسمیٹک سرجری کے ذریعے تمہارے حلیے میں اتنی تبدیلی کردی جائے گی کہ خود تمہارے قریبی لوگوں کے لیے تمہیں پہچاننا آسان نہیں ہوگا۔" اس کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی کرنل توحید نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کردیا۔

"آپ کی باتوں سے تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ مجھے کسی خصوصی مشن پر بھیجنے کی تیاری کررہے ہیں۔" وہ ذہین تھا اس لیے یہ تو کسی صورت تسلیم نہیں کرسکتا تھا کہ صرف اس کی جان کی حفاظت کے لیے اتنا کھٹ راگ پھیلایا جارہا ہے۔ اس لیے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو زبان پر لے آیا۔ اس

بات کو سن کر کرنل توحید نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"کسی حد تک تمہارا اندازہ درست ہے لیکن فوری طور پر میں تمہیں کہیں بھیجنے کا نہیں سوچ رہا ہوں۔ بس ذہن میں ایک اندیشہ سا ہے کہ جس طرح کے حالات پیش آرہے ہیں اور ان کے پیچھے را اور موساد جیسی ایجنسیاں موجود ہیں، آنے والے وقت میں ہمیں اور بھی سخت امتحانوں سے گزرنا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ پہلے سے اپنے دفاع کے لیے کچھ تیاریاں کرلی جائیں۔"

"او کے سر! مجھے کسی بھی صورت میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرے آباؤ اجداد میں سے بھی کئی لوگوں نے اس وطن کے لیے اپنے لہو کی قربانی دی تھی اور میں بھی اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس پاک سرزمین کی خاطر بہانے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے مجھ سے جیسے بھی طریقے سے کام لیا جائے گا، میں انکار نہیں کروں گا۔" اس کی آواز میں میدانِ جنگ میں اترنے والے سپاہی کا سا عزم و حوصلہ تھا جسے کرنل توحید اور ذیشان دونوں ہی نے پوری طرح محسوس کیا اور اس بار ذیشان اسے گلے لگانے کی خواہش کو ضبط نہیں کرسکا اور بانہیں پھیلائے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے خود بھی ذیشان کی گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے ہی دیا۔ لیکن اس وقت ٹھٹک گیا جب ذیشان سے الگ ہونے کے بعد اس نے کرنل توحید کی بانہیں بھی اپنے لیے وا دیکھیں۔ دل میں فخر و خوشی کی اٹھتی لہر کو محسوس کرتا ہوا وہ اس شاندار شخص کے چوڑے سینے سے جالگا جو شاید ہر محبِ وطن کے لیے اپنی بانہیں وا رکھتا تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو نے ٹی وی اسکرین پر نظر آتے چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا شادیِ مرگ طاری ہوگیا کہ بصارت کے سوا سارے قویٰ عارضی طور پر مفلوج سے ہوکر رہ گئے۔ وہ جہاں جس انداز میں بیٹھی تھی، بیٹھی رہ گئی اور ایک ٹک ٹی وی اسکرین کو تکتی رہی۔ یہ کام وہ اتنی یکسوئی سے کررہی تھی کہ لگتا تھا نظر آنے والے چہرے کے صرف نقوش ہی نہیں بلکہ ایک ایک رُواں تک حفظ کرلینا چاہتی ہو۔ وہ اس کے ہلتے لب تو دیکھ رہی تھی لیکن وہ کیا کہہ رہا ہے، یہ سننے سے قاصر تھی۔ اپنی محویت میں اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب اسلم کمرے میں داخل ہوا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"ریلیکس ماہ! اللہ کا شکر ہے کہ اے سی صاحب منظر پر آگئے ہیں اور صحیح سلامت ہیں۔" بہت دھیرے سے اس کے گرد اپنا دایاں بازو پھیلاتے ہوئے اسلم نے اسے خود سے قریب کیا اور بائیں ہاتھ سے اس کی نم ہتھیلیوں کو سہلانے لگا۔ اسلم کی اس مداخلت پر وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی تو احساس ہوا کہ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ شہریار کی گاڑی کے بم دھماکے میں تباہ ہوجانے کے ساتھ اس کی پراسرار گمشدگی کی خبر سننے کے بعد سے وہ بُری طرح بے کل رہی تھی۔ اس کا رُواں رُواں شہریار کی سلامتی کی دعا مانگتا رہا تھا۔ کہیں کسی شے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کی اسلم سے ابھی حال میں ہی شادی ہوئی ہے اور وہ بہ حیثیت شوہر اس کی توجہ اور محبت کا متقاضی ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی اس کیفیت کے دوران اسلم نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا اور بغیر کسی گلے شکوے کے خود اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس کی کیفیت کو محسوس کرلیا تھا اور بہت ہی نرمی سے اسے اتنی بڑی خوش خبری کے شاک سے نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کا یہ جذباتی سہارا بڑا جادو اثر تھا۔ ماہ بانو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

"بس کرو میری جان! اس طرح آنسو بہا کر ناشکری مت کرو۔ یہ تو مقامِ شکر ہے کہ بغیر کسی نقصان کے اے سی صاحب کی زندگی سلامت ہے۔" اب وہ اس کی پشت سہلا رہا تھا لیکن سینے کے مقام پر ماہ بانو کے آنسوؤں سے تر ہوتی قمیص نے اس کے دل میں کیا طوفان اٹھا رکھا تھا، یہ تو بس وہ خود ہی جانتا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ابھی شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں۔" وہ یک دم ہی اس سے الگ ہوئی اور رندھی ہوئی آواز میں کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ خود اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شکرانے کے یہ نفل خاصے طویل ثابت ہوں گے۔ اس خوش خبری کے ملنے سے قبل وہ صلوٰۃ الحاجات میں بھی اس کے طویل سجدوں اور دعاؤں کو دیکھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں شہریار کی خوش نصیبی پر رشک بھی کیا تھا جس کے لیے ماہ بانو جیسی لڑکی کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ وہ اس سے کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی یوں شدت سے اس کے لیے محوِ دعا رہی تھی۔ خود اس کے لیے ماہ بانو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر قیمتی تھی جسے پاکر وہ بے حد مسرور تھا لیکن خود کو بہرحال اس شخص سے کچھ کم ہی خوش قسمت سمجھتا تھا جس نے ظاہری طور پر تو ماہ بانو کو نہیں پایا تھا لیکن جو اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتا تھا۔ ماہ بانو اور شہریار کے تعلق کی نوعیت سے تو وہ جنگل میں ہی اس وقت واقف ہوگیا تھا جب اس نے ماہ بانو کے سامنے شہریار عادل کی بیوی کا ذکر کیا تھا اور وہ اس کی شادی ہوجانے کی خبر

سن کر پہلے تو صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی پھر بعد میں بالکل ہی اچانک خود اس سے شادی کی ہامی بھر لی تھی۔ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً ان دونوں کی حرکات و سکنات سے اسے اندازہ ہوتا رہا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے دل میں محبت کے گہرے جذبات رکھتے ہیں لیکن کسی وجہ سے اس محبت کو اظہار کا موقع نہیں مل سکا۔ اسے ان کی محبت کی پاکیزگی کا بھی اندازہ تھا۔ سفلی جذبات سے محروم محبت کا وہ جذبہ جسے یقیناً اللہ نے ان کے دلوں پر اتارا تھا، کسی طور قابلِ گرفت نہیں تھا کہ وہ ماہ بانو سے کوئی شکوہ کرتا۔

اس نے تو شہریار کا نام لیے بغیر بہت پہلے ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اس کا دل کسی اور کا اسیر ہے۔ اس کے باوجود اگر اس نے ماہ بانو سے شادی کرنے کے فیصلے کو برقرار رکھا تھا تو یہ اس کا اپنا انتخاب تھا اور اسے اپنے اس انتخاب پر کوئی پچھتاوا یا ملال نہیں تھا۔ ازدواجی زندگی کے اس مختصر سے عرصے میں ماہ بانو نے خود کو ایک وفادار بیوی ثابت کیا تھا اور اس کی ہر ضرورت اور خواہش کا جی جان سے خیال رکھتی رہی تھی۔ بدلے میں وہ اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ جہاں آ کر وہ بے بس ہو جاتی تھی اور خود پر سے اختیار کھو بیٹھتی تھی، وہاں اسے تھوڑی سی رعایت دیتے ہوئے گرفت کرنے سے گریز کرے۔ اور اس نے یہی کیا بھی تھا لیکن خود اس کے اپنے دل کو جو تکلیف پہنچی تھی، وہ بھی فطری تھی اور اس تکلیف کو وہ وسیع القلبی سے نظر انداز تو بے شک کر سکتا تھا لیکن اتنا بااختیار نہیں تھا کہ دل کو اس تکلیف میں مبتلا ہی نہ ہونے دے۔ موجودہ حالات میں اس نے اس بات پر بھی شکر کیا تھا کہ حامد راؤ کی فیملی کے تمام افراد واپس اپنے گاؤں ٹاہلی والا چلے گئے ہیں ورنہ ماہ بانو کی یہ کیفیت خواتین کو لازماً کھٹکا دیتی۔ حامد راؤ کی طرف سے ان کے لیے گاؤں یا شہر میں مرضی کے مطابق قیام اور ملازمت کی پیشکش اب بھی برقرار تھی لیکن ماہ بانو کے ایما پر اس نے یہ پیشکش قبول نہیں کی تھی اور خالی فلیٹ میں بیکار بیٹھا شہریار کی طرف سے گرین سگنل ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسے میں جب یہ خبر سننے کو ملی کہ شہریار کی گاڑی کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا ہے اور وہ خود پراسرار طور پر موقع سے لاپتا ہے تو قدرتی طور پر ان دونوں ہی کو شاک لگا لیکن ماہ بانو کی کیفیت ہی الگ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جب تک شہریار کی خیریت کی خبر نہیں ملے گی، وہ خود سولی پر لٹکی رہے گی۔ اور اب وہ خوش خبری مل گئی تھی تو بھی اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے ہوش دلانے پر وہ سنبھلی تھی اور اب شکرانے کے نفل ادا کر رہی تھی جبکہ وہ خود عجیب سی کیفیت میں گھرا بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ ڈور بیل کی آواز نے اسے اس کیفیت سے باہر نکالا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

”کون؟“ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دریافت کیا۔

”کوریئر سروس۔“ باہر سے مختصر جواب دیا گیا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر صاف ستھرے لباس میں کھڑے جس شخص پر پڑی، وہ کہیں سے بھی کسی کوریئر سروس کا نمائندہ نہیں لگ رہا تھا لیکن بہرحال اس کے ہاتھ میں ایک کافی پھولا ہوا لفافہ موجود تھا جو اس نے فوراً ہی آگے بڑھا دیا۔

”اسلم صاحب...؟“ اس کا انداز تصدیق کرنے والا تھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے لفافہ تھام لیا۔

”یہ آپ کے لیے شہریار عادل صاحب نے بھجوایا ہے۔ تفصیلات آپ کو لفافہ کھول کر معلوم ہو جائیں گی۔“ اس نے نپے تلے انداز میں اسے بتایا اور پھر اس کی طرف سے کسی ردِعمل کا انتظار کیے بغیر تیزی سے پلٹ گیا۔ اسلم نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ شخص واقعی کسی کوریئر سروس کا نمائندہ نہیں تھا۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لیے واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں اب بھی ٹیلی وژن چل رہا تھا لیکن خبروں کا سلسلہ روک کر اب کمرشلز چلائے جا رہے تھے۔ کچھ دیر قبل شہریار سے متعلق جو خبر چلی تھی، اس میں اسے لائیو دکھایا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے سے پہلے ان لوگوں کا کام نمٹا کر گیا تھا۔

”کیا ہوا اسلم... کون تھا دروازے پر؟“ اسی وقت ماہ بانو نماز کے مخصوص انداز میں دوپٹا لپیٹے ہوئے وہاں چلی آئی۔ اب وہ کافی پُرسکون اور مطمئن محسوس ہو رہی تھی۔

”شہریار صاحب نے یہ لفافہ بھجوایا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا، لائیں دکھائیں کیا ہے اس میں؟“ اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اشتیاق سے دیکھنے لگی۔ لفافے میں ان دونوں کے پاسپورٹ اور کچھ دیگر سفری کاغذات کے علاوہ ایک مختصر سا خط بھی موجود تھا جس میں شہریار نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی مخاطب کیے بغیر یہ اطلاع دی تھی کہ ان کی روانگی کے سلسلے میں تمام ممکنہ کارروائی کی جا چکی ہے اور اب انہیں ویزے کے حصول کے لیے کل اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے پہنچ کر انٹرویو

تھا۔ اس اطلاع کے ساتھ لاہور سے اسلام آباد تک کے ٹکٹ بھی موجود تھے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ویزا مل جانے کے بعد ان کے سفر کے لیے دیگر انتظامات بھی کر دیے جائیں گے۔ ان دونوں کے لیے یہ اطلاع جہاں خوش کن تھی، وہیں یہ احساس بھی دلا گئی تھی کہ اپنی تمام تر مصروفیات اور مشکلات کے باوجود شہریار ان کی طرف سے غافل نہیں ہے اور شاید اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھے گا جب تک ماہ بانو کو اس کی فرمائش کے مطابق یہاں سے دیارِ غیر روانہ نہیں کر دیتا۔

☆☆☆

”السلام علیکم سر! کیا حال ہے آپ کا؟ میری طرف سے آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔ میں آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ کا نمبر بند تھا پھر خبروں سے پتا چلا کہ آپ کی گاڑی کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا ہے اور آپ پراسرار طور پر لاپتا ہیں۔ اب خبروں ہی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ آپ اللہ کے کرم سے خیر خیریت سے ہیں تو میں نے سوچا ایک بار پھر آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر لی جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس بار میری کوشش کامیاب رہی اور آپ کی آواز سننے کو مل گئی۔“ وہ اس وقت رانا ہاؤس میں موجود تھا اور مسلسل جاننے والوں اور عزیز و اقارب کی فون کالز نمٹا رہا تھا۔ کچھ قریبی لوگ اس سے ملنے کی خواہش میں رانا ہاؤس بھی چلے آئے تھے لیکن سوائے آئی جی مختار مراد کے کسی پر بھی اس کی یہاں موجودگی کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا اور آنے والے مہمانوں کو آفرین رانا خود ہی مناسب خاطر مدارات کے ساتھ نمٹاتے ہوئے خوش اسلوبی سے روانہ کرتی جا رہی تھی۔ ایسے میں جگو کی کال آنا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ٹیلی وژن پر خبریں دیکھ کر وہ اس سے تعلق کی بنیاد پر فون کر سکتا تھا، لیکن اہم بات یہ تھی کہ وہ کوئی بھی خبر منظر پر آنے سے پہلے ہی اس سے رابطے کی ناکام کوششوں کا ذکر کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے کوئی اہم بات کرنی تھی ورنہ اس سے خاصی محبت کرنے کے باوجود جگو نامی وہ غنڈا غیر ضروری طور پر رابطہ نہیں کرتا تھا۔ اب جانے ایسا احترام میں تھا یا وہ احتیاط پسند واقع ہوا تھا لیکن فی الحال اس کے لیے غور طلب بات یہ تھی کہ جگو اس سے کیوں بات کرنا چاہتا تھا۔

”تھینک یو جگو! یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے بات کرنے کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟“ اس نے فوراً ہی اپنا تجسس دور کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

”میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع تھی سر! اطلاع ایسے شخص کے بارے میں ہے کہ مجھے یقین ہے آپ اس میں خصوصی دلچسپی لیں گے۔“

”ایسی بات ہے تو فوراً وہ اطلاع مجھے دے دو۔“ اس نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا۔

”آپ تو جانتے ہی ہیں سر کہ میرا تعلق کس قسم کے لوگوں سے ہے، البتہ میں ایک اہم سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی بندوں سے ذرا اونچے لیول کا بندہ ہوں پھر بھی میری یہ کوشش رہتی ہے کہ سیاسی حلقوں سے ہٹ کر زیرِ زمین دنیا میں ہونے والے واقعات سے آگاہ رہوں۔ میرے چند قابلِ اعتماد مخبر میرے لیے یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ اپنے انہی مخبروں کے ذریعے مجھے اطلاع ملی ہے کہ چودھری افتخار عالم منشیات کے دھندے میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ کام بہت ہوشیاری سے کر رہا ہے اور نچلے درجے کے مجرموں اور منشیات فروشوں کے بجائے ایسے تاجروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جو ظاہری طور پر عزت دار ہیں لیکن پیسے کے حصول کے لیے ناجائز دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔ چودھری ان تاجروں کو مال بچوں کے ڈائپرز میں چھپا کر بھجواتا ہے اور سوائے اعتماد کے بندوں کے کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ڈائپرز کے کاروبار کی آڑ میں کون سا دھندا کیا جا رہا ہے۔ میرے مخبر کو بھی اس حقیقت کا علم نہیں ہو پاتا لیکن اتفاق سے چودھری نے مال کی اس طریقے سے ترسیل کے لیے تیاری کے سلسلے میں جن کاریگروں کو ہائر کیا، ان میں سے ایک میرے مخبر کا دوست ہے اور اسی کے ذریعے اسے یہ ساری اطلاعات ملی ہیں۔ خبر دلچسپ تھی اس لیے اس نے مجھ تک بھی پہنچا دی اور اب میں آپ کو بتا رہا ہوں۔“ جگو کی دی ہوئی اطلاع واقعی چونکا دینے والی تھی جسے وہ کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”چودھری ڈائپرز کی تیاری کا کام کہاں کروا رہا ہے؟“ اس نے فوراً ہی جگو سے پوچھا۔

”یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اصل میں جس کاریگر سے میرے آدمی کو یہ اطلاع ملی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسے اور دیگر کاریگروں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس جگہ لے جایا اور لایا جاتا ہے اس لیے وہ صحیح پتا تو کیا علاقے کا نام بھی نہیں بتا سکتا۔ اس جگہ ان پر اتنی پابندی ہے کہ انہیں اپنے سونے اور کام کرنے کی جگہ کے علاوہ کہیں بھی آزادانہ حرکت کی اجازت نہیں ہے۔ چھٹی بھی ہفتے میں صرف ایک دن بارہ گھنٹے کے لیے ملتی ہے، اس کے علاوہ وہ لوگ دن رات وہیں رہتے ہیں۔ البتہ اس نے اتنا اندازہ ضرور لگایا ہے کہ جس جگہ وہ کام

کرتا ہے، وہ کسی بڑی عمارت کا تہ خانہ ہے جہاں شاید اوپری منزل پر بھی کوئی کام ہوتا ہے کیونکہ اوپر سے انہیں مسلسل چلنے پھرنے، مشینوں کے چلنے اور سامان وغیرہ کے گھسیٹے جانے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود تہ خانہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصے میں وہ اور اس کے ساتھی کاریگر عام ڈائپرز کی تیاری کے علاوہ کچھ مخصوص ڈائپرز میں ہیروئن بھرنے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے اس کام کی نگرانی کوئی غیر ملکی کرتا ہے البتہ عام ڈائپرز کی تیاری کے وقت وہ موجود نہیں رہتا اور تہ خانے کے دوسرے حصے میں چلا جاتا ہے۔ اس حصے میں جانے کی کاریگروں کو اجازت نہیں ہے البتہ انہوں نے وہاں چند غیر ملکیوں کو دیکھا ہے اور وہاں سے آنے والی آوازوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس حصے میں بھی کوئی کام ہو رہا ہے۔ شاید وہاں ہیروئن ذخیرہ کی جاتی ہے کیونکہ انہیں اسی جگہ سے نکال کر بال ڈائپرز میں بھرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔" جگو نے اسے تفصیلی جواب دیا جسے سن کر اس کے ذہن میں بہت سی باتیں تازہ ہونے لگیں۔ ان باتوں پر غور کرنے کے لیے اسے ارتکاز کی ضرورت تھی اس لیے جگو سے اجازت لینا ضروری تھا۔

"تھینک یو جگو! تم نے مجھے بہت کام کی باتیں بتائیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں بھی کچھ اور یاد آئے یا کوئی نئی بات معلوم ہو تو مجھے اطلاع ضرور دینا فی الحال میں انہی اطلاعات پر کام کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر! میں ہر لمحے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" اس نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ وہ شخص بھی اپنی نوعیت کا انوکھا ہی کردار تھا۔ شہریار کی وجہ سے ایک بار اس کے بیٹے کی جان کیا بچی وہ اس کا بے دام غلام بن کر رہ گیا۔ کہنے کو وہ ایک غنڈا تھا اور ایک بڑی سیاسی جماعت کے لیے کام کرتا تھا لیکن شہریار کی طرف سے ملنے والے معمولی سے معمولی احکامات کی تعمیل یوں کرتا تھا جیسے یہی اس کا اصل فریضہ ہو۔ اس بار تو اس نے کچھ اور بھی آگے بڑھ کر کام کیا تھا اور اس کی فرمائش یا حکم پر میدان میں اترنے کے بجائے صرف یہ جاننے کے باعث کہ وہ چودھری کے خلاف کارروائیاں کرتا رہتا ہے، اسے اس کے ایک انتہائی اہم راز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اسے جگو کی دی ہوئی اطلاعات پر غور کرنا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذیشان نے بھی اس کے سامنے چودھری کے تاجر حلقے میں بڑھتے ہوئے ربط ضبط کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے آدمی اب تک یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہے۔ انہوں نے تو اب تک سیدھے سادے کاروبار کی ہی اطلاع دی تھی کیونکہ وہ ان تاجروں کے لیے بس سیکیورٹی گارڈ کا کام کرتے تھے اور ان میں سے کسی نے بھی انہیں اپنا شریکِ راز نہیں کیا تھا۔ سی ایف پی کے لیے کام کرنے والے ان دوسرے درجے کے اہلکاروں کے علاوہ کچھ اور بھی لوگ تھے جو آج کل لاہور میں ہی واقع چودھری کے جوتوں کے کارخانے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ چودھری نے ان سیکیورٹی گارڈز کو اس لیے ہائر کیا تھا کہ اسے خدشہ تھا، کچھ عرصہ قبل اس کے کارخانے میں لگنے والی آگ کسی دشمن کی کارروائی تھی۔ کارخانے کی ازسرِنو تعمیر کے بعد اس نے وہاں اپنے آدمیوں کے علاوہ ان تربیت یافتہ سیکیورٹی گارڈز کی موجودگی ضروری سمجھی تھی اور ان گارڈز کے لیے کمپنی کو بھاری معاوضہ ادا کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ ہو نہ ہو، اس میں کوئی راز ہے۔ اس نے فوراً ہی ذیشان سے رابطہ کر کے اسے ساری بات بتائی۔ وہ اس کی بات سن کر پُرجوش ہو گیا۔

"تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو شہریار۔۔۔ واقعی وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جو ڈیلی رپورٹ دی ہے، اس میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ چودھری کے جوتوں کے کارخانے کے تہ خانے میں ڈائپرز بنانے کا کام کیا جاتا ہے لیکن بظاہری طور پر یہ کوئی قابلِ گرفت بات نہیں تھی اس لیے میں نے توجہ نہیں دی۔ تمہاری دی ہوئی اطلاع کی روشنی میں، میں وہاں ڈیوٹی دینے والے گارڈز سے خود معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کے بعد ہی ہم کوئی ایکشن لے سکیں گے۔" وہ جس جگہ کا پتا جگو سے معلوم نہیں کر سکا تھا، ذیشان سے بات کرنے کے نتیجے میں منٹوں میں اس سے آگاہ ہو گیا۔

"میرے خیال میں تم ساتھ ساتھ فوری ایکشن کی تیاری بھی کر لو کیونکہ تمہارے آدمی جو بھی بتائیں، اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا ہے کہ قبلہ چودھری صاحب ہیروئن کے کاروبار سے بھی منسلک ہیں، اس لیے اب اس شخص کو کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے۔ کارخانے پر ریڈ کے ساتھ ہی ہمیں چودھری کی گرفتاری کا کام بھی کرنا ہوگا۔ تم لے ای سی ایل میں اس کا نام تو ڈلوا دیا تھا نا؟" ذیشان کو مشوروں سے نوازتے ہوئے اس نے ایک اہم سوال کیا۔

"سوری یار! مجھے تمہیں بتانا یاد نہیں رہا تھا۔ اصل میں ہوا یہ کہ ہمارے ای سی ایل میں نام ڈلوانے سے پہلے ہی چودھری یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمارے پاس جو معلومات ہیں، اس کے مطابق وہ امریکا جانے کے لیے پر تول رہا تھا لیکن پھر شاید کسی طرح اس نے خطرے کو بھانپ لیا اور اچانک ہی دبئی روانہ ہو گیا۔ وہاں سے اس کے امریکا جانے کی اطلاع بھی ہمارے پاس ہے۔ یعنی اگر ہم صاف لفظوں میں بات کریں تو چودھری ہماری حد سے نکل چکا ہے اور فی الحال ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔" ذیشان نے جو اطلاع دی، اسے سن کر اس کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ چودھری کے فرار کی صورت میں اب وہ صرف اس کے کارخانے پر ریڈ ہی کر سکتے تھے۔ وہاں کتنے فیصد کامیابی حاصل ہوتی، یہ ابھی واضح نہیں تھا۔ کچھ امید تھی تو وہاں غیر ملکیوں کی موجودگی کی وجہ سے تھی۔ یقیناً وہ غیر ملکی کچھ اہم لوگ رہے ہوں گے جو خفیہ طریقے سے تہ خانے کے خفیہ حصے میں رہائش پذیر تھے۔

"ٹھیک ہے پھر جو مناسب سمجھو کرو۔ میں بہرحال ہر وقت خدمت کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کچھ بجھے ہوئے انداز میں ذیشان سے کہا۔ چودھری کو قانون کی گرفت میں لینے کا ایک اہم موقع ہاتھ سے نکل جانے پر وہ حقیقتاً بہت رنجیدہ تھا۔ وہ شخص اگر گرفت میں آ جاتا تو بہت سارے لوگوں کی تقدیریں بدلنے کا امکان پیدا ہو جاتا کیونکہ پیر آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں اس کا گہرا اثر رسوخ تھا اور وہ اپنے اس اثر رسوخ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کے لوگوں کا مسلسل استحصال کر رہا تھا۔ وہ درمیان سے ہٹ جاتا تو وہاں کے لوگوں کی تعلیم و ترقی کے لیے راہیں کھل جاتیں لیکن شاید ابھی ان بے چاروں کی قسمت میں مزید انتظار لکھا تھا۔

"تمہیں اس مشن سے عملی طور پر علیحدہ رہنا ہوگا کیونکہ ہم تمہارے لیے جو منصوبہ بندی کر رہے ہیں، اس کے مطابق اب تمہارا کہیں بھی نظر آنا مناسب نہیں ہے۔ آج کے دن تم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ دل بھر کر باتیں کر لو، ان کے ساتھ وقت گزارو پھر بعد میں شاید تمہیں ایسے مواقع بہت مشکل سے دستیاب ہو سکیں۔ میں انشاء اللہ جلد تمہیں کامیابی کی نوید سناؤں گا۔"

"اوکے، وِش یو گڈ لک۔" ذیشان کا جواب سن کر اس نے کسی قسم کی بحث نہیں کی اور اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک دے کر آفرین رانا اندر داخل ہوئیں، ان کے پیچھے آتی مختار مراد بھی تھے۔

"السلام علیکم انکل! ہاؤ آر یو؟" اس نے فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ان کا تپاک سے استقبال کیا۔

"جیتے رہو برخوردار۔۔۔ اور یہ بتاؤ کہ آج کل تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟ تمہارے ماموں، ممانی تمہارے لیے بہت پریشان ہیں اور بھابی نے خاص طور پر مجھے تاکید کی ہے کہ تمہیں سمجھاؤں کہ ایسے کام نہ کرو جن سے تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے۔" وہ اس کے شانے پر ایک شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے اس کے ساتھ ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ آفرین رانا نے ان دونوں کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا۔

"فکر نہ کریں ممانی جان! آدمی کی جان طے شدہ وقت پر ہی جاتی ہے۔ زندگی ہو تو آدمی میدانِ جنگ سے بھی صحیح سلامت لوٹ آتا ہے اور زندگی ہی کم لکھی ہو تو پھر ائرکنڈیشنر دفتر میں بھی کوئی فرشتۂ اجل کو روح قبض کرنے سے نہیں روک سکتا۔" مختار مراد کی بات سن کر اس نے آفرین رانا کو تسلی دی۔

"زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔" انہوں نے اسے خفگی سے گھورا۔ "میں خود بھی الحمدللہ مسلمان ہوں اور یہ بات سمجھتی ہوں لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرنا ہر انسان پر فرض ہے اور ایسا کوئی شخص نہیں ہوتا جو جان بوجھ کر ریل کی پٹریوں پر جا لیٹے کہ زندگی ہوگی تو بچ جاؤں گا اور ریل کو خود پر سے گزر جانے دے۔ اگر کوئی شخص ایسی حماقت کرتا ہے تو اسے دیوانہ ہی سمجھا جائے گا اور میں بھی تمہیں تمہاری دیوانگی سے باز رہنے کی نصیحت کر رہی ہوں۔" وہ خفا خفا سی بولتی چلی گئیں۔ اس نے مدد طلب نظروں سے مختار مراد کی طرف دیکھا۔

"میری طرف مت دیکھو بھئی، اس وقت میں بھابی کا وکیل ہوں۔" انہوں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اس کی مدد سے انکار کر دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، میں خود ہی اپنی وکالت کا فریضہ انجام دوں گا۔ آپ لوگ مجھ پر فردِ جرم عائد کریں۔" وہ بھی گویا کمر کس کر میدان میں اتر آیا۔

"فردِ جرم کیا عائد کرنی ہے بیٹا۔۔۔ بس ہمیں تم سے شکوہ ہے کہ تم اپنا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے اور بے خوف و خطر ہر معاملے میں کود پڑتے ہو۔ ایسا کرتے ہوئے تمہیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ تمہارے پیچھے بھی کچھ لوگ ہیں جو پہلے ہی سے زخم خوردہ ہیں اور جن کے دل تمہیں کچھ ہو جانے کے خیال سے دہلتے رہتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے تم نے مجھے بھی اعتماد میں لینا چھوڑ دیا ہے اور بالا ہی بالا جانے کن

سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اپنی سرگرمیوں سے تم اس لیے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں ہے کہ تم کچھ نہ کر رہے ہو اور تم پر اتنا زبردست قاتلانہ حملہ کر دیا جائے۔ اگر خوش قسمتی تمہارا ساتھ نہ دیتی تو شاید آج تم ہمارے سامنے نہیں بیٹھے ہوتے۔ اور ہاں... تم مجھے اتنا بے خبر بھی نہ جانو۔ میں جانتا ہوں کہ حادثے کے وقت تمہارے قابلِ اعتماد ڈرائیور کے بجائے دوسرا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور دھماکے کے وقت وہ گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ بعد میں بھی وہ منظر سے غائب ہے اور صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ کچھ نامعلوم لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ حادثے کی تحقیقات کے لیے پولیس کو بہت دیر بعد اجازت دی گئی اور کسی خفیہ ادارے کے لوگ وہاں منڈلاتے پائے گئے۔ ان ساری باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تم کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو جو تمہاری پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے ہٹ کر ہے اور یقینی طور پر خطرناک بھی۔"

مختار مراد ایک تجربہ کار آدمی تھے جنہوں نے بہ حیثیت ایک پولیس آفیسر جانے زمانے کے کتنے سرد و گرم دیکھے تھے۔ اس کے معاملے میں ان کا تجزیہ غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ اس سے شکوہ کرنے میں بھی بالکل حق بجانب تھے کیونکہ انہوں نے اس سے کوئی خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ مرحوم سجاد رانا کے سسر تھے اور اس رشتے سے بھی بڑھ کر انہوں نے اس کی خلوصِ نیت کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ اس کی معاونت کی تھی۔ ایسے میں وہ ان سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا تو ان کا محسوس کرنا لازمی تھا۔ اور اب اس کا فرض بنتا تھا کہ ان کی دل جوئی کرے چنانچہ کسی حیلے بہانے سے کام لینے کے بجائے سچ بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان سے معذرت کرنے لگا۔

"آئی ایم ریئلی سوری انکل! واقعی آپ کے معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے لیکن بس اچانک ہی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ میرا آپ سے رابطہ ٹوٹ گیا ورنہ آپ نے میری جس قدر مدد کی ہے اس کے لیے میں آپ کا دل سے شکرگزار ہوں۔"

"ان سب باتوں کو رہنے دو بیٹا! میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کسی بھی معاملے میں تمہاری مدد کر کے تم پر احسان کیا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا، وہ ملک کی خاطر کیا یا پھر سجاد اور شمینا کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے... اور یہ دونوں ہی معاملات ایسے ہیں جن سے مجھے خود بھی ذاتی طور پر دلچسپی تھی اور اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو میں نے تمہاری نہیں بلکہ تم نے میری مدد کی تھی۔ خاص طور پر جنگل میں آپریشن کے نتیجے میں ڈاکوؤں کے اتنے بڑے گروہ کی گرفتاری کے بعد تو میرے محکمے کا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے اس لیے میں خود تمہارا احسان مند ہوں۔ لیکن یہ میں بھی سمجھتا ہوں اور تم بھی کہ ہمارے درمیان ایک دوسرے پر احسان جتانے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے مفادات بھی ایک ہیں اور مقاصد بھی۔ سجاد اور شمینا کے قاتل کیفرِ کردار کو پہنچ گئے تو ہم سب کے سینوں میں ٹھنڈ پڑ جائے گی لیکن اس مقصد کے لیے ہم تمہیں کسی صورت داؤ پر نہیں لگانا چاہتے۔ تم ہم سب کے لیے بہت اہم ہو۔" بات گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اس کا خاندان مل کر کوشاں تھا کہ وہ جس راہ پر چل رہا ہے وہاں سے واپس پلٹ آئے۔ اس ساری گفتگو میں بغیر مداخلت کے وہاں بیٹھی رہنے والی آفرین رانا کی خاموشی بھی تائید کر رہی تھی کہ جو کچھ مختار مراد کہہ رہے ہیں، وہی ان کی بھی خواہش ہے... بلکہ مختار مراد کے الفاظ یقینی طور پر ان کی خواہش کے ہی عکاس تھے۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔

"میں آپ لوگوں کی اپنے لیے بے تحاشا محبت سے واقف بھی ہوں اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بھی کہ اگر اس نے مجھے بچپن میں ماں باپ جیسی نعمت سے محروم کیا تھا تو آپ بزرگوں کی صورت میں اس محرومی کا بہت اچھی طرح ازالہ بھی کیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار بھی نہیں ہے کہ آپ کی محبتوں میں اتنی طاقت ہے کہ اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خود کو اس چار دیواری تک محدود کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں، میں نہ رہوں گا، بس ایک ایسا چلتا پھرتا مُردہ بن جاؤں گا جو روح اور دل دونوں سے محروم ہو۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ زندگی انسان کو صرف ایک بار ہی ملتی ہے اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم چاہے کتنی بھی احتیاط سے کام لیں، لیکن ایک دن بہرحال مرنا ہے... تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم کچھ اس طرح جی کر مریں کہ جینے کا حق ادا ہو جائے اور ہمارے مرنے پر لوگوں کو یہ نہ لگے کہ زمین کو ایک ناکارہ بوجھ سے نجات مل گئی۔" اس نے اپنے حق میں بہت مختصر دلائل دیے تھے لیکن لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ مختار مراد اور آفرین رانا اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہ گئے۔

"میرا بیٹا بالکل درست کہہ رہا ہے۔ یہ وہ نمائشی پرندہ نہیں ہے جسے آپ سنہری پنجرے میں قید کر کے خود کو اور

اپنے مہمانوں کو اس کی خوب صورتی سے محظوظ کر سکیں۔ یہ شاہین ہے جس کی شان ہی اونچی اڑان بھرنے میں ہے اور یہ خوش رنگ و قیمتی پنجرے کے بجائے چٹانوں کی سخت زندگی میں ہی خود کو زیادہ خوش اور آرام دہ محسوس کرتا ہے۔" ان تینوں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ کب لیاقت رانا وہاں پہنچے تھے۔ ان کی آواز نے کمرے میں چھایا سکوت توڑا تو ہی وہ تینوں چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ شہریار لپک کر ان کے قریب پہنچ گیا اور انہیں سہارا دیا۔ پے در پے صدموں اور طویل علالت نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا چنانچہ وہ اپنے کمرے سے یہاں تک آنے اور تھوڑا سا بولنے میں ہی بُری طرح ہانپ گئے تھے۔

"آپ کو یہاں اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں بلوا لیتے۔ خدانخواستہ اگر چکرا کر گر جاتے تو کیا ہوتا۔" آفرین رانا بھی ان کے قریب پہنچیں اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا دوسرا بازو تھام لیا۔ شہریار اور وہ مل کر انہیں صوفے تک لے آئے۔ انہوں نے بیگم کی خفگی کے جواب میں انہیں صرف ایک مسکراہٹ سے نوازنے کے سوا کچھ نہیں کہا اور ان کا پیش کردہ پانی کا گلاس تھام کر اس میں سے دو گھونٹ بھرے اور گلاس واپس کرتے ہوئے براہِ راست انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"تمہیں معلوم ہے آفرین... ابھی جب شہریار نے مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا تھا تو مجھ بوڑھے کو یہ سہارا بہت اچھا لگا تھا لیکن پھر بھی میں نے یہ نہیں سوچا کہ اپنے لیے اسے اس کے مشن سے روک لوں کیونکہ اگر میں نے اس وقت یہ قربانی دے دی تو یقیناً مجھ جیسے بہت سے دوسرے بوڑھے والدین سے ان کے سہارے چھننے سے بچ جائیں گے۔" ان کے الفاظ نے آفرین رانا کو نظریں جھکا دینے پر مجبور کر دیا۔

"ٹھیک ہے رانا صاحب! ہمیشہ کی طرح آپ جیتے میں ہاری۔ میں نے اپنا مشقتوں سے پالا بیٹا آپ کے کہنے پر دوسری ماؤں کے کلیجے ٹھنڈے کرنے کے لیے آزاد کیا۔" ان کی آواز اگرچہ صاف تھی لیکن شہریار جانتا تھا کہ ان کی جھکی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ہوگی۔ اس نے بے ساختہ ہی انہیں گلے سے لگا لیا۔ وقت کے ان لمحوں میں لفظ خاموش تھے لیکن قربانی کی ایک ایسی لازوال داستان رقم ہو رہی تھی جو شاید کبھی تاریخ کے صفحوں کا حصہ نہیں بنتا تھا لیکن وقت خود گواہ رہتا کہ شہریار عادل کے خاندان نے ارضِ وطن کے لیے کیا داؤ پر لگایا تھا۔

☆☆☆

"فصل کا کام کیسا چل رہا ہے بہرام؟"

"ایک دم فسٹ کلاس صاحب۔ زمین بالکل تیار ہے۔ آپ چاہو تو راؤنڈ مار کر دیکھ سکتے ہو۔" بہرام کی خوشامدانہ آواز سنائی دی۔

"ہاں، راؤنڈ تو مجھے مارنا پڑے گا۔ معلوم ہوا ہے کہ چودھری صاحب ملک سے باہر ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں مجھے ہی سب کچھ دیکھنا ہوگا۔" یہ عابد انصاری تھا۔ ہمیشہ کی طرح بے شکن لباس اور آنکھوں پر لگے خوب صورت فریم کے چشمے کے ساتھ نہایت معزز اور نفیس نظر آنے والا آدمی... جس سے ملتے ہی لوگ اس کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات محسوس کرتے تھے۔ شہزادی کو بھی وہ کافی اچھا آدمی لگا تھا اور اس کے بنگلے پر ملازمت کے مختصر عرصے میں وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ شہریار نے آخر اسے عابد انصاری پر نظر رکھنے کی ذمے داری کیوں سونپی ہے؟ اس کا ذہن تسلیم ہی نہیں کر سکا تھا کہ یہ اتنا اچھا نظر آنے والا آدمی بھی کوئی مجرم ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ حتی الامکان شہریار کے حکم کی پیروی کر رہی تھی۔ یہاں اسے خصوصیت سے کوئی بہت بڑی ذمے داری نہیں سونپی گئی تھی اور ایسا بہرام کی وجہ سے ہوا تھا لیکن وہ بنگلے کے مختلف حصوں میں اپنی موجودگی کا جواز بنائے رکھنے کے لیے ہاتھ میں صفائی کا کپڑا تھامے فرنیچر وغیرہ کی جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ بنگلے کے اس حصے میں رہے جہاں عابد انصاری موجود ہو۔ اب تک اس کی تگ و دو کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی تھی۔

اب بھی وہ عابد انصاری کے کمرے کی کھڑکی کے بالکل قریب کھڑی ایک شوپیس کو کپڑے سے رگڑ کر چمکاتی ہوئی اس کی بہرام کے ساتھ جاری گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھی اور ابتدا میں ہی حیران ہو گئی تھی کہ عابد انصاری کو کسی فصل سے کیا غرض ہے؟ چودھری اگر گاؤں میں موجود نہیں بھی تھا تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا اکثر ہی ادھر اُدھر آنا جانا لگا رہتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں منشی اللہ رکھا اس خوبی سے سارے انتظامات سنبھالتا تھا کہ کسی مزارعے کو ذرا بھی تساہل کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ چودھری کی موجودگی کی صورت میں بھی عموماً سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور خود چودھری کو بھی کسی نے ان معاملات میں زیادہ سر کھپاتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ اب چودھری کی عدم موجودگی میں عابد انصاری کا فصل کے لیے فکرمند ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی سمجھ تو اسے چودھری اور انصاری کی دوستی کی وجہ بھی

نہیں آئی تھی۔ اس کے نزدیک وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف لوگ تھے۔ اس لیے ان کی دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی ان کی دوستی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی اور اسے اسی وجہ تک پہنچنا تھا۔ دوسری طرف بہرام اور عابد انصاری کے درمیان گفتگو جاری تھی۔

"آپ فکر مند مت ہوں صاحب! پہلے کی طرح سب کام ٹھیک چل رہا ہے۔ آپ چودھری صاحب کو تو جانتے ہی ہیں، اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو وہ سب کی چمڑی گرا دیں گے۔" بہرام جو کہہ رہا تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ بالے کی بیوی کی حیثیت سے شہزادی خود ایسے کئی واقعات سے واقف تھی۔ چودھری کے اکثر معتوبین کو بالے ہی کے ہاتھوں سزا ملتی تھی۔ وہ تھا بھی ذرا اذیت پسند آدمی چنانچہ دل کھول کر ظلم ڈھاتا تھا۔ بعد میں اللہ نے اس کی رسی کھینچی تو وہ دردناک انجام سے دوچار ہوا۔ شہزادی کو اس کی معذوری کے وہ دن یاد تھے جب وہ بے بس سا اپنی چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ ان دنوں اس سے دن رات کام لینے والے چودھری نے بھی اسے فراموش کر دیا تھا اور اس کے علاج معالجے کے لیے کسی قسم کی مدد نہیں کی تھی۔ مایوسی بالے کو ٹاہلی والا کے جعلی پیر کی خانقاہ تک لے گئی اور وہ خانقاہ میں لگائی جانے والی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ یوں اسے اپنے ڈھائے گئے مظالم کی ٹھیک ٹھاک سزا دنیا ہی میں مل گئی۔ آگے حشر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا تھا، یہ تو اللہ ہی جانتا تھا۔

"یہ بات تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ چودھری صاحب کتنے سخت مزاج بندے ہیں لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ مجھے جنہیں جواب دینا ہوتا ہے، وہ کیسے لوگ ہیں۔ اسی لیے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا۔" عابد انصاری خاصا متفکر محسوس ہو رہا تھا پھر اس کی بات بھی چونکا دینے والی تھی۔ بھلا چودھری کی فصل کے سلسلے میں عابد انصاری کس کے سامنے جواب دہ تھا؟ شہزادی الجھن میں پڑ گئی۔

"ہم تو اپنی طرف سے پورا خیال رکھتے ہیں صاحب، آگے آپ خود بھی اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔" اس بار بہرام کا جواب بھی خاصا محتاط تھا۔ گویا وہ خود بھی اپنے اوپر مکمل ذمے داری لینے سے ڈر رہا تھا۔

"ہوں...." عابد انصاری نے ہنکارا بھرا اور ذرا سے توقف کے بعد بولا۔

"پہرے کا کام تو صحیح طریقے سے چل رہا ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ اس لڑکے اکو کی طرح پھر کوئی کھیتوں کی طرف آ نکلے۔ اکو کا تو کوئی والی وارث نہیں تھا اس لیے اس کی موت پر زیادہ ہنگامہ بھی نہیں ہوا لیکن ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔ جنگل میں آنے والا کوئی اور شخص بھی اکو جیسے انجام سے دوچار ہوا تو لوگوں کی توجہ اس طرف ہو جائے گی اور یہ ہم نہیں چاہتے۔ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ فصل کو خفیہ رکھنے کے لیے ہی چودھری صاحب نے اپنے نمک خوار ڈاکوؤں کی قربانی دی تھی۔ انہیں جان بوجھ کر اپنے آدمی کے ذریعے پولیس کو مخبری کروانی پڑی تھی کہ ڈاکو جنگل کے کس حصے میں رہ رہے ہیں، ورنہ اگر پولیس خود منہ اٹھا کر چلی آتی تو ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کا چپا چپا چھان مارتی اور اسے ہمارے اتنے اہم راز سے آگاہی ہو جاتی۔ ایسا ہو جاتا تو ہم سب بے موت مارے جاتے۔ ایک طرف قانون پکڑ کرتا تو دوسری طرف وہ لوگ خون کے پیاسے ہو جاتے جن کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں افیون کی کاشت کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ شمالی پہاڑی علاقوں کی اس فصل کو یہاں اگانے کے لیے جو تجربات کیے گئے ہوں گے، ان پر بے اندازہ سرمایہ خرچ ہوا ہوگا اور ہماری غفلت سے اگر ان کا سرمایہ ڈوب جاتا ہے تو سمجھو ہماری خیر نہیں ہے۔" اپنے مخصوص نرم و دھیمے لہجے میں بولتا عابد انصاری جو انکشافات کر رہا تھا، انہوں نے شہزادی کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

اسے غریب اکو کی موت یاد تھی۔ اپنی منگیتر رانی کی پُراسرار موت کے بعد وہ نیم دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ پھر ایک روز معلوم ہوا کہ اکو غائب ہے اور گاؤں میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ اگلے روز جنگل سے اس کی لاش ایسی حالت میں ملی کہ جانوروں نے اس کے جسم کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ لوگوں نے یہی خیال کیا کہ دیوانہ اپنی دھن میں جنگل میں جا نکلا ہوگا اور حادثے کا شکار ہو گیا لیکن یہ تو عابد انصاری کی زبان سے سن کر اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اکو کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا اور وہ بھی اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے جنگل میں بنائے گئے افیون کے کھیت دیکھ لیے تھے۔ شہزادی لاکھ سادہ لوح اور ان پڑھ سہی لیکن یہ بات تو جانتی تھی کہ اس طرح چھپ کر افیون کاشت کرنا غیر قانونی کام ہے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو گیا کہ وہ ایک نہایت اہم راز سے واقف ہو گئی ہے، ایک ایسے راز سے جس کو جاننے کی پاداش میں اکو کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے اور شاید یہی وہ کام تھا جو شہر یار نے اسے سونپا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ چودھری اور عابد انصاری میں کس قسم کا گٹھ جوڑ تھا اور اب اس کا مزید اس بنگلے میں رہنا ضروری نہیں تھا جہاں بہرام اس کی عزت کے درپے تھا۔ فیصلہ کرتے ہی وہ

تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت میں آئی لیکن اس لمحے وہ یہ فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک نازک ڈیکوریشن پیس موجود ہے۔ اس کی ذرا سی غفلت سے ڈیکوریشن پیس اس کے ہاتھ سے پھسلا اور فرش پر گر کر چھناکے سے چکنا چُور ہو گیا۔ فوراً ہی عابد انصاری کے کمرے کا دروازہ کھلا اور بہرام کسی خوں خوار درندے کی طرح باہر نکلا۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" شہزادی کو دروازے کے قریب پا کر اس نے غرا کر پوچھا۔

"صفائی... صفائی کر رہی تھی۔" اس نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

"تجھے کس نے کہا تھا صفائی کرنے کو؟ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو سارے بنگلے کی صفائی ہوئی تھی۔" بہرام کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"م... میں خود ہی کر رہی تھی۔ کاکا سویا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں تو ایسے ہی جھاڑ پونچھ کرنے لگی۔" اس نے خاصا معقول جھوٹ گھڑا لیکن گھبراہٹ پر قابو نہ پا سکی کہ اکو کی سوختہ لاش اب بھی اس کی یادداشت میں تازہ تھی۔

"جب تجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا تو تجھے کیا لوز پڑی تھی۔ آئندہ زیادہ اپنی مرضی چلائی تو گدی سے پکڑ کر نوکری سے باہر کر دوں گا۔" بہرام نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

"بس کرو بہرام! کیوں بے چاری کو ڈانٹے جا رہے ہو۔" اچانک ہی عابد انصاری نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اس کی گلوخلاصی کروائی اور پھر براہ راست اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جاؤ، ذرا میرے لیے اچھی سی چائے تو بنوا لاؤ۔"

"جی چنگا صاحب۔" شہزادی کی گویا جان میں جان آئی۔ وہ حکم ملتے ہی سرپٹ باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

"اسے تم نے ملازمت پر رکھا تھا نا بہرام؟" اس کے جانے کے بعد عابد انصاری نے پُرخیال انداز میں بہرام سے دریافت کیا۔

"جی صاحب! آپ کو بتایا تھا نا کہ منشی اللہ رکھا نے اس کی سفارش کی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے یہ عورت گڑبڑ لگتی ہے۔" عابد انصاری نے اپنا شک ظاہر کیا۔

"ارے نہیں صاحب! ایسے ہی بے وقوف سی عورت ہے۔ پہلے اس کا گھر والا چودھری صاحب کے پاس کام کرتا تھا۔ ان کا بڑا خاص بندہ تھا۔ وہ مر گیا تو اس پر فاقوں کی نوبت آ گئی اسی لیے منشی جی نے سفارش کر کے اسے یہاں کام دلوا دیا۔" بہرام نے فوراً ہی اس کے خیال کی تردید کی۔

"وہ سب اپنی جگہ ہے لیکن میں بلا جواز اس پر شک نہیں کر رہا۔ یہ دیکھو کہ ڈیکوریشن پیس میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب ٹوٹا ہے جبکہ جس کارنس پر یہ رکھا تھا، وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ اس بات کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ صفائی کے بہانے وہ تمہاری اور میری باتیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔" عابد انصاری کے پُردلیل شک پر بہرام کا منہ کھل گیا اور خود یقین نہ ہونے کے باوجود وہ شہزادی کے دفاع میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"فی الحال خاموش رہو اور اس عورت پر نظر رکھو۔ جو بھی حقیقت ہوئی، وہ خود ہی کھل کر سامنے آ جائے گی۔" عابد انصاری نے اسے مشورہ دیا جس کو سن کر اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔ شہزادی کو پانے کی تمنا برسوں سے اس کے سینے میں مچل رہی تھی اور اب جبکہ یہ موقع ملنے والا تھا تو یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ انصاری کا شک درست ثابت ہونے کی صورت میں اسے ہر حال میں شہزادی کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑتا اور یوں اس کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں اپنی موت آپ مر جاتیں۔ وہ سخت بے مزہ ہو گیا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے شہزادی چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اسی طرف آتی دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ جوتوں کے کارخانے کی آڑ میں چودھری جو گھناؤنا کام کر رہا تھا، وہ اس کے وارنٹ جاری کروانے کے لیے کافی ہے۔" شہر یار اس وقت ایس پی کے دفتر میں موجود تھا اور ذیشان کی زبانی چودھری کے کارخانے پر مارے جانے والے چھاپے کی تفصیلات سن کر اس نے یہ تبصرہ کیا تھا۔ چھاپا بہت کامیاب رہا تھا اور انہیں اپنی توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ تہ خانے میں اتر کر تو وہ لوگ دنگ رہ گئے تھے کیونکہ وہ تو صرف یہ خیال کر رہے تھے کہ وہاں بڑی مقدار میں ہیروئن کا ذخیرہ موجود ہوگا جسے ڈائپرز میں چھپا کر خفیہ طریقے سے مارکیٹ میں بھیجا جاتا ہوگا... لیکن وہاں صرف اتنا معاملہ نہیں تھا۔ انہیں وہاں تیار شدہ ہیروئن کے علاوہ اس کی تیاری میں استعمال ہونے والے خام مال کی بھی بھاری مقدار ملی تھی اور ساتھ میں ایسے آلات و مشینری بھی جن کی مدد سے ہیروئن سازی کی جا سکتی۔ یعنی وہ کارخانہ صرف ہیروئن کی ایک ذخیرہ

گاہ ہی نہیں تھا بلکہ ہیروئن سازی کے لیے بھی استعمال ہو رہا تھا اس لیے وہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے دشمن پر بے حد کاری وار کیا تھا اور یقینی طور پر اسے اس وار سے اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی ہوگی۔

"وارنٹ تو بے شک جاری ہو جائیں گے لیکن گرفتاری کے لیے چودھری دستیاب بھی تو ہو۔ وہ چالاک لومڑ تو پہلے ہی خطرہ دیکھ کر بھاگ نکلا ہے۔" اس کی بات کے جواب میں ذیشان نے اسے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ کب تک بھاگے گا۔ لوٹ کر اسے واپس تو یہیں آنا ہے اور اگر نہیں بھی آیا تو ہم انٹرپول کے ذریعے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ منشیات کے کاروبار سے منسلک کسی شخص کو دنیا میں کہیں بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ جب ہم چودھری کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت پیش کریں گے تو امریکا خود اسے کان سے پکڑ کر ہمارے حوالے کرے گا۔ اگر فرض کرو کہ ایسا نہ بھی ہوا تو اب کم از کم چودھری ساری زندگی یہاں واپس نہیں لوٹ سکے گا۔ اگر ہم نے ڈھنگ سے کوشش کی تو اتنے خطرناک مجرم کی املاک بحقِ سرکار ضبط بھی کی جا سکتی ہیں۔ تم سوچو کہ ایسا ہو گیا تو کتنوں کا بھلا ہو جائے گا۔ میری تو پوری کوشش ہوگی کہ ساری زمینیں غریب مزارعوں میں تقسیم ہو جائیں تاکہ وہ اپنی محنت کا ڈھنگ سے معاوضہ تو حاصل کر سکیں۔" وہ اب بھی بے حد پُرجوش اور پُرامید تھا۔ اس کے منصوبے سن کر ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کی طرف کسی بزرگ کی سی شفقت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میری دعا ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری ہو لیکن سچ کہوں تو میں خود بہت زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔ میرا انٹیلی جنس کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ چودھری جیسا ہر بڑا مجرم اپنے بچاؤ کے لیے پہلے سے ہی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ رکھتا ہے۔ حالات بھی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ چودھری کو خطرے کا ادراک تھا جب ہی وہ خود پر کوئی بُرا وقت آنے سے پہلے ملک سے فرار ہو گیا اور یہ مت سوچنا کہ وہ عجلت میں اپنا سارا مال و متاع یونہی چھوڑ کر بھاگ نکلا ہوگا۔ جو آدمی پیسے سے اتنی محبت کرے کہ اس کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کر ڈالے وہ کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا کہ اپنی کسی چُوک کے نتیجے میں اپنی دولت سے محروم ہو جائے۔ چودھری نے بھی اس بات کا معقول انتظام کر رکھا ہوگا کہ جو کچھ، چاہے جس بھی طریقے سے اس نے کمایا ہے، اس کا ہی رہے۔ رقم تو یقیناً اس نے ویسے بھی ایک حد سے زیادہ اپنی تحویل میں نہیں رکھی ہوگی اور کہیں باہر کے ملک میں منتقل کر دی ہوگی۔ رہے کھیت اور باغات وغیرہ تو دیکھتے ہیں ان کا کیا معاملہ ہے۔" ذیشان نے اپنے خیالات سے اسے آگاہ کیا تو وہ بھی کچھ فکرمند نظر آنے لگا لیکن پھر فی الحال اس موضوع کو آئندہ کے لیے چھوڑ کر درپیش صورتِ حال پر گفتگو کرنے لگا۔

"موقع سے جو غیر ملکی گرفتار ہوا ہے اس نے کچھ بتایا؟"

"وہ کچھ بتانے کے لائق ہی نہیں ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ شخص مکمل طور پر گونگا اور بہرا ہے۔ ہم نے اسے دوسرے دو غیر ملکیوں کی لاشیں دکھا کر دھمکایا ہے جس کے نتیجے میں اس نے ایک کاغذ پر لکھ کر جواب دیا ہے۔ اپنے جواب میں اس نے بتایا ہے کہ وہ ہیروئن سازی کا ایک بہت بڑا ماہر ہے جو ایک پارٹی کے کہنے پر اپنے دو معاونین کی مدد سے وہاں ہیروئن کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کے ساتھی گرفتار ہونے لگے ہیں تو یہی مناسب سمجھا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دونوں معاونین کو گولی ماری تھی اور اب ہیروئن تیار کرنے کا فارمولا صرف اس کے ذہن میں موجود ہے اور ہم اس لیے اس کی زبان نہیں کھلوا سکتے کہ وہ بول ہی نہیں سکتا۔ تشدد کے ذریعے بھی اسے کاغذ پر سب کچھ لکھ کر دینے کے لیے اس لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خاصا سن رسیدہ ہے اور چار برس پہلے اوپن ہارٹ سرجری سے گزر چکا ہے۔ زبردستی کی صورت میں وہ اپنی جان سے چلا جائے گا اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" ذیشان کی بات سن کر وہ منہ بنا کر بڑبڑایا۔ "دنیا بھی عجیب ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ بڈھا جب کسی قابل ہی نہیں ہے تو قبر میں لٹکے ہوئے پیروں کے ساتھ یہ سب کیوں کر رہا ہے... اس عمر میں دولت کما کر وہ کیا کرے گا؟" اسے گویا شدید شکوہ تھا۔

"ضروری نہیں کہ وہ یہ سب پیسے کے لیے کر رہا ہو۔ وہ کسی کاز سے بھی منسلک ہو سکتا ہے۔ وطن اور مذہب کے نام پر بعض دفعہ لوگ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔ تم اپنی مثال سامنے رکھو۔ ہم نے تم سے کتنی بڑی قربانی مانگی ہے لیکن تم بغیر کسی لالچ کے صرف اس لیے تیار ہو گئے کہ تم اپنے ملک و قوم کی خاطر کچھ کرنا چاہتے ہو۔ ایسے ہی وہ بھی کسی مقصد سے جڑا ہوگا۔"

"میرا معاملہ الگ ہے۔ میں کسی کا بُرا نہیں چاہتا بلکہ صرف برائی کا خاتمہ چاہتا ہوں۔" اس نے ذیشان کے خیال

[...]ل کیا۔

[...]ہا تم سوچ رہے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم کا [...]مور پر دوسری قوم کا ولن ہوتا ہے۔ را اور موساد [...]ہی تو تمہاری جان کے درپے نہیں ہو گئے۔ ان [...] تم ایسے شخص ہو جس نے انہیں نقصان پہنچایا ہے [...]ے انہیں مزید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اسی لیے وہ [...]ستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔" ذیشان نے دلیل [...]ائل ہونا ہی پڑا اور وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔

"[...]ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں [...] سوچو کہ اگر وہ گونگا بہرا ہمیں کچھ نہیں بتائے گا تو [...] آگے کس طرح بڑھیں گے؟ ہماری اصل جنگ تو ان [...]ے ہے جو اس سارے کھیل کے پیچھے ہیں لیکن ہر بار [...] ہے کہ ہم چند مہروں کو پیٹنے کے بعد پھر اندھیرے [...]ے ہوتے ہیں۔ اشیش کی گرفتاری ہو یا ٹاہلی والا [...]ل جانے والی کارروائی، ہمارے ہاتھ دو چار کرائے کے [...]سوا کچھ بھی نہیں آپاتا۔" وہ کچھ جھنجلایا ہوا تھا۔

"[...]شمن چالاک ہو تو ایسے ہی حالات پیش آتے ہیں۔ [...]ل صاحب کو بھی احساس ہے کہ ہماری اب تک کی [...]یاں زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ ہم ان کی [...]میں انتشار بپا کرنے میں تو بے شک کامیاب رہے [...] انہیں جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکے ہیں۔ ہماری [...]ش کے باوجود واقعی ایسا ہوتا ہے کہ ہم چند قدم چلنے [...] اندھیرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی [...]ی کے سدباب کے لیے کرنل صاحب نے تمہیں [...] تیر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں سے روانگی سے [...]صاحب نے مجھے مختصراً جو کچھ بتایا ہے، اس سے مجھے [...] ہو سکا ہے کہ وہ تمہاری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے [...]ی سے تمہیں دشمن کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ [...]۔ یہ مت سمجھنا کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا کر [...] اور اپنی فورس کے جوانوں کو بچانا چاہتے ہیں۔ میری [...]ہمارے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے، اس میں انہوں [...]ے خلوص کو بے حد سراہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو [...]ں نے تمہارے اندر دیکھی ہے، وہ ہر کسی میں نہیں [...] اور یہ ہے بھی حقیقت... تمہاری جگہ اگر کوئی اور بندہ [...]ے اپنی لگی بندھی نوکری کرتا۔ یہ جو تم ہر جگہ اپنی [...]ے پھرتے ہو تو ایسا تمہاری بے چین روح کی وجہ [...] ایک اے سی کی کرسی نہیں سنبھال سکتی۔ تم جیسا [...]کر جس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکتا ہے،

لگی بندھی نوکری میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ذیشان کھل کر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

"یہ سب تو تم لوگوں کا خیال ہے لیکن میں اتنا بھی آزاد نہیں ہوں۔ کچھ رشتے اور لوگ دنیا میں ایسے ہیں جن کی فکر سے میں جیتے جی خود کو آزاد نہیں کر سکتا اس لیے تم لوگوں کو میری عدم موجودگی میں ان کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔" اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کوئی سپرمین نہیں ہے جو انسانی کمزوریوں سے آزاد ہو۔

"اس سلسلے میں تم فکر نہ کرو۔ کرنل صاحب پہلے ہی تمہیں یقین دہانی کروا چکے ہیں۔ میں خود بھی ذاتی طور پر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جن لوگوں کی تمہیں فکر ہے، سی ایف پی ہر ممکن طریقے سے ان کا خیال رکھے گی۔" ذیشان نے فوراً اس سے وعدہ کیا۔

"مجھے یقین ہے اسی لیے تو میں اتنی بڑی بازی کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا ہوں... لیکن بار بار یقین دہانی اس لیے چاہ رہا ہوں کہ مجھے لگتا ہے، میں ایک گرداب میں داخل

ہونے والا ہوں جس سے بہ آسانی باہر نہیں آسکوں گا اور نہ ہی مجھے اتنی مہلت مل سکے گی کہ میں اپنے پیاروں کا ذاتی طور پر خیال رکھ سکوں، اس لیے ان کی طرف سے مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے اس بار بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''میری اور تمہاری دوستی اگرچہ بہت پرانی نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس دوستی کی بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کر سکو۔ تمہیں یا تمہارے پیاروں کو کسی بھی صورت میں تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔ کم از کم مجھے تم ہر صورت میں اپنا خیر خواہ پاؤ گے۔'' ذیشان اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کی قربانی دینے جا رہا تھا تو اسے اتنا تو حق حاصل تھا کہ اپنے لیے کچھ یقین دہانیاں جمع کر لے اس لیے ہر ممکن طریقے سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے لیے یہ کام ناممکن ہے یا تم کسی قسم کے شکوک و شبہات کا شکار ہو تو میرے سامنے کھل کر اس کا اعتراف کر سکتے ہو۔ ابھی صرف ایک منصوبہ بنایا گیا ہے، عملی طور پر کوئی خاص اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے تم اگر چاہو تو پیچھے بھی ہٹ سکتے ہو۔ کرنل صاحب سے میں خود بات کر لوں گا۔'' ذیشان نے ایک ایسی بھی بات کہہ دی کہ اگر اس کے دل میں کہیں کوئی شک ہو تو کھل کر سامنے آجائے اور وہ مجبوری میں کوئی قدم نہ اٹھائے۔

''مجھے اگر پیچھے ہٹنا ہوتا تو ہامی ہی نہیں بھرتا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو وقتی جذبات کے تحت بلاسوچے سمجھے کمزور فیصلے کرتے ہیں۔'' اس کا لہجہ خود بہ خود سرد ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ذیشان کی پیش کش میں اس نے اپنے لیے ہتک محسوس کی ہو۔ بہرحال، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''میں نے کرنل صاحب سے جو وعدہ کیا اس پر قائم ہوں اسی لیے اپنی کچھ ذمے داریاں نمٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنی فیملی کے مفادات کے بارے میں سوچنے کے علاوہ میں نے اپنے دو خاص بندوں مشابرم خان اور جگو کو تمہارا نمبر اس ہدایت کے ساتھ نوٹ کروا دیا ہے کہ اگر میں دستیاب نہ ہوں یا کسی حادثے وغیرہ کا شکار ہو جاؤں تو وہ ہر وہ اطلاع جو مجھے دی جانے والی ہو تمہیں دے دیں۔ میں نے انہیں یہ بھی ہدایت کر دی ہے کہ وہ تم سے ہر ممکن تعاون کریں اور تمہارے احکامات کی بھی اسی طرح پیروی کریں جیسے میرے کہے پر عمل کرتے ہیں۔''

''تھینک یو سو مچ شہریار! تمہارے اس خلوص کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' ذیشان نے فوراً اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔'' اس کا لہجہ اب بھی روکھا تھا۔

''آئی ایم ویری سوری یار! مجھے معلوم ہے کہ تم ہرٹ ہوئے ہو لیکن بعض باتوں کا وقت پر ہی واضح ہو جانا بہتر ہے، ورنہ آنے والے وقت میں آدمی کے پاس صرف پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے۔'' ذیشان نے کھلے دل سے اس سے معذرت طلب کر لی۔

''اٹس اوکے۔ اب ہمیں یہ باتیں چھوڑ کر اصل موضوع پر بات کرنی چاہیے۔ چودھری کے کارخانے پر کامیاب ریڈ اپنی جگہ لیکن میں حیران ہوں کہ وہاں سی ایف پی کے گارڈز ہونے کے باوجود معاملہ پہلے کیوں نہیں کھلا اور ہمیں اطلاع باہر سے کیوں ملی؟'' اس نے تیزی سے موضوع بدل دیا۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ سی ایف پی آج پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں کام کر رہی ہے۔ چنانچہ یہاں ہمارے خاص آدمیوں کے علاوہ بہت سے عام لوگ بھی ملازمت کرتے ہیں۔ چودھری نے جب اپنے کارخانے کی سیکیورٹی کے لیے گارڈز کی درخواست کی تو اسے ایک عام نوعیت کا معاملہ سمجھا گیا چنانچہ خاص ملازمین کے بجائے عام افراد کو ہی ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا۔ چودھری نے ان گارڈز میں سے دو کو پیسے کے بل بوتے پر خرید لیا۔ یہ گارڈز دن اور رات کی شفٹوں میں تہ خانے والے حصے کے باہر ڈیوٹی دیتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی ڈیلی رپورٹ میں اس بات سے آگاہ کر دیا کہ کارخانے کے تہ خانے کو بچوں کے ڈائپرز کی تیاری کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے لیکن دیگر مشکوک حرکات و سکنات کے بارے میں کوئی رپورٹ نہیں دی... بلکہ یہ کہ وہ وہاں چودھری کے مفادات کا بھرپور تحفظ کر رہے تھے اور ان کی موجودگی کے باعث کسی کی مجال نہیں تھی کہ بلا اجازت تہ خانے میں داخل ہو سکے۔'' ذیشان نے اس صورتِ حال واضح کی۔

''ٹھیک ہے یہ تو میں سمجھ گیا لیکن ابھی تک مجھ پر اس کام کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے، میرا نام اور حلیہ بدل کر آخر مجھ سے کیا کام لیا جائے گا؟'' اس نے بے شک کرنل صاحب کے سامنے ہامی بھر لی تھی لیکن فطری طور پر ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس کی وجہ سے سوال کرنے پر مجبور تھا۔

''کام تم وہی کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو لیکن تمہارا دائرۂ کار اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا اور واضح ہدف تو چودھری کی شکل میں ہے۔ وہ وطن واپس آجاتا ہے تو اس بار ہم نے اس پر

ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی بھی سطح کے ردِعمل کی پروا کیے بغیر ہم اسے خاموشی سے اٹھا لیں گے اور پھر اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کارروائی کی جائے گی جس میں تم کلیدی کردار ادا کرو گے... کیونکہ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ چودھری کے انکشافات کی روشنی میں جو لوگ سامنے آئیں گے، ہم ان پر قانونی طریقے سے ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے اور جو بھی کیا جائے گا خفیہ طریقے سے ہی کیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چودھری یہاں کے حالات اپنے لیے ناموافق دیکھ کر واپس ہی نہ آئے، ایسے میں تمہیں اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ ہر دو صورتوں میں تمہیں تمہاری ڈیمانڈ کے مطابق افرادی قوت اور دیگر سہولیات فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔''

ذیشان نے پہلی بار کھل کر اسے بتایا تو اس پر بہت کچھ واضح ہو گیا۔ اپنی اصل شخصیت کے ساتھ وہ دشمن عناصر کے خلاف برسرِپیکار تو تھا لیکن ان کی نظروں میں آنے کی وجہ سے ایک طرف تو جہاں اس کے لیے خطرات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے، وہیں وہ کھل کر ان کے خلاف کچھ کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ پچھلے دنوں نور کوٹ سے لاہور آتے ہوئے اس کی گاڑی کا تعاقب اور اس کی سرگرمیوں سے واقف رہنے کے لیے مسلسل استعمال کی جانے والی ڈیوائس اس حقیقت کا بین ثبوت تھے۔ ماریا کے اپنے انجام تک پہنچنے کے باوجود وہ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ بھی اسے گھیرنے کے لیے کوئی اور حربہ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ وہ کسی صورت نہیں بھول سکتا تھا کہ موساد نے اسے قابو میں رکھنے کے لیے اپنی خوب رو اور ذہین ایجنٹ کلارا اینڈرسن کو ڈاکٹر ماریا کے روپ میں کس چالاکی کے ساتھ اس کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ اگر کچھ ایسے اتفاقات نہ ہوتے کہ وہ ماریا کی ذات پر شک نہ کر پاتا تو آج بھی وہ نہایت چالاکی سے اپنا کام انجام دے رہی ہوتی۔ یہ وہی تو تھی جس کی سفارش پر اس نے عابد انصاری کی بطور فاریسٹ آفیسر تعیناتی کی حمایت کی تھی۔ عابد انصاری کی ظاہری شخصیت کچھ ایسی نفیس تھی کہ وہ دھوکا کھا گیا اور اس کے ساتھ پچھلے فاریسٹ آفیسر باجوہ کی طرح کی رعایتیں روا نہ رکھی تھیں۔ یہاں تک کہ اس نے چند درختوں کو قانون کے مطابق کاٹ کر ضلع سے باہر بھیجنے کی اجازت چاہی تو اس نے اس پر بھروسا کرتے ہوئے معمول کی چیکنگ بھی نہیں کروائی تھی۔ اب یہ تو عابد انصاری اور اس کے ساتھی جانتے تھے کہ بظاہر قانون کے دائرے میں رہ کر وہ لوگ کیسے گل کھلا رہے تھے لیکن جو بھی بات تھی، یہ طے تھا کہ گڑبڑ خاصی بڑی نوعیت کی ہے ورنہ اتنا بڑا گیم نہ کھیلا جاتا۔

ماریا کا خیال ذہن میں آتے ہی اسے یاد آیا کہ ابھی تک اس نے اس کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اس کی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا البتہ ماموں اور ممانی کو شریکِ راز کر لیا تھا... اور اب انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے ذیشان کی مدد سے باقی منصوبے پر بھی عمل کیا جا سکتا تھا چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد ذیشان سے مخاطب ہوا۔

''بات کافی واضح ہو گئی ہے اس لیے میں بھی تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے میدانِ عمل سے غائب ظاہر کرنے کے لیے مجھ پر قاتلانہ حملے کا ڈراما کرنے کے مقابلے میں اتفاقی حادثے کا سہارا لینا زیادہ مناسب رہے گا کیونکہ میرے جتنے بھی دشمن ہیں، ان سب کا کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے کچھ جوڑ ہے اس لیے جعلی قاتلانہ حملہ ظاہر کرنے کی صورت میں وہ فوراً اندازہ لگا لیں گے کہ ہم کوئی گہری منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اتفاقی حادثے نے اگر انہیں چونکایا بھی تو بالآخر وہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہیں یقین دلانے کے لیے ٹھوس ثبوتوں کی فراہمی تو تم نے یقینی بنانے کا سوچ ہی لیا ہوگا۔''

''ہاں، اس سلسلے میں ہماری تیاری مکمل ہے۔ اتفاق سے قسمت نے بھی ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا کہ اشیش کمار نے ہماری کسٹڈی میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ خودکشی کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ تو تھا ہی نہیں اس لیے اس نے دیواروں سے ہی بے طرح اپنا سر اور چہرہ ٹکرا کر مرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کامیاب تو نہیں ہو سکا لیکن سر پر ایسی شدید ضرب لگی کہ وہ کوما میں چلا گیا۔ اپنی کوشش کے نتیجے میں اس نے چہرے کے خدوخال الگ خراب کر ڈالے لیکن ہمارے لیے خاصی آسانی ہو گئی ہے۔ اس کا قد و قامت ایسا ہے کہ ہم آسانی سے اسے تمہاری جگہ دے سکتے ہیں۔ اس کے فنگر پرنٹس پہلے ہی تفتیش کی سختیوں سے گزرتے ہوئے ضائع ہو چکے ہیں۔ غرضیکہ ہم اسے تمہاری جگہ دے دیں گے تو ثبوت کی تلاش کرنے والوں کو کسی طور یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ اسپتال میں داخل شخص تمہاری جگہ کوئی اور ہے۔ باقی نگرانی وغیرہ سخت رکھی جائے گی تو کسی کو زیادہ مداخلت کا موقع ہی نہیں مل سکے گا۔''

ذیشان خاصا مطمئن لگ رہا تھا البتہ اس کے لیے اشیش کمار کے بارے میں ملنے والی اطلاع تھوڑی سی مایوس کن تھی لیکن پھر اس نے خود کو یہ سمجھا کر مطمئن کر لیا کہ اتنے عرصے میں اشیش سے جتنی معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں کی

جا چکی تھیں اور وہ معلومات اس اعتبار سے زیادہ سودمند بھی ثابت نہیں ہوئی تھیں کہ اشیش کے بتائے ہوئے کسی بھی ٹھکانے پر وہ اس کے کسی ساتھی کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ چالاک دشمن نے اپنے ساتھی کے پکڑے جانے کی خبر ملتے ہی اپنا ہر ٹھکانا چھوڑ دیا تھا۔

''اوکے... یہ تمہارے مسائل ہیں۔ تمہاری مرضی ہے کہ تم انہیں کس طرح ہینڈل کرو۔ مجھے اپنے مسائل سے نمٹنا ہے اور ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ماریا کی غیر موجودگی کا جواز پیش کرنا ہے۔ میں نے پچھلی تاریخوں میں اس کا طلاق نامہ تیار کروالیا ہے۔ اس طلاق نامے کی کاپی میں ممانی جان کو دے دوں گا اس طرح وہ بعد میں لوگوں کو ماریا کی عدم موجودگی کا جواز آسانی سے دے سکیں گی۔ میڈیا کی انوالمنٹ کی صورت میں بھی ایک مربوط کہانی تیار ملے گی اور میری فیملی کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' ذیشان کی دی ہوئی اطلاع پر کوئی بھی تبصرہ کرنے کے بجائے اس نے گفتگو کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا۔

''میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے پیچھے ہم تمہاری فیملی سے غافل نہیں رہیں گے۔ سی ایف پی کے ملازم کے علاوہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں بھی ان لوگوں کا پورا پورا خیال رکھوں گا اور کسی صورت تمہارے مفادات پر ضرب نہیں پڑنے دوں گا۔'' ذیشان کی پُرخلوص یقین دہانی نے اسے خاصا مطمئن کردیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اتنا کمزور نہیں ہے کہ آسانی سے کوئی ان پر دباؤ ڈال سکے یا کسی طرح کا نقصان پہنچا سکے لیکن پھر بھی اسے اپنی فیملی کے لیے بے تحاشا محبت کی وجہ سے ان کی فکر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑھاپے اور صدموں سے کمزور ہو جانے والے ماموں اور ممانی کو زیادہ امتحانوں سے گزرنا پڑے۔ اس لیے بار بار ان کی فکر دامن گیر ہوجاتی تھی لیکن اس وقت اس نے خود کو خاصا مطمئن محسوس کیا۔ بہت دنوں بعد ایسا تھا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ بھی نہیں تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ اپنے لیے ایک راہ کا تعین کرچکا تھا ورنہ ذیشان کی بتائی ہوئی مختصر تفصیل سے ہی واضح تھا کہ آنے والا وقت اپنے جلو میں اس کے لیے بہت سے تہلکے اور ہنگامے لے کر آرہا ہے... پھر بھی وہ خوش تھا کہ اپنی فطرت کے مطابق کھل کر وہ سب کچھ کرسکے گا جو کرنا چاہتا ہے۔ اس کی مہم جو فطرت اے سی کے خول کو توڑ کر باہر نکل آنے کے خیال سے بہت خوش تھی۔

☆☆☆

پاکستان سے ملنے والی خبریں چودھری کے لیے پریشان کن تھیں۔ اس کی فیکٹری سیل کردی گئی تھی اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے تھے۔ منشی اللہ رکھ نے اسے فون پر تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ چھاپا کسی خفیہ سرکاری ایجنسی کے اہلکاروں نے مارا تھا جنہوں نے اپنی شناخت ظاہر نہیں کی اور اپنی کارروائی کرنے کے بعد یک دم ہی پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ظاہری طور پر اب یہ کیس پولیس کے پاس تھا لیکن یہ بات سمجھی جاسکتی تھی کہ خفیہ ایجنسی نے اس معاملے پر اپنی نگاہ رکھی ہوگی۔ منشی خود احتیاطاً روپوش ہوگیا تھا۔ ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ چودھری کی غیر موجودگی میں اسے ہی گرفتار کرلیا جاتا۔ جیسا کہ فیکٹری کے منیجر... کو حراست میں لے کر زیر تفتیش رکھا گیا تھا۔ چودھری کو اس کی فکر نہیں تھی کیونکہ منیجر کچھ جانتا ہی نہیں تھا اور اس کا دائرہ کار جوتوں کے کاروبار تک ہی محدود تھا لیکن وہ خود اپنی فکر میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کے پاس دولت کی بے شک کوئی کمی نہیں تھی اور فارن بینکوں میں بھی ٹھیک ٹھاک رقوم موجود تھیں لیکن اصل راج پاٹ تو پاکستان میں ہی تھا۔ سونا اگلنے والی زمینیں اور نوٹوں کی بارش کرنے والے کارخانے اور فیکٹریاں چھوڑ کر وہ کس طرح کہیں اور رہ سکتا تھا۔ پھر دولت کمانے کی جو ایک اور راہ اسے ملی تھی، اس کا انحصار بھی اسی بات پر تھا کہ وہ پاکستان میں رہتا۔ ہیروئن کی تیاری اور اسمگلنگ کے لیے اس کی خدمات لینے والوں نے اس کا انتخاب کیا ہی اس لیے تھا کہ وہ پیرآباد کا بڑا چودھری تھا جس کا اثر و نفوذ اپنے گاؤں کے علاوہ اردگرد کے علاقوں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ اگر اس سے پیرآباد کے چودھری اور مطلق العنان حاکم ہونے کا اعزاز ہی چھن جاتا تو پھر اسے ڈھیروں کے حساب سے ڈالرز سے نوازنے والے کیونکر گھاس ڈالتے؟ اس صورتِ حال میں وہ الفا سے بات کرکے اسے مطلع کرنے کی ہمت بھی نہیں کرپارہا تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہی کوئی راہ سجھا دیتا۔

پریشانی کے عالم میں وہ کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ نیویارک پہنچ کر اس نے حسب وعدہ مراد شاہ کے ساتھ ہی رہائش رکھی تھی اور اس وقت بھی اسی کے اپارٹمنٹ میں ٹہلتے ٹہلتے اسے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑگئی۔

''گڑیا! کیوں دادا ابو کے کمرے کا دروازہ ناک کر رہی ہو۔ وہ ڈسٹرب ہوں گے۔'' دستک کے جواب میں کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے قبل ہی اسے دروازے کے پار اپنی بہو کی آواز سنائی دی۔

''مجھے دادا ابو کے پاس جانا ہے ماما... ان سے پاری (پیار) لینی ہے۔'' ننھی سی آواز میں معصوم سا مطالبہ سنائی دیا۔

''دادا ابو خود باہر آئیں تو آپ ان سے پاری لے لینا۔ ابھی آپ نے انہیں تنگ کیا تو وہ آپ سے ناراض ہوں گے اور ماما کو بھی بہت ڈانٹیں گے۔'' شاہدہ نے بچی کو سمجھایا اور پھر ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے شاہدہ زبردستی بچی کو دروازے سے دور لے جارہی ہو۔ چودھری نے اس مسئلے کے حل ہوجانے پر زور سے سر جھٹکا اور ایک بار پھر ٹہلنا شروع کردیا۔

اس کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اپنی معصوم پوتی کی خواہش سن کر فوراً ہی دروازہ کھول دیتا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر کر خوب پیار کرتا لیکن وہ چودھری افتخار عالم شاہ تھا جو عام انسانی جذبات اور رشتوں کی قدر کرنا جانتا ہی نہیں تھا خصوصاً اگر ان رشتوں اور جذبات کا تعلق عورت سے ہو۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی، بہو اور پوتی کسی بھی رشتے میں اس نے کبھی عورت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے نزدیک عورت ہر روپ میں پیر کی جوتی ہی تھی جس سے وہ اپنے حساب کتاب کے مطابق ہی برتاؤ کرتا تھا۔ کشور کے فرار کے بعد تو اس کا دل اور بھی زیادہ سخت ہوگیا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے بنائے ظالمانہ قوانین اور فیصلے بیٹی کے فرار کا سبب بنے تھے۔ اسے یہی لگتا تھا کہ اس نے اپنی باقی دونوں بیٹیوں کی نسبت کشور کو جو تھوڑی سی آزادی دی تھی۔ اس نے اس کا دماغ خراب کیا تھا اور وہ اس کی عزت کو روند کر حویلی کی دہلیز پار کرگئی تھی۔

اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ بنیادی انسانی حقوق کو چھین کر بدلے میں دی جانے والی تھوڑی سی سہولیات نعم البدل ثابت نہیں ہوسکتیں۔ اپنی جاہلانہ اور جاگیردارانہ سوچ کے زیر اثر کشور والے واقعے کے بعد اس کے دل میں عورت کے لیے نفرت مزید گہری ہوگئی تھی۔ جب تک نفرت کا یہ زہر کشور اور آفتاب کی رگوں میں اتار کر وہ انہیں زندگی سے محروم نہ کردیتا، اسے کسی صورت سکون نہیں ملتا۔ لیکن وہ دونوں اس کی دسترس میں آہی نہیں رہے تھے اور فی الحال تو وہ دوسرے سنگین نوعیت کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ اس الجھن کا حل ہی سوچنے کے لیے وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ حل تو نہیں سوجھا مگر اس کے خاص موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

گھنٹی کی آواز سن کر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ یقینی طور پر دوسری طرف الفا ہی ہوسکتا تھا اور اس وقت اس کے لیے اس سے بات کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن بات نہ کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی اس لیے بادل ناخواستہ کال ریسیو کرلی۔

''کیا کررہے ہو چودھری؟'' الفا نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر۔'' وہ اتنا ہی جواب دے سکا۔

''یہ جاننے کے باوجود کہ تمہارے کارخانے پر ریڈ ہو چکا ہے اور وہاں سے مشینوں، آلات اور مال کی برآمدگی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہنری کو بھی گرفتار کرکے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا ہے... تم کچھ نہیں کررہے؟'' الفا کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔

''میں اس خبر پر بہت پریشان ہوں سر اور سمجھ نہیں آرہا کہ کس طرح اس صورتِ حال سے نمٹوں۔ آپ کا جو نقصان ہوا ہے سو ہوا ہے، مجھے خود ذاتی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میں تو واپس اپنے وطن بھی نہیں جاسکتا۔'' اس کے لیے الفا کا لہجہ خاصا ناگوار تھا چنانچہ اس سے کافی حد تک دبنے کے باوجود وہ اسے اپنا نقصان جتائے بغیر نہ رہ سکا۔

''تمہیں ایسا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے جس کی تلافی نہ ہوسکے۔ ہم جب کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے معاملات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ تمہارے جس کارخانے پر ریڈ پڑا ہے، قانون کی رو سے وہ تمہاری ملکیت ہی نہیں ہے اس لیے کوئی تم پر گرفت بھی نہیں کرسکتا۔''

''کیا مطلب؟'' الفا کے الفاظ نے اسے چونکا دیا۔

''ہم نے یہ انتظام کردیا ہے کہ کاغذات کے ذریعے تم یہ ثابت کرسکو کہ کچھ عرصہ قبل تم نے اپنا کارخانہ فروخت کردیا تھا۔ کارخانے کے نئے مالک کا نام سردار وہاب خان درج ہے جو ریکارڈ کے مطابق بیرونِ ملک رہائش پذیر ہے۔ اس طرح تم اس سارے بکھیڑے سے مکمل طور پر بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ سردار وہاب خان کا کوئی وجود نہیں ہے اس لیے اسے کوئی گرفتار بھی نہیں کرسکتا۔ یوں معاملہ آسانی سے رفع دفع ہوجائے گا۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا ذاتی نقصان کہاں ہوا؟ تم تو مکمل طور پر محفوظ ہو۔'' الفا کی بات سن کر چودھری حیرت اور خوشی سے دم بخود رہ گیا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' الفاظ بہت مشکل سے اس کی زبان سے نکلے۔

''تمہارے ملک میں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ جتنے بے ایمان تم لوگ ہو، پیسے کے بل بوتے پر تم سے کچھ بھی کروایا جا سکتا ہے۔'' الفا نے گویا اس کے منہ پر طمانچہ مارا لیکن چودھری جیسے ہوس پرست کے لیے اس قسم کی طعنہ زنی کی کوئی

اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنے مفادات سے آگے کچھ بھی سوچنے کا اہل نہیں تھا۔

''میری سمجھ نہیں آرہا کہ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا۔'' اس نے اپنی شکرگزاری اور خوشی کا اظہار کیا۔

''تم پہلے اپنی پوزیشن کلیئر کرو پھر ہم آگے کے معاملات دیکھیں گے۔ ایک کارخانے پر پڑنے والے ریڈ سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی جاسکتی ہے، ہمارا اصل پروجیکٹ محفوظ رہنا چاہیے... تم اس کی فکر کرو۔ افیون کے کھیت کسی طور کسی کی نظر میں نہیں آنے چاہئیں۔ ان کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے، کر گزرنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' خلافِ توقع الفا نے بہت جلد اپنا لہجہ نرم کرلیا تھا اور اس سے ابتدائی ترش روئی سے بات نہیں کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے سر... جیسا آپ کا حکم۔'' چودھری خوشی میں کچھ اور بھی فرماں برداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ فون بند ہوا تو اس کی پیشانی پر پھیلا تفکر کا جال مٹ چکا تھا اور اس کی جگہ شادابی نے لے لی تھی۔

☆☆☆

بچے کو تھپک تھپک کر سلاتی شہزادی کی نظریں اپنے مختصر سے کوارٹر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آج رات ہی یہاں سے نکلنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا اس لیے دیکھ رہی تھی کہ اس کا کوئی سامان تو اِدھر اُدھر نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے تو وہ بہت مختصر سامان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس سامان میں اس کے اور بچے کے کپڑوں کے علاوہ بچے کی ضروریات کے حوالے سے ہی چند چیزیں موجود تھیں جنہیں وہ پہلے ہی سمیٹ کر رکھ چکی تھی اور اب بس اس بات کی منتظر تھی کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل جائے۔ بنگلے سے نکل کر اسے بس تھوڑی ہی دیر کی پریشانی ہوتی پھر آگے ایک مخصوص مقام پر اسے مشابرم خان مل جاتا۔ اسے یہاں بھیجنے سے قبل ہی شہریار نے سارا منصوبہ طے کر دیا تھا۔ مشابرم خان کو ہر رات مخصوص اوقات میں بنگلے سے نزدیک ایک محفوظ مقام پر موجود رہنا تھا۔ شہزادی کو کوئی خاص معلومات حاصل ہوتیں یا وہ خود کسی وجہ سے ضرورت محسوس کرتی تو اس جگہ پہنچ کر مشابرم خان سے مل سکتی تھی۔ ابھی تک اسے ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اتفاق سے آج وہ جو کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی، وہ اطلاع بہت خاص تھی جسے وہ بلاتاخیر مشابرم خان تک پہنچا دینا چاہتی تھی۔ دوسری پریشانی اسے بہرام کی طرف سے تھی۔ یوں تو اس نے اسے اپنی صحت بہتر کرنے اور رنگ وروپ نکھارنے تک مہلت دی تھی لیکن بدنیت آدمی کا کیا بھروسا ہوتا ہے کہ کب اس کی نیت خراب ہو جائے اور وہ موقع ملتے ہی شب خون مار بیٹھے۔

وہ بہرام.... کی نیت بدل جانے کا خطرہ مول لیے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے یہاں جو کام کرنا تھا، وہ کر چکی تھی اس لیے مزید رکنا بیکار تھا۔ اپنے اچانک فرار کی وجہ وہ منشی اللہ رکھا کی بیوی کو بتا کر معذرت طلب کر سکتی تھی۔ مالی مسائل کے حل کے لیے پہلے ہی شہریار نے وعدہ کر رکھا تھا اس لیے ملازمت کی تو اسے ویسے بھی پروا نہیں تھی۔ بس اسے کسی طرح یہاں سے نکلنا تھا اور وہ بھی فوری طور پر کیونکہ اردگرد بظاہر کوئی بڑا خطرہ نظر نہ آنے کے باوجود وہ اس بنگلے میں عجیب سی وحشت محسوس کر رہی تھی اور یہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش اتنی شدت سے اسے بے چین کر رہی تھی کہ اس کے لیے مزید ایک دن بھی یہاں رکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس کی تھپکیوں اور ہلکوروں سے معصوم بچہ جونہی نیند کی آغوش میں پہنچا، وہ اسے چارپائی پر لٹا کر خود اٹھ کھڑی ہوئی اور کوارٹر کی واحد کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔ معمول کے مطابق رات کے ابتدائی حصے میں ہی بیرونی حصے کی لائٹیں بند کر دی گئی تھیں اور ملازمین کی آمدورفت کا سلسلہ بھی موقوف ہو چکا تھا۔ عابد انصاری صبح جلدی اٹھنے اور رات کو جلدی سونے کا عادی تھا اور اس نے یہی معمول اپنے ملازمین کے لیے بھی مقرر کیا تھا، اس لیے رات کے کھانے کے بعد بنگلے میں چہل پہل ختم ہو جاتی تھی۔ اپنے چند دن کے قیام میں اس معمول سے واقف ہو جانے والی شہزادی نے احتیاطاً کھڑکی سے جھانک کر اپنی مزید تسلی کرلی تو پٹ بند کر کے واپس چارپائی کے قریب آئی اور پہلے سے وہاں باندھ کر رکھی اپنے سامان کی گٹھڑی اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکائی پھر سوئے ہوئے بچے کو بھی اپنی آغوش میں بھر لیا۔ بچہ گہری نیند میں تھا۔ اٹھائے جانے پر تھوڑا سا کسمسایا تو ضرور لیکن ماں کے وجود کی گرمی محسوس کر کے ایک بار پھر بے خبر ہو گیا۔ شہزادی بنا آواز کے محتاط قدموں سے باہر نکلی اور کوارٹر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک بار پھر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں اسے وہاں اپنے سوا کسی دوسرے متنفس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا اور تسلی ہو جانے پر اس نے اپنے قدموں کو ایک بار پھر حرکت دے دی۔ اس کا رخ بنگلے کے مین گیٹ کے بجائے پچھلی جانب تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مین گیٹ پر ہر وقت مسلح چوکیدار موجود رہتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں عقبی حصے میں موجود ایک چھوٹا سا

دروازہ عموماً صرف کنڈی لگا کر بند کر دینے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ اس دروازے کو عموماً ملازمین جنگل میں آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ آمد و رفت لکڑی کے حصول، چھوٹے جانوروں کے شکار یا جنگل سے گزرتی نہر سے مچھلیاں پکڑنے کے سلسلے میں ہوتی تھی اور کوئی ان ملازمین سے پوچھ گچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ شہزادی خود بھی ایک بار خانساماں کی بیوی کے ساتھ اس راستے سے لکڑیاں چننے جنگل میں جا چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرف سے جانے میں اسے بنگلے کا پورا چکر کاٹ کر اس راستے پر جانا پڑے گا جہاں سے اسے مشابرم خان تک پہنچنا ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ رات کے اس پہر مین گیٹ سے کسی طور نہیں گزر سکتی تھی اس لیے یہی راستہ اختیار کرنا بہتر تھا۔

ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اسے واہمہ سا ہو رہا تھا کہ وہ یہ آواز اپنے کانوں سے سن رہی ہے۔ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی وہ دروازے پر پہنچی اور احتیاط سے دروازے کی بھاری کنڈی کھولی۔ خاموش فضا میں کنڈی کھولے جانے سے ارتعاش سا پیدا ہوا۔ وہ اپنی جگہ بُری طرح سہم گئی لیکن جب کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ آگے گھور جنگل پھیلا ہوا تھا جسے دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جنگل کی ہولناک تاریکی سے نظر چراتی ہوئی بنگلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ سامنے کے رخ پر ایک پگڈنڈی تھی جس پر سے وہ بغیر ٹھوکر کھائے گزر سکتی تھی۔ اس پگڈنڈی کے اختتام پر اسے پانچ منٹ مزید چلنا پڑتا پھر وہ اس مقام تک پہنچ جاتی جہاں اس کی مشابرم خان سے ملاقات ہو جاتی۔ بچے کو سینے سے لگائے وہ سہمی سہمی سی اس راستے پر سے گزرتی رہی۔ پگڈنڈی پر قدم رکھنے سے قبل اس نے بنگلے کے گیٹ پر موجود اسلحہ بردار چوکیدار کا سایہ دیکھا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ چوکیدار اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ پگڈنڈی کے اختتام پر جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ چوکیدار کی حدِ نگاہ سے نکل آئی ہے تو اس نے اپنی گٹھڑی میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹول کر کچھ نکالا۔ یہ ایک پنسل ٹارچ تھی جو اسے مشابرم خان نے ہی ایسے کسی موقع کے لیے فراہم کی تھی۔ پنسل ٹارچ کی روشنی نے اس کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ پگڈنڈی کے صاف اور ہموار راستے کی طرح وہ اس مقام سے صرف اندازے کی بنیاد پر نہیں گزر سکتی تھی۔ یہ راستہ ناہموار و کچا تھا جہاں پتھر اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

غنیمت یہ تھا کہ یہاں تک جنگلی جانوروں کی پہنچ نہیں تھی جنگل سے نکل کر یہاں کا رخ نہیں کرتے تھے۔ بہ... بہت خرگوش، گلہری اور چوہوں جیسے چھوٹے اور بے ضر... اس حصے میں پھدکتے پھرتے تھے... اور گاؤں کی... شہزادی اتنی بزدل نہیں تھی کہ ان بے ضرر جانوروں سے... زدہ ہو جاتی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی پنسل ٹا... محدود روشنی میں آگے بڑھتی رہی اور آخر کار اس مقام پر... گئی جہاں برگد کے تین گھنے اور سن رسیدہ درخت پہلو... کھڑے تھے۔

ان درختوں میں سے ایک پر مشابرم خان نے... ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ شہزادی نے حسبِ ہدایت ٹارچ کا... اوپر کی طرف کر کے اسے تین بار جلایا بجھایا۔ طے... پروگرام کے مطابق اس کے بعد مشابرم خان کو اپنی کمین... سے نکل کر اس کے سامنے آ جانا چاہیے تھا لیکن جب چند... کے انتظار کے باوجود اس کی وہاں موجودگی کے کوئی آثار... نہ آئے تو اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ سو فیصد... اس یقین کے ساتھ بنگلے سے نکلی تھی کہ مشابرم خان وہاں... موجود ہو گا۔ یہاں آتے وقت اس نے ایک بار بھی نہیں سو... تھا کہ اگر مشابرم خان مخصوص مقام پر موجود نہ ہوا تو وہ... کرے گی؟ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے ایک بار پھر ٹا... کا رخ اوپر کی طرف کر کے کاشن دینا شروع کیا لیکن اگلے... لمحے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی پنسل ٹارچ کی مد... روشنی کے ساتھ ہی وہاں بہت تیز روشنی پھیل گئی تھی اور وہ دیکھ... سکتی تھی کہ یہ روشنی اس طاقت ور سرچ لائٹ سے نکل رہی ہے... جسے بہرام نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔ بہرام کے ساتھ... ہی اس کا ایک اسلحہ بردار ساتھی بھی کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کر رہی ہے تُو یہاں؟'' بہرام نے کرخت آواز میں اس سے پوچھا لیکن شہزادی اس لائق نہیں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دے سکتی۔ خوف کی زیادتی سے اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''حق نواز! روشنی کر کے دیکھ کہ اوپر یہ اپنے کس ماں کے یار کو ڈھونڈ رہی تھی پھر اسے لے کر واپس بنگلے چلتے ہیں۔'' شہزادی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور خود شہزادی کی گُدّی پکڑ کر اس کے بال... وہ تکلیف سے بلبلا کر چیخ پڑی۔ اس بار اس کی آغوش میں سوئے بچے کی نیند برقرار نہ رہ سکی اور وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ بچے کی آواز سن کر وہ اور بھی سراسیمہ ہو گئی۔ اسے اپنی نازک پوزیشن کا اور بھی شدت سے اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ

...کا ننھا بچہ بھی شدید خطرے کی زد میں تھا۔ اس نے ...ی طور پر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے ...بھی بہرام کی گرفت میں تھے۔ بھاگنے کی کوشش میں ...س ایک زوردار جھٹکا ہی لگ سکا اور وہ جہاں کی تہاں ہی ... البتہ بہرام کا طیش مزید بڑھ گیا اور اس نے اس کے منہ ...ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ خوف سے ادھ موئی ہوئی ...اس کے لیے یہ تھپڑ بھی بہت تھا۔ وہ اس کے بعد مزید کوئی ...احتجاج نہیں کر سکی اور وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ اس دوران حق نواز ...نامی بندے نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔

''ادھر درخت پر تو وڈی زبردست مچان بندھی ہوئی ...بہرام! لگتا ہے کوئی بندہ پابندی سے ادھر وقت گزارتا ...مچان پر پانی کا برتن اور بھنی ہوئی مکئی بھی رکھی ہے۔ برتن ...کا پانی زیادہ باسی نہیں لگتا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو بھی ...آ کر بیٹھتا ہے، وہ کل یا پرسوں بھی ادھر آیا ہوگا اور برتن ...تازہ پانی بھرا ہو گا۔'' ٹارچ سمیت درخت کے اوپر ...والا حق نواز پُرجوش انداز میں بہرام کو رپورٹ دینے ...لگا۔ سن کر شہزادی مزید اندر ہی اندر لرزتی رہی۔ اس کی ...رات کے اس پہر چوری چھپے نکل کر یہاں تک پہنچنے ...حرکت کے لیے ایسے ثبوت ملنے شروع ہو گئے تھے کہ وہ ...کوئی جھوٹا بہانہ بھی نہیں گھڑ سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے تو اُدھر ہی رہ کر نگرانی کر۔ ہو سکتا ہے کہ ...کی ماں کا خصم تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے۔ میں اسے ...لے کر بنگلے جاتا ہوں پھر وہاں سے تیری مدد کے لیے کسی اور کو ...بھیج دوں گا۔'' بہرام نے رپورٹ سن کر حکم صادر کیا اور ...شہزادی کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر لگا کر بولا۔ ''چل ...بنگلے پہنچ کر تیرا حساب کتاب کرتا ہوں۔'' ٹھوکر کھا کر ...وہ بُری طرح بلبلا گئی لیکن بہرام کے حکم سے سرتابی کی ...مجال نہیں تھی اس لیے تکلیف پر قابو پاتے ہوئے کھڑی ہوئی ...سارے منظر میں بیک گراؤنڈ موسیقی کی ضرورت کو پورا ...کرنے کے لیے ایک جیسے سُر میں روتے اپنے بچے کو چپ ...کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ معصوم بچے کے لیے نیند میں ...خلل خاصا تکلیف دہ تھا اس لیے وہ آسانی سے ...راضی نہیں تھا۔

''اگر یہ تجھ سے چپ نہیں ہو رہا تو مجھے بتا، میں اس کا ...گلا دبا کر ہمیشہ کے لیے آواز بند کر دیتا ہوں۔'' اسے بازو ...پکڑ کر بنگلے کی طرف جانے والے راستے پر گھسیٹتے ہوئے ...غرایا۔ شہزادی نے گھبرا کر اپنا ہاتھ بچے کے منہ پر رکھ ...دیا تاکہ اس کی آواز بہرام کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اس

وقت وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ یہ سوچنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی کہ اس کا عمل بچے کے لیے تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ بنگلے تک کا مختصر راستہ جلدی طے ہو گیا اور وہ گیٹ پر الرٹ کھڑے چوکیدار کے سامنے پہنچ گئے۔

''آ گئے بہرام! لگتا ہے یہ یہاں سے نکل کر زیادہ دور نہیں گئی تھی۔'' اسے اپنے سامنے دیکھ کر چوکیدار نے تبصرہ کیا۔

''جا بھی کیسے سکتی تھی۔ اس جنگل میں اپن کا راج ہے۔ یہاں وہی آتا ہے اور یہاں سے وہی واپس جاتا ہے جسے ہم اجازت دیں۔ یہ ہماری اجازت سے آئی تھی تو ہم اسے اپنی اجازت کے بغیر جانے کیسے دیتے۔'' چوکیدار کو جواب دیتے ہوئے بہرام نے اسے اندر دھکیلا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دوبارہ اس قید خانے میں داخل ہو گئی جہاں سے کچھ دیر قبل اپنے تئیں بڑی آسانی سے فرار ہو گئی تھی۔ لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے صیاد اتنے بھی غافل نہیں تھے جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ ان کی فی الفور برگد کے درختوں کے نیچے آمد سے ظاہر تھا کہ وہ ابتدا ہی سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے ورنہ انہیں کیسے پتا چلتا کہ وہ بنگلے سے نکل کر سیدھی کہاں گئی ہے۔

''اب بتاؤ کہ تم کہاں اور کیوں گئی تھیں؟'' اسے گھسیٹ کر بنگلے کے ایک کمرے میں لے جانے کے بعد بہرام نے درشت لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

''تیری زبان کھلوانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تجھ سے زبردستی سچ اگلوانے کے چکر میں تیری ہڈیاں شڈیاں ٹوٹ جائیں۔'' بہرام نے اسے دھمکی دی جسے سن کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تو اس نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ شہزادی نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا اور بے اختیار ہی حلق کے بل چیخنے لگی۔ یہ اس کی چیخوں کا ہی اثر تھا کہ عابد انصاری اپنے بیڈروم سے نکل کر گاؤن کے بند باندھتے ہوئے سیدھا اسی کمرے میں چلا آیا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' ماں اور بچے دونوں کو ایک تسلسل سے روتے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''آپ کا خیال بالکل ٹھیک تھا صاحب۔ یہ موقع دیکھ کر بنگلے سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر میں آپ کے کہنے پر پہلے سے ہی اس کی نگرانی نہ کروا رہا ہوتا تو یہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی۔'' بہرام نے اسے اطلاع دی۔

''اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا بھی یا نہیں؟ یہ کس کے لیے کام کر رہی ہے؟'' اس نے فوراً ہی دوسرا سوال داغا۔

"یہ تو اس سے اگلوانا پڑے گا صاحب۔ ہم نے اسے ادھر برگد کے درختوں کے پاس سے پکڑا ہے۔ وہاں شاید کوئی اس سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔" بہرام نے جواب دیا۔

"تم رہنے دو، یہ کام میں خود ابھی دو منٹ میں کر لیتا ہوں۔" وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس اثنا میں شہزادی بچے کو اپنی چھاتی سے لگا کر خاموش کروا چکی تھی۔

"اس سے بچہ لے لو بہرام۔ جن سوالوں کے جواب دینے میں اسے مشکل ہوگی، ان کا جواب ہم بچے کی مدد سے آسانی سے لے لیں گے۔" الماری کھول کر اس میں سے کچھ نکالتے ہوئے عابد انصاری نے اپنے مخصوص مدھم لہجے میں بہرام کو حکم دیا تو اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر بچے کو اس کی بانہوں سے کھینچ لیا۔ ممتا کی ماری نے بچہ دینے میں مزاحمت کی کوشش کی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچے کا اوپری دھڑ بہرام کی گرفت میں چلا گیا اور وہ خود اس کی ٹانگیں پکڑی رہ گئی۔ دونوں طرف کی کھینچا تانی میں بچے کے نازک بدن میں زبردست کھچاؤ پیدا ہوا اور وہ تکلیف سے بلبلا کر رونے لگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شہزادی نے بچے کے پیر چھوڑ دیے۔ بچہ پوری طرح بہرام کی گرفت میں چلا گیا اور مچل مچل کر رونے لگا۔

"اللہ کے لیے صاحب! مجھے مافی دے دو۔ مجھے میرے بچے کے ساتھ یہاں سے جانے دو۔" وہ تڑپ کر عابد انصاری کے قدموں میں جا گری جو بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں بڑے سائز کی گہرے رنگ کے شیشے والی بوتل لیے کھڑا تھا۔

"اس بوتل کو غور سے دیکھ شہزادی۔ اس میں ایک بڑا زہریلا سانپ موجود ہے۔ اسے میں جس پر چھوڑ دوں' اسے ڈس ڈالتا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کے نشانے پر کوئی معصوم ننھا منا سا بچہ ہے۔" وہ اسے بڑی واضح دھمکی دے رہا تھا۔

"مینوں مافی دے دو صاحب! مجھے میرے بچے کی زندگی بخش دو۔ بدلے میں آپ جو حکم دو گے' میں مانوں گی۔" قدموں میں تو وہ پہلے ہی جھکی ہوئی تھی، اب اپنا سر بھی اس کے پیروں پر رکھ کر زمین پر پٹخنے لگی۔

"یہ اتنا زہریلا سانپ ہے کہ اگر کسی کڑیل جوان کو کاٹ لے تو اسے بھی پانی تک مانگنے کی مہلت نہیں مل پاتی۔ چھوٹے بچے کی تو ایک سے دوسری سانس بھی نہ آسکے گی۔" اس کی التجاؤں سے بے نیاز وہ اپنی ہی بکواس میں لگا تھا جسے سن سن کر وہ بے چاری اور بھی ہول رہی تھی۔

"رحم کرو صاحب! رحم کرو، میرے کاکے کو کچھ مت کہو۔ تم جو پوچھو گے میں بتاؤں گی، جو کہو گے وہ کروں گی۔ بس تم میرے بچے کو چھوڑ دو۔" وہ بُری طرح بلبلا رہی تھی۔

"تم کس کے لیے کام کر رہی ہو؟" بوتل کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اے سی صاحب کے لیے۔ انہوں نے مجھے ڈیوٹی دی تھی کہ بنگلے میں رہ کر مجھے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے، معلوم کر کے انہیں بتاؤں۔ ادھر برگد کے درخت کے پاس ان کے ڈرائیور کو میری مدد کے لیے موجود رہنا تھا پر ملوم نہیں وہ کدھر چلا گیا۔"

اس نے رونے سے سڑ سڑ کرتی ناک کو اوڑھنی کے پلو سے صاف کرتے ہوئے جواب دیا تو عابد انصاری نے بے ساختہ ایک گہرا سانس لیا اور جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "آج تم نے میری اور بہرام کی باتیں سن لی تھیں نا؟"

جواب میں شہزادی نے اثبات میں سر ہلایا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے معافی دے دو صاحب! میں مجبور تھی۔ اے سی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ میں پہلے ہی مشکل میں پھنسی ہوئی تھی، اگر ان کی گل نہ مانتی تو اپنے بچے کو روتا چھوڑ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑتا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اے سی تو بڑا انصاف پسند مشہور ہے۔" عابد انصاری حیران ہوا۔

"وہ گل اپنی جگہ ہے، پر میری بھی مجبوری تھی۔ اگر میں ان کی گل نہ مانتی تو قبر کھود کر اس میں سے مُردہ بچے کی ہڈیاں نکالنے کے جرم میں جیل میں بند رہتی۔ اے سی صاحب نے اس شرط پر مجھے وہاں سے نکلوایا کہ میں ان کی مدد کروں گی۔" اس نے بتایا۔

"تو تم قبر سے مُردوں کی ہڈیاں بھی چراتی ہو؟" عابد انصاری نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نہ جی، پر وہ جرم بھی الگ مجبوری میں ہو گیا تھا۔" تفصیل بتانے لگی کہ کس طرح بالے کی ماں ڈاکٹری علاج سے مایوس ہو کر ٹاہلی والا گاؤں کی خانقاہ پہنچ گئی تھی جہاں کے جعلی پیر نے علاج کے لیے مُردہ بچے کی ہڈیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کی ساس نے ہڈیوں کی فراہمی کا کام جبراً اسے سونپ دیا تھا اور اسے مجبوراً اپنے بچھڑے ہوئے بچوں کے حصول کے لیے یہ نازیبا حرکت کرنی پڑی تھی۔ بدقسمتی سے وہ قبر کھودتے ہوئے پکڑی گئی اور گاؤں والے اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ ڈاکٹر ماریا اور اے سی شہریار کی مداخلت سے اس کی گلوخلاصی ہوئی لیکن تھانے کچہری کے چکر نے اسے خوار کر کے رکھ دیا تھا۔ اس مصیبت سے نکلنے کے لیے اس نے شہریار سے تعاون کی ہامی بھری تھی اور اب اس کے لیے ایک اہم اطلاع لے کر یہاں سے جا رہی تھی۔ جس مقام پر اسے پکڑا گیا تھا، وہاں اصولاً اسے اے سی کے ڈرائیور مشابرم خان کو موجود ہونا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں تھا اور وہ خود بہرام کے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

اس سے ساری تفصیلات سن کر عابد انصاری نے ایک ہنکارا بھرا۔ شہزادی کے بارے میں اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ آج ہی اسے شک ہوا تھا کہ وہ اس کی اور بہرام کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی تھی اور آج ہی ثبوت بھی مل گیا تھا لیکن اس کے لیے اصل تشویش کی بات یہ تھی کہ اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود شہریار کو اس پر شک ہو گیا تھا جب ہی اس نے ملازمہ کے روپ میں اپنا ایک جاسوس اس کے بنگلے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ ملازمہ اس تک کوئی کارآمد اطلاع پہنچانے سے قبل پکڑی گئی تھی لیکن اب آئندہ اسے اور بھی زیادہ محتاط رہنا تھا۔ ان خطوط پر سوچتے ہوئے اس نے شہزادی کو تیز نظروں سے گھورا تو وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ نرم خو اور مہذب نظر آنے والے عابد انصاری کی آنکھوں میں اس وقت کسی درندے کی سی سفاکی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ سمجھتی، عابد انصاری نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور اس میں سے نہایت مہارت سے سیاہ چمکتی جلد والے سانپ کو نکال کر بچے پر پھینک دیا۔ سانپ کو دیکھ کر وہ دہشت سے چیخی اور پھر چیختی چلی گئی لیکن چیخوں کا یہ سلسلہ زیادہ دراز نہیں ہو سکا۔ کوڑیالے سانپ کے نکیلے دانتوں سے بدن میں اتر جانے والے زہر نے منٹوں میں ہی اسے چٹ پٹ کر دیا اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں یہ دیکھنے کے لائق بھی نہیں رہیں کہ اس کی گود کا چراغ گل کرنے والا وہ سیاہ عفریت اب اس کے جگر گوشے سے زندگی کی حرارت چھینتے جا رہا ہے۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ مشابرم خان نے گرما گرم چائے کی چسکی لینے کے بعد باہر کا رخ کیا۔ شہریار نے اسے ذمے داری دی تھی کہ ہر روز شہزادی کی خبر گیری کے لیے جایا کرے۔ اس نے شہزادی کو مطلع کر کے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے کے کافی حد تک قریب اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ برگد کے گھنے درخت پر خاصی اونچائی پر بنائی جانے والی وہ مچان اسے بہت بھاتی تھی۔ وہاں وہ کسی کی نظروں میں نہیں آتا تھا اس لیے اس کا سارا عرصہ عافیت میں گزرتا تھا لیکن روزانہ کی یہ ڈیوٹی اس اعتبار سے خاصی کوفت کا باعث تھی کہ ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور شہزادی نے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ لیکن بہرحال اسے اپنی ڈیوٹی تو انجام دینی ہی تھی اس لیے حسبِ عادت وہ..... روانگی سے قبل گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے لگا۔ اس کی خصوصی توجہ کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی گاڑی فرسٹ کلاس حالت میں تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ واپس پلٹا تاکہ وقت گزاری اور تھکن کے توڑ کے لیے تیار کروایا جانے والا چائے کا تھرماس لا کر گاڑی میں رکھ سکے۔ عمارت کے اندر داخل ہوا تو وہاں اسے عجیب سی ہلچل محسوس ہوئی۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ابھی چند منٹ قبل تو وہاں سب ٹھیک تھا پھر اب لوگ کیوں پریشان سے نظر آرہے ہیں؟

"خان! صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ بہت بُری حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔" اس کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی ایک نائب قاصد نے اسے اطلاع دی تو وہ بھاگتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔ پریشان عبدالمنان فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

"سر! اے سی صاحب...؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں عبدالمنان سے بس اتنا ہی کہا۔

وہ فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "دعا کرو مشابرم خان! میری لاہور میں آئی جی صاحب کے پی اے سے بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایکسیڈنٹ بہت خطرناک تھا۔ ٹرک تقریباً گاڑی پر چڑھ ہی گیا تھا۔ گاڑی کی جو حالت ہوئی ہے، اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اندر موجود شخص کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اے سی صاحب کو سخت تشویش ناک حالت میں سروسز اسپتال میں بھجوایا گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے فی الحال ان کی زندگی کی کوئی امید نہیں دلائی ہے۔ اس وقت انہیں سب کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔" عبدالمنان نے سخت افسردہ لہجے میں اسے اطلاع دی جسے سن کر مشابرم خان جیسے اونچے پورے مرد کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں لاہور جا رہا ہوں منان صاحب!" اگلے ہی پل اس نے فیصلہ کیا اور بغیر کچھ سنے تیزی سے باہر کی طرف دوڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر پوری قوت سے ایکسلریٹر کو دباتے ہوئے اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اسے جلد از جلد شہریار کے پاس لاہور پہنچنا ہے۔ وہ شہزادی سمیت دنیا کے ہر کام کو فراموش کر چکا تھا۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ھے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔'' باب نے فون پر تیز آواز میں کہا۔ ''کیا بکے جارہی ہو، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ تم میری بیوی نہیں ہو۔ میری گرل فرینڈ نہیں ہو۔ میری منگیتر نہیں ہو پھر آخر یہ سب کچھ کیوں؟ لنڈا، مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ میرے پیچھے کیوں پڑگئی ہو۔ پلیز میری جاسوسی چھوڑ دو۔''

''میں تمہارے اور ٹینا کارسن کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔'' میں نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''تمہارے درمیان کیا چکر چل رہا ہے، تم اسے میلاکس میں لنچ کے لیے لے کر گئے تھے نا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کسی معزز شخص کی بیوی ہے مگر تم اس کے ساتھ کھلے عام گل چھرے اڑاتے پھر رہے ہو۔ جانتے ہو اس طرح کارسن کی کتنی بے عزتی ہوگی؟''

''تو کیا ہوا۔'' باب بولا۔ ''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔''

''غرض ہے۔ میں تمہیں چاہتی ہوں۔''

''لیکن تم صرف میری دوست ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' باب نے جھلا کر جواب دیا۔ ''ویسے بھی میں اس بات کا قائل ہوں کہ دوستوں کو بھی ایک خاص حد کے اندر رہنا چاہیے اور بس!''

اس وقت باب گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے سامنے نظر دوڑائی۔ کنگ چپس شاپ نظر آرہی تھی۔ باب نے گاڑی پارکنگ لاٹ کی طرف موڑی۔ ''ایک منٹ کے لیے چپ کر جاؤ۔ میں گاڑی پارک کررہا ہوں۔''

''لاک ہارورڈ کار پارکنگ میں۔'' میں نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ویسے اس وقت میں بھی شدید غصے میں تھی۔

''شاید تم نے قسم کھالی ہے کہ لمحہ بھر کے لیے بھی خاموش نہیں ہوگی۔'' اس نے غصے سے جواب دیا۔

''یہ جاننے کے باوجود کہ ٹینا شادی شدہ ہے، اس کے باوجود کیوں اس کی زندگی میں داخل ہورہے ہو؟''

''ٹینا اور میں دوست ہیں اور بس!'' اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ ''ہم اسکول میں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں، لڑکپن کی دوستی ہے۔''

''ہاں واقعی... یہ بات تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''وہ تمہاری لڑکپن کی دوست ہے اور پھر اس نے تمہیں لات ماردی اور ایک کے بعد ایک شوہر بدلتی گئی۔ میں سب جانتی ہوں تم دونوں کے بارے میں اور وہ بھی بہت اچھی طرح مکمل تفصیلات کے

رقیب بجلی

مختار آزاد

محبتوں کے سودے بنا کسی لالچ وطمع کے طے پا ں اور پروان چڑھتے ہیں....خود غرضی اور بے وفائی کی ذراسی آمیزش انہیں لمحوں میں ختم

کردیتی ہے ....گھروں تک بجلی پہنچانے وال ے ٹھیکیداروں کا احوال جو دلوں کو تاراج کرتے ہوئے آشیانوں پر بجلی گرارہے تھے....

محبت کے بھیس میں منافقت کا لبادہ اوڑھے ہرجائیوں کا کھیل

ساتھ۔''

''زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اسے بھی غصہ آگیا۔ ''وہ میری اچھی دوست تھی اور ہے اور جہاں تک لات مارنے کی بات ہے تو اس نے شادی کی تھی اور بس! اب تم ماضی کے گڑے مردے اکھاڑتی نہ پھرو۔'' اس کی آواز ضرورت سے زیادہ اونچی تھی۔

''مبارک ہو... تمہیں اس کی شادی، سوری شادیوں کی بات اب تک یاد ہے۔ لگتا ہے بڑی سخت چوٹ لگی تھی تمہارے دل پر اس کی شادیوں کی خبر سن کر۔''

''بکواس بند کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کردیا۔ میں نے بھی غصے سے فون پٹخ دیا اور صوفے پر نیم دراز ہوکر اپنے اوسان درست کرنے لگی۔

میں دس منٹ پہلے ہی گھر لوٹی تھی اور باب کو فون کرنے کی وجہ یہ تھی کہ فورتھ ایوینیو سے گزرتے ہوئے میں نے اس کی گاڑی سے ٹینا کو اترتے دیکھ لیا تھا جس کی وجہ سے غصے میں آگ بگولا ہوگئی تھی۔

باب ادھیڑ عمر کا مرد تھا اور میں کئی سالوں سے اسے جانتی تھی۔ میں دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتی بھی لیکن وہ مجھ پر

ف زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس کے باوجود میں سمجھتی تھی کہ ایک دن میری محبت اس کے پتھر دل میں سوراخ کرہی دے گی مگر جب سے مجھے پتا چلا کہ ٹینا اور باب اب اکثر ایک ساتھ دیکھے جارہے ہیں تو میرے دل میں ٹینا کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی.... میں ہر حال میں اسے باب سے دور کرنا چاہتی تھی مگر میرا بس نہیں چل رہا تھا۔ جب سے وہ ایک بار پھر ٹینا کے قریب ہوا تھا، تب سے ہماری دوستی میں بھی دراڑ آگئی تھی۔ اب تو وہ مجھے ایک فون کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ یہ بات مجھے تڑپائے جارہی تھی۔

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی تو میں نے کال اٹینڈ کی۔ ''بولو، کیا بات ہے۔''

''مجھے معلوم نہیں کہ تم کیوں خوامخواہ میرے پیچھے پڑگئی ہو۔'' دوسری طرف سے بنا رسمی کلمات کے باب نے لعن طعن شروع کردی۔ ''خدا کے لیے میری ذاتی زندگی میں دخل دینا چھوڑ دو۔ یہ میرے معاملات ہیں۔ تم میری دوست ہو، بس دوست کی حد تک رہو۔ میری جاسوسی کرنا بند کردو۔''

یہ سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ میں نے کچھ کہے بنا فون رکھا اور رونے لگی۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ ''اب کیا ہوا؟'' میں نے فون اٹھاتے ہی کہا۔

''لنڈا۔''

''بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف باب نہیں کوئی اور تھا۔

''میں گلین بات کررہا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔ ''تمہیں یاد ہوگا کہ آج رات ہماری ملاقات طے ہے۔''

''گلین کافلنگ۔'' میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد خوشی سے کہا۔ ''ہائے، کیسے ہو؟''

''تم ٹھیک تو ہو۔'' شاید اس نے میری ہسٹریائی آواز سے کچھ اور مطلب نکال لیا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ، کیا ہورہا ہے۔'' میں نے اپنی آواز اور لہجہ نارمل کرتے ہوئے کہا۔

''بہت مصروف... سارا دن سانس لینے کو بھی فرصت نہیں مل پائی۔'' گلین نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دی تھی۔ ''خیر تم سناؤ کیا ہورہا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں۔''

”میں نے تمہیں یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ کانفرنس کی وجہ سے کچھ چیزیں اچانک سامنے آگئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں سے نکلتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹا اور لگ جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”اگر ہم سات بجے ملیں تو...“

”کوئی مسئلہ نہیں، شام سات بجے ہی مل لیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر، ہم وہیں ملتے ہیں۔“

اوکے... بائے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کردیا۔

میں ہفتہ بھر پہلے ڈینور میں ایک کانفرنس کے موقع پر گلین سے ملی تھی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے لیکسن پاور کمپنی کا چیف کارسن اور اس کی بیوی ٹینا بھی آئی ہوئی تھی۔ اسی دوران میں ہمارا تعارف ہوا تھا۔ گلین کولاریڈو کا رہنے والا تھا اور ڈینور کی ایک پاور کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر کام کرتا تھا۔ میں بنیادی طور پر الیکٹریکل انجینئر ہوں اور ان دنوں انرجی سیکٹر بالخصوص یون بجلی گھروں کی تنصیب کے حوالے سے بطور کنسلٹنٹ کام کررہی تھی۔ ہم نے اس پہلی ملاقات کے موقع پر کیوانی ریستوران میں لنچ کیا تھا۔ ہماری گفتگو کا محور یون بجلی گھر تھے۔ اسے اگلے ہفتے لیکسن آنا تھا۔ میں خود اسی شہر میں رہتی تھی۔ طے ہوا تھا کہ جب وہ آئے گا تو ہم ایک شام ساتھ ڈنر کریں گے۔ اس نے وہیں تاریخ اور مقام بھی طے کردیا تھا۔ اب اس کا فون آیا تو مجھے بھی یاد آگیا۔

اب وہ لیکسن میں تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ یون بجلی گھروں کی تیاری کے لیے لیکسن پاور کمپنی کو کنسورشیم میں شمولیت پر رضامند کرسکے۔ وہ ڈکوٹا کے مقام پر ایک بہت بڑا یون بجلی گھر تعمیر کرنے کا خواہش مند تھا۔ پلانٹ لگانے کے لیے وہ مقام نہایت موزوں تھا۔ وہاں دن کے چوبیس گھنٹے ہوا بنا تعطل کے چلتی تھی مگر نامعلوم وجہ کی بنا پر لیکسن پاور کمپنی کا چیف ایگزیکٹیو...... پریذیڈنٹ کارسن مجوزہ منصوبے میں شمولیت پر ہچکچا رہا تھا۔ گلین کی کوشش تھی کہ کسی طرح اسے کنسورشیم میں شمولیت پر رضامند کرلے۔

دوروز پہلے اس نے ای میل پر لیکسن میں اپنی موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ میں کارسن کو قائل کرنے میں اس کی مدد کروں۔ گلین مہذب اور دلچسپ آدمی تھا۔ اُس روز مجھے اس کے ساتھ باتیں کرکے اچھا لگا..... ویسے تو مجھے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے مگر پھر بھی میں لیے دیے رہنے والی عورت تھی۔ ویسے بھی لیکسن چھوٹا سا شہر تھا جہاں بات بہت جلد پھیل جاتی تھی۔ اس لیے میں خاصی احتیاط برتتی تھی کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط بات منسوب نہ ہو مگر اس کی بات کچھ مختلف تھی۔ گلین مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ رکھ رکھاؤ والا شخص تھا۔ اس کے ساتھ لنچ یا ڈنر کے لیے ریستوران کا انتخاب اتنا عام نہیں ہوتا کہ جہاں ہرا ایرا غیرا منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ ویسے میں عمر کی تیسری دہائی میں تھی اور طلاق کے بعد برسوں سے تنہا تھی۔ اکثر دل پھینک کنوارے اور تازہ تازہ رنڈوے یا مطلقہ مرد میرے پیچھے پیچھے پھرتے تھے مگر میں اس مزاج کی نہیں تھی کہ ہر ایک کو لفٹ کراتی۔

گلین کے ساتھ ڈنر کے لیے میں طے شدہ وقت پر لیکسن کنٹری کلب پہنچ گئی۔ وہ ڈائننگ ہال میں میرا منتظر تھا۔ اورنج جوس پینے کے دوران میں ایک دوبار میری نظر ٹینا اور کارسن پر بھی پڑی۔ وہ دونوں ڈائننگ روم سے متصل دوسرے کمرے میں لوگوں کے چھوٹے سے گروپ کے درمیان تھے۔ شیشے کی دیوار کے پار منظر بالکل واضح تھا۔ میں نے انہیں نظر انداز کیا۔ اس وقت میں ٹینا کی وجہ سے گلین کے ساتھ ڈنر کی خوشی کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے... جہاں میں کارسن کی نظروں سے دور ہوسکوں۔“ گلین نے سرگوشی کی۔ اس نے بھی کارسن کو دیکھ لیا تھا۔

”شاید نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کے ساتھ لوگ کام کیسے کرلیتے ہیں۔“ گلین کن انکھیوں سے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”بڑا ہی جھکی آدمی ہے۔“

”ارے نہیں...“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”لگتا ہے تم اب تک اسے سمجھ نہیں پائے ہو۔ وہ برا آدمی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں مسکرادی۔ ”اصل خرابی یہ ہے کہ یہاں سب کچھ بگڑا ہوا ہے۔ بس یہی ایک مسئلہ ہے ورنہ میرے خیال میں کوئی اور بات نہیں۔“

”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ اس نے ہنکار بھر کر کہا۔ ”اس سے بات کرنے کی کوشش کرو۔“

”نہیں ...... ابھی موقع نہیں ہے۔“

”بڑا چالاک آدمی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جہاں کارسن کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ”برابر میں اس کی بیوی کھڑی ہے نا وہ سنہری بالوں والی۔“

”ہاں... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں یہ سن کر دل ہی دل میں جل بھن گئی۔

”خاصی دل پھینک لگتی ہے۔“ گلین نے آہستہ سے

”کیا مطلب؟“ میں یہ سن کر چونک گئی۔

”میں قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ کل شام میں نے اسے دوسرے مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔“ اس نے دھیمی آواز جواب دیا۔

”تم نے جو کچھ دیکھا اور جس بات کی قسم کھانے کو تیار اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ٹینا کے یہاں بہت دوست ہیں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ممکن ہے وہ کوئی دوست ہو مگر تم شاید اسے غلط سمجھ بیٹھے۔“ میرے میں دبی دبی ناراضی تھی۔ یہ اور بات کہ میں اپنے دل کہہ رہی تھی کہ گلین تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ کمبخت ہے ہی بدکردار۔

”تمہارے خیال میں ٹینا اپنے شوہر کے مقابلے میں جوان نہیں ہے۔“ اس نے میری ظاہری خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا تذکرہ جاری رکھا۔ ”خیر مجھے تو کارسن کے مقابلے میں کافی کم عمر لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار شیشے کے پار دیکھا۔ کارسن اور ٹینا بدستور .... کھڑے لوگوں سے باتیں کررہے تھے۔

”ممکن ہے کہ ٹینا کی جوانی کے باعث اسے بھی اپنے بڑھاپے کا احساس کم ستاتا ہو۔“ میں نے کارسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گول مول جواب دیا۔

”کچھ اس کے بارے میں تو بتاؤ۔“ یہ کہہ کر گلین مسکرادیا۔ میں سمجھ گئی، اس کا اشارہ ٹینا کی طرف تھا۔

”بڑی دلچسپی ...... لے رہے ہو اُس کی ذات میں۔“ میں نے چہرہ اس کے قریب کرکے کہا، وہ مسکرا کر رہ گیا۔

”خیر... اب اگر تم ان دونوں کے بارے میں کچھ جاننے کے خواہش مند ہو تو سنو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر گلین بات یہ ہے کہ...“ میں نے اسے کارسن اور ٹینا کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

ٹینا، کارسن کی نہ تو پہلی بیوی ہے اور نہ ہی شاید آخری۔ اس نے کئی برس پہلے اپنی بیوی کو تیس سال اکھٹے گزارنے کے بعد طلاق دے دی تھی۔ کارسن ان مردوں میں سے ہے جو عمر کے ڈھلنے پر جوان بیوی کو اپنی مردانگی کا تمغہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اس نے طویل برس ڈونا کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں اور پھر انہیں طلاقیں بھی دیں۔ ایک عورت تو اس کی زندگی میں اتنی تیزی سے آئی اور گئی کہ کارسن کے قریبی دوستوں کو بھی اس بات کا پتا نہیں چلا کہ چٹ بیاہ اور پٹ طلاق کیسے ہوئی تھی۔

”اوہو... یہ بات ہے۔“ گلین بے ساختہ ہنس پڑا۔

”خاموشی سے سنو۔“ میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”اوکے۔“ یہ سنتے ہی اس نے تیزی سے اپنی ہنسی کو بریک لگائے اور ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا یقین دلایا۔

”وہ لڑکی شاید سیوکس فال کی رہنے والی تھی۔ ان کی شادی اور طلاق اتنی تیزی سے ہوئی کہ میں اس لڑکی کا نام تک جان نہ سکی۔“ میں نے دوبارہ وہیں سے بات شروع کی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔

”اچھی ملازمت، ضرورت سے بہت زیادہ دولت اور بڑھاپا... کارسن نے اس وقت کو عیش وعشرت میں بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس لیے ایک کے جاتے ہی دوسری لڑکی فوراً ہی اس کی زندگی میں آجاتی۔ کارسن کی شخصیت تو جاذب نظر نہیں مگر اس کی آمدنی، عیش وعشرت کی دلدادہ حسیناؤں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ بھی یہ بات جانتا ہے اس لیے اس نے ہر آنے والی کو صرف گلے سے لگایا دل سے نہیں۔ آخری طلاق کے کچھ دنوں بعد اسے نہ جانے کہاں سے ٹینا ٹکرا گئی۔ ٹینا بھی شادیوں پہ شادیاں کرنے کی شوقین ہے۔ اسے بھی ان شوہروں کی تلاش رہتی ہے جن کا پیسہ وہ پانی کی طرح بہاسکے۔“ یہ کہہ کر میں سانس لینے کو خاموش ہوئی اور گلین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرارہا تھا۔

”کارسن غالباً اس کا چوتھا شوہر ہے یا کم از کم میں اس کے شوہروں کے بارے میں جتنا جانتی ہوں، اس میں کارسن کا نمبر چوتھا ہے۔“

”شادی مہمات کے باوجود اب بھی وہ خاصی دلکش ہے۔“ گلین نے لقمہ دیا۔

”سنو...“ میں نے چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے رازداری سے کہا۔ ”وہ دور سے تمہیں جتنی جوان نظر آرہی ہے، حقیقت میں اتنی ہے نہیں لیکن پیسہ سب کچھ کردیتا ہے۔ جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان...“

”اور جوان کو تو جوان بشرطیکہ وہ لڑکی ہو۔“ گلین نے بے تکا لقمہ دیا۔

”خیر، حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کولاریڈو میں جاکر شادی کی اور پھر واپس آکر لیکسن کی سماجی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ کئی سال کے باوجود یہ دونوں دل پھینک پنچھی اب تک ایک ہی شاخ پر بیٹھے چہچہا رہے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی

اور کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم ٹینا اور کارسن کے بارے میں جو جاننا چاہتے تھے، اب وہ سب کچھ جان چکے ہوگے۔''

''کچھ اور بھی بتاؤ نا۔'' میری توقع کے برعکس اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں درخواست کی۔ ''پلیز پلیز... کچھ اور بھی۔'' اس وقت وہ مجھے ایسے ضدی بچے کی طرح لگا جس کی ماں اسے سلانا چاہتی ہو مگر وہ ایک کے بعد ایک کہانی کی فرمائش کر کے اسے پریشان کر رہا ہو۔

''اب مزید سنانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں بچا ہے۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ ٹینا کے ماضی کو جانتا ہوگا؟''

''وہی کیا... لیسکن میں ہر شخص اُس کے ماضی سے بخوبی واقف ہے۔'' میں نے گلین کی بات سن کر جواب دیا۔

''حیرت ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود اس نے نہ صرف شادی کی بلکہ اتنے سالوں سے اُس کے ساتھ شادی نباہ بھی رہا ہے۔'' گلین نے حیرت سے کہا۔

''اس بات کو دفع کرو۔'' میں نے موضوع کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم کارسن کو رشوت کی پیشکش کرو۔ مجھے یقین ہے، کام بن جائے گا۔ ویسے بھی وہ کوئی ایماندار آدمی نہیں ہے۔ بہت گھٹیا شخص ہے۔''

''یہ ممکن تو ہے۔ ایک بار معاملہ طے ہو جائے تو پھر رشوت کی رقم بھی کنسورشیم کی لاگت کے کھاتے میں کھپ جائے گی۔ پورا معاملہ نارمل طریقے سے طے شدہ نظر آئے گا۔''

''کنسورشیم کمیٹی والے مان جائیں گے کہ رشوت...''

''کیوں نہیں...'' اس نے قطع کلامی کی۔ بڑے بڑے معاملات میں اس طرح کی غیر قانونی لین دین تو ہوتی رہتی ہے، جسے بعد میں لاگت کے کھاتے میں ڈال کر حساب کتاب پورا کر دیا جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ کارسن تمہاری پیشکش کو مسترد نہیں کرے گا۔'' میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

''ویسے یہ ہے غلط کام۔'' اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ''بڑا غیر پیشہ ورانہ رویہ ہے کہ کسی کو قائل کر کے کام نکالنے کے بجائے اسے رشوت کی پیشکش کر دو۔'' وہ سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ مجھے ایک دم وہ بالکل مختلف گلین لگ رہا تھا۔ ''اگر اس نے رشوت لینے کے بعد کسی سے اس کا ذکر کر دیا تو...'' کچھ دیر سوچنے کے اس نے کہا۔

''نہیں کرے گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔ ''یہ اس کا شہر ہے اور اپنے علاقے میں خود اپنے ہاتھوں اپنی... ساکھ تباہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اتنا تو وہ عقلمند ہے۔''

''بہت اچھا۔'' گلین نے کہا اور فوراً گفتگو کا موضوع پلٹ دیا۔ ''مجھے یہاں کے کچھ اور لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔''

اسی دوران میں میری نظر سامنے پڑی۔ باب ولسن اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا رخ بار کی طرف تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل کا زخم تازہ ہو گیا۔ ایک محبت کا غم تو دوسرا آنٹی آلی کا زخم... وہ لیسکن میں تنہائی کی ماری عورت تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھی۔ ''میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر میں خواتین کے لیے مخصوص روم کی طرف بڑھی لیکن بار کاؤنٹر پر جا کر رک گئی۔ باب بھی وہاں موجود تھا۔

''اوہ... تو تم میری جاسوسی کر رہی ہو۔'' مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے طنز سے کہا۔

''میں کسی کی جاسوسی نہیں کر رہی۔'' میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ ''یہاں کسی کے ساتھ آئی ہوں ڈنر پر۔''

''تم اور ڈنر کی دعوت پر...'' اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ارے کہیں یہ وہی تو نہیں، پون بجلی گھر والا۔'' اس نے کنپٹی کو شہادت کی انگلی سے دباتے ہوئے ہال پر نظر ڈالی۔ گلین کی پشت صاف نظر آ رہی تھی۔ ''کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے استفساریہ لہجے میں کہا اور پھر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

میں نے اس کی بات سنی اور نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''یہ بھی پون بجلی گھر کے معاملے میں بالکل دیوانہ ہو رہا ہے۔'' اس نے پھر طنز کا نشتر چلایا۔

''وہ دیوانہ نہیں ہے۔'' میں نے تیزی سے گردن موڑی اور اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر میرے پاس پیسے ہوں تو میں بھی اپنے گھر کی چھت پر پون بجلی کا پلانٹ لگا لوں چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو... سمجھ گئے یا تفصیل سے سمجھاؤں۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' باب نے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بڑی عجیب بات ہے، مجھے تو یہ شخص بزنس ایگزیکٹیو سے زیادہ پرانی کاروں کا سیلزمین زیادہ لگتا ہے۔'' اس نے بھویں چڑھا کر کہا۔ اس کے لہجے سے نفرت جھلک رہی تھی۔

''تم اس سے جل ہی نہیں رہے بلکہ پریشان بھی ہو رہے ہو۔'' میں نے دھیمے لہجے میں نہایت چبا چبا کر کہا اور وہاں سے چل دی۔

''سوری گلین۔'' میں نے واپس اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

''وہ تمہیں بتا رہا تھا نا کہ میں نے ٹینا کو کل شام ایک مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔''

''تو پھر...'' میں نے قطع کلامی کی۔

گلین نے گردن موڑی اور آنکھوں سے باب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ شخص تھا ٹینا کے ساتھ۔''

''باب ولسن۔'' میں نے کہا۔

''شاید...''

''جس کی طرف تمہارا اشارہ ہے، وہ تو باب ولسن ہی ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''یہ ایک مقامی اخبار کا رپورٹر ہے۔ میں نے تمہیں اپنی آنٹی اولیو کے بارے میں بتایا تھا نا، وہی جنہوں نے یہاں کے کئی اخبارات میں پون بجلی گھروں کے بارے میں مضمون لکھے تھے۔ ان کے مضمون اور رائے کو بڑی پذیرائی ملی تھی مگر یہ...''

''ارے ہاں، یاد آیا۔'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس کا باب سے...''

''تعلق ہے۔'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہی وہ شخص ہے جس نے ان کی تجویز کا نہ صرف مذاق اڑایا بلکہ انہیں اپنے اخبار میں اتنا ذلیل کیا کہ عام لوگ ان کا مذاق اڑانے لگے۔ آنٹی نے لوگوں کے مذاق سے شرمندہ ہو کر کئی ماہ تک خود کو اپنے گھر تک محدود کر لیا تھا۔ یہ ان کی تنہائی کا [illegible] بڑی تکلیف پہنچائی ہے اس نے میری آنٹی [illegible] میرے لہجے میں خود بخود تلخی اتر آئی۔

[illegible] گلین نے تاسف [illegible]

[illegible] میں نے [illegible]

[illegible]

[illegible] میں نے کہا [illegible] بجلی تیار کرنے کے لیے نہایت [illegible] ہے۔ ماہرین کی ریسرچ اس بات کی تصدیق کرتی [illegible] اس میں منافع بھی ہے تو پھر آخر وہ کیا بات ہے جو اسے [illegible] سے روک رہی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔'' گلین نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ ''دیکھو، ہم یہاں ڈنر کرنے آئے ہیں کارسن پر بحث کرنے نہیں۔ اتنی اچھی شام کو رائگاں نہیں جانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

''بس! ایک بات...''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کاروبار کی باتیں دفتر میں ہوں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے، کلب میں صرف تفریح کرنا چاہیے۔'' اس نے ویٹر کو آرڈر لکھواتے ہوئے کہا۔

ڈنر کے بعد ہم کافی پینے کے لیے لان میں آ گئے۔ یہاں ایک بار پھر میں نے ذکر چھیڑ دیا کہ آخر کارسن پون بجلی گھروں کے حوالے سے معاہدہ کرنے پر رضامند کیوں نہیں ہے۔

''ہوں... سوچنے کی بات تو ہے...'' اس بار گلین نے میری بات کو سنجیدگی سے لیا۔ ''میں بھی یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں اور تم سے بھی درخواست ہے کہ اپنے طور پر اس بات کا پتا چلانے کی کوشش کرو۔ آخر تم بھی تو بطور کنسلٹنٹ اس حوالے سے رپورٹ تیار کر چکی ہو۔ ویسے بھی کارسن اور ٹینا تمہیں جانتے ہیں اگر تم چاہو تو...''

''سمجھ گئی، میں کوشش کرتی ہوں۔'' گلین کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے میں نے کہا۔ ''تم اپنے طور پر بھی پتا چلانے کی کوشش کرو۔ میں براہِ راست کارسن سے مل کر اس مسئلے پر بات کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتائے گا۔''

''یہ مناسب ہے۔'' اس نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تو کب مل رہی ہو اس سے؟''

''کل یا شاید پرسوں۔ میں اس سے ملنے کے بعد تمہیں فون کرتی ہوں۔''

''یہ مناسب ہے۔''

اس کے بعد ہم جن موضوعات پر دیر تک باتیں کرتے رہے، اُن کا تعلق گلین کے کاروبار اور پون بجلی گھروں سے ہرگز نہیں تھا۔

☆☆☆

شام کے [illegible] ساڑھے [illegible] رہے تھے۔ میں لیسکن کنٹری [illegible] ڈائننگ ہال کی طرف جا رہی تھی۔ آج سہ پہر ہی میں نے گلین کو ہوٹل پر ایس ایم ایس کیا تھا۔ ''میں اس سے مل کر آئی ہوں۔''

اس نے فوراً جواب دیا اور شام کو ڈنر پر ملاقات کی دعوت دے دی۔ میں ڈائننگ ہال میں پہنچی تو وہ کھڑکی کے

ساتھ رکھی میز پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا رخ داخلی دروازے کی طرف تھا۔ جیسے ہی اندر داخل ہوئی، وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔ میں اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

”آج دوپہر لنچ پر میری کارسن سے ملاقات ہوئی ہے۔ کافی تفصیلی بات چیت رہی۔“ رسمی کلمات کے بعد میں نے بتانا شروع کیا۔

”کیا کہتا ہے وہ؟“ گلین نے بے تابی سے پوچھا۔

”میں یہی جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ آخر وہ پون بجلی گھروں کے معاہدے میں شمولیت سے کیوں کترا رہا ہے۔“

”تم نے براہِ راست یہ سوال کیا تھا اس سے؟“ گلین نے پوچھا۔

”نہیں مگر میری باتوں کا مطلب یہی تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دراصل وہ سمجھ رہا ہے کہ تم یہاں پاور پلانٹ نصب کرو گے اور ساری بجلی ٹرانسمیشن لائنوں کے ذریعے کیلیفورنیا پہنچا دو گے۔ اس طرح نہ تو لیسکن کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ ہی اس کی کمپنی پر بجلی کی فراہمی کا دباؤ کم ہوگا بلکہ طلب بڑھتی ہی جائے گی، جس سے بعد کے سالوں میں مسائل پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس طرح مزید نئی کمپنیوں کو لیسکن میں پلانٹ لگانے کا موقع مل جائے۔ اس طرح اس کی کمپنی کے بزنس پر منفی اثر پڑے گا۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔“ گلین نے یہ سن کر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”ایسا سو فیصد تو نہیں ہوگا اور اگر ہوتا بھی ہے تو پھر بھی جن کی زمینوں پر پلانٹ لگے گا، ٹرانسمیشن لائن گزرے گی یا پھر جو کسان چھوٹے چھوٹے پون بجلی گھر اپنی زمینوں پر خود لگا کر بجلی پیدا کریں گے، انہیں کرایہ، قیمت اور منافع میں بھی حصہ بھی ملے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے رکا۔ ”اب ایسے میں اسے کیا تکلیف ہے۔ بات کچھ اور ہوگی مگر وہ بتانا نہیں چاہ رہا ہے۔“

”میرا مشورہ ہے کہ تم میٹنگ میں ان کے تمام تر خدشات دور کرنے کی کوشش کرو۔“

”میٹنگ...“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”کون سی میٹنگ، مجھے تو اس بارے میں کچھ علم نہیں۔“

”جمعرات کو پون بجلی گھر...کے حوالے سے تمام تر شراکت داروں کی جنرل میٹنگ ہو رہی ہے اور یہ تمہارے لیے بہترین موقع ہے کہ اس منصوبے کے حوالے سے پائے جانے والے تمام تر خدشات کی وضاحت کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔ ”کارسن نے مجھے خود بتایا ہے اور شرکت کی بھی دعوت دی ہے۔“

”ہونہہ۔“ ہنکارا بھرتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم یہ بتاؤ کہ وہاں جا رہے ہو یا نہیں۔“ اس کے تاثرات دیکھ کر میں بھی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

یہ بات سن کر گلین نے میری طرف دیکھا اور چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ”بالکل جا رہا ہوں بلکہ ہم دونوں جا رہے ہیں۔“

اسی دوران ویٹر اورنج جوس لے آیا۔ ہم نے جوس پیا تو گلین نے تجویز دی کہ کہیں اور جا کر کھانا کھاتے ہیں۔

”اچھی تجویز ہے۔“ یہ سنتے ہی میں اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ ”چلو۔“

کچھ دیر بعد ہم میلانس ریستوران میں بیٹھے تھے۔ میلانس اوپن ائر ریستوران تھا اور ارد گرد صرف کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ ہم نے اپنا آرڈر نوٹ کروایا۔ تھوڑی دیر میں ویٹر ہیم برگر لے آیا۔ ابھی ہم نے کھانا شروع نہیں کیا تھا کہ میری نظر اچانک بیک بوتھ پر پڑی۔ اس ریستوران کا کھانا تو مشہور نہیں تھا البتہ شہرت کی وجہ دوسری تھی۔ یہاں شہر بھر کے عیش پرستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے شریف لوگ وہاں جانے سے کتراتے تھے مگر میری حیرت کی وجہ دوسری تھی۔ ٹینا اور باب دونوں وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں حد سے زیادہ گم تھے۔ ٹینا جیسی عورتوں سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی تھی لیکن پھر بھی وہ ایک معزز شخص کی بیوی تھی جس کا شہر میں نام اور مقام تھا۔ وہ جس انداز میں کھلے عام بدنام زمانہ اوپن ائر ریستوران میں بیٹھی تھی، وہ اسے قطعی زیب نہیں دیتا تھا مگر جو منظر آنکھوں کے سامنے تھا، اسے دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ اسے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”کیا ہوا؟“ میرے چہرے پر منفی تاثرات دیکھ کر گلین نے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے پارکنگ ایریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لگتا تو نہیں، کچھ تو ضرور ہے۔“ اس بار اس نے حجت کی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ”یہ کیا، لگتا ہے کہ دونوں اب پکڑے گئے۔“ میں بڑبڑائی۔

”کیا ہوا؟“ یہ کہتے ہوئے گلین نے بھی اس طرف

دیکھا جہاں میری نظریں جمی ہوئی تھیں۔ سامنے سے کارسن آ رہا تھا۔ اس کا رخ بیک بوتھ کی طرف تھا۔

کارسن تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بیک بوتھ میں داخل ہوا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ہم دونوں بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو دیکھ لیا مگر وہ دونوں اس کی آمد سے بے خبر ایک دوسرے میں ہی گم تھے۔ کارسن جس انداز میں ان دونوں کی طرف بڑھا، اسے دیکھ کر تو صاف لگتا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ کارسن تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے ٹینا کو بازو سے پکڑ کر باب کی آغوش سے کھینچ کر علیحدہ کرنا چاہا مگر باب نے اسے سختی سے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ باب پاگل ہو گیا ہے جو ایک شوہر کے سامنے اس کی بیوی کو یوں اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے۔ کارسن نے پورا زور لگا کر اسے باب سے علیحدہ کرنا چاہا مگر ٹینا نے بھی چلانا شروع کر دیا۔ پل بھر میں سب کی نظریں ان تینوں کی طرف اٹھ گئیں۔ رقیب اور عاشق کا کھلا تماشا شروع ہو چکا تھا۔

ٹینا ان کے درمیان بیچ بچاؤ کراتے ہوئے چلا رہی تھی۔ باب اور کارسن ایک دوسرے پر مکے برسا رہے تھے۔ دونوں بری طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ لمحہ بھر میں وہاں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بیچ بچاؤ کے لیے سب ان کی طرف دوڑے۔ گلین بھی ہیم برگر پھینک کر تیزی سے ان کی طرف بھاگا۔ وہ شاید کارسن کو بچانا چاہتا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑی۔

گلین کارسن کے پیچھے تھا۔ وہ اسے کمر سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹنا چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں وہ لڑکھڑایا اور نیچے گرا۔ اس کے اوپر کارسن اور اس کے اوپر ٹینا گری.... جو بچاؤ بچاؤ چلاتے ہوئے گتھم گتھا عاشق اور شوہر کو علیحدہ علیحدہ کرنا چاہتی تھی۔ اسی دوران کچھ اور لوگ آگے بڑھے اور کسی نہ کسی طرح کھینچ کھانچ کر ٹینا اور باب کو کارسن کے اوپر سے ہٹا دیا تھا۔ جیسے ہی یہ دونوں ہٹے، ان کے نیچے دبے گلین نے بھی خود کو کسی طرح اس کے نیچے سے نکالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر کارسن... کارسن فرش پر چت پڑا ہلکے ہلکے جھٹکے لے رہا تھا اور پھر اس نے ایک ہچکی لی اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

صورتِ حال نہایت گمبھیر ہو چکی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ لڑائی گھنٹا بھر چلے مگر سب کچھ لمحہ بھر میں ختم ہو گیا شاید کارسن بھی۔ میں بھی دوسروں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے فرش پر پڑے کارسن کو دیکھ رہی تھی، جس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ٹینا گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے بھی ایک دو جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے جس وحشت ناک انداز میں وہ چلا رہی تھی، اب اتنی ہی خاموش تھی۔ لگتا تھا کہ اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ باب ایک طرف زمین پر بیٹھا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

گلین فرش پر بیٹھ کر کارسن کے دل کی دھڑکن رواں کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی کوشش بے سود رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے کارسن کی نبض ٹٹولی، آنکھوں میں جھانکا، شہ رگ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ تو مر چکا ہے۔“ گلین نے تاسف بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ یہ سنتے ہی وہاں عجیب سی بھگدڑ مچ گئی۔ ٹینا اٹھی اور لاش سے چمٹ کر رونے لگی۔ باب ایک طرف بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے ایسے ہل رہا تھا، جیسے اسے مسلسل جھٹکے لگ رہے ہوں۔ اسی دوران کسی نے پولیس کو فون کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پولیس سائرن گونجنے لگے۔ ایمبولینس بھی پہنچ گئی۔

پولیس والوں نے ٹینا کو لاش سے علیحدہ کیا۔ لاش کو مردہ خانے منتقل کیا جا رہا تھا۔ پولیس نے باب کو بھی حراست میں لے لیا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ بمشکل سانس لے پا رہا تھا۔ اسے پولیس حراست میں اسپتال منتقل کیا گیا۔ پولیس کو لاش کے قریب سے ایک چاقو بھی ملا تھا، جسے انہوں نے حفاظت سے پلاسٹک کی تھیلی میں رکھ لیا تاکہ انگلیوں کے نشانات مٹنے نہ پائیں۔

پولیس افسر گرانٹ نے میرے اور گلین سمیت وہاں موجود ان تمام لوگوں کے بیانات لیے جو اس جھگڑے کے عینی شاہد تھے، جس میں کارسن کی جان چلی گئی تھی۔ گرانٹ نے بیانات لے کر ہم سب کے نام اور پتے نوٹ کیے اور پھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس واقعے کے بعد کس کمبخت کو بھوک لگتی۔ ہم دونوں بھی خاموشی سے پلٹے اور واپس جانے کے لیے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ راستے بھر ہم دونوں چپ چاپ تھے۔ بیچ بچاؤ کے دوران میں گلین کی قمیص بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کا حلیہ بھی بہت خراب تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اسے بھی خوب مارا ہو۔

وہ رات مجھ پر بہت کٹھن تھی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ جونہی ذرا سی آنکھ لگتی، کارسن کی موت کا منظر فلم کی طرح چلنے لگتا اور میں گھبرا کر اٹھ جاتی۔ دوسرے دن ناشتا کر کے میں کچن میں ہی لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی مگر

گزری رات کے واقعے کا اثر اب تک ذہن پر تازہ تھا۔ دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ میں کافی بنا کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف پلٹی ہی تھی کہ پولیس افسر گرانٹ کا فون آ گیا۔

''مجھے آپ سے کچھ ضروری سوال جواب کرنے ہیں کیا آپ پولیس اسٹیشن پہنچ پائیں گی۔'' اس نے رسمی کلمات کے بعد کہا۔

''کب پہنچنا ہے؟''

''ابھی، یا کچھ دیر میں۔'' اس نے کہا۔ ''میں دفتر میں ہی موجود ہوں، بہتر ہوگا جتنا جلد ہو آپ پہنچ جائیں۔''

''ٹھیک ہے، میں کچھ دیر میں گھر سے نکلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور کافی پینے لگی۔

☆☆☆

جب میں پولیس اسٹیشن کی طرف ..... جا رہی تھی کہ اچانک نارڈ کوسٹ نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ وہ مقامی عدالت کے جج کا کورٹ رپورٹر تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم گرانٹ کی طرف جا رہی ہو؟'' اس نے بنا تمہید کے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پولیس، کارسن کے قتل کی فردِ جرم تیار کر رہی ہے۔ ایک دو دن میں اس پر فردِ جرم عائد ہو جائے گی۔'' نارڈ میرے گھر کے قریب رہتا تھا اور ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ابھی گرانٹ سے مل کر آ رہا ہوں، اس نے ہی بتایا تھا کہ تم بھی آنے والی ہو۔'' نارڈ نے جلدی سے کہا۔

جس انداز میں سرِ عام کارسن کی موت واقع ہوئی تھی، اس لحاظ سے باب سراسر اس کا قاتل تھا۔ یہ اور بات کہ اس کا وکیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ اس کا مؤکل بے گناہ ہے اور اس پر حملہ مقتول نے کیا تھا مگر پھر بھی... اس کے خلاف فردِ جرم عائد ہونا یقینی بات تھی۔ وکیلِ استغاثہ کے لیے وکیل کا مضبوط نکتہ یہ تھا کہ ملزم نے مقتول کی بیوی کو اپنے جال میں پھانس رکھا تھا اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سب نے دیکھا کہ وہ صرف اپنی بیوی کو اس کی بانہوں سے چھڑا رہا تھا مگر باب چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ خیر عدالت کا کام تو دور کی بات ہے، مجھے تو اس وقت گرانٹ سے ملنا تھا۔

''میں عدالت جا رہا ہوں پھر ملتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

نارڈ کے جانے کے بعد میں گرانٹ سے ملنے کے لیے پولیس اسٹیشن کی طرف چل دی۔ سب جیل اور عدالت کمپلیکس میں ساتھ ساتھ واقع تھے البتہ پولیس اسٹیشن دو بلاک دور تھا۔ وہاں تک پہنچنے سے پہلے مجھے ڈونٹ شاپ اور پوسٹ آفس والی چھوٹی سی سڑک سے گزرتے ہوئے آگے جانا تھا۔

کمرے میں سراغرساں جانسن اور پولیس افسر گرانٹ اپنی اپنی ڈیسک پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گرانٹ نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ میں سیدھی اس کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم رات والے واقعے پر ایک بار پھر تفصیل سے گفتگو کر رہے تھے۔

''میں پوری ایمانداری سے کہتی ہوں کہ ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا۔'' میں نے گرانٹ کے ایک سوال کے جواب میں کہنا شروع کیا۔ ''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ باب یا کارسن میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ البتہ باب نے کارسن پر مکے ضرور برسائے تھے۔ اسی دوران میں گلین پہنچا اور کمر سے پکڑ کر کارسن کو پیچھے کھینچنے کی کوشش کی۔ اسی اثنا میں باب نے ایک زوردار مکا مارا جو شاید اس کی کنپٹی پر لگا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اسی دوران میں وہ لڑکھڑایا۔ اس کے لڑکھڑانے سے گلین نے بھی توازن کھو دیا۔ یوں پہلے گلین نیچے گرا، اس کے اوپر کارسن گر پڑا۔'' مکا بازی شروع ہونے سے کارسن کے گرنے تک جو میں نے دیکھا تھا، وہ اسے کل رات بھی بتایا تھا اور اب ایک بار پھر تفصیل سے اس کے گوش گزار کر دیا۔

''تو پھر اس کے بعد باب نے کارسن پر چھلانگ لگا دی۔'' گرانٹ نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں... وہ بھی اس پر گر پڑا۔'' یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر خیال ظاہر کیا۔ ''ممکن ہے کہ اس لڑائی کی کسی نے موبائل فون سے وڈیو بنالی ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا، وہ سو فیصد درست ہے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوا ہے۔'' گرانٹ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے یوٹیوب اور دوسری سوشل ویب سائٹس چیک کی ہیں۔ ایسی کوئی وڈیو آدھا گھنٹے پہلے تک تو اپ لوڈ نہیں ہوئی تھی۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے کئی بار لوکل ریڈیو سے بھی یہ اپیل نشر کروائی ہے کہ اگر کسی نے اس طرح کی وڈیو بنائی ہے تو پولیس سے رابطہ کرے مگر اب تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور پانی کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اب ہمیں جائے وقوعہ سے ملنے والے ثبوت اور

عینی شاہدین کے بیانات کی روشنی میں ہی تفتیش کو آگے بڑھانا ہو گا، فی الحال تو یہی لگتا ہے۔''

''میرے خیال میں آپ اپنا کام مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' اس نے نوٹس لکھتے لکھتے سر اوپر اٹھایا۔ ''خیر، باب اب بالکل ٹھیک ہے۔ اسے اسپتال سے پولیس اسٹیشن منتقل کر دیا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور پھر کہنا شروع کیا۔ ''ایک دو عینی شاہدین نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ زمین پر پڑا اس طرح جھٹکے لے رہا تھا جیسا مرگی کے مریض کو دورے پڑتے ہیں۔''

''یہ بالکل سچ ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''خود میں نے اپنی آنکھوں سے اسے جھٹکے لیتے دیکھا تھا مگر پھر اچانک اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد پتا چلا کہ وہ مر گیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں رکی اور چند لمحے تک سوچنے کے بعد ایک خیال ظاہر کیا۔ ''مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ اگر اسے مرگی کا دورہ پڑا تھا اور موت دورے کے سبب ہوئی ہے تو کیا ایسا ممکن ہے کہ اگر لڑائی کی حالت میں کسی مریض کو مرگی کا دورہ پڑے تو وہ اسی حالت میں مر جائے؟''

میری بات سن کر گرانٹ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ ''یہ بات تحقیق طلب ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہی اس بات کا درست جواب دے سکتا ہے۔'' خیر ذرا ایک بار پھر تفصیل کے ساتھ یہ بتاؤ کہ لڑائی کیسے شروع ہوئی تھی؟'' گرانٹ نے سوال جواب کا موضوع واپس کل رات والے واقعے کی طرف موڑ دیا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ کہ کیا واقعی باب نے کارسن کی کنپٹی پر گھونسا مارا تھا اور لڑائی سے پہلے باب اور ٹینا صرف ڈنر کر رہے تھے۔''

''نہیں۔'' میں نے یہ سنتے ہی نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''وہ ایک دوسرے میں بری طرح کھوئے ہوئے تھے۔ ان کی میز پر دو ڈرنکس رکھے ہوئے تھے لیکن شاید انہیں ڈرنکس سے زیادہ ایک دوسرے میں زیادہ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔''

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔ ان کی ٹیبل واقعی کھانے کے برتنوں سے خالی تھی مگر ایک سوال باقی ہے؟'' گرانٹ نے کہا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ ''اگر وہ صرف ڈرنک کر رہے تھے تو جہاں پر وہ دونوں گرے تھے وہاں زمین پر چھری کہاں سے آئی؟''

''مجھے کیا پتا؟''
''اس وقت تم لوگ کیا کر رہے تھے، میرا مطلب ہے لڑائی شروع ہونے سے پہلے۔''
''یقیناً وہاں کھانا کھانے آئے تھے۔''
''تو تمہاری میز پر چھری...''
''بالکل نہیں۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ''ہمیں شدت کی بھوک لگی تھی، ہم نے بیم برگر منگوایا تھا اور ا سے کھانے کے لیے چھری کانٹے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''
''سوال اب بھی باقی ہے کہ لاش کے برابر چھری کہاں سے آئی؟''
''کیا وہ میلالس ریستوران کا چاقو ہے؟'' میں نے گرانٹ سے سوال کیا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''تو کیا وہ باب کا تھا؟''
یہ سن کر گرانٹ نے میری طرف ہمدردی سے دیکھا۔ ''دیکھو، میں اب تک اس بات پر یقین نہیں رکھتا ہوں کہ باب نے جان بوجھ کر اسے مارا اور نہ ہی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور پھر اچانک میری دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یاد آیا، باب کہہ رہا تھا کہ میں تم سے پوچھوں، کیا اس کی غیر موجودگی میں اس کے پیارے کتے کی دیکھ بھال کر سکو گی؟ وہ اپنے کتے کی طرف سے بہت پریشان ہے۔''
''جی ہاں، کم از کم میں اتنا تو ضرور کر سکتی ہوں۔''
''شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''اب آپ جا سکتی ہیں۔ زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''
''کوئی بات نہیں۔'' یہ سنتے ہی میں فوراً واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

گرانٹ سے ملنے کے بعد میں سیدھی باب کے گھر گئی۔ اس نے اپنے آئرش نسل کے کتے کا نام ایلزی رکھا تھا۔ جب میں وہاں پہنچی تو وہ لان میں ٹہل رہا تھا۔ باب کی پڑوسن مسز گبسن مجھے دیکھ کر قریب آگئیں۔ ''اسے لینے آئی ہو۔'' میں نے ایلزی کی طرف اشارہ کیا۔ ''باب کی خواہش کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی دیکھ بھال کروں۔''
''یہ بہت اچھا ہوگا۔'' مسز گبسن نے مسکرا کر کہا۔ ''ویسے میں نے آج صبح اخبار میں سب کچھ پڑھ لیا ہے۔ میں بھی ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ اب اس بے چارے کا کیا ہوگا؟''
میں نے سیٹی بجا کر اشارہ کیا تو بڑے بڑے بالوں والا ایلزی میری طرف دوڑا چلا آیا۔ ویسے ایلزی مجھ سے مانوس تھا۔ جب تک ٹینا کا قضیہ بیچ میں نہیں آیا تھا تو میں اکثر باب کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ میں نے اشارہ کیا، ایلزی دم ہلاتا ہوا میرے میرے پیچھے چلنا لگا۔ کچھ دیر بعد وہ میری کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں گھر جا رہی تھی۔
گھر پہنچی تو پورچ میں گلین کھڑا تھا۔ ''ارے تم۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''فون کر لیا ہوتا۔''
''میں... ابھی ابھی پہنچا ہوں۔ ڈور بیل بجانے والا تھا۔ مجھے کیا پتا کہ تم اندر نہیں تھیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ کچھ دیر بعد میں، گلین اور ایلزی گھر کے اندر تھے۔ میں نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر ایلزی بھی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔
''تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے ایلزی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''اس واقعے نے تو میری طبیعت پر برا اثر ڈالا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے اب تک پیش آنے والے واقعات تفصیل سے بتائے۔
''میں بھی کچھ دیر میں ڈینور کے لیے نکل رہا ہوں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کارسن کی موت کے بعد فی الحال سارے معاملات ہی اٹک گئے ہیں۔ جب تک اس کی جگہ نئے چیف کا تقرر نہیں ہوتا، تب تک معاملات جوں کے توں رہیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ ''میری کمپنی یہ نہیں چاہتی ہے کہ میرا نام کسی قتل کے معاملے میں آئے چاہے وہ بطور گواہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے انہوں نے فوری طور پر مجھے واپسی کی ہدایت کی ہے۔ نئے چیف کا تقرر ہونے کے بعد شاید کسی اور کو معاہدے پر بات چیت کے لیے بھیجا جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ وہ کسی حد تک نروس لگ رہا تھا۔ ''دیکھو نا، اب جب کہ سب سے بڑی رکاوٹ ہٹ گئی ــ اور میں نئے چیف سے ممکنہ طور پر معاہدہ طے کرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا تو وہ مجھے واپس بلا رہے ہیں۔ اب جس کو بھیجیں گے، اسے تو پکی پکائی ہانڈی ملے گی۔ میں نے جو اتنی محنت کی، سر کھپایا، وقت لگایا، وہ سب گیا بھاڑ میں۔ کریڈٹ لے جائے گا وہ آنے والا اور ناکامی گئی میرے کھاتے میں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بہت افسردہ لگ رہا تھا۔
''حوصلہ کرو۔'' میں بھی اس کی بات سن کر پریشان ہوگئی۔
''ویسے مجھے امید ہے کہ اس ناکامی پر کمپنی مجھے

ملامت سے نہیں نکالے گی۔'' یہ کہہ کر گلین رکا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ''مجھے بھی کارسن کی افسوسناک موت کا دکھ ہے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' وہ عجیب بے ربط انداز سے کہہ رہا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ واپس بلائے جانے کی بات اس نے دل پر لے لی تھی۔ ''خیر، معاہدے سے لے کر کارسن کی موت تک، جو کچھ ہوا میں کسی طور اس کا ذمے دار نہیں۔''
''یہ سب کچھ جان کر مجھے دلی افسوس ہوا۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسا دیا۔
''میں کوشش کروں گا جلدی واپس آؤں۔'' اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ خاصا دل شکستہ لگ رہا تھا۔
''بالکل، ہم جلد دوبارہ ملیں گے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''یقیناً... ہم دوبارہ ملیں گے اور جلدی ملیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بنا کچھ کہے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کا سن کر میں بھی اداس ہوگئی.... چند روز کی قربت میں ہم دونوں ایک دوسرے کے خاصے قریب آ گئے تھے۔
میں کافی دیر سے کچن میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ مجھے گلین یاد آ رہا تھا اور میں خود کو یہ باور کروانے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے اگلے چند ہفتوں تک کوئی یاد نہ آئے۔ میں خود غرض بننا چاہتی تھی مگر شاید یہ بات میرے بس سے باہر تھی۔ میں لاکھ چاہنے کے باوجود خود غرض نہیں ہو سکتی تھی۔ شاید اسی لیے اب تک تنہا تھی مگر گلین کے بعد... میں نے سر جھٹکا۔ میں خود کو سوچوں کے سمندر سے نکالنا چاہتی تھی۔ اچانک مجھے اپنے پاؤں پر کوئی شے رینگتی محسوس ہوئی۔ دیکھا تو ایلزی پاؤں چاٹ رہا تھا۔ بے اختیار مجھے اس پر پیار آ گیا۔ میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے سر پر پیار سے انگلیاں پھیرنے لگی۔
میں کچن سے اٹھ کر لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئی اور وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول دیا مگر سوچوں سے پیچھا نہ چھڑا سکی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کل رات باب کی حالت اتنی غیر کیسے ہوئی؟ بظاہر وہ مکمل تندرست آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے اور کارسن کے ساتھ مار کٹائی بھی کچھ ایسی غیر معمولی نہیں تھی مگر پھر بھی اس کی حالت اتنی خراب کیسے ہوئی کہ رات اسپتال میں گزارنا پڑی۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ جب اسے کارسن کی موت کا علم ہوا ہوگا تو نفسیاتی لحاظ اس پر منفی اثر ہونا لازم تھا مگر ریستوران میں تھوڑی سے دیر کی مار کٹائی میں اس کی حالت کا غیر ہو جانا... کم از کم میری سمجھ سے یہ بات باہر تھی۔ کل رات تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا اپنے جسم پر سے... کنٹرول ختم ہو چکا ہے۔ وہ مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟... لاکھ سوچنے پر بھی میں یہ سمجھ نہ سکی۔ بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے ایک بات یاد آ گئی۔
یہ تقریباً پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ کورٹ ہاؤس میں ایک ٹیزر کی نمائش ہوئی تھی۔ ننھے سے ٹیزر کو جسم کے ساتھ لگاؤ تو جسم کو جھٹکا لگتا تھا۔ یہ ٹیزر مجرموں سے سچ اگلوانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں بھی وہاں گئی تھی۔ وہاں باب بھی موجود تھا۔ لوگ ٹیزر سے لگنے والے جھٹکے محسوس کرنا چاہتے تھے مگر ڈر بھی رہے تھے۔ اس موقع پر پولیس افسر جانسن اور باب نے خود کو رضا کارانہ طور پر آگے کیا۔ اس وقت بظاہر دونوں تندرست اور ہر لحاظ سے اس ٹیسٹ کے لیے فٹ تھے۔ سب سے پہلے ٹیزر کی آزمائش جانسن پر کی گئی اور اس کے بعد باب کا نمبر آیا۔ ٹیزر لگنے کے بعد دونوں نے اسی طرح جھٹکے لیے تھے جیسے کل رات مرنے سے پہلے کارسن نے۔ بعد میں باب نے اس تجربے پر اپنے اخبار میں ایک دلچسپ مضمون بھی لکھا تھا۔
میں نے فوراً پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ گرانٹ اس وقت دفتر میں ہی تھا۔
''مسٹر گرانٹ میں لنڈا تھامسن بول رہی ہوں۔''
''جی کہیے۔''
''میرا خیال ہے کہ میں شاید یہ بات جان گئی ہوں کہ اصل میں کل رات کیا ہوا ہوگا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اب یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ کام کس نے کیا ہے۔ ٹینا نے یا پھر گلین... میرا مطلب ہے گلین کا فلنگ۔''
''میں سمجھ گیا، جانتا ہوں اسے۔'' گرانٹ نے فوراً جواب دیا۔
''وہ کچھ دیر پہلے ڈینور جانے کے لیے لیکسن سے نکلا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اب بھی اسے پکڑ سکتے ہیں۔ آپ پتا چلائیں کہ کیا ان دونوں میں سے کسی ایک کے پاس ٹیزر تو نہیں ہے۔''
مجھے ایسا لگا کہ میری بات سن کر وہ کسی دوسرے شخص سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد آفیسر جانسن لائن پر تھا۔ ''شکریہ لنڈا، یہ ٹیزر والا کیا معاملہ ہے؟ ذرا کھل کر بتاؤ۔'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
''اس وقت بہت ساری باتیں ذہن میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔'' میں نے جانسن کو بتانا شروع کیا۔ ''میں یقین سے تو

کچھ نہیں کہہ سکتی مگر لگتا ہے کہ باب اور کارسن میں سے کسی ایک یا دونوں پر ٹیزر استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے واقعے کے وقت ان کے جسم جھٹکے لے رہے تھے۔'' میں نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔ ''ضروری ہوگا کہ باب اور کارسن کے جسموں پر ٹیزر لگنے کے نشانات چیک کیے جائیں۔''

''کیا تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟'' یہ گرانٹ کی آواز تھی۔

''مجھے نہیں پتا۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''مجھے نہیں پتا کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں۔ نہ ہی میں یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ کس نے کیا ہے... ٹینا نے یا پھر گلین مگر مجھے لگتا یہی ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ کیوں ہوا، کس نے کیا اور اس کا مقصد کیا تھا... یہ آپ پتا چلائیں۔''

''ٹینا اور گلین کی میل ملاقات تھی؟'' گرانٹ نے قطع کلامی کی۔

''وہ بھی ڈینور کانفرنس میں تھی اور گلین بھی۔ یقیناً وہ مل چکے ہوں گے۔ ویسے پچھلے ہفتہ دس دن سے گلین لیسکن میں ہی تھا۔ اور ٹینا ایسی چیز ہے تو نہیں کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ جو اس سے ایک بار مل لے، وہ آسانی سے اسے نہیں بھول سکتا بشرطیکہ ملنے والا مرد ہو۔''

''اور کوئی بات؟'' گرانٹ نے پوچھا۔

''کارسن کا ریستوران پہنچنا اتفاقی نہیں تھا۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا کہ وہ اپنی گاڑی سے نکل کر سیدھا اس طرف بڑھا جہاں ٹینا اور باب ہم آغوش تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی نے اسے فون کرکے بتایا ہوگا کہ وہ دونوں اس جگہ ہیں۔ کارسن تو مر گیا مگر سوال یہ ہے کہ اسے کس نے اُن دونوں کی وہاں... موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ دوسرا یہ کہ کارسن کو یہ اطلاع دے کر وہاں بلوانے کا مقصد کیا تھا۔ تیسرا یہ کہ کیا سب کچھ اتفاق تھا یا سوچا سمجھا منصوبہ...؟''

''تمہارے نکات غور طلب ہیں۔'' میں خاموش ہوئی تو اس نے کہا۔ ''تمہارا شکریہ۔ تمہاری باتوں سے تفتیش میں بہت مدد ملے گی۔ اس معاملے میں جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوتی ہے، میں تمہیں فون کرکے بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر گرانٹ نے فون بند کر دیا۔

اب مجھے اپنا دماغ خاصا ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ویسے تو کارسن کا قتل اور باب کا مجرم ٹھہرنا سیدھی سی بات تھی لیکن جب پولیس تفتیش میں ٹیزر کا معاملہ آیا اور مقدمہ عدالت میں چلا تو کافی باتیں زیرِ بحث آئیں۔ ٹینا اور گلین کے پاس ٹیزر کی موجودگی ثابت ہوئی۔ یہی نہیں، واقعے کے وقت وہ دونوں کے پاس موجود تھا۔

کارسن دل کا مریض تھا۔ عدالت میں یہ بھی سوال اٹھا کہ آیا اس کی موت کا سبب باب کا گھونسا تھا یا پھر دل کا دورہ یا پھر ٹیزر کا جھٹکا جو دل کے مریض کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ حیرت انگیز طور پر پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اس کی موت کی اصل وجہ بتانے سے قاصر رہی تھی۔ ساتھ ہی عجیب بات یہ تھی کہ کارسن اور باب دونوں کے جسم پر ٹیزر استعمال کرنے کے نشان نہیں ملے۔ جس کے متعلق یہ قیاس کیا گیا کہ اگر ٹیزر استعمال کیا گیا تھا تو چند گھنٹوں بعد اس کے نشانات جسم سے معدوم ہو جاتے ہیں۔ پولیس نے واقعے کے لگ بھگ پندرہ بیس گھنٹے گزر جانے کے بعد نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے ممکن ہے کہ ٹیزر لگا تو ہو مگر زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے نشان ختم ہو گیا۔ ان حالات میں باب کے قتل کی اصل وجوہ کا تعین کرنا پولیس اور عدالت، دونوں کے لیے بہت مشکل کام تھا۔

دوسری طرف گلین نے اپنے پاس ٹیزر کی موجودگی کا اعتراف تو کیا لیکن اس رات استعمال کرنے کا الزام مسترد کر دیا۔ گلین کا کہنا تھا کہ وہ ایک بڑے شہر میں رہتا ہے۔ اس نے ٹیزر اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا مگر آج تک کبھی اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

ٹینا نے نہ صرف ٹیزر کی موجودگی کی تصدیق کی بلکہ اس رات اس کے استعمال کا بھی اعتراف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹیزر باب پر استعمال کیا تھا تاکہ وہ کارسن کو اس کے ہاتھوں پٹنے سے بچا سکے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ ٹینا کے بیان سے ہی جائے وقوع سے ملنے والے چھری کا معما حل ہوا مگر باقی دو مشتبہ افراد نے اسے پھر معما بنا دیا۔ ٹینا نے الزام لگایا تھا کہ وہ چھری اس نے باب کے پاس دیکھی تھی۔ اگرچہ وہ عام سی چھری تھی مگر لڑائی کے دوران کسی کی جان بھی لے سکتی تھی۔ ٹینا کے مطابق یہی وجہ تھی کہ جب وہ کارسن سے گتھم گتھا تھا تب اس نے باب کو ٹیزر سے جھٹکا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں غلطی سے ٹیزر کارسن کو بھی لگ گیا ہو۔ ویسے بھی اس وقت جو صورتِ حال تھی، اس میں ایسا ہونا ممکن تھا۔ البتہ باب نے ٹینا کے الزام کو سرے سے ہی مسترد کر دیا تھا۔ اس نے بیان دیا کہ واقعے کے وقت اس کے پاس چھری نہیں تھی۔

اگر باب درست اور ٹینا غلط تھی تو پھر گلین ہی مشکوک رہ جاتا تھا۔ اس نے بھی باب کی طرح چھری سے ہر قسم کی

لاعلمی ظاہر کی اور پولیس بھی اس سے چھری کا تعلق نہیں جوڑ سکی۔ رہی سہی کسر ریسلاٹش کی ویٹرس کرسٹین کے بیان نے پوری کر دی۔ اس نے عدالت کو بتایا کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا، اس نے گلین اور مجھے ہیم برگر لا کر دیا تھا، جسے کھانے کے لیے کانٹے چھری پیش نہیں کیے جاتے۔ عدالت میں باب کے وکیلِ صفائی نے ان بیانات کی روشنی میں دلیل دی کہ لڑائی کے وقت وہاں کئی لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ممکن ہے کہ ناگہانی لڑائی سے گھبرا کر کوئی اٹھا ہو، اس کی چھری گر گئی ہو جو لوگوں کے پاؤں سے ٹھوکر کھاتے ہوئے کارسن کی لاش کے قریب پہنچ گئی ہو۔ فرانزک ٹیسٹ کے نتیجے سے بھی کوئی خاص مدد نہیں مل سکی۔ چھری پر اتنے سارے نشان تھے کہ جس میں سے کسی فردِ واحد کی انگلیوں کے نشانات کا تعین کرنا ناممکن تھا۔

عدالتی کارروائی کے دوران ٹینا نہایت پُرسکون رہی مگر اس کا یہ سکون کام نہیں آیا۔ عدالت میں یہ ثابت ہو گیا کہ گلین اور ٹینا واقعے سے کچھ پہلے ڈینور میں منعقدہ انرجی کانفرنس میں پہلی بار ملے تھے، جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ شرکت کے لیے پہنچی تھی۔ وہیں گلین اور اس کی پہلی ملاقات ہوئی اور اس کے بعد دونوں میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ اُس وقت مجھے گلین کا وہ جملہ یاد آیا جب اس نے لیسکن کنٹری کلب میں ٹینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہی کارسن کی بیوی ہے۔ اسی لمحے گلین میری نظروں سے گر گیا۔ گلین اور ٹینا نے عدالت میں اپنی دوستی کا اعتراف کیا مگر یہ قابلِ سزا جرم نہیں تھا۔

کئی مہینوں کی سماعت کے بعد جیوری نے ٹینا کو واقعے کا اصل محرک قرار دیا۔ اسی کی وجہ سے وہ لڑائی شروع ہوئی، جس کے نتیجے میں کارسن کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ عدالت نے اسے ایک سال قید اور دس ہزار ڈالر جرمانے کی سزا دی۔ ساتھ ہی اسے کارسن کی جائداد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ کارسن کی ساری جائداد کا وارث اس کی پہلی بیوی سے ہونے والی اولاد کو قرار دیا گیا۔ ٹینا نے عدالت سے استدعا کی تھی کہ اسے سزا بھگتنے کے لیے ریاست کی کسی دور دراز جیل بھیج دیا جائے۔ عدالت نے یہ استدعا قبول کر لی۔ ویسے بھی اتنا کچھ ہونے کے بعد وہ کس منہ سے لیسکن میں رہ پاتی۔

باب کو سرِعام مار پیٹ اور پرائیویٹ پراپرٹی میں ہنگامہ آرائی کے الزام میں دو ماہ قید اور تین ہزار ڈالر جرمانہ ہوا۔ اس سارے واقعے میں گلین پر کوئی الزام ثابت نہ ہوا اور وہ بری کر دیا گیا۔

گلین کو مقدمے کے دوران میں ہی اس کی کمپنی نے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ مگر لیسکن پاور کمپنی نے اسے نیا چیف بھرتی کر لیا مگر قدرت کے فیصلے انوکھے ہوتے ہیں۔ وہ عہدہ سنبھالنے کے لیے براستہ کار ڈینور سے لیسکن آ رہا تھا کہ ہائی وے پر ایک خوفناک حادثے میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔

اس سارے واقعے کا دلچسپ پہلو یہ نکلا کہ مجھے ایک اچھا دوست مل گیا اور شاید برسوں بعد مجھے کوئی سچا ساتھی ملا تھا۔

☆☆☆

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں ایلزی کے ساتھ گھر کے سامنے ٹہل رہی تھی کہ سامنے سے باب آتا دکھائی دیا۔ ''ارے تم...'' میری نظر جیسے ہی اس پر پڑی، میں نے خوشی سے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ باب کو دیکھتے ہی ایلزی تیزی سے اس کی طرف دوڑا اور پاؤں سے لپٹ گیا۔

''چلو، اندر چلو۔''

''کب رہا ہوئے؟'' میں نے اس کو لیونگ روم میں بٹھا کر کافی بنائی اور... رسمی بات چیت کے بعد پوچھا۔

''کل شام۔'' اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اچھے چال چلن اور صحافتی پس منظر کے باعث میری باقی سزا معاف کر دی گئی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا...''

''ہاں، کچھ اچھا ہوا، کچھ بُرا ہوا... پر یہی زندگی ہے۔''

''ٹینا کو نہیں بھول پائے اب تک۔'' یہ سن کر میں نے شرارت سے کہا۔

''پہلی بار اس حرافہ کو دل سے بھلا دیا اور نظروں سے گرا دیا ہے۔''

''کیا مطلب...''

''بڑی شاطر عورت ہے۔ میں تو خود اس کے ہاتھوں استعمال ہوا تھا۔''

''کیا...'' یہ سن کر میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اس نے گلین کے ساتھ مل کر یہ ناٹک رچایا تھا۔'' باب نے انکشاف کیا۔ ''ایک طرف وہ کارسن کو مار کر اس کی ساری دولت ہتھیانا چاہتی تھی تو دوسری طرف گلین کو کارسن کی موت کے بعد پاور کمپنی کا نیا چیف بنوا کر خود اپنا عیش برقرار رکھنا چاہتی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا یہ سب کچھ...؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''کچھ ان سے کچھ حالات سے۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔ ''مجھے ٹینا نے پیشکش کی تھی کہ گلین کے چیف بننے کے بعد وہ مجھے بھاری تنخواہ اور مراعات پر افسر تعلقاتِ عامہ بنوا دے گی۔''

''تو تم جانتے تھے کہ کارسن مارا جائے گا۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ''اگر میں یہ جانتا تو پھر اس گھناؤنے کھیل کا حصہ نہیں بنتا۔''

''تو تم نے ان سے نہیں پوچھا کہ کارسن بیچ سے کیسے ہٹے گا؟''

''گلین اور ٹینا، دونوں سے پوچھا تھا مگر وہ یہ کہہ کر ٹال جاتے تھے کہ ہم نے سوچ رکھا ہے۔ وقت آنے پر دیکھ لینا۔'' یہ کہہ کر اس نے لحہ بھر توقف کیا۔ ''بس! میں یہیں مار کھا گیا۔ مجھے کارسن کی موت کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔''

''تو کارسن کو فون کس نے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کیا تھا مگر آواز بدل کر۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''منصوبے کے مطابق مجھے اسے اشتعال دلانا تھا تاکہ ٹینا کے بقول وہ غصے میں آئے اور پھر اسے طلاق دے دے۔ اس طرح اسے کارسن کی آدھی جائداد مل جائے گی وہ لڑائی اسی منصوبے کا حصہ تھی۔''

''تم سب ناکام ہوئے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کسی کو کچھ نہیں ملا ماسوائے رسوائی اور ذلت کے۔''

''میں تمہارا بڑا مشکور ہوں جو ایلزی کا خیال رکھا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''میں اسے لینے آیا ہوں۔''

''ہاں ہاں، ضرور لے جاؤ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تمہارا ہی ہے۔ میں نے تو بس چند روز اس کی دیکھ بھال کی ہے۔''

''اس کے لیے میں تمہارا بہت ہی شکر گزار ہوں۔''

''ارے نہیں باب... ایسی کوئی بات نہیں۔ آخر تم میرے دوست ہو۔''

''ایک اور بات... میرے ساتھ ڈنر پر چلو۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے پیشکش کی اور امید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں اس کی بات سن کر کافی دیر خاموش رہی اور پھر گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''باب، تم نے بہت دیر کر دی۔''

''کیا مطلب۔'' وہ یہ سن کر چونک گیا۔

''جب میں تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی تو تم ٹینا کے گرد گھوم رہے تھے۔ اور اب...'' یہ کہہ کر میں نے گہری سرد سانس لی۔ ''اب سب کچھ ختم ہو گیا۔ بہت کچھ بدل گیا۔'' یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں کے کونوں میں نمی اتر آئی۔ اس لیے میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

''دیکھو میں تم سے...''

''معذرت چاہتی ہوں۔'' اسی دوران میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے باب سے معذرت کرتے ہوئے فون اٹھایا، نمبر دیکھا اور کال اٹینڈ کی۔ ''ہیلو... ہاں میں تیار ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں نکل رہی ہوں۔''

''کہیں جا رہی ہو؟'' جیسے ہی میں نے فون بند کیا، اس نے پوچھا۔

''ہاں، ڈنر پر جانا ہے مگر اس سے پہلے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔

''اچھا... ٹھیک ہے، تو پھر میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایلزی کو گود میں اٹھایا اور جانے لگا۔

''اے باب سنو!'' میں نے اسے پکارا۔ وہ دروازے پر تھا، وہیں رک گیا۔ ''میں اور گرانٹ اگلے اتوار کو شادی کر رہے ہیں۔ تم ضرور آنا سینٹ ولیم چرچ میں...''

یہ سن کر وہ جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی پلکوں پر نمی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر وہ پلٹا اور آہستہ سے کہا ''بائے'' اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

بائے۔'' میں نے بھی آہستہ سے جواب دیا اور کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ شکستہ قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ ایلزی اس کی گود میں تھا۔ اسے جاتا ہوا دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں گرانٹ سے شادی کرنے جا رہی تھی مگر میں نے برسوں اپنی آنکھوں میں باب کے خواب سجائے تھے لیکن اس نے کبھی مجھے اہمیت نہیں دی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔ اس کی شکستہ چال، افسردگی، نم آنکھیں... میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ میری محبت جیت گئی تھی۔ وہ خود کو میرے قدموں میں ڈال کر نامراد لوٹ گیا تھا۔ پہلی بار مجھے جیت کا احساس ہوا یا شاید اب میں خود غرض بننے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

دیر آید

تنویر ریاض

باعثِ تاخیر اگر کچھ ہوتا ہے تو اس میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے .....دو بھائیوں کی مثالی محبت کا قصہ .....وقت و حالات نے ان دونوں کے درمیان فاصلے حائل کر دیئے تھے....

[illegible] ماضی کے [illegible] جنہیں تھامے [illegible] وقت کی دھند [illegible]

بوڑھے آدمی نے آنکھیں کھولیں اور درد سے کراہنا شروع کر دیا۔ اس کے سوجے ہوئے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی دھار بہہ نکلی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے صاف کرنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے اس کا بازو بے جان ہو گیا ہے اور حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اس نے بڑی مشکل سے گردن گھما کر پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی بیوی کی طرف

دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس کی بیوی آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ پر نیم دراز تھی اور اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آنے لگا۔ ہاں، وہ ایک ٹرک ہی تھا۔ بہت بڑا ٹرک جس کا سامنے والا بمپر آگے کی طرف نکلا ہوا تھا۔ یہ آخری منظر تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ ٹرک کی زوردار ٹکر سے اس کی کار الٹ گئی اور اس کی بیوی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اسے اپنے آپ کو بچانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اب وہ ٹوٹے ہوئے ونڈ شیلڈ سے آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے بازوؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ اس بار اسے جزوی کامیابی ہوئی تاہم وہ پوری طرح اس کے دماغ کا حکم ماننے سے قاصر تھے اور مٹی کے کھلونوں کی طرح اس کے کندھوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ بازو اپنی جگہ موجود تھے البتہ انہیں اپنی عمومی پوزیشن پر آنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ ایک بار وہ اپنے آپ کو سیٹ بیلٹ سے آزاد کروا لیتا تو کسی نہ کسی طرح رینگ کر کار سے باہر آ سکتا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ کسی کی مدد سے اسپتال جاتا اور گاڑیاں کھینچ کر لے جانے والی کمپنی پر ہرجانے کا دعویٰ کر سکتا تھا کیونکہ وہ بھی گاڑی کھینچنے والا ٹرک تھا۔ اسے ٹرک کے کیبن کے پیچھے لگی ہوئی کرین نظر آئی تھی اور اس پر مخصوص رنگ یعنی نیلا اور پیلا پینٹ کیا گیا تھا۔ ٹرک کے کیبن میں دو افراد سوار تھے جن کے پورے جسم پر ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ اس نے غصے سے سوچا۔ ’’اوہ میرے خدا! وہ مجھے مرنے کے لیے یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں بھی انہیں چھوڑوں گا نہیں۔‘

ایک بار پھر ڈیزل انجن کی گھڑگھڑاہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے بڑی مشکل سے گردن گھما کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہی نیلے پیلے رنگ کا ٹرک آہستہ آہستہ کار کی جانب بڑھ رہا تھا جو اس سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا۔ ’میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔‘ اس نے تلخی سے سوچا۔ ’میری غلطی نہیں تھی۔ انہوں نے ہی ٹرک کی رفتار تیز کر رکھی تھی۔ انہوں نے میرے بازو توڑ دیے اور میری بیوی کو جان سے مار دیا۔ ایسے لوگوں سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔‘

وہ ٹرک اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ اسے اس کے بھاری ٹائروں اور دروازے کے نچلے حصے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ پولیس کہاں ہے؟ اس وقت تک تو کسی پٹرولنگ کار کو یہاں آ جانا چاہیے تھا۔ اس نے کیبن کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر اسے بھاری جوتے نظر آئے۔ پھر دوسری طرف کا دروازہ بھی کھل گیا اور دونوں آدمی باہر آ گئے۔ اس نے مشاہدے کی بنیاد پر اندازہ لگایا کہ وہ اسی کی طرف آ رہے ہیں۔ انہوں نے کاؤبوائے بوٹ پہن رکھے تھے جن کا اگلا حصہ نکیلا اور سخت ہوتا ہے۔ ان کا رخ اسی کی جانب تھا۔ وہ بے صبری سے ان کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دونوں سڑک پار کر کے اس کی کار تک آئے اور کھڑکی کے پاس رک گئے۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ’’میری مدد کرو۔‘‘ اسے اپنی آواز سن کر یوں لگا جیسے وہ غرارے کر رہا ہو اور اس کے الفاظ ان کی سماعت تک پہنچنے سے پہلے ہی فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ ان دونوں کی چھاتی اور بازوؤں پر مختلف ٹیٹوز بنے ہوئے تھے جس سے ان کے ذوق اور مزاج کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کے چہروں کی جانب دیکھ پاتا، کاؤبوائے جوتے پہننے والے نے کہیں سے ایک تیز دھار بلیڈ نکالا جسے دیکھ کر بوڑھا خوف زدہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا یہ میری گردن کاٹنے والا ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

ان میں سے لمبے قد والا آگے بڑھا اور بوڑھے شخص کو گمان گزرا کہ وہ سیٹ بیلٹ کاٹنا چاہ رہا ہے۔ پھر دوسرے لمحے اسے محسوس ہوا جیسے اس کے گلے پر تیز دھار والا بلیڈ رکھ دیا گیا ہو اور وہ ابھی تک اپنی سیٹ سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندی چھانے لگی اور اس میں چلانے کی بھی قوت باقی نہ رہی۔ اس کا چہرہ خون سے تر ہو گیا اور آنکھیں بند ہونے لگیں پھر اس کے دل اور دماغ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم نے میرا گلا کیوں کاٹ دیا لیکن جواب دینے والے پہلے ہی اس چوری کی گئی کار میں بیٹھ کر فرار ہو چکے تھے جو انہوں نے کچھ فاصلے پر کھڑی کی ہوئی تھی۔

☆☆☆

بائرن نے تیسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی فون اٹھا لیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ’’چیف بائرن بول رہا ہوں۔‘‘ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

’’بائرن۔‘‘ ایک عورت کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ’’میں ریا بول رہی ہوں۔‘‘

بائرن کی نگاہوں کے سامنے اپنے بہترین دوست کی بیوی کا چہرہ گھوم گیا جو ایک شائستہ اور وضع دار عورت تھی لیکن

وقت اس کی آواز سے پریشانی عیاں تھی۔

’’کیا ہوا، سب خیریت تو ہے؟‘‘ رات کے اس پہر اس کے فون کرنے کا مطلب یہی تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ اس کا دھیان فوراً ہی ٹام کی طرف چلا گیا جسے پچھلے دنوں دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے پہلا سوال اسی کے بارے میں کیا۔

’’ٹام تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

چند لمحے خاموشی رہی پھر اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’ٹام کہیں چلا گیا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا لیکن وہ منگل کے روز سے گھر واپس نہیں آیا ہے۔‘‘

بائرن نے بے اختیار چادر کی سلوٹیں دور کرنا شروع کر دیں۔ اب جمعرات کا دن شروع ہونے والا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹام کو غائب ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ ویسے تو جولیا بھی نہیں آئی تھی لیکن وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ ان دونوں کی زندگی ٹام اور ریا سے مختلف تھی۔

ریا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ’’میں نے اس کے تمام دوستوں اور جاننے والوں کو فون کر لیا ہے لیکن ان میں سے کسی کو بھی ٹام کے بارے میں کچھ علم نہیں اور نہ ہی انہوں نے اس کے متعلق کچھ سنا ہے۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا‘ جانتی ہوں کہ تمہیں نیوجرسی گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے اور ٹام سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی لیکن میں نے سوچا کہ شاید وہ کچھ وقت تم جیسے پرانے دوست کے ساتھ گزارنا چاہ رہا ہو۔‘‘

وہ بولتے بولتے ایک بار پھر خاموش ہو گئی پھر چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔ ’’کیا وہ تمہارے پاس بھی نہیں آیا؟‘‘ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

’’میں پہلی دستیاب فلائٹ سے تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔‘‘ بائرن اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ’’امید ہے کہ سہ پہر تک پہنچ جاؤں گا۔ اس دوران اگر وہ گھر آ جائے تو مجھے فون کر دینا۔‘‘

☆☆☆

بائرن، ٹام کے دفتر میں اس کی گھومنے والی کرسی پر .... بیٹھا ہوا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا جس کی حالت خاصی خراب دکھائی دے رہی تھی۔ دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے کیبنٹ کافی پرانے ہو چکے تھے جبکہ کچھ الماریاں الٹی پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی شخص نے غصہ میں آ کر انہیں اپنی ٹھوکروں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

اس نے کچھ فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے مطلب کی نہیں تھی اور ان سے ٹام کی گمشدگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ ٹام کا لیپ ٹاپ بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

بارن کئی سال پہلے صرف ایک مرتبہ اس دفتر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ سال میں ایک مرتبہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ وہ ٹام کے ساتھ اپنے آبائی شہر کولمبس بھی ضرور جاتا جہاں وہ ایک ہی محلے میں رہتے اور ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ انہی دنوں ٹام نے اپنا بزنس شروع کیا اور اب اس دفتر میں دوسری بار آکر بارن کو یوں محسوس ہوا کہ اتنے دنوں میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا جس سے اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ ٹام ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی معقول آمدنی تھی اور اس نے مضافات میں ایک خوب صورت گھر بھی خرید لیا تھا۔ اس کی مالی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ دفتر کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے یوں لگا کہ دفتر کی یہ حالت جان بوجھ کر بنائی گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں نیوجرسی میں اس کے ماتحتوں کے کمرے کہیں بہتر تھے۔

بارن نے تمام الماریوں، درازوں اور باکس کی اچھی طرح تلاشی لی تاکہ اسے ٹام کی گمشدگی کے بارے میں کوئی اشارہ مل سکے۔ ریا نے اسے یقین دلایا تھا کہ ٹام کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں اور نہ ہی کبھی اس نے اس بارے میں کوئی بات کی تھی۔

''وہ میونسپل پلاننگ کا ماہر تھا۔'' اس نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ مختلف شہروں کا دورہ کرکے لوگوں سے انٹرویو اور کام کرنے کے طریقہ کار کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کرتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی سے بغض رکھتے ہوں۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔''

ریا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہ واقعی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو دشمن بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اور ٹام ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ بارن کی آنکھوں کے سامنے اس کی تصویر گھوم گئی۔ پتلے پتلے مسکراتے ہونٹ، محراب نما بھویں اور بناوٹی انداز۔۔۔۔ وہ لوگوں میں بہ آسانی گھل مل جاتا تھا۔ اپنے دوست کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی تن دہی سے تلاشی بھی لے رہا تھا۔ بالآخر اس کے ہاتھ ایک لفافہ آہی گیا جو ٹائپنگ میز کی نچلی دراز میں ٹیپ کے ذریعے چپکایا گیا تھا۔ بارن نے لفافہ کھولا۔ اس میں پرانے اخبارات کے تراشے رکھے ہوئے تھے۔ اسے ان تراشوں کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان میں چھپنے والی تصویروں سے سب کچھ واضح تھا۔ ان تصویروں میں وہ اپنے پرانے گھر اور والدین کو بہ آسانی پہچان سکتا تھا۔ ایک اور تصویر اس کے اسکول کی تھی جبکہ ایک اور تصویر میں ایک دس سالہ لڑکا مسکرا رہا تھا۔ بارن کے ہونٹوں پر ایک سرگوشی ابھری۔ ''ڈینیل۔''

بارن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے وہ تمام تراشے دوبارہ لفافے میں رکھ دیے پھر اس کی نگاہ ایک اور کاغذ پر گئی جس پر کچھ نام اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا لیکن وہ سارے پتے کولمبس کے تھے۔ اس نے وہ فہرست بھی لفافے میں رکھی اور اسے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ چند منٹوں بعد وہ اپنی کرائے کی کار میں طوفانی رفتار سے جنوب کی جانب جارہا تھا۔

☆☆☆

چاند کی روشنی میں وہ خالی مکان اور زیادہ پُراسرار لگ رہا تھا۔ اس کے داخلی دروازے کو جزوی طور پر ایک پلائی ووڈ کے ٹکڑے سے بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی تاکہ محلے کے بچے اندر نہ داخل ہوسکیں۔ وہ خود بھی ماضی میں ایک مرتبہ ایسی کوشش کر چکا تھا۔ اچانک کوئی چیز اس کے پیروں سے ٹکرائی۔ اس نے پنسل ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، وہ ایک زنگ خوردہ برائے فروخت کا بورڈ تھا جو بڑھی ہوئی گھاس میں چھپ گیا تھا۔ گویا یہ مکان پینتیس سال بعد بھی خالی ہی تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے اصل مالک کی وصیت پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا۔

یہاں پہنچتے ہی اس کے زخم ہرے ہوگئے۔ ماضی کے واقعات ایک فلم کی طرح اس کے ذہن کی اسکرین پر چلنے لگے۔ اسے یاد آیا کہ ہر ممکن تلاش کے باوجود اس کے بھائی ڈینیل کی لاش نہیں مل سکی تھی اور نہ ہی پولیس اس کے اغوا اور قتل کا معمّا حل کر پائی تھی۔ البتہ مجرم کی نشاندہی ہوگئی تھی اور وہ اپنے انجام کو بھی پہنچ گیا تھا اور اس طرح انصاف کرنے والوں نے ڈینیل کا بدلہ لے لیا تھا۔ جب بارن نے ٹام کے دفتر میں اخبارات کے تراشے اور ناموں کی فہرست دیکھی تو اسے یقین ہوگیا کہ اس کے گمشدہ دوست کو اس پرانے کیس کے حوالے سے کچھ نئے حقائق کا پتا چلا ہوگا جو کہ ممکنہ طور پر ان دونوں کے لیے خطرناک ہوسکتے تھے۔ اسی لیے وہ اس مکان پر آیا تھا جو اس جگہ سے صرف دو بلاک کے فاصلے پر تھا جہاں وہ اور ٹام پل کر جوان ہوئے تھے۔ اس تمام عرصے میں وہ کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آیا تھا۔ یہی مکان تھا جہاں انہوں نے ڈینیل کے قاتل کو مار ڈالا تھا۔

شاید ٹام ان لوگوں کے بارے میں جانتا ہو جن کے نام اس فہرست میں درج تھے لیکن وہ خود کہیں غائب ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اسے بلیک میل کررہا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو ٹام کے بارے میں معلوم ہوگیا ہو کہ وہ ڈینیل کے قاتل کو مارنے میں شریک تھا۔

بارن نے لمبی گھاس میں سے راستہ بنایا اور مکان کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کھڑکیوں سے آنے والی چاند کی روشنی نے اندر کی تاریکی کو کم کردیا تھا۔ اس نیم تاریکی میں وہ تھوڑی دیر بعد کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکا۔ وہاں ایک کرسی اور کافی کی میز پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر راہداری پر ڈالی اور ڈرتے ڈرتے ٹارچ جلا کر کچن کا جائزہ لیا۔ اس کی چوکھٹ پر کوئی چیز پھڑ پھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی پتنگا ہوگا لیکن وہاں اسے ایک چوکور کاغذ نظر آیا جس کے کنارے ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ یہ کاغذ کچھ زیادہ پرانا نہیں تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ اسے حال ہی میں وہاں لگایا گیا ہے۔ بارن احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ہر قدم کے ساتھ اس کے ذہن میں ماضی کی یادیں تازہ ہورہی تھیں۔

اس کہانی کا آغاز بڈی کی گمشدگی سے ہوا جو بارن کا پالتو کتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ ڈینیل کا مستقل ساتھی اور سایہ بن گیا۔ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ نظر آتے۔ وہ ایک گرم صبح تھی اور ان کی چھٹیاں ختم ہونے میں ایک مہینا باقی تھا کہ بڈی اچانک غائب ہوگیا۔ اسے ناشتے کے بعد کسی نے نہیں دیکھا۔

اس کی گمشدگی کا ڈینیل کو اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ بارن نے اسے مشورہ دیا کہ اس طرح سوگ منانے کے بجائے وہ بڈی کو گھر گھر تلاش کرے۔ بارن کو بالکل بھی امید نہیں تھی کہ اس ترکیب کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔ اس طرح ڈینیل کی توجہ اس جانب مبذول ہوجاتی اور وہ کچھ دن بعد صبر کرکے بیٹھ جاتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ مشورہ زندگی بھر کے لیے روگ بن جائے گا۔

ڈینیل کو یہ آئیڈیا پسند آیا۔ اس نے ایک کاغذ پر بڈی کی رنگین تصویر بنائی اور صبح سویرے پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نیت سے نکل پڑا لیکن اس کی واپسی نہیں ہوئی۔ کتے کی تصویر بعد میں کوڑے کے ڈرم میں پڑی ہوئی ملی جو اس مکان کے ساتھ منسلک تھا جہاں اس وقت بارن کھڑا ہوا تھا۔ اس مکان میں رہنے والے شخص نے کتے اور ڈینیل کی گمشدگی کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ تاہم کسی کو اس کی

بات پر یقین نہیں آیا۔

وہ عمر رسیدہ شخص اس گھر میں تنہا رہتا تھا۔ اس کی کوئی بیوی یا گرل فرینڈ نہیں تھی اور اس کے بارے میں لوگ مختلف قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بائرن کے دوستوں کے خیال میں وہ ایک مشکوک شخص تھا۔ جب بائرن نے اپنے بھائی کو گھر گھر جا کر تلاش کرنے کا مشورہ دیا تو وہ اسے مسٹر کرسٹی کے بارے میں بتانا بھول گیا۔ مسٹر کرسٹی کا معمول تھا کہ اسکول کی چھٹی کے وقت اپنے صحن کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا کر وہاں سے گزرتے والے بچوں کو گھورتا رہتا۔

ڈینیل کی گمشدگی کے بعد پولیس نے اس سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ جس وقت اس کے گھر کی تلاشی لی جا رہی تھی تو بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سمیت آدھا محلہ اس کے گھر کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ آخری آفیسر کو رخصت کرنے دروازے تک آیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو فتح کا جشن منانے یا کامیابی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ ٹام نے زور سے بائرن کو ٹہوکا دیا اور بولا۔

''ایسے شخص کو تو مار دینا چاہیے۔ اگر ڈینی کی جگہ میرا بھائی ہوتا تو میں کبھی اس کی جان بخشی نہیں کرتا۔''

بائرن اور ٹام کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ مضبوط جسم کے ایتھلیٹ تھے۔ ان دونوں نے اپنے طور پر کرسٹی کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی اس نے دستک سن کر اپنے گھر کا عقبی دروازہ کھولا تو ٹام نے اسے وحشیانہ انداز میں مارنا شروع کر دیا اور چند ہی لمحوں میں اسے رسّی سے باندھ دیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے کرسٹی کی گردن کے گرد رسّی کا پھندا بنایا اور اس کا دوسرا سرا چھت میں لگے ہوئے ہک سے گزار کر چولہے کے دروازے کے ساتھ باندھ دیا۔ بائرن کو اپنے دوست کی مہارت اور اعتماد دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

بائرن کا خیال تھا کہ انہیں اس سے ڈینیل کے بارے میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے لیکن ٹام نے اس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہا۔ اس کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔ اب ان کا ارادہ تھا کہ اسے اس وقت تک لٹکائے رکھیں گے جب تک وہ ڈینیل کے بارے میں کچھ نہیں بتا دیتا۔ ٹام نے کرسٹی کو ایک کرسی پر کھڑا کر دیا۔ کرسٹی پریشانی کے عالم میں دائیں بائیں جھول رہا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ بائرن اس سے ڈینیل کے بارے میں کچھ پوچھتا، ٹام نے اس کے ہونٹ پر انگلی رکھ دی اور بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا تم نے کسی گاڑی کی آواز سنی؟''

بائرن تیزی سے سامنے والے دروازے کی طرف لپکا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگا۔ ڈاک خانے کی گاڑی کرسٹی کے پوسٹ باکس سے واپس جا رہی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور جب وہ پلٹا تو دیکھا کہ جس کرسی پر کرسٹی کو کھڑا کیا گیا تھا، وہ ایک طرف کو الٹی پڑی ہوئی ہے اور اس کا بے جان جسم چھت سے لٹکا ہوا ہے۔ ٹام نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بے وقوف نے چھلانگ مارنے کی کوشش کی تھی۔'' پھر وہ عقبی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

بائرن اس خوف ناک منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں وقتی طور پر سلب ہو کر رہ گئیں۔ وہ سر جھکائے ٹام کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا اور جب وہ موقع واردات سے کافی دور چلے گئے اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ کسی نے انہیں مکان میں داخل ہوتے یا باہر آتے ہوئے نہیں دیکھا ہے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ بعد میں بائرن کو خیال آیا کہ ٹام نے نکلنے سے پہلے کرسٹی کے ہاتھ کھول دیے تھے تاکہ یہی سمجھا جائے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ واقعہ اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر باورچی خانے کی چوکھٹ سے لگا ہوا کاغذ نکالا اور ٹارچ کی روشنی میں اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا جس پر شکستہ حروف میں لکھا تھا۔ ''تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

☆☆☆

کولمبس پولیس ڈپارٹمنٹ کا چیف، بائرن کا ہم عمر ہی تھا۔ اس نے رسمی طور بائرن کا خیر مقدم کیا اور اس کے سامنے کافی رکھ کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ بائرن نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''چیف! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ملاقات کے لیے وقت دیا۔ جانتا ہوں کہ تم بے حد مصروف ہو۔''

''تم مجھے اسٹیو کہہ سکتے ہو۔ میں اپنے ایک ساتھی چیف کو کیسے منع کر سکتا تھا جبکہ اس کا تعلق نیو جرسی سے ہو۔''

بائرن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں یہیں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا ہوں۔''

''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

"میرا بہترین دوست ٹام لاپتا ہے اور میرے پاس یہ یقین کرنے کی وجوہات ہیں کہ وہ یہیں کہیں کوکبس میں موجود ہے۔ اس کی بیوی کی پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔"

"وہ کوئی بچہ نہیں ہے۔" اسٹیو اپنی کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم نے کبھی اسے تلاش کر بھی لیا تو وہ کبھی تمہارا شکرگزار نہ ہوگا۔ اور ویسے بھی تم جانتے ہو کہ پولیس گھر سے بھاگے ہوئے شوہروں کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" بائرن اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی وجہ سے چھپتا پھر رہا ہے بلکہ زیادہ امکان یہی ہے کہ اسے کہیں لے جایا گیا ہے۔"

"اگر تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے تو ایف بی آئی اس معاملے کو دیکھ سکتی ہے۔" اس نے لحہ بھر کے لیے توقف کیا اور بائرن کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "میری نظر میں یہ پولیس کیس نہیں ہے اور ویسے بھی میں تمہیں بتادوں کہ ان دنوں ہم بہت مصروف ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان دنوں جرائم کی لہر نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے اور اخبارات میں ان واقعات کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اخبار اس کی جانب بڑھا دیا اور ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا گلا کاٹ دیا گیا۔ بظاہر اس قتل کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مقتول کا پرس محفوظ ہے اور یہ پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ ایسے جرائم کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ اس شہر کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے اور اس کی حفاظت کے لیے میرے پاس پانچ سو سے بھی کم پولیس کی نفری ہے۔ اس سے تم میری مصروفیت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

بائرن کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں تصویر کے نیچے لکھے ہوئے مقتول کے نام پر جم گئی تھیں ۔۔۔۔ نکولس اے اسٹرومیئر۔ اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے وہ فہرست نکالی جو اسے ٹام کے دفتر سے ملی تھی اور وہ اس میں درج ناموں پر نظر دوڑانے لگا۔ اسٹرومیئر کا نام تیسرے نمبر پر تھا۔ اس نے اخبار میں دیے گئے نام کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور اسٹیو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"اسٹیو! تمہارا کہنا ہے کہ حالیہ دنوں میں اس طرح کی اور بھی وارداتیں ہوئی ہیں۔ کیا میں ان کے نام جان سکتا ہوں؟"

اسٹیو نے لحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر طوطے کی طرح بولنے لگا۔ "رابنسن، فلیچر، فورسٹر کلاڈیاس۔۔۔۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

بائرن نے ایک بار پھر فہرست میں دیے گئے ناموں پر نظر دوڑائی۔ اس میں رابنسن اور فورسٹر کے نام موجود تھے۔ اس نے اسٹیو کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس مقتولین کی فہرست موجود ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وہ کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔

اسٹیو نے غور سے اس فہرست کو دیکھا اور بولا۔ "میں تمہارے ساتھ ایک آفیسر کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں لیکن ہم تمہیں علیحدہ میز کرسی نہیں دے سکتے۔ تمہیں اسی کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔"

☆☆☆

پہلی ملاقات میں وینڈا اسے نہ پہچان سکی اور نہ ہی بائرن نے واقفیت جتانے کی کوشش کی جبکہ اس نے دیکھتے ہی وینڈا کو پہچان لیا تھا۔ حالانکہ اس واقعے کو کئی برس گزر چکے تھے۔ وہ اسے اپنے ساتھ تہ خانے میں بنے ہوئے کمرے میں لے گئی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "چیف کا کہنا ہے کہ میں تمہیں ان جرائم کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کروں اور اس سلسلے میں تمہاری معاونت کروں۔ کیا خیال ہے، کام شروع کیا جائے؟"

یہ کہہ کر اس نے کئی فائلیں میز پر رکھ دیں اور ان تین آدمیوں کے قتل کے بارے میں تفصیل بتانے لگی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ تفصیل ختم کرکے وہ بولی۔ "ان تینوں کیسوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ تینوں ہی عمر رسیدہ افراد تھے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے یہ بات پہلے ہی نوٹ کرلی ہو گی۔ اس کے علاوہ گواہوں نے تصدیق کی ہے کہ قاتل دو بھاری بھرکم گورے ہیں جن کے جسم پر ٹیٹوز بنے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ہمارا آرٹسٹ ان کے خاکے تیار کر رہا ہے، جو جلد ہی ہمیں مل جائیں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم مقتولین کے گھر والوں سے ایک بار پھر ملاقات کرسکیں؟" بائرن نے پوچھا۔

"اس سے کیا حاصل ہوگا؟" وینڈا نے پوچھا۔

بائرن نے اسے ٹام اور اس کے دفتر سے ملنے والی فہرست کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ "تمہارے دوست کا اس معاملے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" بائرن نے جواب دیا۔ "میں اسی سوال کا جواب تلاش کرنے نکلا ہوں۔"

☆☆☆

رابنسن کی بیوہ نے ان کا استقبال گھر کے دروازے پر کیا۔ اس نے ہاتھ کی بنی ہوئی زرد اور سبز رنگ کی شال پہن رکھی تھی۔ اس نے انہیں پورچ میں رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خوش دلی سے بولی۔

"کیا میں تم لوگوں کے لیے کافی بناؤں؟"

"نہیں، ہم کافی پی چکے ہیں۔" بائرن نے جلدی سے کہا۔ "ہم تمہارے شوہر کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔"

مسز رابنسن کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ شال کو اپنے کندھوں کے گرد مضبوطی سے لپیٹتے ہوئے بولی۔

"کیا اب بھی کچھ سوالات باقی ہیں۔۔۔۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ جو نقصان ہونا تھا، وہ تو ہوچکا۔ کیا اس طرح رابنسن واپس آجائے گا؟"

بائرن محتاط انداز میں بولا۔ "یقیناً یہ ایک بڑا نقصان ہے اور اس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں لیکن یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ لوگ اسی طرح قتل کیے جارہے ہیں۔ ہم اسے روکنا چاہتے ہیں اور اسی لیے یہاں آئے ہیں۔"

مسز رابنسن نے اس کی طرف دیکھا اور سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"ممکن ہے کہ تمہیں کچھ معلوم ہو۔" وینڈا مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ "بعض اوقات ہم جو سمجھتے ہیں اس سے زیادہ جانتے ہیں۔"

"کیا تم یا تمہارا شوہر ٹام نامی کسی شخص سے واقف تھے؟"

بوڑھی عورت نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ "میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔"

رابنسن نے جیب سے فہرست نکال کر اس کی طرف بڑھائی اور بولا۔ "اس فہرست میں جو نام درج ہیں، ان میں سے کسی کو جانتی ہو؟"

اس عورت نے غور سے فہرست پڑھی اور بائرن کو واپس کردی۔ وہ بولا۔ "ان میں سے تم کسے پہچانتی ہو، اس پر انگلی رکھ دو۔"

اس عورت نے ہچکچاتے ہوئے ایک نام پر انگلی رکھی دوسرے اور تیسرے نام پر بھی اس نے اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک فورسٹر کلاڈیاس تھا جبکہ دوسرا ابھی زندہ تھا۔

"تم ورجل کرسٹی کو جانتی ہو، کیا اس سے بھی تمہارے شوہر کا کوئی تعلق رہا ہے؟"

مسز رابنسن نے ایک بار پھر فہرست پر نظر دوڑائی اور بولی۔ "یہ نام فہرست میں موجود نہیں ہے پھر اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وینڈا کچھ بولنے والی تھی لیکن بائرن نے اسے اشارے سے روک دیا اور بوڑھی عورت سے بولا۔ "میری طرف دیکھ کر جواب دو۔"

مسز رابنسن نے اپنا زرد ستا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم یہ کس طرح جانتے ہو؟ تمہیں یہ شک کیوں ہوا؟"

بائرن نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہارے شوہر کے پاس کوئی ایڈریس بک یا ڈائری تھی۔۔۔۔ وہ کہاں رکھی ہے؟"

اس نے اندرونی دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں، ٹیلی فون کے پاس۔"

بائرن نے وینڈا سے کہا کہ وہ اندر جا کر ایڈریس بک لے آئے۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آئی اور اس نے ایڈریس بک بائرن کو تھما دی۔ وہ اپنی کار کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "ہم اسے چیک کرنے کے بعد واپس کردیں گے۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جواب میں چلاتے ہوئے بولی اور پیر پٹختی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

واپسی میں اس نے اپنی گاڑی بار کے سامنے روکی اور سوالیہ نظروں سے وینڈا کی جانب دیکھا۔ اس نے دعوت قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی اور اٹھلاتی ہوئی کار سے باہر آگئی۔ بار کے ایک کونے میں دونوں اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہے تھے کہ وینڈا بولی۔ "کیا تم مجھے اس فہرست کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟"

"جب میں نے محسوس کیا کہ اس فہرست میں کچھ نام تمہارے مقتولین کے بھی ہیں تو مجھے خیال آیا کہ ان کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے ان سب کو آپس میں باندھ رکھا ہے لہٰذا مسز رابنسن کو دیکھ کر میں نے چانس لینے کے بارے میں سوچا اور اسے وہ فہرست دکھا دی۔ وہ ان میں سے کچھ لوگوں کو جانتی تھی اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کا شوہر ان لوگوں کے ساتھ کرسٹی سے بھی واقف تھا۔"

"یہ کرسٹی بیچ میں کہاں سے آگیا؟ اس کا نام تو فہرست میں نہیں ہے۔"

"لیکن وہ اسے جانتی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ اس

کاشوہر بھی اسے جانتا ہوگا اور میرا دوست بھی ان سب لوگوں سے واقف ہوگا یا کم از کم ان کے نام جانتا ہوگا۔"

"کیوں؟" وینڈا نے پوچھا۔

"اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔"

وینڈا نے گہری سانس لی اور بولی۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ان لوگوں کے قتل میں تمہارے دوست کا ہاتھ ہے؟"

بائرن نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ "میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں جانتا لیکن مجھے اس پہلو پر بھی غور کرنا ہوگا۔"

وینڈا اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "تمہیں اس بوڑھی عورت کو یہ فہرست دکھانے کا خیال کیسے آیا؟ یہ نام تمہارے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں؟"

وینڈا کی قربت نے اس پر نشہ سا طاری کردیا تھا، اس نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"کیا واقعی میں تمہیں یاد نہیں رہا؟"

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے ہم کبھی مل چکے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم بیکر ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ایک دن میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ تمہارے اسکول آیا۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ جم میں لڑکیاں ڈانس کررہی ہیں۔ وہاں کا گارڈ ہمارے دوست کا بھائی تھا اس لیے اس نے ہمیں اندر آنے دیا۔ تبھی میری نظر تم پر گئی۔ تم کچھ فاصلے پر رقص کررہی تھیں۔ میں تمہارے قریب گیا اور تم سے اپنے ساتھ رقص کرنے کی درخواست کی۔"

"اوہ خدا..... کتنی دلچسپ کہانی ہے۔" وینڈا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "کہتے رہو۔ میں سن رہی ہوں۔"

"تم نے میری دعوت قبول کرلی۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور میں بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ پھر اچانک ہی بینڈ کی دھن تبدیل ہوگئی اور میں اس لمحے کی سنسنی خیزی کو کبھی نہیں بھلا سکا۔ جب تم میرے بہت قریب آگئی تھیں۔ میں ایک کیتھولک اسکول میں پڑھ رہا تھا اور وہ ستر کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک مجھے لڑکیوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ایسی حرکت کر بیٹھا جس کے لیے اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔"

"اوہ، میرے خدا۔" وینڈا نے سرگوشی کی۔ "وہ تم تھے؟"

"اب تمہیں یاد آگیا؟" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "اس وقت میں بہت مایوس ہوگئی تھی جب تم اچانک ہی شیطان کی طرح غائب ہوگئے اور میں تم سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی۔"

"ہاں، میں اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے تمہیں بھی کھو دیا۔ لیکن یقین کرو میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکا۔"

"تم بعد میں بھی کوشش کرسکتے تھے۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ بائرن کوئی جواب دیتا، وینڈا کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے بیگ سے فون نکالا اور بولی۔

"سراغ رساں سارجنٹ ٹکر۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو وہ بولی۔ "ہم پانچ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔"

اس نے فون بند کرکے بیگ میں رکھا اور اٹھتے ہوئے بولی۔ "ہمیں چلنا ہوگا۔ پولیس اسٹیشن پر ایک پیکٹ ہمارا منتظر ہے جس نے کافی سنسنی پھیلا دی ہے اور اس کا تعلق تم سے ہے۔"

☆☆☆

پولیس چیف اسٹیو دوسری منزل پر واقع تفتیشی کمرے میں ان کا انتظار کررہا تھا۔ اس کے سامنے طویل میز پر کارڈ بورڈ کا ڈبا رکھا ہوا تھا جسے بڑی بیدردی سے کھولنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میز کے گرد کئی لوگ سفید کوٹ پہنے کھڑے تھے اور وہ اس ڈبے کے بارے میں فکرمند نظر آرہے تھے۔

"یہ کسی گمنام شخص کی طرف سے تمہیں بھیجا گیا ہے۔" اسٹیو نے بائرن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اسے کھولنے کے بعد جو کچھ ہم نے دیکھا، اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ٹھیک ہی کیا۔"

بائرن اس کے سامنے میز کی دوسری جانب رکتے ہوئے بولا۔ "تم نے کیا دیکھا؟"

اسٹیو نے اپنی انگلی سے ڈبے کو آگے کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری دی گئی فہرست میں اگلا نام ٹموتھی ویکلے کا ہے اور اس فہرست کے مطابق ابھی زندہ ہے لیکن جب ہم اس کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اسے بھی قتل کردیا گیا؟" بائرن نے کہا۔

"ہاں، اس کا سر خاندانی تلوار سے قلم کیا گیا۔ مسٹر ویکلے نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس

ان کے لیے اس تلوار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ کسی وارث نے انہیں قتل کرنے کے لیے اس تلوار کا استعمال کیا ہو۔"

وینڈا جو ڈبے کی جانب بڑھ رہی تھی، یہ سن کر رک گئی اور بولی۔ "خدا کے واسطے کہہ دو کہ اس کا سر اس ڈبے میں نہیں ہے۔"

اسٹیو نے اس کی جانب دیکھا اور بائرن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "بائرن! مجھے ڈر ہے کہ تمہارے لیے یہ ایک بری خبر ہوگی لیکن اس ڈبے میں جو کچھ بھی ہے، اس کا تعلق تمہارے لاپتا دوست سے ہے۔"

"بری خبر۔" بائرن نے مردہ آواز میں کہا۔

وینڈا نے ڈبے میں جھانکا اور چلاتے ہوئے بولی۔ "اوہ، میرے خدا۔"

"ہاں بری خبر۔" اسٹیو نے نرم لہجے میں کہا۔ "کسی بدبخت نے اس کی شہادت کی انگلیاں تمہیں بھیجی ہیں۔"

بائرن گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یقین ہے کہ یہ انگلیاں اسی کی ہیں؟"

"ہاں، ہم نے ایک انگلی خودکار فنگر پرنٹ سسٹم میں بھیجی تھی۔ یہ تمہارے دوست کی انگلیوں کے نشان سے ملتی ہے جو چند برس پہلے لیے گئے تھے، جب اس نے اٹلانٹا میں پستول کے لائسنس کے لیے درخواست دی تھی۔ البتہ ڈبے پر سے انگلیوں کے نشانات نہیں ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈبا بھیجنے والا اس بارے میں بہت محتاط تھا۔"

"کیا ٹام کے زندہ بچنے کی کوئی امید ہے؟" بائرن نے پوچھا۔

"یہ ممکن ہے۔" اس نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی کوشش کی۔ "وہ اب بھی زندہ ہوگا۔ بشرطیکہ انہوں نے اس کا خون روکنے کی کوشش کی ہو۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انگلیاں کاٹنے سے پہلے یا بعد میں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے بائرن! میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بہت اچھے دوست ہو۔"

"اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟" بائرن بولا۔

اسٹیو نے اپنا بھاری سر ہلایا اور بائرن کی طرف ایک پلاسٹک بیگ بڑھا دیا جس میں ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک تحریر موجود تھی۔ بائرن نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اس کے حاشیے پر دھبے پڑے ہوئے تھے جبکہ کاغذ کے درمیان میں ٹیپ کا ایک ٹکڑا چپکا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "بائرن سے کہو جلدی کرے، میں اپنا کام تقریباً ختم کرچکا ہوں۔"

اسٹیو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہر بات ایک دوسرے کے خلاف جارہی ہے۔ لگتا ہے کوئی مذاق ہورہا ہے۔"

"اس فہرست میں سے اب کون باقی رہ گیا ہے؟"

"صرف ایک، اس کا نام رینڈل ہے اور عمر چھہتر سال۔ چند برس پہلے اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا، اس کے بعد سے وہ اکیلا رہتا ہے۔ اب ہمیں اس پر نظر رکھنا ہوگی۔"

"کیا تم نے رات کی ڈیوٹی کے لیے کسی کو مامور کیا ہے؟"

"ہاں، تم اور وینڈا! مجھے امید ہے کہ تم دونوں اس کام کے لیے انتہائی موزوں ہو۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" بائرن نے کہا اور سوچنے لگا کہ اس طرح اسے وینڈا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔

"بائرن! تم اسلحہ خانے سے کوئی ہتھیار لے لو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے اعشاریہ پینتالیس کا پستول ٹھیک رہے گا۔"

"ہاں، ہمیں اسی کی تربیت دی گئی ہے۔"

"وینڈا! تم چیف بائرن کے ساتھ اسلحہ خانے تک چلی جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

راہداری سے گزرتے ہوئے وینڈا نے کہا۔ "ممکن ہے کہ تمہارا دوست اب تک زندہ ہو لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا۔ شاید وہ ان لوگوں کے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہو۔"

بائرن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کی نظر میں ٹام کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔

وہ ایک کمزور مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اب تو تم جان گئے ہوگے کہ ان واقعات کے پیچھے اس کا ہاتھ نہیں ہے۔"

☆☆☆

رینڈل اپنے لیونگ روم کے تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا ان دونوں پولیس آفیسرز کو دیکھ رہا تھا جو اس کے محافظوں کی جگہ ڈیوٹی پر آئے تھے۔ عورت نے تمام کھڑکیوں کا جائزہ لیا جبکہ مرد دوسرے کمروں کا معائنہ کرنے کے بعد تولیے سے ہاتھ پونچھتا ہوا لیونگ روم میں داخل ہوا۔ رینڈل نے پوچھا۔

"تمہیں اپنی دلچسپی کی کوئی بات نظر آئی؟"

بائرن نے احتراماً اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

رینڈل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میں بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا۔ مجھے عزت چاہیے۔“

وینڈا نے بائرن کی طرف دیکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات یاد رکھنا کہ ہمیں آج کی رات اس بوڑھے کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس کی باتوں کو صبر اور سکون سے برداشت کرو۔“

بائرن نے کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے کا بولٹ چیک کرنے لگا۔

وینڈا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ایک منٹ ٹھہرو۔“ پھر اس نے رینڈل پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔ ”کیا تمہیں کوئی بات معلوم ہوئی؟“

بائرن کچن کی طرف چلا گیا۔ وینڈا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ بائرن نے کہا۔ ”میں کافی بنا رہا ہوں۔“

وینڈا نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور بولی۔ ”بائرن!“ پھر اس نے دونوں بازو سینے پر رکھ لیے۔

بائرن نے لیونگ روم کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اس کے بیڈ روم کی دراز میں بچوں کے انڈرویئر بھرے ہوئے ہیں۔“

”ممکن ہے کہ اس کے پوتے پوتیاں ہوں۔“ وینڈا نے امکان ظاہر کیا۔

بائرن نے کوئی جواب نہیں دیا اور کافی بنانے میں مصروف ہوگیا۔ وینڈا نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں اس کی شخصیت بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ وینڈا نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس مکان میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکتی۔“

”کیا مجھے اپنا باتھ روم استعمال کرنے کی اجازت ہے؟“ ان کے ناراض میزبان نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس میں تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”یہ تمہارا گھر ہے۔“ بائرن نے جواب دیا۔ ”تم جو چاہتے ہو وہ کرو۔ بس اتنی گزارش ہے کہ گھر سے باہر مت جانا۔ کھڑکیوں کے پردے اور دروازے بند رکھنا۔“

”اگر میں چاہوں تو اپنے بستر پر بھی جاسکتا ہوں۔“ رینڈل نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”یہ تمہارے اوپر منحصر ہے۔“ بائرن نے اپنی بات دہرائی۔ ”ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔“

بوڑھے شخص نے ایک چھپکلی کی طرح مکان کے عقبی حصے کی طرف بڑھنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

☆☆☆

وینڈا اپنے الفاظ پر قائم نہ رہ سکی اور صبح تین بجے کے لگ بھگ اس کی آنکھ لگ گئی۔ بائرن بیرونی دروازے کی طرف رخ کرکے ایک کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ کسی نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو اس کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ جائے گا۔ کوڑا اٹھانے والے ٹرک کی آواز سن کر وہ دونوں بیدار ہوگئے۔ بائرن فوراً ہی کھڑا ہوگیا اور کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے باہر جھانکنے کے لیے کھڑکی کا بھاری گرد آلود پردہ ہٹایا۔ کچرا اٹھانے والا ٹرک رینڈل کے گھر کے سامنے رک گیا تھا اور اس میں سے ایک شخص باہر آرہا تھا۔ بائرن نے اس کے بازوؤں پر ٹیٹوز دیکھے اور مڑتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”یہ شخص اپنے کاؤبوائے بوٹ خراب کرے گا۔“

”کچھ نظر آرہا ہے؟“ وینڈا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

بائرن نے کہا۔ ”نہیں۔ وہ صرف کچرا اٹھا رہے ہیں...“ لیکن دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔ اس نے دیکھا کہ کاؤبوائے بوٹ والے شخص نے کچرے کا ڈرم خالی کرکے اپنی جگہ پر رکھ دیا تھا جبکہ دوسرا شخص جو ڈرائیور تھا، ایک اینٹ لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ بائرن کے ذہن میں الفاظ گونجنے لگے۔ دو سفید فام افراد جن کے پورے بدن پر ٹیٹوز بنے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اینٹ اس کھڑکی سے ٹکرائی جہاں سے وہ باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے دائیں طرف جھک کر اپنے آپ کو شیشے کے ٹکڑوں سے بچایا پھر اسے کچن سے وینڈا کی چیخ سنائی دی۔ ”بائرن۔“

اس نے دائیں طرف جھک کر اپنا پستول نکال لیا۔ اسی دوران وینڈا بھی دوڑتی ہوئی آگئی اور اپنا پستول نکال لیا۔ اچانک تباہ شدہ کھڑکی میں سے کاؤبوائے بوٹ والے کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے لمبے اور گھنگرالے بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ ٹیٹوز کی وجہ سے اس کے نقش و نگار دب کر رہ گئے تھے، اس کے باوجود بائرن کو اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لڑکے نے دستی بم نکال کر کمرے میں پھینک دیا اور پلک جھپکتے میں غائب ہوگیا۔ بائرن یا وینڈا کو گولی چلانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

دھماکے کے نتیجے میں بائرن کو ایک بار پھر فرش پر لیٹنا پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور کانوں

کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وینڈا پر کیا گزری ہوگی۔ کو کہ دھماکے سے اس کے اعصاب متاثر ہوئے تھے لیکن وہ زندہ تھا اور دشمنوں کے رحم و کرم پر تھا۔

رینڈل کی وحشت ناک چیخوں نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ دونوں مکان میں داخل ہو چکے تھے اور رینڈل کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے ایک کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ بائرن نے اپنا پستول تلاش کرنے کے لیے اٹھنا چاہا تو ڈرائیور نے وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے ماتھے پر ٹھوکر ماری۔ بائرن دوبارہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

بائرن نے اپنے آپ کو اس جانب گھسیٹنا شروع کیا جہاں وینڈا لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ بے ہوش تھی۔ اس کا ہاتھ کسی دھاتی شے سے ٹکرایا تو اس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور سست روی سے تباہ شدہ دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس نے سورج کی روشنی میں دیکھا کہ رینڈل کو ٹرک کے کمپریسر پر پھینک دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک نے وہ لیور دبا دیا جس سے ٹرک کا بلیڈ نیچے آتا تھا۔ رینڈل زور سے چلّایا اور کسی بے جان کیڑے کی طرح ڈھیر ہوگیا۔ موت اس کے سر پر آچکی تھی۔

بائرن کی پہلی گولی بڑے بوٹ والے شخص سے دور فاصلے پر گزرتے ہوئے ٹرک میں جا کر لگی۔ رینڈل کی چیخوں اور مشین کے شور کی وجہ سے وہ دونوں گولی کی آواز نہ سن سکے۔ لہٰذا بائرن نے ایک اور کوشش کی۔ اس بار گولی دوسرے شخص کو لگی اور وہ ایک طرف کو جھکتا چلا گیا اور لیور پر اس کی گرفت ختم ہوگئی لیکن ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے ساتھی نے لیور سنبھال لیا اور بلیڈ کے نیچے آنے کا عمل دوبارہ شروع ہوگیا۔ رینڈل نے بے بسی سے بائرن کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اگلے فائر کے لیے سیدھا ہوتا، بلیڈ رینڈل کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اب اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کی دہشت بھری آواز فضا میں ابھری اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

جب اس شخص کو یقین ہوگیا کہ اس کا ساتھی واقعی مر چکا ہے تو وہ دبے پاؤں اس راستے پر چل دیا جہاں سے ٹرک آیا تھا۔ بائرن کو اس پر گولی چلانے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس دوران وہاں کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اس کا شکار جا چکا تھا اور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ یہ منظر دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔ پولیس کار کے سائرن کی آواز قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

بائرن نے اپنے عقب میں وینڈا کے کھانسنے اور کراہنے کی آواز سنی۔

”اپنی آنکھیں مت کھولنا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور زمین پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں بھی بند کرلیں۔

سہ پہر کے قریب بائرن اور وینڈا کو اسپتال ایمرجنسی روم سے فارغ کر دیا گیا۔ اسٹیو ان دونوں کا اپنے دفتر میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے اسٹیو کو رینڈل کے ساتھ ہونے والے حادثے کی تفصیل بتائی جس کا اندازہ پہلے ہی اسٹیو کو ہو چکا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب یہ سلسلہ رک جائے گا کیونکہ فہرست میں موجود سب لوگ مارے جا چکے ہیں۔“

جب وہ دونوں جانے لگے تو اسٹیو نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا۔ جانتے ہو انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے یقین ہے بائرن کہ تم میرا اشارہ سمجھ گئے ہوگے۔“

بائرن اس کی جانب مڑا اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا ”شاید میں یہ بات کبھی نہ جان سکوں۔ انہوں نے وہی کیا جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ معاملہ ختم ہوگیا ہے۔“

اس نے اسٹیو یا وینڈا کو اس تحریر کے بارے میں نہیں بتایا جو اسے اپنی جیکٹ کی جیب سے ملی تھی۔ یہ کاغذ اس وقت اس کی جیب میں رکھا گیا ہوگا جب بم دھماکے کے بعد وہ اور وینڈا بے ہوش ہوگئے تھے۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ”اطمینان سے سوچو تو جان جاؤ گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تمہیں اکیلے آنا ہے۔“ اس خط کا طرزِ تحریر بھی ڈبے میں ملنے والے جیسا تھا۔

اسٹیو کے دفتر سے باہر نکل کر وینڈا نے بائرن کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ ”تمہیں آج رات اکیلے نہیں رہنا چاہیے کم از کم میں ایسا نہیں چاہتی۔“

بائرن سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں نے اپنی ساری زندگی اسی طرح گزاری ہے۔“

وینڈا ایک قدم پیچھے ہٹی اور بولی۔ ”لیکن......“

بائرن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”میری اپنی دنیا میں مگن ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں بھی پاکر کھو دوں۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

وینڈا بولی۔ ”اوہ خدا! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ محض ایک وہم کی خاطر مجھے ٹھکرا دو گے۔ تم خوابوں کی دنیا میں رہنے والے شخص ہو۔ اس کے باوجود مجھے اچھے لگتے ہو

، تم نے بہت سی باتیں مجھ سے چھپائی ہیں۔ جانتی ہوں کہ ،اقعات کے پیچھے کوئی ایسی بات ہے جس کا تعلق تمہارے ،لے بھائی کے اغوا سے ہے۔“

اب بائرن کے چونکنے کی باری تھی۔ اس نے وینڈا کی ،ب حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ،لی۔ ”ہاں، میں تمہارے بھائی اور کرسٹی کے بارے میں ،تی ہوں۔ جس دن تم مجھے ملے تھے، اسی روز میں نے گوگل ،ے یہ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ میں محض ایک خوب ،رت لڑکی ہی نہیں بلکہ اچھی پولیس آفیسر بھی ہوں۔ تمہارے دوست کے پاس جن لوگوں کے ناموں کی فہرست ملی، وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس واقعے سے جڑے ہوئے ہیں جس کا اندازہ مجھے اب ہوا ہے۔“

بائرن چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا پھر اعتراف کرتے ،ے بولا۔ ”میں نے اور ٹام نے مل کر کرسٹی کو مارا تھا کیونکہ ،س نے میرے بھائی کو اغوا کیا تھا۔ ہم اس وقت بچے تھے ،مارا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم تو صرف اس ،ے اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنے گئے تھے۔ اس ،یادہ میں کچھ نہیں جانتا لیکن اب ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی کرسٹی کی موت کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور ٹام کا اغوا اسی سلسلے کی ،ی ہے۔“

”اس فہرست کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا ،۔ اس میں شامل تمام لوگ کرسٹی کے ہم عمر تھے لیکن میری ،مجھ میں نہیں آرہا کہ ٹام کے پاس یہ فہرست کہاں سے آئی ،ور اس کا کیا کر رہا تھا؟ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید ان ،تلوں کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہو لیکن اس کی کٹی ہوئی انگلیاں ،ے بعد میں بھی اسی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اسے اغوا کیا گیا اور وہ کسی مشکل میں ہے۔“

وینڈا نے محتاط انداز میں اسٹیو کے دفتر کے دروازے ،انب دیکھا اور بولی۔ ”تم اتنے عرصے سے یہ غم اپنے ،یں لیے پھر رہے ہو جو یقیناً کسی ڈراؤنے خواب سے کم ،ہیں۔“

بائرن نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”یہ ڈراؤنا ،ی وقت شروع ہوگیا تھا جب میں نے ڈینی کو اس ،نتے کی تلاش میں بھیجا تھا اور کرسٹی کی موت بھی اسی کا ،صہ ہے۔ اسی لیے اتنا عرصہ میں اپنے شہر سے دور رہا۔ اسی لیے میں نے پولیس کی ملازمت اختیار کرلی لیکن ایک بار پھر مجھے یہاں لے آئی ہے۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“ وینڈا نے پوچھا۔ ”ٹام کی

بیوی کو کیا بتاؤ گے؟"

"اب میں کیا کروں گا۔" بائرن نے اس کی بات دہرائی اور ٹالنے کی غرض سے بولا۔ "اپنے موٹیل جاؤں گا اور پسندیدہ مشروب سے دل بہلاؤں گا اور پھر مناسب وقت پر اس کی بیوی کو فون کر کے کہہ دوں گا کہ ٹام واپس نہیں آرہا بلکہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔"

وینڈا نے اس کی جیکٹ کا کالر پکڑا اور اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہارا ذہن بدل جائے تو مجھے فون کر لینا اور اندھیرا ہونے کے بعد باہر مت نکلنا۔ میں تم پر نظر رکھوں گی۔"

بائرن نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔ اسے اپنی جیب میں رکھا ہوا خط کسی پتھر کی سل کے مانند لگ رہا تھا۔

☆☆☆

کرسٹی کا مکان پہلے کی طرح چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ وہ جھاڑیوں اور ٹوٹی ہوئی شاخوں کے درمیان سے ہوتا ہوا مرکزی دروازے تک پہنچا۔ وہاں وہی بوسیدہ پلائی ووڈ کا دروازہ ایک کیل کے سہارے ٹکا ہوا تھا۔ بائرن نے اسے ہلکا سا ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ راہداری میں کچن کی جانب سے زرد روشنی آرہی تھی۔ وہ اسی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ جانتا تھا کہ اس کا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ چکی تھیں۔

کمرے کے وسط میں وہی زنگ آلود کرسی رکھی ہوئی تھی جس کے پائے ٹام کے وزن سے لرز رہے تھے۔ ٹام نے احتیاط سے پہلو بدلا کیونکہ وہ پلائی ووڈ کی بوسیدہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے اور کٹی ہوئی انگلیوں پر گندی سی پٹی نظر آرہی تھی۔ اس کے منہ پر بھی ایک میلا کپڑا بندھا ہوا تھا۔ بائرن نے اس کے گلے میں رسّی بھی دیکھی جو چھت کے ہک سے گزرتی ہوئی اس شخص کے ہاتھ میں تھی جس نے خط لکھ کر بائرن کو یہاں بلایا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے پورے جسم پر ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔

"اب تو تمہیں کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا؟" اس نے بھاری لہجے میں بائرن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بائرن نے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ نیلی آنکھیں، ستواں ناک اور شانوں پر پھیلے ہوئے لمبے بال۔۔۔ وہ کچھ کچھ ڈینی سے مل رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا حلق خشک ہونے لگا اور لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ اتر آئی۔ اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لگ رہا تھا کہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔

"کیا تمہیں بچپن میں معلوم نہیں تھا کہ تمہارا دوست کرسٹی کو جانتا ہے؟ مجھے اس پر حیرت ہو رہی ہے حالانکہ ٹام تمہارا بہترین دوست تھا۔"

بائرن نے ٹام کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ بائرن نے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"شاید تمہیں معلوم نہیں کہ کرسٹی کو کم عمر لڑکوں سے دوستی کرنے کا شوق تھا۔ چودہ سال کی عمر تک وہ کرسٹی کا محبوب تھا۔ اس کے بعد اسے کسی کم عمر لڑکے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کرسٹی نے اسے دھمکی دی کہ وہ اپنی جگہ کسی کم عمر لڑکے کا بندوبست کرے ورنہ وہ اسے کسی اور کے پاس بھیج دے گا۔ اتفاق سے اسی وقت میں کتے کی تلاش میں باہر نکلا۔ ٹام نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے جھوٹ بولا کہ ہمارا کتا کرسٹی کے پاس ہے۔ میں اس کے گھر میں چلا گیا۔ اس وقت میری عمر صرف 9 سال تھی۔ اس نے میرے لیے تہ خانے میں ایک کمرا تیار کر رکھا تھا اور اگر فوراً ہی میری تلاش شروع نہ ہو جاتی تو وہ مجھے ٹام کی جگہ رکھ لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس کے آنے سے پہلے کرسٹی نے مجھے اپنے دوستوں کے پاس بھیج دیا۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس کے کن دوستوں کی بات کر رہا ہوں؟ تمہیں ان ناموں کی فہرست ٹام کے دفتر سے مل گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹام کو یہ فہرست مسز کرسٹی سے ملی ہوگی اور یہ اسی کو بلیک میل کر کے پیسے بنا رہا ہوگا۔ میں سات سال تک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ کوئی مجھے اپنا لے پالک ظاہر کرتا تو کوئی میرا تعارف اپنے بھتیجے یا پوتے کے طور پر کرواتا۔ یہ مختلف نام تھے اور اگر ٹام کے پاس یہ فہرست نہ ہوتی تو مجھے ان لوگوں کو یاد رکھنا مشکل ہو جاتا۔

"جب میری عمر سولہ سال ہوئی تو میں ان لوگوں کے لیے بیکار ہو گیا۔ اب میرا کوئی خریدار نہیں تھا۔ میں گھر نہیں ... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا ... میں چھوٹا بچہ نہیں رہا تھا۔ میں جرم کی دنیا کا باسی بن گیا ... کے نتیجے میں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔۔۔ اور سچ تو یہ ہے ... وہاں کا ماحول مجھے راس آگیا۔ وہیں میری ملاقات ... ایسے شخص سے ہوئی جو تمہاری وجہ سے جیل گیا تھا۔ ا...

...الی معلوم ہوا کہ تم نیوجرسی میں پولیس آفیسر ہو۔ اسے معلوم ... تھا کہ تم میرے بھائی ہو۔ اسے امید تھی کہ جیل سے رہا ... ہونے کے بعد وہ تم سے انتقام ضرور لے گا لیکن اس سے پہلے ... اس کی موت واقع ہو گئی۔" کمرے میں گہری خاموشی ... چھائی ہوئی تھی۔ بائرن کو لگا جیسے سڑک کے پار کوئی گاڑی آکر ... رکی ہے اور کسی نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا ہے لیکن وہ ... اس کا وہم بن گیا۔ ڈینی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر تم اور ٹام ..... کرسٹی کو نہ مارتے تو پولیس اس سے میرا پتا معلوم کر لیتی اور یوں میری زندگی برباد نہ ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ٹام کا منصوبہ تھا۔ اس نے کرسٹی کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ کسی سے بات کر سکے۔ وہ تمہیں صرف اپنی مدد کے لیے ساتھ لے کر گیا تھا تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں تم سے کام لے سکے۔"

بائرن نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اب کیا ہوگا ڈینی؟"

"جیل سے باہر آنے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ ان لوگوں کو چن چن کر ماروں گا جنہوں نے میری زندگی ... کی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اب صرف ٹام بچ گیا ہے۔ میں نے اسے اغوا کیا تو جانتا تھا کہ تم اس کی تلاش میں آؤ گے۔ میں تمہیں اس کی حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ ویسے تو ... دامن بھی صاف نہیں ہے۔"

"میں نے کسے قتل کیا ہے؟"

"میرا ایک دوست جو تمہاری وجہ سے جیل گیا اور وہیں ... ۔"

بائرن نے اپنا سر ہلایا اور نرمی سے بولا۔ "میرے ... اب میں کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں اپنے بھائی کا خیال نہ رکھ سکا اور اس صدمے سے ممی اور ... ممی چل بسے۔ تمہاری زندگی تباہ ہو گئی اور میں ساری ... اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے بھاگتا رہا۔ لیکن ہم اس ... چھوٹے تھے اور کرسٹی کو قتل کرنے کی نیت سے ... تھے۔ اس میں ٹام کا بھی قصور نہیں۔ یہ میں اس ... ہا کہ اس کے گلے سے پھندا نکال دیا جائے لیکن ... سامنے ایسا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا کیونکہ میں اس صدمے سے باہر نہیں آسکوں گا اور یہ سلسلہ ختم ... جائے جاری رہے گا۔ میں اسے یہاں سے لے ... وں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کیا کیا ... اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہونا ... کہ یہ سب کچھ کیوں کیا۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ٹام نے کئی برس پہلے تمہیں اس گھر میں بھیجا تھا۔ اس وقت میں تمہاری مدد کے لیے نہیں پہنچ سکا لیکن اب میں نے تمہیں پالیا ہے۔ اب میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ اگر اپنی نہیں تو میری خاطر تمہیں یہاں سے چلنا ہوگا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اور اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔"

بائرن آگے بڑھا اور اس نے ڈینی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رسّی کا سرا تھام لیا۔ ڈینی نے اسے سختی سے دیکھا اور رسّی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"پلیز!" بائرن نے التجا کی۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" بائرن نے مزید کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ "مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

رسّی پر ڈینی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بائرن نے اس کی گرہ کھولی اور اسے چھت کے ہک سے نکال لیا۔ اس کا سرا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ٹام کو کرسی سے اٹھایا اور اسے لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ٹام کے ہاتھ کھولنے اور اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ ڈینی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے بہ آواز بلند بولنا شروع کیا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس نے اس گھر کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ "وینڈا۔۔۔۔ چیف! ہم باہر آرہے ہیں۔ گولی مت چلانا۔ میں پہلے اس شخص کو باہر بھیج رہا ہوں جو ان واقعات کا ذمے دار ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹام کی پشت پر زوردار ٹھوکر لگائی اور وہ ایک ہی جست میں دروازے سے باہر جا گرا۔

"وینڈا! اب میں باہر آؤں گا لیکن میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ اسے دیکھ کر کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم میری بات سن رہی ہو؟ تم اسے پہچان لو گی لیکن صبر سے کام لینا۔ جانتا ہوں کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی خوف زدہ ہو سکتا ہے لیکن اس وقت وہ میرے ساتھ ہے۔۔۔۔ ڈینی میرا بھائی۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈینی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اس گھر سے باہر آگیا جہاں وینڈا اس کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ بائرن کو احساس تھا کہ اسے ڈینیل تک پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی لیکن اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو مزید تباہ ہونے سے بچا لیا۔

☐

www.Paksociety.com

غلام گردشیں

خود پسندی اور جھوٹی انا و تکبر کے قلعے تعمیر کرنے والوں کا عبرت انگیز فسانہ

منظر امام

ہر ماحول ... ہر جگہ اپنے اندر ایک پُراسراریت کا عنصر رکھتا ہے ... بات صرف اسے محسوس کرنے کی ہے ... ایک ایسے ہی ماحول کی پروردہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی سنسنی خیز کہانی ... جہاں انسانیت کی توہین ... تذلیل ... تضحیک اور بے توقیری کرنے والے وحشیوں کے ظلم نے دیدہ و داماں ترکیے ہوئے تھے ...

چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔

نصیر پور۔ ٹرین یہاں صرف شاید ایک ہی لمحے کے لیے رکتی تھی۔ اس کے بعد اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔ یہاں اترنے والے بہت پھرتی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مجھے بھی یہ بات بتادی گئی تھی۔ اور کس نے بتائی تھی، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

اس اشتہار پر اچانک ہی نگاہ پڑی تھی جس میں نصیر پور کے کسی میاں صاحب کی حویلی میں ایک ملازمت تھی۔ اشتہار میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ملازم کو چوبیس گھنٹے وہیں رہنا ہوگا۔

تنخواہ بہت معقول تھی اور ان دنوں میرے پاس کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں اس ملازمت کے لیے تیار ہو گیا۔ اشتہار میں کسی کا فون نمبر بھی درج تھا۔ میں نے فون کیا تو دوسری طرف سے کسی نے کھردری آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''

''میرا نام واصف ہے جناب۔'' میں نے بتایا۔ ''میں آپ کا اشتہار پڑھ کر آپ کو فون کر رہا ہوں۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم پہلے آدمی ہو جس کا فون آیا ہے اس لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟''

''جی جناب! ماسٹر ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''سوشیالوجی میں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب نصیر پور آجاؤ، کام یہاں بتایا جائے گا۔''

اس طرح میں نے نصیر پور کے لیے اپنا سوٹ کیس تیار کر لیا۔ مجھے اپنے ساتھ دو چار جوڑوں اور کچھ ضروری سامان کے علاوہ اور کیا لے جانا تھا۔

لیکن جانے سے پہلے ماں سے اجازت لینا ضروری تھی۔ میں جانتا تھا کہ ماں کو احساس بھی نہیں ہوگا کہ میں اس سے کیا کہہ رہا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ اس کے باوجود یہ میری عادت تھی کہ میں ہر کام کرنے سے پہلے ماں کو ضرور بتا دیا کرتا تھا۔

میری ماں ذہنی مریضہ تھیں۔

میں نے اپنی ماں کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ میں کسی کو نہیں جانتا تھا، سوائے اپنی ماں کے۔ ہوش آیا تو صرف ماں میرے سامنے تھی۔ میرے لیے محنت کرتی ہوئی، راتوں کو جاگتی ہوئی... اور میری ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جانے والی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میری ماں نے کن حالات میں میری پرورش کی ہوگی۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ماں بتاتی ہے کہ میں جب دو برس کا تھا تو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

گھر میں باپ کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی کہ میں اسے دیکھ سکتا اور اندازہ لگا لیتا کہ میرا باپ کیسا ہوگا۔

ٹرین ایک لمحے کے لیے رک گئی تھی اور میری سوچوں کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔

اس شخص کی بات یاد آئی کہ ٹرین بس ایک لمحے کے لیے رکے گی۔ لہٰذا اس کے رکتے ہی میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اتر گیا۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

نہ کوئی کیبن، نہ کوئی گیٹ۔ پلیٹ فارم کے نیچے دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا یا شاید کھیت ہوں کیونکہ اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس آدمی نے اپنی کھردری آواز میں بتایا تھا۔ ''تمہیں لینے کے لیے حویلی میں سے گاڑی پہنچ جائے گی۔''

لیکن وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ صرف سناٹا تھا اور پلیٹ فارم کے باہر سے جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں کوئی بزدل انسان نہیں ہوں لیکن اس ماحول نے واقعی پریشان اور خوف زدہ کر دیا تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب یہاں سے کہاں جاؤں؟ نہ جانے وہ کم بخت حویلی کتنے فاصلے پر ہوگی۔ میں تو اس اندھیری رات میں اس انجان مقام پر پیدل بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اور نہ ہی کوئی ایسا شخص دکھائی دے رہا تھا جس سے کچھ معلوم کر سکتا۔

سوائے انتظار کے اور کیا چارہ تھا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور کوٹھری کے پاس والی ایک بینچ پر آکر بیٹھ گیا۔ اب ایک بار پھر میری سوچیں میرے ساتھ تھیں۔

میں نے بھی کیا زندگی گزاری تھی۔ پریشانیوں سے بھری ہوئی... مسلسل جدوجہد کرتی ہوئی زندگی۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے پڑھوائی۔ ماں اگرچہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن بے پناہ ہمت کی مالک تھی۔ صابر، قناعت پسند، خدا سے کبھی مایوس نہ ہونے والی۔ بے شمار خوبیاں تھیں ماں میں۔

مجھے ہمیشہ سے یہ احساس رہا تھا کہ مجھے اپنی ماں کا سہارا بننا ہے، ہر حال میں۔ اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اب طاقت نہیں ہے کہ وہ محنت کر سکے۔ اس لیے میرا دھیان اپنی پڑھائی کی طرف لگا رہتا تھا۔ زندگی میں سوائے تعلیم اور ماں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اچھل پڑا۔ اس آدمی نے ایک اونی چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کا چہرہ آدھا چھپا ہوا تھا۔ اس کی چمک دار آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ''چلو میرے ساتھ۔'' اس نے کہا۔

میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی کھردری آواز والا تھا۔ ''میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔'' میں نے کہا۔

''راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی لیے یہاں آنے میں دیر ہو گئی۔ بس اب آجاؤ۔''

میں اس کے پیچھے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چل پڑا۔

اب دکھائی دیا کہ پلیٹ فارم کے نیچے ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس اندھیرے میں اس گاڑی کا صرف ایک خاکہ ہی سا دکھائی دے رہا تھا۔

پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر اس نے کہا۔ ''بس، ایک منٹ کے لیے رک جاؤ۔ ہلاکو سے تمہارا تعارف ضروری ہے۔''

میں اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔ نہ جانے ہلاکو سے اس کی کیا مراد ہو سکتی تھی۔ بہرحال، اس کے کہنے کے مطابق میں وہیں کھڑا رہا۔

''ہلاکو! آؤ، یہاں آجاؤ۔'' اس نے گاڑی کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔

چند لمحوں بعد ایک دیو پیکر بلا ہمارے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ میں اسے بلا ہی کہہ سکتا ہوں۔ وہ ایک کتا تھا۔ اتنا دیو قامت جس کے بدن پر بڑے بڑے بال تھے، ریچھ کی طرح۔ انتہائی سیاہ رنگ... جیسے وہ خود بھی اس اندھیرے ہی کا ایک حصہ ہو۔

اس کا چہرہ انتہائی بھیانک اور خوفناک تھا۔ اس کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے چراغ جل رہے ہوں۔ وہ ہیبت ناک کتا میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

خدا کی پناہ... کیسی بھیانک رات تھی میری۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا۔ اس وقت خوف کے باعث میں کانپ رہا تھا۔ پلیٹ فارم کے نیچے گاڑی کے پاس ہلاکو نام کے اس کتے نے چاروں طرف سے مجھے سونگھنا شروع کر دیا تھا۔

اس پُراسرار آدمی نے اس کتے سے کہا تھا۔ ''ہلاکو! یہ حویلی کے مہمان ہیں۔ ان کو اچھی طرح پہچان لے۔'' اور اس کتے نے مجھے سونگھنا شروع کر دیا۔

ہر لحہ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بھیانک کتا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اس وقت اس لمحے کو کوس رہا تھا جب مجھے نصیر پور میں جاب کرنے کی خواہش ہوئی تھی۔

ہلاکو کی غراہٹ بھی بھیڑیے جیسی تھی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے سونگھتا رہا پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ ''اس کتے نے تمہیں قبول کر لیا ہے۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''جب یہ کسی کو قبول نہیں کرتا تو اس کو بری طرح زخمی کر دیتا ہے۔ اب چلو، گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے اس کتے کو دیکھا۔ وہ گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے جمپ لگا کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے جھجکتے دیکھ کر اس آدمی نے ہنستے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ اب یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ تم اپنا سوٹ کیس لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔''

مجھے وہی کرنا پڑا جو اس نے کہا تھا۔ اس وقت بھی میں اتنا خوف زدہ تھا کہ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں نہ جانے کتنی دعائیں پڑھ ڈالیں۔

گاڑی چلانے والا وہی پُراسرار آدمی تھا جس نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنا تعارف بھی نہیں کروایا تھا۔

سفر شروع ہوا۔ خوف سے اس بات کا بھی احساس نہیں رہا کہ یہ سفر کتنی دیر کا تھا۔ میری نگاہیں اس دیوہیکل کتے پر جمی ہوئی تھیں جو اب مجھ سے بے نیاز ہو کر کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

گاڑی کھیتوں کے درمیان سے گزرتی رہی۔ پھر ایک آدھ مکانات دکھائی دینے لگے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ پھر باقاعدہ آبادی سی شروع ہو گئی۔ یہاں روشنی ہو رہی تھی۔ ویسے رات ہونے کی وجہ سے یہاں بھی ہر طرف سناٹا تھا۔

پھر گاڑی ایک بہتر روڈ پر مڑ گئی اور کچھ دور چلنے کے بعد ایک حویلی کے گیٹ پر آ کر رک گئی۔ گاڑی کے ہارن پر گیٹ کھول دیا گیا۔ گاڑی گیٹ میں داخل ہو گئی اور حویلی کے پورچ میں آ کر رک گئی۔ رات کی وجہ سے وہ حویلی گو پوری طرح واضح نہیں ہو سکی تھی لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو گیا کہ یہ بہت بڑی حویلی ہے۔ ہمارے اترنے سے پہلے ہی کتا گاڑی سے اتر کر ایک طرف چلا گیا۔ دو ملازم آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

''صاحب کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔'' اس آدمی نے سوٹ کیس اٹھانے والے ملازم سے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا کھانا تمہارے کمرے میں پہنچا دیا جائے گا۔''

''نہیں، اس وقت مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے بتایا۔ ''میں نے راستے میں کھا لیا تھا۔''

''تمہاری مرضی... اور ہاں، اپنے کمرے کا دروازہ رات کو بند رکھنا۔ یہاں رات کے وقت بلائیں گھومتی رہتی ہیں۔''

نہ جانے اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ مجھے خوف زدہ کر گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔

اس نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بہر حال، میں نے اس کے کہنے کے مطابق کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ویسے بھی اگر وہ نہیں کہتا تو بھی میں کرتا۔

میں نے وہ رات بہت بے چینی میں گزاری۔

میں سوچتا رہا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ اس رات پر یادوں نے مجھ پر یلغار کر رکھی تھی۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا زندگی کس طرح گزاری تھی میں نے۔

اور جب میں نے ماسٹر کر لیا، ایک جگہ اچھی ملازمت کر لی تو اس وقت ماں کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ جانے کیوں؟ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ ان کی نگاہیں سامنے کسی موہوم سے نقطے پر ٹکی رہتیں اور وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہتیں۔

شروع شروع میں تو جب میں آواز دیتا۔ ''اماں! کیا ہو رہا ہے؟ کس سے باتیں کر رہی ہیں؟''

تو وہ چونک کر جھینپی سی ہنسی ہنسنے لگتیں۔ اس کے بعد ہوا کہ انہوں نے چونکنا ہی چھوڑ دیا۔ بس باتیں کیے جاتیں۔

والی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میں انہیں ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے یہ انکشاف کر دیا کہ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ جانے ایسا کیوں ہوا تھا؟

وہ تو ایک مضبوط عورت تھیں۔ ہمیشہ شکر ادا کرتی تھیں۔ ہر حال میں امید کا دامن ہاتھ میں تھامے رہیں۔ کبھی اپنے آپ کو کسی احساس میں مبتلا نہیں کیا۔ پھر کیا ہو گیا تھا ان کے ساتھ؟

سوچتے سوچتے صبح ہو گئی اور میں نہیں جانتا کہ مجھے کس وقت نیند آئی تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک سے آنکھیں کھل گئیں۔

میں نے دروازہ کھولا تو ایسا محسوس ہوا جیسے دروازے کے پیچھے سے چاند نکل آیا ہو۔ کیا خوب صورت چہرہ تھا۔ کیسی کمسن لڑکی تھی جس کے چہرے کی معصومیت نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ دروازے کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''بتاؤ، کہاں ہے وہ؟ تم نے میرے محبوب کو کہاں چھپا رکھا ہے؟''

میں حیرت سے کئی قدم پیچھے ہٹ آیا۔

''بتاتے کیوں نہیں؟ کیوں پریشان کر رہے ہو؟ بتاؤ کہاں چھپایا ہے اس کو؟ یہ سب تمہاری سازش ہے۔ تم نے ابا حضور سے مل کر مجھے تنہا کر دیا ہے۔''

یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی نفسیاتی مریضہ ہے۔ ایسی خوب صورت اور طرح دار لڑکی کا اس طرح ذہنی طور پر معذور ہونا بہت افسوس کی بات تھی۔

''بتاؤ ورنہ جان سے مار دوں گی۔'' اس نے اچانک اپنے دوپٹے کے پلو سے ایک پستول نکال لیا جس کا رخ ظاہر ہے میری ہی طرف تھا۔

میری تو جان نکل گئی۔ ہو سکتا تھا کہ پستول بھرا ہوا ہو۔ ایک ذہنی مریضہ سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسی وقت ایک عورت تیزی سے ہمارے قریب آ گئی۔ ''زہی بی بی! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ چلیں اندر۔''

''اس آدمی نے میرے محبوب کو چھپا رکھا ہے۔'' اس نے پستول والے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا۔ ''میں اسے جان سے مار دوں گی۔''

''ہاں... ہاں، میں اس سے کہوں گی۔ یہ آپ کے محبوب کو واپس لے آئے گا۔''

''اچھا۔''

''ہاں، آپ آئیں۔'' اس عورت نے لڑکی کا بازو تھام لیا۔

وہ لڑکی کسی معصوم بچے کی طرح اس کے ساتھ چل پڑی۔ میں بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے اوجھل ہو جانے کے بعد میں اس لڑکی کے بارے میں سوچتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

نہا کر اور لباس تبدیل کر کے جب غسل خانے سے باہر نکلا تو حویلی کا ایک ملازم ناشتے کی ٹرے لیے سامنے کھڑا تھا۔ ''ناشتا کر لیں صاحب۔'' ملازم نے کہا۔

''وہ صاحب کہاں ہیں جو رات کو مجھے اپنے ساتھ لائے تھے؟'' میں نے ٹرے لیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ منیجر صاحب ہیں۔'' ملازم نے بتایا۔ ''ان سے شام کو ملاقات ہو گی۔ وہ اس وقت زمینوں کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''حمید نام ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے آپ کی ڈیوٹی پر لگایا گیا ہے۔''

''اچھا بھائی حمید! یہ بتاؤ، ابھی کچھ دیر پہلے ایک پاگل سی لڑکی یہاں میرے پاس آئی تھی، وہ کون ہے؟''

''وہ میاں صاحب کی بیٹی ہے جی۔ سب سے چھوٹی اولاد۔ اس حویلی کی مالکن... لیکن ان کا ذہن کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں، وہ تو میں نے اندازہ کر لیا تھا لیکن ایسی لڑکی کے ہاتھ میں پستول کا ہونا تو بہت خطرناک ہے۔''

''ارے نہیں صاحب، وہ تو نقلی پستول ہے۔'' حمید ہنس پڑا۔ ''ہر وقت بی بی کے پاس ہوتا ہے۔''

''حمید! میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن مجھے یہاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مجھے یہاں ملازمت دی گئی ہے۔ کس نے دی ہے، کس کام کے لیے دی ہے، میں یہ بھی نہیں جانتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ حویلی کس کی ہے؟''

''یہ حویلی میاں صاحب کی ہے صاحب۔ میاں بشیر نام ہے ان کا۔ اس پورے علاقے کے مالک۔ آپ انہی کی ملازمت میں آئے ہیں۔ کس کام کے لیے آئے ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ یہ سب منیجر صاحب بتائیں گے۔''

''اور تمہارے منیجر صاحب شام کو آئیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ شام تک میں کیا کروں؟''

''حویلی دیکھیں جی۔ یہاں بہت کچھ ہے۔ ایک ایسا کمرا بھی ہے جس میں کتابیں ہی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ ایک کمرے میں میاں صاحب کے خاندان کی یادگاریں

ہیں۔ آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ سب جگہ جاسکتے ہیں، سوائے زنان خانے کے۔“

ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے یہی سوچا کہ حویلی کا چکر لگا لیا جائے۔ اب تو یہاں رہنا ہی تھا اس لیے اس مقام سے جتنی بھی واقفیت ہوجاتی میرے لیے یہی بہتر تھا۔

وہ حویلی میرے اندازے سے کہیں زیادہ بڑی تھی۔ نہ جانے کتنے حصے تھے۔ اَن گنت کمرے، دالان، صحن، غلام گردشیں... محرابوں والے راستے اور ایک کمرا واقعی لائبریری کا تھا۔

کمرا کیا اچھا خاصا ہال تھا جس کی دیواروں پر پینٹنگز لگی ہوئی تھیں اور الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ ساری کتابیں چرمی جلدوں میں تھیں اور ان پر باقاعدہ اس طرح نمبر لکھے ہوئے تھے جس طرح لائبریری میں لگائے جاتے ہیں۔

اگر یہ شوق میاں صاحب کا تھا تو وہ واقعی باذوق انسان تھے۔

میں جہاں جہاں بھی گیا، کسی نے مداخلت نہیں کی۔ ملازم سامنے آتے بھی تو ادب سے ایک طرف ہٹ جاتے۔ مجھے اس کتے کا خوف تھا جس کا نام ہلاکو تھا لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید دن کے وقت اسے باندھ کر رکھا جاتا ہوگا۔

میں الماری میں رکھی کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک ایک آدمی میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت بھیانک سا انسان تھا۔ انتہائی مضبوط بدن، سیاہ رنگت، چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھیں اور گھٹا ہوا سر۔ اسے دیکھنے ہی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”آں... ایں... آں۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ گونگا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے اشاروں کی زبان میں دریافت کر رہا تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ اب یہ ایک نئی مصیبت سامنے آگئی تھی۔

میں نے اپنے طور پر اشاروں ہی کی مدد سے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں آیا ہوں؟ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

اچانک اس گونگے نے میرا گریبان پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کردیا۔ میں نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے اس کے چہرے پر ایک گھونسا رسید کردیا۔ یہی میری غلطی تھی۔ اس نے جواب میں کسی ماہر باکسر کی طرح میرے چہرے پر ایک ایسا پنچ مارا کہ میں دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔

☆☆☆

کسی سیٹی کی تیز آواز اور ایسا شور جیسے بہت سے لوگ ماتم کررہے ہوں۔ میں اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں اور میں ان کے پہلو میں تھا۔

اور سامنے تین ڈاکو تھے جنہوں نے سیاہ نقابوں سے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ وہ ہمارے گھر میں ڈاکا ڈالنے آئے تھے اور انہوں نے ماں کے ساتھ بہت بدتمیزی بھی کی تھی۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ میں ان پر ٹوٹ پڑوں گا لیکن ماں نے میرا ارادہ بھانپ کر میرا ہاتھ دبا دیا۔ پھر وہ کم بخت گھر کا سارا سامان لے کر فرار ہوگئے۔

ماں نے بہت مشکلوں سے یہ سب جمع کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ماں نے آہستہ آہستہ رونا شروع کردیا۔ وہ آواز سفر کرتی ہوئی میرے کانوں تک آرہی تھی۔

لیکن نہیں۔ یہ کوئی اور آواز تھی۔ کسی کے ہنسنے کی آواز۔ کوئی زور زور سے ہنس رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ لوگ میرے اردگرد کھڑے تھے اور میں ایک ہال پر تھا۔

آہستہ آہستہ چہرے واضح ہوتے گئے۔ یہ سب حویلی کے ملازمین تھے اور ان کے درمیان وہی منیجر تھا جو مجھے اسٹیشن سے یہاں تک لایا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی شال سے اپنے چہرے کو آدھا چھپا رکھا تھا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ اس وقت میں خود کو تماشا محسوس کر رہا تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس آدمی نے مجھ پر کیوں حملہ کیا تھا؟ مجھے یہاں کس قسم کی ملازمت دی گئی ہے؟“ میں نے یہ سارے سوالات منیجر سے کیے۔

”سب ٹھیک ہے۔ پریشان مت ہو۔“ منیجر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”وہ گونگا میاں صاحب کا محافظ ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تم یہاں آگئے ہو۔ وہ تمہیں اجنبی سمجھا تھا۔ اسے سمجھا دیا گیا ہے۔“

”لیکن یہاں میرا کام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس دوران میں دوسرے ملازمین کمرے سے باہر چلے گئے۔ صرف میں اور منیجر رہ گئے اور وہ کمرا میرا ہی تھا یعنی وہ کمرا جو مجھے دیا گیا تھا۔

”پہلے تم میاں صاحب سے مل لو۔“ منیجر نے کہا۔

”پھر کام بھی سمجھا دیا جائے گا۔“

”کب ہوگی یہ ملاقات؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی... ابھی تم میرے ساتھ چلو گے۔“

میں نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا۔ اب میں اس شخصیت سے ملنے کے لیے جا رہا تھا جس کی یہ حویلی تھی اور جس نے مجھے ملازم رکھا تھا۔

منیجر آگے آگے چل رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ کئی کمروں اور دالانوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ہال میں آگئے۔ یہ بہت بڑا ہال تھا... قدیم طرز کے شان دار فرنیچر سے سجا ہوا۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر سفید چادر اور گاؤ تکیے تھے۔ میاں صاحب اس تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔

سفید کرتہ شلوار میں ان کی شخصیت بہت شان دار دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، چڑھی ہوئی مونچھیں۔ یہ سب ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ انہوں نے اپنے پیروں پر ایک قیمتی خوب صورت سی چادر ڈال رکھی تھی۔ منیجر نے مجھے ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔

میں نے ادب سے میاں صاحب کو سلام کیا جو مجھے بہت دلچسپی اور تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کچھ دیر بعد سامنے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ میاں صاحب نے اپنی گونجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کامران۔“ میں نے بتایا۔

”تعلیم اور اپنے تجربے کے بارے میں بھی بتاتے جاؤ۔“

میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے اور میرا تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے بہت دلچسپی سے میری باتیں سنیں۔ بظاہر وہ مجھے ایک شفیق انسان دکھائی دے رہے تھے۔

”اور تمہارا خاندانی پس منظر کیا ہے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ والد صاحب کا انتقال ہوچکا ہے۔ صرف ماں ہیں اور اپنے والدین کی میں تنہا اولاد ہوں۔

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اپنی گردن ہلائی۔ ”میں نے تمہارا انتخاب کرلیا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“

”منیجر تمہیں کام سمجھا دے گا۔“ میاں صاحب نے کہا۔ ”اور ایک بات یاد رکھنا کہ تمہارا یہاں رہنا آسان بھی ہوگا اور مشکل بھی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے مشکل بناتے ہو یا آسان کرتے ہو۔ اب تم جاسکتے ہو۔“

میں کرسی سے کھڑا ہوا تو اسی وقت وہ لڑکی کمرے میں آگئی جو نفسیاتی مریضہ تھی۔ جس نے میرے پاس آکر الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔ ”بابا جان۔“ اس نے میری طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ ”وہ لوگ کب آئیں گے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے؟ اس نے وعدہ کیا تھا نا کہ مجھے لے جائے گا؟“

”ہاں ہاں، لے جائے گا بیٹا۔“ میاں صاحب نے کہا۔ ”تم باہر کیوں آگئیں؟ جاؤ اندر جاؤ۔“

”میں ہر وقت اندر ہی تو رہتی ہوں۔ میں جاتی کہاں ہوں۔“

”اچھا بیٹا! اس وقت جاؤ، شاباش۔“

وہ چلی گئی۔ اس نے جاتے ہوئے بھی میری طرف دھیان نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ میاں صاحب کے چہرے پر دکھ کے تاثرات تھے۔ ”کامران!“ میاں صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اگر یہ لڑکی کبھی تم سے الٹی سیدھی بات کرے تو اس کا خیال مت کرنا۔ اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔“

”جی ہاں میاں صاحب۔“

”بس میری زندگی میں یہی ایک دکھ ہے۔“ میاں صاحب جیسے اب اپنے آپ سے بول رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک خاص انداز سے تالی بجائی۔ تالی کی آواز پر ایک دروازے سے وہی گونگا برآمد ہوا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک وہیل چیئر لے کر آیا تھا۔

یہ سب کچھ مجھے حیرت زدہ کر رہا تھا۔

گونگے نے میری طرف دیکھ کر اس انداز سے اپنی گردن ہلائی جیسے مجھ سے اپنے رویے کی معذرت کر رہا ہو۔ پھر اس نے وہیل چیئر تخت کے پاس لگا دی اور میاں صاحب کو سہارا دے کر وہیل چیئر پر بٹھا دیا۔

میاں صاحب ایک معذور انسان تھے۔

☆☆☆

”صاحب، ایک بات کہوں۔“ حمید نے میرے لیے چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

”ہاں کہو۔“

"آپ یہاں سے چلے جائیں تو اچھا ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ جگہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں حمید! ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب میں کیا بتا سکتا ہوں۔ آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا۔ ابھی آپ کا سامنا اکبر اور اصغر صاحب سے نہیں ہوا ہے نا۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"میاں صاحب کے بیٹے۔ بڑے کا نام اکبر اور چھوٹا اصغر ہے۔ دونوں ایک نمبر کے بدتمیز اور بدمعاش ہیں۔ ذرا سی دیر میں انسان کی عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں۔ خدا ان سے بچائے۔ پوری بستی ان سے خوف زدہ رہتی ہے۔"

حمید کی باتوں نے خود مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔

اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ میں کسی طرح ان دونوں بھائیوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہوں۔ ویسے ابھی تک اس گونگے والے واقعے کے، میرے ساتھ اور کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

اور جہاں تک میاں صاحب کا تعلق تھا تو وہ مجھے بہت معقول آدمی دکھائی دیے تھے۔ میں نے جب حمید سے میاں صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بھی یہی کہا۔

"ان کی کیا بات ہے جناب۔ وہ تو فرشتہ آدمی ہیں۔"

"وہ مفلوج کب ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا صاحب۔ مجھے آئے ہوئے تین برس ہو رہے ہیں۔ میں نے ان کو ایسا ہی دیکھا ہے۔"

شام کے وقت منیجر سے ملاقات ہوئی۔ اس پُراسرار آدمی نے اس وقت بھی اپنے آدھے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔

"کامران! کیا تمہیں میاں صاحب نے بتایا کہ تمہیں یہاں کیا کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ساری باتیں آپ سے معلوم کرلوں۔"

"ہوں۔" منیجر نے ایک گہری سانس لی۔ "تم نے زیبی بی بی کو دیکھا ہے؟" منیجر نے پوچھا۔ "میاں صاحب کی بیٹی؟"

"جی ہاں، آپ شاید ان کی بات کر رہے ہیں جو نفسیاتی مریضہ ہیں۔"

"ہاں، میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ تم اسے اس کے محبوب ہونے کا یقین دلاؤ گے۔"

"کیا؟" میں یہ سن کر اچھل پڑا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"پوری بات سن لو۔ زیبی نے کبھی کسی لڑکے سے محبت کی تھی۔ یہ محبت صرف خط و کتابت اور کبھی کبھی فون کی حد تک تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے۔ میاں صاحب کو یہ سب باتیں پسند نہیں ہیں لیکن وہ زیبی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس کی ضد کے آگے انہیں مجبور ہونا پڑا۔ اور انہوں نے اس نوجوان کو حویلی میں آنے کی دعوت دی۔ وہ نوجوان شہر میں رہتا تھا۔ ایک شام وہ آیا لیکن حویلی نہیں پہنچ سکا۔"

منیجر اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ جب مجھ سے اس کی خاموشی برداشت نہیں ہو سکی تو میں نے دریافت کیا۔ "منیجر صاحب! کیا ہوا تھا اس لڑکے کے ساتھ؟"

"دوسری صبح ایک کھیت سے اس کی لاش ملی تھی۔" منیجر نے اپنی بات مکمل کی۔

"اوہ۔" یہ سن کر واقعی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ "کیا ہوا تھا اس کو؟ کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟"

"ہاں، حادثہ ہی سمجھ لو۔ کسی نے اس کا مرڈر کر دیا تھا۔" منیجر نے بتایا۔ "بس جب یہ خبر زیبی کو ملی تو اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور اب وہ ہر طرف اپنے محبوب کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔"

"افسوس ہوا یہ سن کر۔ کیا قاتل کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں، رات کے اندھیرے میں جنم لینے والے بہت سے حادثے اپنا نشان نہیں چھوڑتے۔" منیجر نے بتایا۔

بہت گہری بات کر دی تھی اس نے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ "آپ بتائیں، اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"میں نے بتایا نا کہ تم اسے یقین دلاؤ گے کہ تم ہی اس کے محبوب خرم ہو۔" منیجر نے بتایا۔ "خرم نے زیبی کو جو دو چار خط لکھے تھے، وہ ہمارے پاس ہیں۔ تم ان کو پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس نے کس قسم کی باتیں لکھی ہوں گی۔ تمہیں زیبی سے وہی باتیں کرنی ہیں تاکہ وہ تم پر یقین کرتی جائے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ اس طرح اس کی ذہنی حالت ٹھیک ہو جائے گی؟"

"ہاں، ڈاکٹروں نے یہی کہا ہے۔" منیجر نے کہا۔ "لیکن یاد رہے، تم سیریس ہو کر اس سے واقعی عشق کی کوشش مت کرنا۔ ہر وقت اپنی اوقات یاد رکھنا۔"

مجھے اس کی یہ بات بہت بری لگی۔ "اطمینان رکھیں منیجر صاحب! میں اپنی اوقات یاد رکھوں گا۔"

"برا مت مانو، یہ میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ زیبی کے دونوں بھائی بہت سر پھرے اور بہت خطرناک ہیں۔"

بالکل یہی بات حمید نے کی تھی اور اب یہی بات منیجر بھی کہہ رہا تھا۔ آخر کیسے تھے اس کے دونوں بھائی؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز نے مجھے جیسے اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی بھیانک چیخ بھی سنائی دی۔

☆☆☆

وہ بے چارہ گھٹنوں کے بل چل رہا تھا۔

اس کی پشت پر چھ سات اینٹیں رکھی ہوئی تھیں اور اسے اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ اس طرح چلتے ہوئے اینٹیں نہ گرنے پائیں۔ ورنہ پھر اس کی شامت ہی آجاتی۔

وہ اس حویلی کا ملازم تھا اور اسے اس حال تک لانے والے کا نام اکبر تھا۔ میاں صاحب کا بڑا بیٹا... جو کچھ فاصلے پر ایک بندوق لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس نے اس بے چارے ملازم کو خوف زدہ کرنے کے لیے گولی چلائی تھی۔ ہم نے وہ چیخ اس ملازم کی سنی تھی۔

اکبر صورت ہی سے خوں خوار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی شاندار مونچھیں تھیں۔ میاں صاحب اور اکبر کی مونچھوں کے درمیان بس سفیدی اور سیاہی کا فرق تھا۔

منیجر بھی میرے ساتھ ہی کمرے سے نکل آیا تھا۔

اکبر نے میری طرف دیکھتے ہوئے منیجر سے پوچھا۔ "یہ آدمی کون ہے؟"

"یہ کامران صاحب ہیں۔" منیجر نے بتایا۔ "میاں صاحب نے انہیں ملازمت پر رکھا ہے۔"

"کیسی ملازمت؟"

"وہی زیبی بی بی والی۔" منیجر نے بتایا۔

"لعنت ہے۔" اکبر کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ "خدا جانے بابا کی غیرت کو کیا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے لیے کیا کیا کر رہے ہیں۔"

اب میں دو قدم آگے بڑھ آیا۔ "اکبر صاحب! آپ جس لڑکی کے لیے یہ کہہ رہے ہیں، وہ شاید آپ کی بہن بھی ہے۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے۔" اکبر نے اب میری طرف دھیان دیا۔ "اچھے تیور ہیں تمہارے... لیکن یاد رکھنا، یہ تمہارا شہر نہیں ہے۔ یہ میاں صاحب کی حویلی ہے۔ اپنی حد میں رہنا۔ حد سے آگے بڑھے تو شاید واپس بھی نہیں جا سکو گے۔"

اب میں واقعی جھنجلا گیا تھا۔ "مسٹر اکبر! میں نہیں جانتا کہ اس حویلی میں کیا ہو رہا ہے... اور نہ ہی مجھے یہاں کے معاملات سے کوئی دلچسپی ہے۔ میں یہاں سیدھی سادی ملازمت کے چکر میں آیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں قدم قدم پر میری توہین ہوگی۔ میری اوقات یاد دلائی جائے گی۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی ملازمت پر۔" پھر میں نے منیجر کی طرف دیکھا۔ "منیجر صاحب! مہربانی فرما کر میرا سوٹ کیس کمرے سے منگوا دیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اکبر غرایا۔ "تمہیں بابا نے ملازم رکھا ہے۔ وہی تمہیں نکال سکتے ہیں۔ تم ان کی مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ وہی لڑکی دکھائی دے گئی۔ وہی، میاں صاحب کی بیٹی زیبی۔ وہ اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری طرف چلی آرہی تھی اور اسے دیکھ کر میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ "نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک اس لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہو جاتا۔"

☆☆☆

میں نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ لوگ تھے جو پاگلوں کی طرح روتے اور شور کرتے ہوئے ایک طرف دوڑ رہے تھے۔ اسی بستی کے کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔

مجبور، غریب اور کمزور لوگ۔ میں اس وقت حویلی سے باہر سیر کے لیے نکلا تھا۔ بس یوں ہی۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ حویلی کے اردگرد کیا ہے۔ کیسے لوگ ہیں۔ کیسا ماحول ہے... کہ میں نے اس طرح کی افراتفری دیکھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔

میں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اس کے پاس چلا گیا۔ "بابا! کیا بات ہے... کیا ہوا ہے یہاں؟"

بابا نے اپنی دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم یہاں نئے آئے ہو؟"

"جی ہاں بابا! بالکل نیا ہوں۔ اس لیے مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"آج پھر بستی کی ایک لڑکی اٹھا کر لے گئے ہیں۔" بابا نے بتایا۔ "یہ اس کے ماں باپ ہیں جو بے چارے فریاد کرتے پھر رہے ہیں۔"

"کون اٹھا کر لے گئے ہیں؟"

"کیا معلوم، کم بخت آندھی طوفان کی طرح گاڑیوں میں آتے ہیں اور بستی کی کسی نہ کسی لڑکی کو اٹھا لیتے ہیں۔ ان کے پاس بندوقیں بھی ہوتی ہیں۔ ہم کمزور لوگ ان کا کیا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ بس وہ آتے ہیں اور گاؤں کی ایک عزت چلی جاتی ہے۔"

"کیا اس لڑکی کا کوئی پتا نہیں چلتا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس بے چاری کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ چھ مہینوں میں ایک بار ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ دو لڑکیوں کی لاشیں دریا سے مل چکی ہیں۔" بوڑھے نے بتایا۔

"کیا پولیس میں رپورٹ نہیں ہوتی؟"

"پولیس بھی کیا کرسکتی ہے۔ ان کم بختوں کو کون پہچانتا ہے۔ بس نقابیں باندھ کر آتے ہیں۔ کسی کا چہرہ سامنے نہیں ہوتا۔"

"تو اب اس لڑکی کے ماں باپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"بے چارے میاں صاحب کے پاس جاکر فریاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کیا کرسکتے ہیں۔"

"تو کیا اس وقت سب میاں صاحب کی طرف گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

میں یہ سب دیکھنے کے لیے حویلی میں واپس آگیا۔ یہاں واقعی بہت سے لوگ تھے۔ ان میں اس بدنصیب لڑکی کے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار بھی تھے۔ میاں صاحب اپنی وھیل چیئر پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔

لوگ رو رو کر فریاد کر رہے تھے۔ میں بھی ایک طرف جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میں نے میاں صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے۔ کچھ دیر بعد میاں صاحب نے اپنی گردن اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولنے لگے۔ ان کی آواز میں دکھ بھرا ہوا تھا۔ "میرے بچو! تم بتاؤ یہ بوڑھا اور معذور انسان تمہارے لیے کیا کرسکتا ہے؟ خدا جانے وہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کس طرف چلے جاتے ہیں۔"

"میاں صاحب! ہماری تو عزت چلی گئی۔" لڑکی کا باپ رو رہا تھا۔ "وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے میاں صاحب! اگر اسے کچھ ہوا تو میں بھی مرجاؤں گا۔"

"مجھے احساس ہے دینو۔" میاں صاحب نے کہا۔ "تم ایک باپ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں؟ پہلے بھی پولیس کو بتاچکا ہوں لیکن پولیس نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"پولیس کبھی کچھ نہیں کرے گی میاں صاحب۔" کسی نے کہا۔

"ہاں، انہیں سوائے باتیں بنانے کے اور کچھ نہیں آتا لیکن اس بار میں اوپر تک معاملہ اٹھاؤں گا۔ خدا کا قہر نازل ہو ان لوگوں پر۔ اب کوئی محفوظ ہی نہیں رہا۔ نہ جانے کس وقت ان کا رخ حویلی کی طرف ہوجائے۔"

بہت دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ غریب اور کمزور لوگ روتے دھوتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میاں صاحب کو اندر پہنچا دیا گیا اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ آخر یہاں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟

میں بوجھل دل سے اپنے کمرے میں آگیا۔

یہاں ایک آدمی میرے انتظار میں تھا۔ وہ اس حویلی کا چھوٹا مالک تھا۔ اصغر! میاں صاحب کا بیٹا۔ میں نے اس کے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔

وہ گہری اور تنقیدی نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا؟"

"جی ہاں اور آپ بھی شاید مجھے میری اوقات یاد دلانے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں، میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں یہ سمجھا دوں کہ تم یہاں کے معاملات میں دلچسپی مت لو۔ کون اغوا ہو رہا ہے، کس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، یہ سب تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔"

"سمجھ گیا... لیکن میرے کانوں تک جو آوازیں آتی ہیں وہ تو میں سن ہی لیتا ہوں کیونکہ میرے کان کھلے ہوئے ہیں۔"

"بس، یہیں تک رہنا اور جس ڈرامے کے لیے تمہیں رکھا گیا ہے، اس کو ڈراما ہی سمجھنا۔" اس نے کہا پھر مجھے گھورتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ میں ایسی ملازمت پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن منیجر نے بتایا تھا کہ مجھے تیس ہزار روپے ماہانہ ملیں گے اور اس دور میں تیس ہزار ماہانہ بہت بڑی بات تھی۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ لڑکی زہی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

میری خواہش تھی کہ اتنی اچھی لڑکی ذہنی طور پر ٹھیک ہو جائے۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ڈرامے کی ابتدا کس طرح کروں۔ کیا اسے میرے سامنے لایا جائے گا... یا مجھے اس کے سامنے لے جائیں گے یا کوئی میرا تعارف کروائے گا؟ پتا نہیں کیا ہوگا۔ ویسے یہ بات درست تھی کہ اس حویلی کے معاملات بہت پُراسرار اور الجھے ہوئے تھے۔ میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ زہی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس نے ایک پھول دار لمبی فراک پہن رکھی تھی۔ اس پھول دار لباس میں وہ خود بھی کسی بڑے پھول کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

اس وقت اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ یعنی خاموشی کی صورت میں وہ کسی طرح بھی ذہنی مریضہ نہیں دکھائی دیتی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

منیجر نے مجھے اس لڑکے کا نام بتا دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنا ڈراما شروع کردیا۔ "زہی! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ تم مجھے نہیں پہچانتیں؟ میں خرم ہوں۔"

"خرم!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "کیا تم واقعی خرم ہو؟"

"ہاں، تم یقین کرو میں ہی خرم ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں خط لکھے تھے؟"

"کیا بکواس ہے۔" وہ اچانک بھڑک اٹھی۔ "آخر اور کتنے خرم یہاں لائے جائیں گے۔ تم چوتھے آدمی ہو جو اپنے آپ کو خرم کہہ رہے ہو لیکن تم خرم نہیں ہو، سمجھے؟ اور تم ہو بھی نہیں سکتے۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔"

میں یہ سن کر کھسیانا سا گیا۔ وہ اس وقت ذہنی طور پر بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی اور اس نے یہ کہہ کر حیران کر دیا تھا کہ میں اس حویلی میں آنے والا چوتھا خرم ہوں۔

"سنو!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم چاہے جو بھی ہو اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو اپنا یہ ڈراما جاری رکھو۔ یہ میں تمہیں مشورہ دے رہی ہوں، ورنہ...."

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

میں حمید کی طرف دیکھ رہا تھا جو میرے کمرے کی صفائی کے لیے آیا تھا۔ وہ کبھی کبھی میری طرف اس طرح دیکھ لیتا جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو جبکہ میں بھی اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، سننا چاہتا تھا۔

بالآخر جب اس سے صبر نہیں ہوسکا وہ تو میرے پاس آکر بولا۔ "صاحب! آپ یہاں سے چلے جائیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔"

"حمید! مجھے یہاں سے جانا تو ہے۔ میں یہاں رہنے کے لیے نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "بس، ذہن میں کچھ الجھنیں ہیں۔ وہ دور ہوجائیں تو اچھا ہے۔"

"آپ بھی کن چکروں میں پھنسے ہیں صاحب۔"

"تم یہ بتاؤ، کیا اس حویلی میں مجھ سے پہلے بھی کچھ لوگ خرم کے طور پر آچکے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے حیران ہوکر میری طرف دیکھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"تم میری بات کا جواب دو۔"

"جی صاحب۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تین چار پہلے بھی آئے تھے لیکن زہی بی بی نے سب کو بھگا دیا۔"

"لیکن مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی... بلکہ وہ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ میں اپنا ڈراما جاری رکھوں۔"

"پتا نہیں صاحب کیا بھید ہے لیکن آپ کے لیے یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ نے دونوں کو تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ کتنے خطرناک ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بندوق نکال لیتے ہیں۔"

"تم ان کی فکر مت کرو۔ ان کو میں سنبھال لوں گا۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ تمہاری زہی بی بی تو مجھ سے بات کرتے وقت بالکل ٹھیک دکھائی دے رہی تھیں۔"

"ایسا ہی معاملہ ہے ان کا۔" حمید نے بتایا۔ "کبھی بالکل ٹھیک ہو جاتی ہیں اور کبھی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی ہیں۔"

"اور جو گاؤں کی لڑکیاں غائب ہوتی ہیں، ان کا کیا قصہ ہے؟"

"وہ بھی خطرناک بات ہے صاحب! خدا جانے ان بے چاریوں پر کیا گزرتی ہے۔ کون لے جاتا ہے اور پھر ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔"

"اور تمہارے میاں جی کیا کرتے ہیں؟"

"وہ بے چارے کیا کرسکتے ہیں صاحب۔ آپ نے تو خود دیکھ لیا ہے۔ وہ تو اپنے پیروں پر بھی نہیں چل سکتے۔"

اسی وقت میاں صاحب کا بڑا بیٹا اکبر اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ حمید اسے دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" اکبر نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"کمرے کی صفائی کے لیے آیا تھا صاحب۔"

"اب جا یہاں سے۔"

حمید فوراً ہی کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اکبر نے میری طرف دیکھا۔ ''مسٹر! کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا خیال ہے کہ میں اپنا نام بتا چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے کامران نام ہے میرا۔''

''خیر، جو بھی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''آپ کے ساتھ، کہاں؟''

''میرے ساتھ چلو گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔'' وہ مسکرا دیا۔ خلافِ توقع اس وقت اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جو میں تم سے یہاں نہیں کر سکتا۔''

''اکبر صاحب! میں کوئی بچہ نہیں ہوں جس کو کوئی نقصان پہنچا دے۔ چلیں، کہاں چلنا ہے۔''

میں اکبر کے ساتھ حویلی سے باہر آ گیا۔ گیٹ کے باہر اس کی جیپ کھڑی ہوئی تھی اور دو مسلح محافظ جیپ کے پاس کھڑے تھے۔

اکبر نے مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں محافظ پیچھے بیٹھ گئے۔ اور سفر شروع ہو گیا۔ یہ ایک انجانا سفر تھا۔ مجھے نہیں اندازہ نہیں تھا کہ اکبر کے دل میں کیا ہے اور وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ ویسے اتنا یقین تھا کہ وہ مجھے نقصان اس لیے نہیں پہنچا سکتا کہ حویلی کے ملازمین نے ہمیں ایک ساتھ باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

بستی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کھیتوں کے سلسلے تھے جو نہ جانے کہاں تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ راستے میں اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی توجہ ڈرائیونگ پر رہی۔

بہت دیر کے بعد جیپ ایک کچے راستے پر مڑ گئی اور ایک اور طویل سفر کے بعد بالآخر جیپ رک گئی۔ یہاں بھی ایک مکان بنا ہوا تھا۔ میدانوں اور کھیتوں کے درمیان۔

یہ ایک خوب صورت بڑا مکان تھا۔ ''آ جاؤ۔'' اکبر نے کہا۔

ہم اس مکان میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی دو ملازم کھڑے ہوئے تھے۔ اکبر مجھے اپنے ساتھ ایک سجے سجائے کمرے میں لے آیا۔ اس کے محافظ باہر ہی رک گئے۔

''کامران! تم یہ بتاؤ کہ میں تم پر کتنا بھروسا کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ مجھ پر بھروسا ہی کر کے مجھے یہاں تک لائے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' وہ سوچنے لگا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے سگار نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔ ''زیبی ایک اچھی لڑکی ہے... کیوں؟''

مجھے بہت محتاط ہو کر اس کا جواب دینا تھا۔ نہ جانے اس میں اس کی کون سی چال تھی۔ ''جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔ زیبی بی بی ایک اچھی لڑکی ہیں۔''

''وہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''مجھے کہنے دو کہ اس کا یہ حال ظالم باپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میاں صاحب ایک ایسے ظالم انسان ہیں جن کے نزدیک صرف اصولوں اور زمینوں کی اہمیت ہے۔ انسانی جذبے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔''

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جو بظاہر ایک سخت اور خطرناک انسان تھا لیکن اس وقت وہ جو باتیں کر رہا تھا، وہ اس کے مزاج سے بالکل مختلف تھیں۔

''کامران! شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ایک ظالم اور بے رحم شخص ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایسا ہوں لیکن... کم از کم اپنی بہن کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اس بہن کے لیے جس کی انگلی تھام کر اسے چلنا سکھایا ہے۔ میرے ہی کہنے پر بابا نے خرم کو بلانے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کے دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ خرم کی موت میں بابا کا ہاتھ ہے۔ اس کی موت کے بعد بے چاری زیبی کا یہ حال ہو گیا۔ اس کو نارمل کرنے کی ہم نے کتنی کوششیں کی ہوں گی، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔''

میں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہا تھا جو اس وقت کوئی ظالم جاگیردار وغیرہ نہیں بلکہ ایک بہن کا بھائی تھا۔ اس وقت بھائی کی محبت بول رہی تھی۔

''آپ یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم زیبی کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' میں اس کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ ''زیبی کو لے کر چلا جاؤں؟''

''ہاں، اس کو اس ماحول سے نکال کر لے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری وجہ سے وہ نارمل ہو جائے گی۔ میں مجبور ہو کر یہ کہہ رہا ہوں۔ شہر میں تمہاری شادی کا سارا انتظام میں خود کروں گا۔ تمہیں بس کچھ دنوں تک میاں صاحب کے کارندوں کی نگاہوں سے روپوش رہنا ہے۔''

''یقین نہیں آ رہا کہ ایک بھائی اپنی بہن کے لیے ایسا

ہا ہے۔''

''ہاں کیونکہ اس بھائی کو بہن کی خوشیاں درکار ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا اس طرح ہنگامہ برپا نہیں ہو جائے گا؟''

''بالکل ہوگا، اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تمہیں چھپ کر رہنا ہوگا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ تم میری بہن کی خوشیوں کا خیال رکھو گے۔''

''آپ نے تو مجھے کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہادر بنو یار!'' اس بار اس نے مجھے بہت بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کل شام کو سارا انتظام کر دوں گا۔ تم زیبی کو لے کر نکل جانا۔''

☆☆☆

میں ذہنی خلجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔

نہ جانے کتنے سوالات میرے ذہن میں تھے۔ کیا واقعی یہ سب ممکن تھا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ زیبی ایسی لڑکی تھی جس کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ لیکن اس کو حویلی سے فرار کرانا... یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف میاں صاحب کا رویہ تھا۔ وہ ایک شفیق اور مہربان انسان تھے۔ ان کے ساتھ یہ بہت بڑا دھوکا ہوتا۔ کیا میں انہیں ایسا دھوکا دے سکتا تھا؟

پھر یہ کیسی بات تھی کہ خود زیبی کے بھائی نے مجھے ایسا مشورہ دیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اسے واقعی اپنی بہن سے اتنی ہی محبت تھی یا کوئی اور بات تھی؟ لیکن وہ دوسری بات کیا ہو سکتی تھی؟

سوچتے سوچتے میرے دماغ کی چولیں ہلنے لگیں۔

خیال آیا کہ اس ملازم حمید سے مشورہ کروں لیکن شاید مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ایک الجھی ہوئی صورتِ حال تھی اور کسی اور کو رازدار نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

اس رات کھانے سے فارغ ہو کر میں پائیں باغ میں آ گیا۔ یہاں مختلف پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے اور کئی فوارے تھے جن کے اردگرد سنگی بینچیں بنائی گئی تھیں۔

میں باغ میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں بالکل خالی الذہن ہو رہا تھا۔ کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر کوئی اچانک میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ زیبی تھی۔ اپنی پوری دل کشی اور سادگی کے ساتھ۔ نہ جانے کیوں اس کو دیکھ کر ہمیشہ میری دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔

''تم خرم ہو نا؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میں خرم ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' اس نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں وہ کہانی سناؤں گی جو تم نے ایک بار فون پر سنائی تھی۔ تمہیں یاد ہے نا؟''

''نہیں، مجھے یاد نہیں ہے۔''

''کیوں یاد نہیں ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ یہ کہانی تمہیں ہمیشہ یاد رہتی ہے؟'' اس نے کہا پھر میرے ہاتھ پر اپنی گرفت اور سخت کر دی۔

پھر کچھ عجیب سی بات ہوئی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس وقت میری رگوں میں دورانِ خون تیز ہو جاتا۔ اس خوب صورت ماحول کا مجھ پر اثر ہونے لگتا۔ اس کے برعکس ایک سکون، ایک طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک اثر انگیز ٹھنڈک سی میرے وجود میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

''تم ڈرامے کیوں نہیں کر رہے؟'' اس نے اچانک میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ ''تم خرم نہیں ہو۔ اگر تم خرم ہو تو بتاؤ خرم مجھے کس نام سے پکارتا تھا؟''

اور اس وقت میں پھٹ پڑا۔ ''بی بی! میری بات سنو۔'' میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں خرم نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم میری باتیں سمجھو گی یا نہیں سمجھو گی۔''

''میں سب سمجھتی ہوں۔ بہت عقل مند ہوں میں۔'' وہ اچانک ہنس پڑی۔

وہ سایہ۔ وہی اس کے ایب نارمل ہونے کا تاثر۔ بہرحال میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''زیبی! مجھے افسوس ہے کہ تمہارے خرم کے ساتھ ایک بہت بڑا حادثہ ہوا تھا لیکن زندگی کو رواں رہنا چاہیے۔ اسی میں زندگی کا حسن ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو دیکھنا ہے۔ خود کو سنبھالنا ہے۔ اسی لیے جو ہوا، اسے بھول جاؤ اور خوش رہو۔ تم ایک اچھی اور معصوم لڑکی ہو۔ تمہیں نئے سرے سے اپنی زندگی گزارنی ہے۔''

''اور اس نئی زندگی کے لیے تم کیا کرو گے؟'' اس نے پوچھا بالکل نارمل انداز سے۔ ایسی بات کوئی ذہنی مریضہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

''میں تمہارا ساتھ دوں گا زیبی۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

اچانک پودوں کے درمیان کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور ایک آدمی نکل کر سامنے آ گیا۔ یہ وہی گونگا تھا، میاں صاحب

کا خاص ملازم۔

اسے دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا کہ زیبی پھر بھڑک اٹھی۔

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' وہ میری طرف مخاطب ہو کر چیخی۔ ''تم خرم نہیں ہو۔ مجھے دھوکا دینے آئے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔''

گونگا وہاں رکا نہیں تھا۔ وہ ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے ایک طرف چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد زیبی بھی وہاں نہیں رکی۔ وہ اندر چلی گئی۔ میں اکیلا کھڑا سوچتا رہ گیا کہ آخر اس حویلی میں کتنے بھید پوشیدہ ہیں۔

میں بھی کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ کمرے کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں اپنے کمرے کے دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ ''کامران! بات سنو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجھے آواز دینے والا اصغر تھا، میاں صاحب کا چھوٹا بیٹا۔ وہ تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ ورنہ میں نے اس کے ساتھ بھی مسلح محافظ دیکھے تھے۔ ''کامران! تم اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو ابھی اسی وقت حویلی سے نکل جاؤ۔''

یہ ایک اور نئی صورتِ حال سامنے آ رہی تھی۔

''خیریت تو ہے اصغر صاحب؟''

''یہ میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ تم ایسا کرو، فوراً اپنا سوٹ کیس اٹھا کر حویلی کے پچھلے گیٹ پر آ جاؤ۔''

''آخر کیوں؟ میں ایسا کیوں کروں؟ جب تک مجھے صحیح صورتِ حال نہیں معلوم ہو جاتی۔ میں یہاں سے کیسے چلا جاؤں؟''

''اور صحیح صورتِ حال تمہیں موت تک لے جائے گی بے وقوف انسان۔'' اس نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ اکبر بھائی نے تم سے جو کچھ بھی کہا ہے، وہ مجھے نہیں معلوم ہوا ہو گا۔''

میں یہ سن کر چونک پڑا۔ اصغر اپنی دھن میں بولتا جا رہا تھا۔ ''اکبر بھائی کے خاص آدمیوں میں میرے آدمی بھی ہیں جنہوں نے اکبر بھائی کی یہ سازش سن لی تھی۔ اور تمہیں اندازہ ہے کہ اکبر بھائی نے یہ سازش کیوں بنائی ہو گی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''صرف اس بے چاری زیبی کو راستے سے ہٹانے کے لیے۔'' اصغر نے بتایا۔ ''خود سوچو، جب تم زیبی کو لے کر فرار ہو جاؤ گے تو یہی اکبر بھائی زیبی پر آوارہ اور بدچلن ہونے کا الزام لگا دیں گے۔''

''لیکن کیوں... اپنی بہن پر الزام لگانے کا فائدہ کیا ہوگا؟''

''سامنے کی بات ہے۔ جب میاں صاحب کو یہ بات پتا چلے گی تو وہ زیبی کو جائداد سے محروم کر دیں گے۔ نکال دیں گے اس کو اپنی زندگی سے کیونکہ ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔ اس کے بعد جائداد کے صرف دو حصے دار رہ جائیں گے۔ ایک اکبر بھائی اور دوسرا میں۔ اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے میرے لیے بھی کوئی سازش تیار کر رکھی ہو گی۔ اب تو سمجھ گئے؟''

''واقعی اب ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی سارا جھگڑا دولت کا ہے۔''

''ہاں، صرف دولت کا۔ اس کے علاوہ اس سازش کا ایک دوسرا اور خطرناک پہلو بھی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''وہ یہ ہے کہ تم زیبی کو لے کر نکلو گے تو اکبر بھائی کے آدمی تمہارا تعاقب کر کے تمہیں مار دیں گے۔ اور کہا یہ جائے گا کہ اکبر بھائی نے طیش اور غیرت میں آ کر تم دونوں کو مار دیا ہے کیونکہ تم دونوں حویلی سے بہت فاصلے پر ایک ساتھ مرے ہوئے پائے جاؤ گے... بلکہ یہ زیادہ محفوظ طریقہ ہو گا اکبر بھائی کے لیے۔ اب تم خود بتاؤ، کیا تمہاری زندگی کو خطرہ ہے یا نہیں؟''

''واقعی یہ تو بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔'' میں نے کہا۔ میں واقعی خطرے کو محسوس کر چکا تھا۔ میں ویسے ہی کھٹک رہا تھا کہ اکبر جیسے آدمی نے یہ مشورہ کیوں دیا تھا کہ میں اس کی بہن کو لے کر فرار ہو جاؤں۔ ایسا مشورہ تو کوئی عام آدمی بھی نہیں دیتا۔

اب اندازہ ہوا کہ میرے لیے صورتِ حال کتنی خطرناک تھی۔ واقعی زیبی کو ساتھ لے جاتے ہوئے اگر ہم دونوں کو مار دیا جاتا تو کوئی افسوس کرنے والا نہیں ہوتا۔

''اصغر صاحب! اب بتائیں میں کیا کروں؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہاں سے نکل چلو۔'' اصغر نے کہا۔ ''لیکن تم اس بستی سے باہر نہیں جاؤ گے۔''

''تو پھر کہاں جاؤں گا۔''

''میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔'' اصغر نے بتایا۔ ''یہاں سے کچھ فاصلے پر میری ایک بیٹھک ہے، تمہیں وہاں چھپا دیا جائے گا۔''

"لیکن کیوں؟ میں سیدھے شہر ہی کیوں نہ چلا جاؤں؟" میں نے پوچھا۔ "میرے یہاں رہنے کا فائدہ کیا ہے؟"

"نہیں، تم ابھی واپس نہیں جانا۔" اصغر نے کہا۔ "میں اکبر بھائی کی اس سازش کا بھرپور جواب دینا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"میں سمجھا نہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کرسکوں گا؟"

"یہ آہستہ آہستہ تمہیں خود ہی معلوم ہوجائے گا۔" اصغر نے کہا۔ "فی الحال تو یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔"

☆☆☆

مجھے اس حویلی سے نکل کر ایک مکان میں پہنچا دیا گیا۔ یہ بھی تقریباً ویسا ہی مکان تھا جیسا اکبر کا تھا۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کے اور نہ جانے کتنے معاملات ہوں گے۔ یہ لوگ کیا کیا نہیں کرتے ہوں گے۔

مجھے جو کمرا دیا گیا، وہ بہت اچھی طرح سجا ہوا تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اس حویلی میں آنے کے بعد میری زندگی کی کہانی کتنی تیز رفتار ہوگئی ہے۔

دو چار دنوں میں کیسی کیسی باتیں سامنے آگئی تھیں۔

اب یہ اصغر مجھ سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کیا ہوسکتا تھا، اس کا اندازہ مجھے نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ یہ مجھے ایک خطرناک سازش سے بچا کر لے آیا تھا۔

فی الحال تو اصغر میرا ہمدرد ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن نہ جانے آگے چل کر اس کی ہمدردی کون سا رخ اختیار کرتی۔

اس رات پھر ایک واقعہ ہوا۔

میرے اس مکان میں پہنچ جانے کے کچھ دیر بعد اصغر بھی آگیا۔ "اب تم یہاں دو چار دن آرام سے رہو۔" اس نے کہا۔ "تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اب بھی الجھا ہوا ہوں۔"

"الجھنوں کو ذہن سے جھٹک دو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اور ہاں، ایک بات اور، فی الحال اس مکان سے باہر مت نکلنا۔ ویسے تمہاری خدمت کے لیے گاموں باہر ہی بیٹھا رہے گا۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو، اسے بتا دینا۔"

میں گاموں نام کے اس ملازم کو دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی ایک قوی ہیکل انسان تھا جس کے شانے سے ایک بندوق لٹکی رہتی تھی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں یہاں آکر قید ہوگیا ہوں... لیکن کیوں؟ میری ذات میں ایسی کون سی خاص بات تھی؟

اصغر کے کمرے سے جانے کے بعد میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ قوی ہیکل ملازم گاموں پوری طرح چاق و چوبند کھڑا تھا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ یعنی میں وہاں آکر قید ہوگیا تھا۔

بہرحال، آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ میں کن چکروں میں الجھایا گیا ہوں۔

میں نے وہ رات کچھ جاگتے کچھ سوتے ہوئے گزاری۔ میرے لیے کھانے پینے کا بہت اچھا بندوبست تھا لیکن میں اپنی الجھنوں کا کیا کرتا۔

شاید صبح ہونے والی تھی جب میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس وقت پوری طرح سویرا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔

میرے سامنے حمید کھڑا تھا۔ میاں صاحب کا وہ ملازم جو میرا ہمدرد ہوگیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ زیبی بھی تھی۔ وہی ابنارمل لڑکی جو اس وقت بالکل بھی ابنارمل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

میرے خدا! ایک بار پھر میرے لیے حیرتوں کا سفر شروع ہوگیا تھا۔

ہم ایک اور گھر میں تھے۔ یہاں مجھے بہت خاموشی سے لایا گیا تھا۔ اس کمرے میں میرے سامنے زیبی اور حمید بھی تھے۔ دونوں بڑی ہوشیاری کے ساتھ مجھے اس مکان سے نکال لائے تھے۔

اصغر کا ملازم گاموں اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ شاید اسے یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ میں اس کمرے سے باہر نہیں نکلوں گا... یا میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔

اور ان دونوں نے مجھے اس گھر سے نکالنے کے اس موقع سے فائدہ اٹھالیا تھا۔

وہ چھوٹا سا گھر حمید کا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر میں لے آیا تھا۔ زیبی بھی اس کے ساتھ تھی اور وہ ابنارمل بالکل بھی نہیں تھی بلکہ ایک نارمل لڑکی تھی جو مجھے اپنی کہانی سنا رہی تھی۔

"سب یہ سمجھتے ہیں کہ میرا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں شروع سے اپنے ہوش میں رہی ہوں۔ میں نے یہ بہروپ اپنے باپ میاں صاحب کے ظلم کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔"

"لیکن میاں صاحب تو مجھے بہت مہربان اور ہمدرد انسان معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، بظاہر وہ ایسے ہی ہیں۔" زیبی نے بتایا۔

"لیکن اندر سے وہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ معذور ہو جانے کے باوجود ان کی بے رحمی اپنی جگہ ہے۔ اس کہانی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انہوں نے اس آدمی کو مروا دیا جس سے میں نے محبت کی تھی۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ حرکت بابا ہی کی ہے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ بابا نے میرے ارمانوں اور احساسات کی پروا نہ کرتے ہوئے میری شادی ایک عیاش قسم کے سیاست داں سے طے کردی کیونکہ وہ شخص ان کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا۔"

"سمجھ گیا اور تم نے اس شادی کو ٹالنے کے لیے خود کو پاگل بنالیا۔"

"ہاں، کیونکہ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔" زیبی نے کہا۔ "میرے اس راز سے صرف حمید واقف تھا۔" اس نے حمید کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن میں بھی کیا کرسکتا تھا صاحب؟" حمید بول پڑا۔ "میں تو ایک معمولی ملازم ہوں۔"

"پھر بابا نے میری ذہنی حالت کو درست کرنے کے لیے دو تین نوجوانوں کو خرم کا نام دیا۔ لیکن میں نے سب کو بھگا دیا۔ پھر تم آگئے۔ نہ جانے کیوں تمہارے آنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ مجھے پروٹیکشن مل گئی ہے۔ تم میری حفاظت کر سکتے ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو دوسروں کے ساتھ کرچکی تھی۔"

حمید نے میری طرف دیکھا۔ "صاحب! جب آپ کو چھوٹے صاحب اپنے ساتھ لے کر آئے تو میں نے زیبی بی بی کو بتا دیا۔ مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ چھوٹے صاحب آپ کو کہاں لے گئے ہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ اصغر بھائی نے ایسا کیوں کیا؟ کیا بات تھی ان کے ذہن میں؟"

میں نے اسے بتا دیا کہ پہلے اکبر نے مجھ سے کیا کہا تھا اور اصغر نے کیا کہا۔ "اوہ خدا!" زیبی نے ایک گہری سانس لی۔ "میرے بھائی اسی مزاج کے ہیں۔ ان کے لیے دولت سے بڑی چیز اور کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ دولت حاصل کرنے کے لیے اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔"

"بی بی! یہ سارا جھگڑا دولت کا ہے۔" میں نے کہا۔ "ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔"

"حمید نے جب یہ بتایا کہ تمہیں اصغر بھائی ساتھ لے گئے ہیں تو نہ جانے کیوں میں کھٹک گئی۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اور ہم تمہیں وہاں سے نکال کر لے آئے۔"

"اور اب آپ کی تلاش ہورہی ہوگی صاحب۔" حمید نے کہا۔

"میں تو یہاں آکر الجھ گیا ہوں۔" میں زیبی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں یہاں ملازمت کے لیے آیا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنی پریشانیاں سامنے آجائیں گی۔"

"اب ہم نے اپنا فرض پورا کردیا ہے۔" زیبی نے کہا۔ "اب تم خود سوچ سکتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم واپس جانا چاہو تو اس کا بھی انتظام ہوسکتا ہے۔"

"زیبی! تم یہ بتاؤ تم کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم ساری زندگی ابنارمل بنی رہو گی؟"

"نہیں، میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی جائداد اور ایسی دولت پر جس کے لیے رشتے ختم ہوجاتے ہوں۔ مجھے نہیں چاہیے یہ سب۔ مجھے اپنا سکون چاہیے اور اس سکون کے لیے میں نصیر پور چھوڑ رہی ہوں۔ حویلی چھوڑ رہی ہوں۔ جارہی ہوں یہاں سے۔"

"کہاں... کہاں جاؤ گی؟"

"تمہارے ساتھ۔" زیبی نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا؟ میرے ساتھ جاؤ گی؟"

"ہاں، اگر تم مجھے اپنے ساتھ رکھ سکو۔" زیبی نے کہا۔ "اور تم میں اتنی ہمت ہو کہ مجھے سہارا دے سکو۔"

میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ میں تو زندگی بھر اس کو اپنے سینے میں چھپا کر رکھنے کو تیار ہوں اور اس کے لیے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔

"بتاؤ، کیا سوچ رہے ہو؟" زیبی نے پوچھا۔

"زیبی! میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔" میں نے کہا۔ "ایک بار میں تمہیں لے کر یہاں سے نکل جاؤں تو پھر ہمیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تمہارے بھائیوں اور تمہارے بابا کی حکومت اس علاقے پر ہوگی لیکن شہر میں وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ ہم وہاں بالکل محفوظ ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے... تو پھر میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" زیبی نے کہا۔ "آخر میرے دونوں بھائی بھی تو یہی چاہتے تھے نا۔"

"تم کیا سمجھتی ہو کہ ہم اتنی آسانی کے ساتھ یہاں سے نکل سکیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، نکلنا بہت مشکل ہوگا۔" زیبی نے کہا۔ "لیکن

حمید نے سارا انتظام کرلیا ہے۔ کیوں حمید؟''
''ہاں بی بی! سب انتظام ہو چکا ہے۔ آپ لوگوں کو دو دن اسی مکان میں چھپ کر رہنا ہوگا۔ تاکہ سب کی بھاگ دوڑ ختم ہو جائے اور تھوڑا سکون ہو جائے۔ اس کے بعد ہم تینوں یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''اور یہ دو دن تمہیں حویلی میں گزارنے ہوں گے۔'' زیبی نے کہا۔'' تاکہ تم دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ لوگ کیسی پلاننگ کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں بی بی! یہی بات میرے ذہن میں بھی ہے۔ ویسے آپ یہاں بہت آرام سے رہ سکتی ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آتا اور کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔ بس کھانے پینے کی تکلیف ہو جائے گی۔ ویسے راشن، سبزیاں سب رکھی ہوئی ہیں۔''

''تو پھر کس بات کی پریشانی... میں پکانا جانتی ہوں۔ بچپن سے میرا یہی شوق رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے جی تو پھر میں بے فکر ہو کر جاتا ہوں۔''

☆☆☆

ایک دن زیبی کے ساتھ بہت خوب صورت انداز میں گزر گیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو اپنے دکھ سکھ سناتے رہے۔ زیبی جتنی خوب صورت تھی، اس کی باتیں اور بھی خوب صورت تھیں۔

میں بھی اس کے ساتھ رہ کر یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں کس امتحان سے گزر رہا ہوں یا کیسی بلائیں ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہیں۔ دونوں کو ہی اس کی پروا نہیں تھی۔

اس نے بہت مزیدار کھانا بنایا تھا۔ اس کی یہ خوبی بھی سامنے آگئی تھی۔ یعنی وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل لڑکی تھی۔ ایسے ماحول میں پیدا ہونے اور زندگی گزارنے کے باوجود اس کے مزاج میں بے انتہا نرمی تھی۔

اس کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کا ذکر بہت احترام اور پیار سے کیا کرتی۔ میں نے اس سے پوچھا۔
''زیبی! کیا تمہارے بابا شروع سے معذور تھے؟''
''نہیں تو... وہ تو اچھے خاصے دوڑتے بھاگتے انسان تھے۔ ایک ایکسیڈنٹ کے بعد ان کی یہ حالت ہوگئی۔ ان کی جیپ الٹ گئی تھی۔''

''اور تمہاری والدہ... ان کا انتقال کیسے ہوا؟''
''سچ تو یہ ہے کہ بابا کے جبر نے انہیں مار ڈالا۔'' زیبی نے بتایا۔'' وہ ایک صابر اور شاکر قسم کی عورت تھیں۔''

''اب یہ بتاؤ، کیا تمہیں یہ احساس ہے کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی کیسی گزرے گی؟''
''ہاں، معلوم ہے مجھے۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''میں نے بہت عیش و آرام کی زندگی گزاری ہے۔ تمہارے ساتھ مجھے پریشانیاں ہوں گی۔ اس کے باوجود میں اس لیے خوش رہوں گی کہ کم از کم ظلم اور جبر کے ماحول سے تو دور ہو جاؤں گی۔''

''میں تمہارے دونوں بھائیوں کی طرف سے حیران ہوں۔''

''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔'' دولت کا لالچ آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتا ہے۔ دونوں دولت کے لیے ایک دوسرے کو مار بھی سکتے ہیں بلکہ وہ بابا کا خون بھی کر سکتے ہیں لیکن ان کی ہمت نہیں ہوتی۔ بابا نے اپنے اردگرد جو محافظ رکھے ہوئے ہیں، وہ بہت خطرناک ہیں۔''

''خاص طور پر وہ گونگا۔'' میں نے کہا۔
''ہاں، وہ بابا کا خاص آدمی ہے۔'' زیبی نے بتایا۔ ''بابا کے ایک اشارے پر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ صرف اور صرف بابا کا حکم مانتا ہے۔''

''تمہارے غائب ہونے کے بعد تمہارے بابا اور دوسروں کا کیا حال ہوگا؟''
''میرا خیال ہے کہ دونوں بھائیوں کو اس بات کا غصہ ہوگا کہ میں ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ انہیں دکھ نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ بابا تلملائیں گے، دہاڑیں گے۔ انہیں اپنی ناک کے کٹ جانے کا افسوس ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''افسوس کی بات ہے۔''

زیبی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے اس لڑکی پر افسوس ہونے لگا جو ہزاروں غریبوں سے زیادہ غریب تھی... جس کے پاس بظاہر سب کچھ تھا لیکن کچھ بھی نہیں تھا۔

ابھی ہماری باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ حمید حویلی کی خبر لے کر آگیا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو حمید تو آیا ہی تھا، اس کے ساتھ وہ گونگا بھی تھا اور کچھ اور محافظ بھی تھے۔ حمید نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

☆☆☆

تکلیف کی شدت سے میری چیخیں نکل رہی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ زیبی کے ساتھ کیا گزری تھی۔ مجھے

صرف اپنا معلوم تھا کہ وہ لوگ بہت بیدردی سے مجھے مارتے اور کھینچتے ہوئے اس مکان سے باہر لائے تھے۔ اردگرد لوگ بھی جمع ہو گئے تھے لیکن کس میں اتنی ہمت تھی کہ ان کے کاموں میں مداخلت کر سکتا۔

ایک طرف زیبی بھی چیخ رہی تھی۔ انہیں گالیاں دے رہی تھی۔ دھمکیاں دے رہی تھی لیکن اسے کسی بوری کی طرح اٹھا کر ایک گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا۔

اور جہاں تک میرا سوال ہے تو مجھے ہوش نہیں رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مار کھاتے کھاتے میں بے ہوش ہو چکا تھا اور جب آنکھ کھلی تو کسی جگہ گھپ اندھیرے میں پڑا ہوا تھا۔

میرا پورا بدن کسی بہت بڑے زخم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایسی ہی بے پناہ تکلیف ہو رہی تھی۔ میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں صرف اتنا محسوس کر سکتا تھا کہ میں کسی کمرے کے فرش پر پڑا ہوں۔ یہ کمرا کہاں تھا؟ کس کا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

پھر ایک چیخ سنائی دی۔
کسی عورت یا لڑکی کی چیخ۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ خدا کی پناہ۔ یہ کیسے لوگ تھے۔ بے چاری زیبی پر تشدد کر رہے تھے۔ چیخ بھی ایسی تھی جیسے کسی کے جسم پر کوڑے برسائے جا رہے ہوں۔

پھر اس لڑکی کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ شاید وہ بھی میرے ساتھ اسی کمرے میں تھی۔ اسی لیے اس کی آواز مجھے اتنے قریب معلوم ہو رہی تھی۔

اگر یہ زیبی تھی تو پھر ایسے لوگوں پر سوائے لعنت کے اور کیا ہو سکتا تھا جو اپنے ہی خون کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے تھے۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ میرے ہاتھ ایک دیوار سے ٹکرا گئے۔ یعنی مجھے کسی دیوار کے ساتھ لا کر پھینکا یا رکھا گیا تھا۔

اس عمل میں بے انتہا تکلیف ہوئی۔ میرے دونوں ہاتھ بھی زخمی تھے۔ شاید انہوں نے میری بے ہوشی کے دوران مجھ پر غصہ اتارا تھا۔ نہ جانے کتنے کوڑے یا ڈنڈے سہائے ہوں گے اور ابھی ان کا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ وہ مجھے کسی ویرانے میں پھینک دیتے۔

لیکن وہ مجھے یہاں اٹھا کر لے آئے تھے۔ یعنی ان کے دل میں ابھی اور بھی بہت کچھ تھا۔ وہ لڑکی سسکیاں لیتے لیتے خاموش ہو گئی۔ نہ جانے وہ یا تو بے ہوش ہو گئی تھی یا کوئی اور بات تھی۔

میں نے آگے کی طرف رینگنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ درد کی ایسی لہر اٹھی کہ میں چیخ اٹھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر اپنی گردن ایک طرف ڈال دی۔

خدا جانے میں کتنی دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔
پھر آہستہ آہستہ روشنی پھیلنے لگی۔ یہ روشنی بلندی پر بنے ہوئے ایک روشن دان سے آرہی تھی۔ یعنی دن نکل آیا تھا اور یہ کہانی رات بھر کی تھی۔

اب معلوم ہوا کہ میں ایک بڑے کمرے میں ہوں۔ ایک دیوار کے ساتھ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ میں کسی تہ خانے میں ہوں۔

اور مجھ سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ ایک لڑکی پڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ زیبی ہی تھی۔ میں کہنیوں کے بل خود کو گھسیٹتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

اور وہ زیبی نہیں بلکہ کوئی اور لڑکی تھی۔ جوان اور خوب صورت۔ وہ بھی زخمی تھی۔ اس کے چہرے پر چوٹ کے

شوخی

سردار جی کا رات کو سگریٹ پینے کو دل چاہا۔ ہر طرف ماچس ڈھونڈی پر کہیں نہیں ملی۔ آخر کار ناامید ہو کر موم بتی بجھا کر سو گئے۔

☆☆☆

ایک شیخ تنور سے روٹی لے کر جا رہا تھا۔ اچانک ایک کتا روٹی چھین کر بھاگ گیا۔ شیخ بھی کتے کے پیچھے بھاگے۔ شیخ بھاگتے بھاگتے تھک گیا۔ تو رک کر سانس لیا اور بولا۔ یا اللہ اس روٹی کا ثواب ابا جی مرحوم کو پہنچا دینا۔

☆☆☆

ایک بچہ پیدا ہوتے ہی نرس سے پوچھنے لگا:
''موبائل ہے؟''
نرس: ''ہے، کیا کرنا ہے؟''
بچہ: ''کچھ نہیں، بس گرل فرینڈ کو فون کر کے بتانا ہے میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔''

حکیم سید محمد رضا شاہ بخاری، تورنگ میانوالی

نشانات تھے۔ نہ جانے اس لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا مٹکا اور اس کے پاس ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ پانی ہونے کے احساس نے مجھے تقویت پہنچائی۔

میں اسی طرح اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا مٹکے تک آیا۔ لڑکی کے پاس آکر میں نے لڑکی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ کلبلا کر رہ گئی۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھے جارہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "لو تھوڑا سا پانی پی لو۔"

"نہیں۔" وہ بہت بُری طرح خوف زدہ تھی۔ "تم مجھے، ما... مارو گے۔"

"نہیں، میں نہیں ماروں گا۔ مجھے تو خود یہاں لایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "خود دیکھ لو۔ میں تم سے زیادہ زخمی ہوں۔ مجھے لانے والوں نے بہت بے رحمی سے مارا ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے ایک ہاتھ کا سہارا دے کر اسے تھوڑا سا پانی پلایا اور خود بھی دو چار گھونٹ لے لیے۔ کچھ جان میں جان آگئی۔

"ہاں، اب بتاؤ کون ہو تم... کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"رخسانہ۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔ "مجھ کو اٹھا کر لے آئے تھے۔ اور... اور......" اس نے رونا شروع کر دیا۔ "بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر۔ میری عزت......" وہ اس سے آگے کچھ نہیں بول سکی۔

"کون لوگ ہیں یہ؟"

"اسی حویلی کے۔" وہ نفرت سے بولی۔ "میرے بھائی نے ساری زندگی حویلی والوں کی خدمت کی اور اس کا یہ نتیجہ ملا۔ انہوں نے اس پر بھی ظلم کی انتہا کر دی اور اس کے سامنے مجھے اٹھا کر لے آئے۔"

"اوہ، کیا نام ہے تمہارے بھائی کا؟" میں نے پوچھا۔

"حمید۔" اس نے بتایا۔

اب سب کچھ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ بے چارے حمید نے ہم لوگوں کو دھوکا نہیں دیا تھا بلکہ انہیں شبہ ہو گیا ہوگا کہ زیبی کی گمشدگی میں حمید کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے مجبور کر دیا گیا ہو۔ اس کی بہن کو اغوا کر کے اور خود اس پر ظلم کر کے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ سب کس کے اشارے پر ہوا تھا؟ میاں صاحب کے؟ اکبر کے یا پھر اصغر کے؟ گونگے کا سامنے آنا تو یہ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ سب میاں صاحب نے کیا ہے لیکن اس بے چاری کی عزت کس کے ہاتھوں برباد ہوئی تھی؟

اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان بے رحم لوگوں کو گولیاں مار دیتا جن کے نزدیک رشتوں کی بھی اہمیت نہیں تھی۔ نہ جانے زیبی کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔

وہ لڑکی رو رو کر خاموش ہو چکی تھی۔ شاید اب اس میں مزید رونے کی قوت ہی نہیں تھی۔ بہرحال، میں اس کے پاس بیٹھا اسے دلاسے دیتا رہا۔

کچھ دیر بعد سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ وہ لڑکی اٹھ کر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھنے لگی۔

سب سے آگے گونگا ہی تھا۔ اس کے پیچھے دو اور آدمی تھے جو میرے لیے اجنبی تھے جنہیں میں نے حویلی میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔

ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں شاید ہمارے لیے ناشتا لایا گیا تھا۔ اس نے بڑی خاموشی سے ٹرے سامنے رکھ دی۔ پھر گونگے نے اشارہ کیا کہ ہم جلدی سے ناشتا ختم کر لیں۔

"تم تو یہیں رہو گے۔" ان دونوں میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ "یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔"

رخسانہ بری طرح خوف زدہ ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"نہیں، یہ نہیں جائے گی۔" میں مضبوط لہجے میں بولا۔ "کیوں اس بے چاری پر ظلم کر رہے ہو؟"

"اوہو، اتنی دیر میں یارانہ ہو گیا۔" دوسرے نے ہنس کر کہا۔

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کاش میرے اختیار میں کچھ ہوتا۔

اچانک ٹرے لانے والے کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل پر کچھ سنا پھر ہماری طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہے۔ اس وقت تو اس لڑکی کو چھوڑ دیا ہے بعد میں آکر لے جائیں گے۔"

گونگا بھی ان کے اشارے پر ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ تہ خانے کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔ رخسانہ کا خوف ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ بدستور لرز رہی تھی۔ "اب یہ لوگ

میرے ساتھ کیا کریں گے؟" اس نے روتے ہوئے پوچھا۔ "اتنا ظلم تو برداشت کر ہی چکی ہوں۔"

"پریشان مت ہو۔" میں نے تسلی دی۔ ویسے اس وقت خود مجھے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں مر جاؤں گی۔" اس نے کہا۔ "لیکن ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

میں سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ حمید کی بہن تھی اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس بے چاری پر اس ظلم کی وجہ میں خود بنا ہوں۔

اچانک تہ خانے کی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز گونج اٹھی۔ اس بار آنے والا تنہا تھا اور وہ گونگا تھا۔ وہ تہ خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سیڑھیاں اترتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔

اس کے چہرے پر جس قسم کے تاثرات تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس نیت سے آیا ہوگا۔ وہ اس لڑکی کے لیے آیا تھا جو بے چاری کسی فاختہ کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔

گونگے کو یقین تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا اس لیے اس نے مجھ پر دھیان ہی نہیں دیا بلکہ اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف لے جانے لگا۔ لڑکی پھر شور کرنے لگی۔

میں نے غصے میں آکر اس گونگے کو ایک گھونسا رسید کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے لوہے کی کسی دیوار پر گھونسا مارا ہو۔ میرا ہاتھ جھنجھنا اٹھا۔

گونگے نے مجھے دھکا دیا۔ میں ایک طرف جا گرا۔ ایک تو میں ویسے ہی زخمی ہو رہا تھا اور اب اس گونگے کی بے پناہ طاقت۔ میں چیخ پڑا۔ دوسری طرف وہ لڑکی چیختی ہوئی گونگے سے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کیے جارہی تھی لیکن گونگا کسی دیو کی طرح اس پر چھا گیا۔

میں اس لڑکی کو ہر قیمت پر اس گونگے سے بچانا چاہتا تھا لیکن کس طرح؟ اور اچانک خدا کی مدد میرے سامنے آگئی۔ وہ لوہے کی ایک سلاخ تھی جو اس جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں میں جا کر گرا تھا۔ وہ گونگا اب پوری طرح اس لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔

میں نے وہ سلاخ اٹھائی اور گونگے کے سر پر رسید کر دی۔ وہ چاہے کتنا ہی مضبوط اور لوہے کا سہی۔ لیکن اس چوٹ نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ ڈکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔

اس کا سر پھٹ چکا تھا۔ سرخ خون نے اس کے چہرے کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جارہا تھا۔

میں نے دوسرا وار کیا۔ اس وقت مجھ میں حوصلہ بھی آگیا تھا اور میں پُرجوش بھی ہو رہا تھا۔ یہ دوسرا وار کاری ثابت ہوا۔ وہ ڈکراتا ہوا فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

میری سانسیں چڑھ آئی تھیں۔

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی پر اس طرح حملہ کیا تھا۔

رخسانہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ "چلو نکلو یہاں سے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔"

میں نے وہ سلاخ ایک طرف پھینکی۔ اور ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم دروازے کے پاس کھڑے ہو کر باہر کی ٹُن گُن لیتے رہے لیکن باہر صرف خاموشی تھی۔

ہم دروازہ کھول کر باہر آگئے اور جو کچھ ہمارے سامنے تھا، وہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ ہم دونوں کچھ دیر تک بے وقوفوں کی طرح کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

ہم ایک کھیت میں کھڑے ہوئے تھے۔

میرا یہ اندازہ بالکل غلط نکلا تھا کہ ہم حویلی کے تہ خانے میں ہیں... بلکہ یہ صرف تہ خانہ تھا، ایک کمرا جس کا دروازہ کھیت میں کھلتا تھا۔ اس کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

خدا کی پناہ... وہ تہ خانہ اتنی ہوشیاری سے بنایا گیا تھا کہ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کھیتوں کے درمیان کوئی تہ خانہ بھی ہو سکتا ہے۔

"رخسانہ! یہ ہم کہاں آگئے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" رخسانہ بھی حیران ہو کر ہر طرف دیکھے جارہی تھی۔ "نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے۔"

"کیا تمہیں کچھ یاد نہیں آرہا؟"

"نہیں، کیونکہ کھیت تو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن اتنا ضرور اندازہ ہے کہ ہم حویلی سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔"

"کچھ بھی ہو، اب ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

لیکن ہم وہاں سے نہیں نکل سکے۔ تہ خانے کے اندر سے ایک اور چیخ سنائی دی جس نے ہمیں حیران کر دیا۔ یہ چیخ

بھی کسی لڑکی کی تھی۔
''یا خدا! کون ہے یہ؟'' رخسانہ نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''آواز تو تہ خانے سے آرہی ہے۔'' میں نے کہا۔
''خدا کے لیے چلو یہاں سے۔'' رخسانہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہ جانے کیا چکر ہے۔ ہم تہ خانے میں اس گونگے کو چھوڑ آئے تھے۔ اب کون چیخ رہا ہے؟''
ہم آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ وہی چیخ پھر سنائی دی۔ واضح طور پر تہ خانے سے آتی ہوئی چیخ... جہاں ہم گونگے کو بے ہوش چھوڑ آئے تھے۔
''رخسانہ! تم یہیں ٹھہرو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں، میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''تمہاری وجہ سے مجھے حوصلہ رہتا ہے۔''
''تو پھر آؤ۔ دیکھتے ہیں کیا چکر ہے۔''
ہم تہ خانے میں واپس آگئے۔
ایک لڑکی بے ہوش گونگے کے پاس کھڑی ہوئی چیخے جا رہی تھی۔ گونگا اسی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا اور اس کی چڑھتی اترتی سانسیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ ابھی زندہ ہے۔
ہماری آہٹ سن کر اس لڑکی نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور رخسانہ چیخ اٹھی۔ ''ارے، نازنین تم؟''
نازنین نام کی اس لڑکی نے چونک کر رخسانہ کو دیکھا اور دوڑتی ہوئی رخسانہ سے آکر لپٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش بھی ہو چکی تھی۔
رخسانہ نے بہت مشکل سے اس کو سنبھالا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اس وقت کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ''رخسانہ! کون ہے یہ؟'' میں نے رخسانہ سے پوچھا۔
''یہ بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے اس کو یہاں سے لے چلیں۔''
''لیکن یہ آئی کہاں سے؟''
''تہ خانے کی سیڑھیوں کے نیچے ایک اور دروازہ ہے۔'' رخسانہ نے بتایا۔ ''اس طرف بھی ایک کمرا ہے، شاید اس کو وہیں رکھا گیا تھا۔''
''پتا نہیں۔ کیسا گورکھ دھندا ہے۔ اب اس کو کہاں لے جائیں؟''
''یہاں سے تو نکلیں۔ وہ لوگ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔''

ہم بڑی مشکلوں سے اس لڑکی کو اٹھا کر تہ خانے سے باہر لے آئے۔ ہر وقت گونگے کے ہوش میں آنے یا ان لوگوں کے آجانے کا خوف لگا ہوا تھا لیکن ہم خیریت سے تہ خانے سے باہر آگئے تھے۔
میں نے نازنین کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ رخسانہ آگے آگے چل رہی تھی۔ اس نے بتایا۔ ''اب مجھے یاد آرہا ہے۔ یہ اپنا ہی علاقہ ہے۔ یہاں کچھ فاصلے پر ایک کوٹھری بنی ہوئی ہے۔ کسی زمانے میں اس میں ایک کنواں تھا۔ اب وہ سوکھ چکا ہے اور اس طرف کوئی نہیں جاتا۔ ہم وہاں کچھ دیر رک سکتے ہیں۔''
رخسانہ کا اندازہ صحیح تھا۔ ہمیں وہ کوٹھری بھی مل گئی۔ ہم نے اس بے ہوش لڑکی کو ایک طرف لٹا دیا۔
''اب بتاؤ کون ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ وہ لڑکی ہے جو اب سے ایک مہینا پہلے ہماری بستی سے اغوا ہوگئی تھی۔'' رخسانہ نے بتایا۔ ''اس کو وہ لوگ اٹھا کر لے گئے تھے جو گاؤں کی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو لے جا چکے ہیں۔ جو چہرے کو چھپائے ہوئے، فائرنگ کرتے ہوئے آتے ہیں اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ پھر ان کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ نہ جانے یہ بے چاری کس طرح مل گئی ہے۔''
''یہ اسی بستی کے ایک تہ خانے سے ملی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاید دوسری لڑکیاں بھی آس پاس ہی ہوں۔''
''خدایا! ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ ان لڑکیوں کو بستی سے کہیں دور لے جاتے ہوں گے۔''
''اب تو اس بھید کے ڈانڈے بھی یہاں کی حویلی سے ملتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''خدا جانے یہ سب کیا ہے؟''
نازنین نام کی اس لڑکی نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی پھر اٹھ بیٹھی۔ اس کی بے ہوشی ختم ہو چکی تھی۔ رخسانہ کو دیکھ کر وہ پھر رونے لگی۔ رخسانہ نے اسے خود سے لگا لیا۔
میں ان دونوں کے پاس سے ہٹ آیا۔ میں اس کوٹھری سے باہر آگیا تھا تاکہ نازنین خود کو سنبھال بھی سکے اور رخسانہ اسے میرے بارے میں بھی بتا دے۔
کچھ دیر بعد میں واپس گیا تو نازنین نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔
''نازنین نے تو عجیب بات بتائی ہے۔'' رخسانہ نے کہا۔ ''یہ کہتی ہے کہ ہماری بستی سے جتنی لڑکیاں غائب ہوئی ہیں، وہ سب اسی تہ خانے میں رکھی جاتی ہیں۔''

''اور انہیں اغوا کرنے والا کون ہوتا ہے؟ کس کے پر اغوا کی جاتی ہیں؟''
''یہ نہیں معلوم۔'' رخسانہ نے کہا۔ ''یہ نہیں بتایا۔''
''نازنین! تم کھل کر بتاؤ۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟'' میں ہ پوچھا۔ ''اس وقت ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔''
''میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔'' نازنین نے آہستہ ہو بتایا۔ ''وہ ایک نقاب باندھے رہتا ہے جس سے وہ نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے لیکن دوسرے نقاب والے گی ہر بات مانتے ہیں۔ وہ ان کا سردار معلوم ہوتا ہے۔''
''تمہارے سامنے کتنی لڑکیاں لائی گئی تھیں؟''
''صرف ایک لڑکی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور وہی کم نقاب پوش۔'' نازنین بولتے بولتے رک گئی۔
پھر رخسانہ نے اس کی بات مکمل کی۔ ''وہی نقاب پوش ول کو برباد کرتا رہا ہے۔''
''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم نے کبھی ی آواز تو سنی ہوگی۔ آواز سے تو پہچان لوگی؟''
''نہیں، وہ کچھ بولتا نہیں ہے۔'' نازنین نے بتایا۔ صرف اشاروں سے حکم دیتا ہے۔''
''کہیں وہ یہی گونگا تو نہیں ہے؟'' رخسانہ نے پوچھا۔
''ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس گونگے نے ایسی گیم شروع کردی ہوں۔''
''اب کیا ہوگا؟'' رخسانہ نے پوچھا۔ ''اب ہم یہاں کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ پتا نہیں حمید بھائی کے ساتھ کیا ی ہوگی۔ ان لوگوں نے میرے بھائی کے ساتھ کیسا ال کیا ہوگا؟ کہیں غصے میں ان کو جان سے ہی نہ مار ''
''ایسے بے رحموں کا کوئی بھروسا نہیں۔'' میں نے
اور اسی وقت گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ی کوٹھری کو گھیر لیا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ قوی ہیکل اور ریچھ نما کتا ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑا
ہمیں اس کوٹھری سے باہر نکالا گیا۔ گھیرنے والے دس و تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور دونوں ایک ساتھ تھے۔
اور وہ خطرناک کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔
دونوں بھائی نازنین کو ہمارے ساتھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ''کون ہے یہ لڑکی؟ یہ تمہارے ساتھ کہاں سے آگئی؟'' اکبر نے مجھ سے پوچھا۔
''یہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ اس بے چاری کو تم لوگوں نے قید کر رکھا تھا۔''
''ہم نے قید کر رکھا تھا؟'' اصغر نے حیرت سے دہرایا۔ ''کہاں قید کیا ہوا تھا؟''
''اس تہ خانے میں جہاں تم نے ہمیں رکھا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''یہ لڑکی اسی تہ خانے میں تھی اور تم لوگ تو اس طرح انجان بن رہے ہو جیسے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''
''بے وقوف انسان! ہم واقعی اس کے بارے میں نہیں جانتے۔'' اکبر نے کہا۔
''ہم تمہیں تو اس لیے لائے تھے کہ تم نے ہمارے ساتھ غداری کی تھی۔'' اصغر نے کہا۔ ''تم زینی کو بہکا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے اور حمید نے ہمارے ساتھ غداری کرتے ہوئے تم دونوں کا ساتھ دیا تھا جس کی سزا اسے دے دی گئی۔''
''کیسی سزا دی تم نے؟ تم نے اس کا غصہ اس معصوم لڑکی پر نکالا۔'' میں نے رخسانہ کی طرف اشارہ کیا۔
''ہاں، حمید کو ایک جھٹکا دینا ضروری تھا۔'' اصغر ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس موقع پر ہم نے بابا کے خاص ملازم گونگے سے بھی کام لیا ہے جو بے چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''
''کیا؟'' مجھے یہ سن کر ایک جھٹکا سا لگا۔ ''کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟''
''یہ تو تم بتاؤ گے کیونکہ تم اس کو مار کر اس تہ خانے سے باہر نکلے ہو۔'' اکبر نے کہا۔ ''لیکن تم یہ بتاؤ کہ یہ دوسری لڑکی تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟''
''میں بتا چکا ہوں کہ یہ اسی تہ خانے میں تھی۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' اصغر آگے بڑھ کر بولا۔ پھر اس نے نازنین کی طرف دیکھا۔ ''لڑکی! یہ بتا تو وہاں کیسے اور کہاں سے آگئی؟''
''تم وحشیوں نے مجھے وہاں قید کر رکھا تھا۔'' نازنین نے غصے سے کہا۔
''بکواس مت کر۔ ہمارا تجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''
''اس تہ خانے میں سیڑھیوں کے نیچے ایک دروازہ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''جو بظاہر نظر نہیں آتا۔''
یہ انکشاف ان دونوں کے لیے بھی حیران کر دینے والا تھا۔ ان کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ انہیں وہاں نازنین کی

موجودگی کا بھی علم نہیں تھا۔ تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس تہ خانے سے کوئی اور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ تہ خانہ کسی اور کے استعمال میں بھی تھا۔

''چلو۔'' اکبر نے مجھے دیکھا۔ ''چل کر ہمیں وہ دروازہ دکھاؤ۔''

ہم گویا ایک چھوٹے جلوس کی صورت میں واپس چل پڑے۔ دونوں لڑکیاں آگے آگے تھیں۔ ان کے پیچھے میں چل رہا تھا اور میرے پیچھے وہ دونوں بھائی اور ان کے ملازم تھے۔

ہم اسی تہ خانے میں پہنچے تو گونگا وہاں نہیں تھا۔

''ارے، یہ گونگا کہاں چلا گیا؟'' اکبر نے حیرت ظاہر کی۔

''بھائی! شاید وہ صرف بے ہوش تھا۔'' اصغر نے کہا۔ ''ہوش آنے پر اٹھ کر بھاگ گیا۔''

''لیکن کہاں؟ ہم تو سامنے ہی تھے۔''

''وہ دیکھو۔'' میں نے سیڑھیوں کے نیچے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔''

''کمال ہے۔ اب سے پہلے ہمیں یہ دروازہ کبھی دکھائی نہیں دیا۔''

ہم اس دروازے میں داخل ہو گئے۔

خدا کی پناہ! یہ تو ایک طویل سرنگ سی تھی جو نہ جانے کتنی دور تک چلی جا رہی تھی۔ اس سرنگ میں روشنی بھی روشن دانوں سے آ رہی تھی۔

اکبر اور اصغر قدم قدم پر حیرت کا اظہار کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے لیے اس سرنگ کی موجودگی حیرت انگیز تھی۔ اس بات کی تصدیق ہوتی جا رہی تھی کہ اس سے پہلے خود انہیں بھی سرنگ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

ہم اسی طرح چلتے رہے۔ دونوں لڑکیاں اب میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی بری طرح خوف زدہ تھیں۔ پھر اچانک ہم ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے۔

اس کمرے میں اور کئی لڑکیاں یا عورتیں تھیں، جنہوں نے ہمیں دیکھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ خوف زدہ لڑکیاں جن کے جسموں پر مناسب لباس بھی نہیں تھے۔

''خدا کی پناہ۔'' رخسانہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''یہ سب تو گاؤں کی لڑکیاں ہیں۔''

وہ لڑکیاں نازنین اور رخسانہ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ کچھ عجیب ماحول بن گیا تھا۔ بستی سے اب تک اغوا ہونے والی کئی لڑکیاں وہیں موجود تھیں۔

''ہم نہیں جانتے کہ یہ سب کیا ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''ان لڑکیوں کو یہاں کون لایا ہے؟''

ان دونوں بھائیوں کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ وہ سچ ہی کہہ رہے ہیں۔ ان لڑکیوں کا اس طرح پایا جانا ان کے لیے بھی حیرت انگیز تھا۔

''بتاؤ، تم لوگوں کو یہاں کون لایا ہے؟'' اصغر نے پوچھا۔

''ہم نہیں جانتے۔'' ایک لڑکی نے جواب دیا۔ ''وہ ایک نقاب پوش ہے۔ ہم نے آج تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا لیکن اسی کم بخت نے ہمیں برباد کیا ہے۔''

یہی بات نازنین بھی بتا چکی تھی۔

''وہ کب آتا ہے یہاں؟'' اکبر نے پوچھا۔

''دن میں دو بار۔'' دوسری لڑکی نے جواب دیا۔ ''یہ اس کے آنے کا وقت ہے۔ کچھ دیر میں آتا ہی ہوگا۔''

میں چونکہ ان واقعات کی وجہ سے خود بھی ان میں شریک ہو گیا تھا اسی لیے میں نے ان دونوں سے کہا۔ ''کیوں نہ ہم خاموشی سے اس کا انتظار کریں۔''

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' اکبر نے کہا ''اور جب وہ آ جائے تو اس پر قابو پا لیں۔ دیکھیں تو سہی، وہ کم بخت ہے کون۔''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ حرکت تم دونوں کی ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، ہم اتنے برے نہیں ہیں۔''

لڑکیوں کو سمجھا دیا گیا کہ وہ اب بالکل خاموش ہو جائیں پھر ہم سب ادھر ادھر چھپ گئے۔ اس تہ خانے میں اتنی گنجائش تھی کہ کئی درجن لوگ پوشیدہ رہ سکتے تھے۔

ہم اس کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

لڑکیوں کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اس نقاب پوش کو اچانک پکڑ کر ہمیں ہوشیار کرنے کے لیے شور مچائیں گی پھر ہم بھی آ جائیں گے۔

اب پردہ اٹھنے کا انتظار تھا۔

پردہ تھوڑی دیر میں اٹھ گیا۔ لڑکیوں کے شور کرنے کی آوازیں آئیں اور ہم دوڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ ایک قوی ہیکل نقاب پوش ان لڑکیوں میں گھرا ہوا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ لڑکیاں کسی جونک کی طرح اس سے چمٹ گئی تھیں۔

پھر جب ہم اس کمرے میں پہنچے تو وہ نقاب پوش تھ

سکتے میں آگیا اور اس موقع پر کسی لڑکی نے اس کا نقاب نوچ لیا۔

وہ میاں صاحب تھے... معذور میاں صاحب۔ ان لڑکوں کے باپ۔ اس حویلی کے مالک... شریف اور ہمدرد سمجھے جانے والے جو ایک حادثے کے بعد مفلوج ہو چکے تھے۔

☆☆☆

وہ شاید پاگل ہی ہو گیا تھا۔

نہ جانے کون سا میکنزم تھا جس کی وجہ سے ایک سیلاب سا اس تہ خانے اور اس سرنگ میں چلا آیا تھا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ ہمارے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

اس جنونی نے شاید سب کچھ برباد اور تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہم سب ایک حیرت کے عالم میں اپنی جانیں بچانے کے لیے پاگلوں کی طرح دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ پانی کے پریشر سے سرنگ کی دیواریں ٹوٹنے لگی تھیں۔ نہ جانے یہ کیا میکنزم تھا اور کتنے برسوں پہلے بنایا گیا تھا۔

میاں صاحب شاید جنونی ہو گئے تھے۔ اس کے دونوں بیٹوں نے اور ہم سب نے ان کا اصل چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ مفلوج نہیں تھا۔ یہ سب اس کا ڈھونگ تھا اور اتنی کامیابی سے ادا کر رہا تھا کہ خود اس کے بیٹوں کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

ہم سب دوڑتے جا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں میرے ساتھ تھیں۔ سب سے آگے خود میاں صاحب تھے۔ اس کے پیچھے اس کے دونوں بیٹے پھر دوسرے لوگ۔ ایک قیامت اس سرنگ میں امڈ آئی تھی۔ ہم گرتے پڑتے بھاگے جا رہے تھے۔ ایک اور دیوار گری۔ ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ خدا جانے اس دیوار کے نیچے کون آ گیا تھا لیکن رک کر دیکھنے کا ہوش ہی کس کو تھا۔

ہم چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے۔ پھر ایک اور ریلا آیا۔ اس ریلے نے اکبر کے پاؤں اکھیڑ دیے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن بہتا چلا گیا۔ اس کی آخری چیخ انتہائی دردناک تھی۔ اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ ایک لڑکی بھی گئی۔ پانی کے تیز ریلے نے مجھے بھی اکھاڑ دیا تھا لیکن اس وقت دونوں لڑکیوں نے مجھے سنبھال لیا۔ ورنہ آج میں بھی اس کہانی کو دہرانے کے لیے زندہ نہیں رہتا۔

سیڑھیاں... سرنگوں کے اختتام پر کچھ اور سیڑھیاں۔ اور یہاں خود میاں صاحب کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک دیوار بھی گر پڑی تھی۔ میاں صاحب چیختے ہوئے ڈھیر ہو گئے۔

میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اسے پکڑ لیا۔ اسے جانے نہیں دیا۔ پانی کا ایک اور زبردست ریلا آیا۔ اس بار اصغر بہہ گیا تھا۔ چیختا چلاتا ہوا۔ اس کے ساتھ دو ملازم بھی تھے۔

ایک دیوار اور بیٹھ گئی۔ خدا کی پناہ... کیسی تباہی آ گئی تھی۔ ایسے مناظر انگریزی فلموں میں دیکھے جاتے ہیں لیکن یہ سب میرے سامنے ہو رہے تھے اور میں اس منظر کا حصہ بنا ہوا تھا۔

سیڑھیاں ختم ہوئیں۔ میاں صاحب کو میں نے تھام رکھا تھا۔ اس سے حساب جو لینا تھا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی ایسا لگا جیسے ہم دارالسکون میں آ گئے ہوں۔

پانی کے ریلے سرنگوں ہی میں رہ گئے تھے۔ اوپر کچھ بھی نہیں تھا اور اس وقت ہم حویلی میں تھے۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ ان سرنگوں کا تعلق حویلی سے ہو سکتا ہے اور ہم حویلی میں تھے۔

کیا حاصل ہوا تھا؟

میاں صاحب کے دونوں بیٹے چلے گئے تھے۔ کئی لڑکیاں ڈوب چکی تھیں اور وہ خود بے ہوش ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ایک قیامت تھی۔

ہر لحاظ سے قیامت۔ حویلی کی سرنگوں کی تباہی۔ اس بات کا انکشاف کہ نقاب پوش گروہ کا سربراہ خود میاں صاحب ہی تھا۔ ایک ہوس زدہ بوڑھا انسان... جس نے گاؤں کی لڑکیوں کو برباد کرنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ ایک گروہ ترتیب دیا تھا۔ وہ گاؤں کی لڑکیوں کو اغوا کر کے حویلی کے تہ خانوں میں پہنچا دیتا۔ جہاں وہ ان کو بے آبرو کرتا....

اپنے آپ کو پردے میں رکھنے کے لیے اس نے معذور ہو جانے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا تاکہ کسی کا بھی دھیان اس کی طرف نہ جائے۔ اس کے اس گھناؤنے راز سے صرف اس کا گونگا ملازم ہی واقف تھا۔

حویلی والوں پر ایک قیامت آ گئی تھی۔

اس سے بڑی قیامت اور کیا ہو گی کہ اس کے دو جوان بیٹے بھی اس کے لائے ہوئے سیلاب کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ پانی انہیں بہا کر لے گیا تھا۔ پھر ان پر سرنگ کی دیواریں گر پڑی تھیں۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ انہیں موت آ گئی تھی۔ ورنہ وہ کس طرح اپنے باپ کی صورت دیکھتے۔

ان تہ خانوں اور سرنگوں سے پانچ لڑکیاں ملی تھیں

جن ان کے گھروں کو بھیج دیا گیا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ غصے میں بھرے ہوئے اس حویلی کو تباہ کرنے اور میاں صاحب کو مارنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب بپھرے ہوئے تھے۔ انہیں بڑی مشکلوں سے آنے سے روکا گیا تھا۔

کیونکہ میاں صاحب کہلانے والا اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔

اور یہ اس کا ڈھونگ نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر ایک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف میں کھڑا تھا تو دوسری طرف زیبی بھی تھی۔ جس پر ایک سکتہ سا طاری تھا۔

اپنے باپ کے بارے میں اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔ میاں صاحب کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی بے چارگی تھی۔

کیا وقت ہوتا ہے۔ میں اس آدمی کو اس حویلی پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور اب وہی آدمی حسرت بھری تصویر بنا ہوا لیٹا تھا۔

''کامران!'' زیبی اچانک میرے پاس آ کر بولنے لگی۔ ''تم نے اس آدمی کو کیوں بچایا؟ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کو بچایا جاتا۔ اس کو مرنے کیوں نہیں دیا؟''

''میں نے انسانی ہمدردی کے تحت اس کو بچایا ہے۔''

''لیکن اس نے تو کسی کو انسان نہیں سمجھا۔'' زیبی نے کہا۔ ''میں... میں شرم سے زمین میں گڑی جا رہی ہوں۔ اسے اپنا باپ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے مجھے۔ یہ اس قابل کہاں تھا۔ اب میں کس طرح کسی کو اپنا چہرہ دکھاؤں گی؟''

''دیکھو زیبی! میاں صاحب نے جو کچھ کیا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم ان کے گناہوں کی ذمّے دار نہیں ہو سکتیں... بلکہ تمہارے دونوں بھائی بھی اچھے تھے۔ بظاہر وہ سخت اور بے رحم قسم کے لوگ تھے لیکن وہ اس حد تک نہیں گئے تھے جس حد تک تمہارا باپ چلا گیا تھا۔ لیکن اب خود دیکھ لو۔ کیا ملا ہے اس شخص کو۔ حسرت اور عبرت کا نشان بنا پڑا ہے۔''

''لیکن میں... میں کس طرح اس احساس سے پیچھا چھڑاؤں کہ یہ آدمی میرا باپ تھا؟''

''تم اس کے گناہ اپنے سر کیوں لے رہی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''خدا کے نزدیک صرف وہی مجرم ہوتا ہے جس نے جرم کیا ہے۔ قدرت اس کی اولاد اور رشتے داروں سے انتقام نہیں لیتی۔''

''کاش... کاش میں ایسے شخص کی بیٹی نہ ہوتی۔''

''تم دیکھ رہی ہو جو کچھ تمہارے باپ کے ساتھ ہوا ہے، اسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''قدرت کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔''

دروازے پر دستک کے ساتھ حمید بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ ''صاحب! بہت سے لوگ حویلی کے باہر جمع ہیں۔ وہ سب میاں صاحب سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ پولیس بھی آ گئی ہے۔''

''جاؤ، ان لوگوں کو بتا دو کہ قدرت نے میاں صاحب کو سزا دے دی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے بڑی سزا دنیا کا کوئی قانون نہیں دے سکتا۔''

حمید جانے لگا تھا کہ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''یہ بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''صاحب! آپ نے خود دیکھ لیا ہو گا کہ مجھے آپ دونوں کا پتا بتانے کے لیے کس طرح مجبور کر دیا گیا تھا۔ اب وہ دونوں تو اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے ظلم کی داستانیں رہ گئی ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے میری بہن کو اٹھایا تھا۔''

''رخسانہ اب کیسی ہے؟'' مجھے رخسانہ کا خیال آ گیا۔ اس افراتفری کے بعد وہ دکھائی نہیں دی تھی۔

''ہاں، اب ٹھیک ہی ہے۔'' حمید نے اپنی گردن جھکا لی۔ ''بے چاری کی تو زندگی برباد ہو گئی۔ گھر میں ہے اور صرف روئے جا رہی ہے۔''

''حمید! اسے تم میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

''اچھا صاحب! بھیج دوں گا۔''

☆☆☆

مجھے اس حویلی میں رکنا پڑ گیا۔

طوفان تھم چکا تھا۔ میاں صاحب کی وہی حالت تھی۔ ساری جائداد، ساری دولت اب زیبی کی ہو گئی تھی کیونکہ اب وہی قانونی وارث تھی۔

زیبی نے مجھ سے التجا کی کہ میں معاملات کے حل ہونے تک اسی حویلی میں اس کے ساتھ رہوں۔ میں نے اس کی یہ بات مان لی۔ ویسے بھی میں فی الحال اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ لڑکی ٹوٹ گئی تھی، ہر لحاظ سے۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ اس کے دو بھائی مر چکے تھے۔ اس کے باپ کے سیاہ کرتوت اس کے سامنے آ گئے

تھے اور وہ مفلوج ہو کر لیٹ چکا تھا۔

اس کے علاوہ جو اہم بات تھی، وہ یہ تھی کہ میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ اپنے باپ اور بھائیوں کے بالکل برعکس۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”کامران! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ میں کتنی بدقسمت لڑکی ہوں؟“

”ہاں، اس کا احساس ہے مجھے۔“

”جب دونوں بھائی زندہ تھے، جب باپ اپنے ہوش میں تھا، اس وقت بھی میں کیسی زندگی گزار رہی تھی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں تھا۔ میرے محبوب کو مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ مجھے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پاگل پن کا ڈھونگ رچانا پڑا۔ واہ! کیا زندگی تھی میری۔ اور اب بھی کیا زندگی ہے۔ ایک جائداد کے سوا، کون ہے میرا۔ میں نے حویلی سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ میں لوگوں کی طنزیہ اور غصے بھری نگاہوں کا سامنا نہیں کر سکتی کیونکہ میں میاں صاحب جیسے شخص کی بیٹی ہوں۔“

”تم پھر سب کا جرم اپنے سر لے رہی ہو۔“

”تو پھر کیا کروں میں؟ کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟“

”تم میرے پاس آجاؤ۔“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ وہ چونک گئی۔

”ہاں زیبی! میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں چاہتا ہوں کہ زندگی کے اس سفر میں تمہارا ساتھ دوں۔۔۔ اگر تم پسند کرو تو۔۔“

زیبی رونے لگی۔ یہ شاید خوشی کے آنسو تھے یا اس احساس کے تھے کہ کسی نے اسے سہارا دینے کی بات کی ہے۔

”کاش! اس وقت ہمارا کوئی بزرگ ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آکر اس نازک سچویشن کو سنبھال لیتا۔“

”کامران! یہ بتاؤ کیا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟“

”صرف ماں ہیں اور وہ بھی ذہنی مریضہ۔“ میں نے بتایا۔

”کہاں ہیں تمہاری امی؟“

”میں انہیں شہر چھوڑ آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کیا وہ یہاں نہیں آسکتیں؟“

”یہاں؟“

”ہاں، تم ان کو یہیں بلا لو۔ میں ان کی خدمت کروں گی۔“ زیبی نے کہا۔ ”میرے لیے اس سے بڑی بات اور کچھ نہیں ہو سکتی۔“

”ہاں، میرے لیے بھی کچھ نہیں ہو سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”ایک طرف مجھے تم مل جاؤ گی اور دوسری طرف امی میرے پاس رہیں گی۔“

زیبی نے شرما کر اپنی گردن جھکا لی۔

☆☆☆

میں شہر جا کر امی کو اپنے ساتھ لے آیا۔

ان کی حالت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ انہیں اپنے ہوش میں دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ مجھے گویا سب کچھ مل رہا تھا۔ ایک طرف زیبی جیسی لڑکی کا ساتھ اور دوسری طرف امی۔ مجھے اس کے علاوہ اور کیا چاہیے تھا۔

میں ایک بار پھر اسی پلیٹ فارم پر تھا۔

نصیر پور کے پلیٹ فارم پر۔ اس بار بھی مجھے لینے کے لیے وہی کھڑکھڑاتی ہوئی آوازوں والا منیجر آیا ہوا تھا۔ میں اس کہانی کے دوران اس کے بارے میں بتانا تو بھول ہی گیا۔

منیجر ایک مخلص آدمی تھا۔ اس کا چہرہ کسی حادثے میں آدھا جل گیا تھا اس لیے وہ ہر وقت اپنے چہرے کو چھپائے رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔

وہ حویلی کا خاص اور بااعتماد ملازم تھا لیکن اسے بھی میاں صاحب کے کارناموں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میاں صاحب کا دوسرا روپ کیا ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان تھا۔

میاں صاحب کے ذہنی توازن کھو دینے اور دونوں بیٹوں کی موت کے بعد اب وہ زیبی کا منیجر تھا اور اسی ایمان داری اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا تھا جس طرح میاں صاحب کی زندگی میں دیا کرتا تھا۔

پورے قصبے میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ میں اور زیبی ایک ہونے جا رہے ہیں۔

میاں صاحب کے گونگے ملازم کا کوئی پتا نہیں چلا۔ خدا جانے وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ بہرحال، اب اس بستی سے کوئی لڑکی اغوا نہیں ہو رہی تھی۔

نہ جانے کیوں نصیر پور کے اسٹیشن سے لے کر حویلی تک امی بہت بے چین رہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہوں یا کوئی بات انہیں یاد آ رہی ہو۔

حویلی کے گیٹ پر گاڑی سے اترنے کے بعد انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹے! تم مجھے کہاں لے کر آئے ہو؟“

”امی! یہیں ہے آپ کی ہونے والی بہو۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ آپ کا انتظار کر رہی ہوگی۔“

اس دوران میں زیبی بھی گیٹ تک چلی آئی۔

امی نے اسے بے ساختہ گلے لگا لیا۔ زیبی ان سے مل کر بہت دیر تک روتی رہی۔ شاید اسے اپنی ماں یاد آگئی ہو گی۔

زیبی ہمیں کمرے میں پہنچا کر دوسرے انتظامات کے لیے چلی گئی۔

”بیٹے!“ امی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لے چلو یہاں سے۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔“

”کیوں امی! کیا ہو گیا آپ کو؟“

”مجھے یہاں آکر وحشت سی ہو رہی ہے۔“ امی دھیرے سے بولیں۔ ”چلو یہاں سے۔“

”امی! دو دنوں کے بعد زیبی سے میری شادی ہونے والی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اسی لیے تو آپ یہاں آئی ہیں۔“

”کون ہے یہ لڑکی؟“

”یہ میاں بشیر کی بیٹی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس حویلی کے مالک۔“

”اور میاں بشیر کہاں ہیں؟“

”وہ بیمار ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ چل پھر نہیں سکتے۔“

”کیا میں میاں بشیر سے مل سکتی ہوں؟“ امی نے پوچھا۔

”کیوں نہیں، آپ چائے پی لیں پھر چلتے ہیں۔“

چائے پینے کے دوران بھی امی کی پریشانی برقرار رہی۔ نہ جانے انہیں کس بات کی بے چینی تھی۔ وہ کبھی بیٹھ جاتیں، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتیں۔ نہ جانے انہیں کیا ہو گیا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ”امی! خیریت تو ہے نا۔۔۔ آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟“

”پتا نہیں بیٹا، تم ایسا کرو یہاں سے چلو۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ پریشان ہو رہی ہیں تو واپس چلتے ہیں لیکن کم از کم ایک نظر میاں صاحب کو تو دیکھ لیں۔ زیبی کیا سوچے گی۔“

امی خاموش ہو گئیں۔

چائے لے کر آنے والی رخسانہ تھی۔ اسے دیکھ کر میں نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ یہ لڑکی بھی بہت اچھی تھی۔ ہم بہت دیر تہ خانے میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ میں نے اس سے ذہنی طور پر قربت بھی محسوس کی تھی لیکن اب ہمارے درمیان زیبی آچکی تھی۔

وہ ٹرے رکھ کر واپس چلی گئی۔ شاید اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرے اور زیبی کے درمیان کیا رشتہ ہونے جا رہا ہے۔

چائے ختم ہوئی تو میں نے امی سے کہا۔ ”چلیں، میاں صاحب کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد ایک دن آرام کے بعد کل صبح آپ کو واپس لے جاؤں گا۔“

میاں صاحب کی وہی حالت تھی۔

خالی خالی نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہے تھے۔ امی کمرے میں داخل ہوئیں تو ٹھٹک کر رہ گئیں۔ پھر انہوں نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔ ”ہرگز نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیا نہیں ہو سکتا؟“

”یہ شادی۔“

”کیوں؟“

”بیٹا! میں نے کہا نا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن امی کیوں نہیں ہو سکتی؟“

”اس لیے کہ یہی شخص تمہارا باپ ہے۔“ امی نے بتایا۔

☆☆☆

تو یہ تھی کہانی۔

میاں صاحب میرے باپ تھے۔ امی نے ان سے چھپ کر شادی کی تھی۔ گھر والوں کی مرضی کے بغیر۔۔۔ اور جب میں صرف دو سال کا تھا تو میاں صاحب نے امی کو طلاق دے دی تھی۔

اپنی پرانی عادت کے تحت۔

امی نے ان سے کوئی مراعات نہیں لی تھیں۔ وہ خاموشی سے مجھے لے کر شہر آگئیں اور میری پرورش کرتی رہیں۔

پتا نہیں، بعض کہانیاں اتنی پیچیدہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ امتحان ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

زیبی سے میری محبت کا اب دوسرا رخ ہو گیا ہے۔ وہ میری بہن ہے۔ میں نے اس کی شادی ایک شریف نوجوان سے کر دی ہے اور میری بیوی رخسانہ ہے۔۔۔۔ حمید کی بہن۔

میاں صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور زندگی بڑے امتحانوں سے گزرنے کے بعد رواں ہو چکی ہے۔

دائرے

کاشف زبیر

کہتے ہیں کہ جرم کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھانا مشکل ہوتا... اس کے بعد راستے کشادہ اور راہیں ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں... ایسے ہی چند آوارہ گرد منچلوں کے مشاغل جو اپنی اپنی پسند کی زندگی کے لیے ہر آرام و آسائش کا انتظام پلک جھپکتے میں چاہتے تھے... اُن کے خوابوں اور خواہشات کی تکمیل کا واحد ذریعہ جرم کے راستے تھے... جن پر نہ صرف وہ خود کاربند تھے... بلکہ دوسروں کے لیے بھی بانہیں واتھیں...

تلاطمِ ہستی میں بھٹکنے کے بعد بکھر جانے والوں کا خونی رنگ ماجرا

شارق اس منی بس کے ساتھ ایک طرف پہاڑ کے کنارے بنی حفاظتی دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا۔ بس کے اندر سے جمشید کے چلّانے کی آواز آرہی تھی۔ امیر خان اور حمزہ اس کے پاؤں میں لگی گولی نکال رہے تھے۔ شارق سے کچھ ہی دور بس کے دروازے کے ساتھ بختیار اور سلطان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر تشویش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہی دونوں اس واردات کے ماسٹر مائنڈ اور کرتا دھرتا تھے۔ دو گھنٹے پہلے اس خوب صورت بنگلے سے روانہ ہوئے تو وہاں چار عدد لاشیں موجود تھیں۔ مارے جانے والے تمام افراد بختیار اور سلطان کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ شارق کے خیال میں یہ قتل و غارت گری بلاوجہ تھی۔ وہ اس کے بغیر بھی کام چلا سکتے تھے۔ ویسے وہ قتل و غارت گری میں براہِ راست شریک نہیں تھا کیونکہ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا تھا لیکن بختیار کے مطابق یہ ضروری تھا۔

"اگر ہم انہیں چھوڑ دیتے تو اس وقت دارالحکومت کی مستعد پولیس ہمارے پیچھے لگی ہوتی۔"

"وہ تو اب آئے گی۔" جمشید کے زخم پر پٹی باندھتے ہوئے امیر خان نے تلخ لہجے میں کہا۔ جمشید مرنے والے ایک گارڈ کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ فائرنگ کا آغاز بھی اسی نے کیا تھا۔ وہ گارڈ کو مسلح دیکھ کر نروس ہوگیا اور گولی چلا دی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی چلائی ہوئی گولی گارڈ کو نہیں لگی اور گارڈ نے جوابی فائر کیا۔ گولی جمشید کے پاؤں میں اتر گئی۔ اس پر بختیار نے گارڈ کو شوٹ کر دیا۔ اس کے بعد جو سامنے آیا وہ مارا گیا۔ سب سے آخر میں انہوں نے بنگلے کے مالک ملک احسان شاہ کو گولی ماری حالانکہ اس نے غیر ملکی کرنسی سے بھرے دونوں سوٹ کیس نہایت شرافت سے ان کے حوالے کر دیے تھے۔

واردات کے دوران میں جمشید زخمی ہوگیا تھا۔ اس کی ہڈی بچ گئی تھی لیکن گولی گوشت میں پیوست تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح بس تک پہنچ گیا تھا لیکن اس کے بعد اس کی ہمت

اب دے گئی۔ اس واردات کی خبر عام ہونے سے پہلے وہ دارالحکومت کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ جمشید نے تکلیف کی وجہ سے چلّانا شروع کر دیا تھا۔ امیر خان نے بختیار سے کہا۔ "اسے دیکھنا ہوگا۔"

"ابھی ہم نہیں رک سکتے۔" وہ بولا۔ بس شارق چلا رہا تھا۔

"اس کی مرہم پٹی کے لیے سامان چاہیے۔"

"ابھی ہم نہیں رک سکتے۔" بختیار نے دوبارہ کرخت لہجے میں کہا۔

امیر خان، حمزہ صادق اور جمشید آپس میں دوست تھے۔ اسی طرح بختیار اور سلطان کے درمیان دوستی تھی۔ صرف شارق ان میں الگ تھلگ تھا۔ اس کا تعلق جرائم کی دنیا سے نہیں تھا لیکن وہ پیسے کمانے کی خاطر سلطان کے پاس آیا تھا۔ بختیار نے اسے ایسے ہی شامل نہیں کر لیا تھا، سلطان نے اس کی ضمانت لی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شارق بہت اچھا ڈرائیور ہے اور وہ ان کے کام آسکتا ہے۔ سلطان کے اعتماد کی وجہ یہ بھی تھی، شارق اس کا دور پرے کا رشتے دار بھی تھا۔ اسی نے شارق کی سفارش کی تھی۔ اس نے بختیار سے کہا۔ "وہ ضرورت مند بھی ہے اور قابلِ اعتماد بھی۔"

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"میرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور میں اس کا دور کا چاچا بھی لگتا ہوں۔" سلطان نے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

شارق شاہ پہاڑوں کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس زمین تھی لیکن سنبھالنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا اس لیے اس نے اپنی زمین بیدار خان کو ٹھیکے پر دے دی۔ وہ اس سے تمبا کو کی صورت سونا اگا نے لگا اور زمرد شاہ کو بس لگا بندھا ملتا۔ وہ اصل میں سیدھا آدمی تھا، لوگ اس کی سادگی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

چند سال بعد ہی بیدار خان نے اپنا کچا مکان پکا کرالیا پھر اس نے آس پاس کی زمین لے کر اسے بڑا کر لیا۔ اس کے گھر میں گاڑی آگئی اور آنگن میں گائیں بھینسیں بھی بندھ گئیں جبکہ زمرد شاہ کا گھرانا وہی فاقہ مست رہا۔ وہ بس زمین کا مالک تھا اور اس کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی۔ ٹھیکے پر زمین لینے والا یہاں مجبور تھا۔ اس کے پاس آبائی زمین نہیں تھی اور جن کے پاس تھی، وہ اسے بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ سیدوں کا گاؤں تھا اور ایک غیر تحریر شدہ قانون کے مطابق کہ زمین کسی غیر سید کو نہیں بیچی جا سکتی، اس لیے وہ مجبور تھا۔

بیدار خان بس ایک معاملے میں مار کھاتا تھا، شاہوں کی اس بستی میں اس کا کوئی مقام نہیں تھا۔ اس کا تعلق معمولی خاندان سے تھا۔ اس لیے یہاں نہ تو اسے زمین مل سکتی تھی اور نہ رشتہ... مگر جب اس کے پاس دولت آگئی تو اس نے کسی طرح کوشش کر کے ایک غریب سید زادے سے اس کی لڑکی کا رشتہ حاصل کر لیا اور چپکے سے شادی کر لی۔ اگر اعلانیہ کرتا تو گاؤں والے کبھی یہ شادی نہ ہونے دیتے۔ جب اس نے ولیمے کی دعوت کی تو سب خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بہر حال، اس نے کوئی غیر قانونی یا غیر شرعی کام نہیں کیا تھا اس لیے اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شارق اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اس نے کئی بار باپ سے کہا کہ وہ زمین کا ٹھیکا بڑھائے مگر صوفی منش زمرد شاہ خاموش رہتا۔ بیدار خان اسے وہی رقم دے رہا تھا جو آج سے دس سال پہلے دیتا تھا۔

زمرد شاہ نے بیٹے سے کہا کہ وہ تعلیم حاصل کرے اور اپنی زندگی خود بنائے۔ اسکول کی تعلیم مکمل کر کے وہ کالج میں پڑھنے کے لیے ایک نزدیکی شہر چلا گیا۔ اس نے گریجویشن وہیں سے کیا اور زمرد شاہ کی خواہش کے باوجود آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ "بابا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں خود زمین آباد کروں گا۔"

زمرد شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شارق پڑھ لکھ کر یہ کام کیسے کرے گا لیکن شارق نے کسی نہ کسی طرح اسے راضی کر لیا۔ زمرد شاہ نے بیدار خان سے کہہ دیا کہ زمین اب واپس کر دے، یہ اس کا آخری سال ہے۔ بیدار خان نے بہ ظاہر خوش دلی سے اقرار کر لیا کہ سال پورا ہوتے ہی وہ زمین واپس کر دے گا مگر اسے فکر لگ گئی۔ یہ زمین سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی اور اس علاقے میں اس سے اچھی زمین کسی کے پاس نہیں تھی۔ بیدار خان اسے کسی طرح حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس کے ہاتھ ایسا کوئی موقع ہی نہیں لگا۔ زمرد شاہ سادہ آدمی تھا لیکن شارق نئے زمانے کا پڑھا لکھا اور ذہین نوجوان تھا۔ اسے آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

بیدار خان کی ایک ہی لڑکی تھی۔ حالانکہ اس نے بعد میں دوسری شادی بھی کی تھی لڑکے کے لیے مگر اس کے نصیب میں مزید اولاد ہی نہیں تھی۔ رابینہ خان اپنے اکلوتے ہونے کا پورا فائدہ اٹھاتی۔ اس نے پہلے اسکول تک پڑھا پھر کالج میں پڑھنے کی ضد کی لیکن بیدار خان نے زندگی میں پہلی بار بیٹی کو

سختی سے انکار کر دیا۔ جب اس نے زیادہ رونا دھونا کیا تو بیدار خان نے اسے پرائیویٹ پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس سے پڑھتی؟ ایسے میں بیدار خان کو شارق کا خیال آیا۔ اس خیال کے پیچھے کوئی منصوبہ تھا یا نہیں لیکن یہ خیال بیدار خان کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ اس نے شارق سے درخواست کی کہ وہ رابینہ کو پڑھا دیا کرے۔ شارق نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

رابینہ تقریباً سترہ سال کی بہت خوب صورت لیکن اپنے نقوش اور صحت سے عمر سے بڑی نظر آنے والی لڑکی تھی۔ اپنے باپ کی طرح تیز طرار اور شوخ وشنگ بھی تھی۔ اس میں کروفر نہیں تھا جو دولت کے ساتھ خود بہ خود آجاتا ہے لیکن اپنے انداز اور اطوار سے وہ گاؤں کی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ جدید انداز میں تراشے ہوئے سرمئی مائل بھورے بال، سیاہ آنکھیں اور اس پر سرخ وسفید رنگت اور دلکش نقوش نے اسے سحر انگیز حسن کا مالک بنا دیا تھا۔ شارق اسے دیکھ کر حیران ہوا اور پھر متاثر بھی ہوا۔ اس جیسے نوجوان کے لیے رابینہ جیسی لڑکی سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ ان کے معاشرے میں مرد وعورت میں اختلاط عام نہیں ہے لڑکے عام طور سے اپنی کزنز سے بھی فری نہیں ہوتے۔ کسی غیر لڑکی سے میل ملاقات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شرعی پردہ بھی ہوتا ہے لیکن غیر مردوں سے بات اور ملاقات کا پردہ تو لازمی کیا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے ایک ساتھ ہونے کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا... اور وہی نکلا۔

شارق اور رابینہ آپس میں محبت کرنے لگے اور یہ بات ان کے بڑوں سے بھی زیادہ دن چھپی نہیں رہی۔ شارق نے ماں باپ سے کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف رابینہ سے اور وہ اس کا رشتہ بیدار خان کے گھر لے جانے پر راضی ہو گئے۔ لیکن بیدار خان نے رشتہ قبول کرنے کی ایسی شرط ان کے سامنے رکھ دی جس کا ماننا بہت ہی مشکل تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہماری ہاں رسم میں لڑکی کی قیمت لی جاتی ہے۔ تم لوگوں کو بھی رابینہ کی قیمت دینی ہوگی۔''

زمرد شاہ حیران ہوا کیونکہ ان کے رواج میں تو لڑکیوں کو جہیز دیا جاتا تھا، ان کی قیمت لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اگر تمہارا رواج ایسا ہے تو میں اپنے بیٹے کی مراد پوری کرنے کے لیے رابینہ کی قیمت دوں گا۔ کیا مانگتے ہو اپنی لڑکی کی قیمت؟''

''تمہاری زمین۔'' بیدار خان نے کہا تو زمرد شاہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''تب یہ رشتہ بھی نہیں ہو سکتا۔'' بیدار خان نے بے پروائی سے کہا۔ زمرد شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بیدار خان! تم جانتے ہو یہاں کوئی غیر سید زمین نہیں لے سکتا۔''

''بیدار خان سب کر سکتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہاں تو کوئی سید زادی سے شادی بھی نہیں کر سکتا... پر بیدار خان نے کی ہے۔ پھر یہ میرا اور تمہارا معاملہ ہے، کسی کو خبر ہی نہیں ہوگی۔''

زمرد شاہ کی بیوی نے مخالفت کی۔ اگر وہ زمین بیدار خان کو دے دیتے تو خود کہاں سے گزارہ کرتے۔ شارق کو پتا چلا تو وہ بپھر گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بیدار خان اتنا بے غیرت ثابت ہوگا۔ اس نے رابینہ سے رابطہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ رابینہ باپ کی مخالفت کرے گی لیکن خلاف توقع رابینہ نے اس معاملے میں دخل دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''بابا میری اور تمہاری شادی کے لیے مان گیا ہے، اب وہ کوئی شرط رکھ رہا ہے تو تم پوری کر دو۔''

''وہ ہماری زمین مانگ رہا ہے۔''

''تو بدلے میں اپنی بیٹی بھی تو دے رہا ہے۔'' رابینہ نے کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' شارق بولا۔ ''ہمارے ہاں کوئی زمین نہیں بیچتا... چاہے وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو۔ زمین عزت ہوتی ہے۔''

''میں بھی کسی کی عزت ہوں۔'' رابینہ تنک کر بولی۔ ''میرے اور تمہارے حوالے سے گاؤں میں کیسی کیسی باتیں ہو رہی ہیں، کیا میری کوئی عزت نہیں ہے؟ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو سوچو لوگ کیا کہیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' شارق کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ''مگر تم سوچو کہ ہم زمین دے دیں گے تو پھر ہم کیا کریں گے؟''

''سنو، بابا اس رشتے پر اسی لیے راضی ہوئے ہیں۔'' رابینہ نے آہستہ سے کہا۔ ''ورنہ میرے اور بھی بہت رشتے آرہے ہیں اور وہ بابا کو منہ مانگی رقم دینے کو بھی تیار ہیں۔ مگر بابا میری وجہ سے پہلے تمہیں موقع دے رہے ہیں، صرف میری ضد پر...''

''لیکن زمین...''

رابینہ جھنجلا گئی۔ ''شارق! تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ دیکھو، تم زمین بابا کو دو گے لیکن بابا کا سب کچھ میرا ہے اور میرا سب کچھ میرے شوہر کا ہوگا۔''

شارق کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے باپ سے بھی

بات کی تو اس نے کہا۔ ''بیٹا جی، یہ ٹھیک ہے کہ سب کچھ تمہارا ہوگا لیکن اس وقت جب بیدار خان نہیں ہوگا۔ اب اس کی مرضی کہ اپنے مرنے سے پہلے اس دولت اور جائداد کا کچھ بھی کرے۔''

''وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' شارق نے یقین سے کہا۔ ''وہ رابینہ سے بہت محبت کرتا ہے اور اگر ہم مشکل میں ہوں گے تو یہ مشکل رابینہ کو بھی برداشت کرنا پڑے گی۔''

زمرد شاہ اور اس کی بیوی تیار نہیں تھے لیکن شارق رابینہ کے لیے کچھ ایسا پاگل ہوا تھا کہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے پر تل گیا تھا۔ ان میاں بیوی کی کمزوری یہ تھی کہ وہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا اور جب شارق نے دھمکی دی کہ وہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلا جائے گا اور پھر کبھی انہیں اپنی صورت نہیں دکھائے گا تو مجبوراً انہیں ماننا پڑا۔ رشتے کے بدلے زمرد شاہ نے اپنی آبائی زمین بیدار خان کے حوالے کر دی۔ ادھر نکاح نامے پر سائن ہوئے اور اُدھر زمرد شاہ نے زمین کے انتقال کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ وہ دکھی تھا اور اس کی بیوی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ صرف شارق خوش تھا جس کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی۔ وہ بالآخر رابینہ کو بیاہ کر گھر لے آیا تھا۔

رابینہ جس طرح آئی تھی، اس کے بعد اسے خوش آمدید کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور سے شارق کی ماں اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ رابینہ کو بھی اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھی۔ اسے شارق مل گیا تھا اور مالی ضروریات اس کا باپ پوری کر دیتا تھا، اسے اور کیا چاہیے تھا۔ شادی کے ابتدائی دن تو شارق فارغ رہا لیکن پھر اس نے ماں باپ کے طعنے دینے پر اڈے پر ڈرائیوری شروع کر دی۔ ڈرائیونگ ویسے تو اس علاقے کا ہنر تھی۔ ہر شخص ڈرائیونگ جانتا تھا اور اکثر تو اسی سے روزی کماتے تھے۔ شارق کے کزنز کے پاس گاڑیاں تھیں۔ اس نے صرف بارہ سال کی عمر میں ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور دشوار گزار پہاڑی راستوں پر بھی پورے اعتماد سے گاڑی چلا لیتا تھا۔ اس نے چھوٹی سی کار سے لے کر بڑے ٹرک تک چلائے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے لائسنس بھی بنوا لیا تھا۔

روزگار کے لیے وہ شہر سے علاقے تک آنے والی وین چلانے لگا۔ یہ ڈیوٹی سخت تھی۔ چھ گھنٹے کی مستقل یک طرفہ... ڈرائیونگ تھی اور آنے جانے میں بارہ گھنٹے لگتے تھے۔ شہر میں وین صرف ایک گھنٹا رکتی تھی جس میں وہ آرام کرتا اور کھانا کھاتا تھا۔ اڈے سے ایک گھنٹے کا گاؤں کا سفر تھا۔ وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا تو اس کی واپسی رات آٹھ بجے ہوتی۔ وہ تھکن سے چُور ہو جاتا مگر رابینہ کو بھی وقت دینا پڑتا۔ رابینہ کا یہ حال تھا کہ وہ صبح اٹھ کر ناشتا بھی اپنے باپ کے گھر جا کر کرتی اور پھر وہاں سے رات کا کھانا کھا کر اور شارق کے لیے لے کر آتی تھی۔ گھر میں وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ شارق ناشتا اڈے پر کرتا اور دوپہر کا کھانا پنڈی میں کھاتا۔ ماں نے دو تین بار رابینہ کی شکایت کی کہ وہ سارا دن ماں باپ کے گھر رہتی ہے تو شارق نے ماں سے کہا کہ وہ خود اس سے بات نہیں کرتی ہیں تو وہ یہاں رہ کر کیا کرے گی۔ ماں نے تنک کر کہا۔ ''یہ اس کا گھر ہے عورت گھر میں کیا کرتی ہے۔''

ماں کے مجبور کرنے پر شارق نے رابینہ سے کہا کہ وہ گھر میں رہا کرے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''مجھ سے تمہاری ماں کی بنی ہوئی صورت نہیں دیکھی جاتی۔''

شارق کو غصہ آگیا۔ ''رابینہ! یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو، وہ میری ماں ہے۔''

''ہاں، تمہاری ماں ہے لیکن میری تو ساس بھی نہیں ہے۔ وہ مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی ہیں۔ شکر کرو، میں تم سے الگ ہونے کا نہیں کہہ رہی ہوں، اپنے ماں باپ کے گھر جا کر کچھ اچھا وقت گزار لیتی ہوں ورنہ یہاں تو سارا دن گھٹ گھٹ کر پاگل ہو جاؤں۔''

شارق عام سا مرد تھا۔ وہ ماں کی بات سنتا تو اسے وہ صحیح لگتی اور جب بیوی کی سنتا تو وہ اسے ٹھیک لگتی۔ وہ سارا دن کام کے بعد تھکا ہارا آتا تو گھر میں یہ جھگڑے اس کا استقبال کرتے۔ اس کام میں آمدنی اچھی تھی ورنہ یہاں روزگار کہاں تھا۔ گاڑی بھی اس کے رشتے کے چچا کی تھی، اس وجہ سے اسے زیادہ تنخواہ مل جاتی تھی۔ زمرد شاہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کا گھر خرابی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ دونوں طرف سے پس رہا تھا اور اوپر سے روزگار کے لیے ہمت سے بڑھ کر محنت کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے بیٹے کو مشورہ دیا۔

''شارق! اپنے سسر سے بات کر اور اس سے زمین پٹے پر مانگ لے۔ تو جتنی محنت اس کام میں کر رہا ہے، اس سے آدھی زمین پر کرے گا تو اس سے دس گنا زیادہ کما لے گا۔''

''بابا! زمین تو وہ خود کاشت کرتا ہے۔''

''اس نے بہت کما لیا ہے اور تیرا بھی حق بنتا ہے۔ تُو کمائے گا تو اس کی بیٹی خوش رہے گی۔''

شارق سوچ میں پڑ گیا۔ زمین پر کام کرنا اس کی پرانی خواہش تھی۔ اس نے پہلے رابینہ سے مشورہ کیا، وہ خوش ہو

گئی۔ ’’میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی۔ اتنی محنت کرتے ہو اور ملتا کیا ہے، صرف پندرہ ہزار روپے۔‘‘

’’پر تیرا ابا بابا مان جائے گا؟ وہ اس زمین پر خود کاشت کرتا ہے۔‘‘

رابینہ سوچ میں پڑ گئی۔ ’’زمین تو نہیں دے گا، پر تمہیں شریک کرلے گا۔ تم محنت کرو گے اور آمدنی میں اپنا حصہ لو گے۔‘‘

شارق نے یہی سوچ کر بیدار خان سے بات کی اور خلافِ توقع وہ فوراً مان گیا۔ ’’میں خود تجھ سے یہ بات کرنے کا سوچ رہا تھا۔ ویسے بھی زمین تجھے اور رابینہ کو ملے گی۔ ابھی سے اسے سنبھال لے۔ آمدنی آدھی آدھی کرلیں گے۔‘‘

’’میرا تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔‘‘ شارق نے خوش ہو کر کہا۔ ’’گھر سے پندرہ گھنٹے دور رہنا بہت مشکل ہے۔‘‘

’’پر میری ایک شرط ہے۔‘‘ بیدار خان نے کہا۔

شارق چونکا۔ ’’کیسی شرط چاچا؟‘‘

’’تُو اور رابینہ یہاں میرے پاس آکر رہو۔‘‘ بیدار خان نے کہا۔ ’’تم جانتے ہو، وہ سہولتوں میں پلی ہے اور تمہارے گھر میں اسے کوئی سہولت نہیں ملی ہے اس لیے.....‘‘

’’بس چاچا۔‘‘ شارق کھڑا ہو گیا۔ ’’اب یہ بات دوبارہ مت کہنا۔ میں بے غیرت نہیں ہوں جو سسرال میں رہوں۔‘‘

’’اچھا، سسر کی زمین میں شراکت کی خواہش ضرور کرتے ہو۔‘‘ بیدار خان نے طنز کیا۔ ’’لیکن سسرال میں رہنے سے غیرت آرہی ہے۔‘‘

’’کیونکہ وہ زمین میری ہی تھی۔‘‘

’’تھی... اب نہیں ہے۔‘‘ بیدار خان نے کہا۔ ’’اگر تمہیں اس زمین میں اپنا حصہ چاہیے تو میری بات ماننا ہو گی۔‘‘

’’اوّل تو میں بے غیرت نہیں ہوں، دوسرے میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔‘‘

’’مرضی تمہاری... کرتے رہو ڈرائیوری۔‘‘ بیدار خان نے بے پروائی سے کہا۔ شارق غصے میں بل کھاتا واپس گھر آگیا۔ اس نے پہلے رابینہ کو اس بارے میں بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی تائید کرے گی مگر خلافِ توقع رابینہ نے کہا۔

’’تو بابا نے کچھ غلط تو نہیں کہا ہے۔‘‘

شارق اچھل پڑا۔ ’’غلط نہیں کہا ہے؟ میں گھر داماد بن جاؤں اور سب کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں؟‘‘

’’جب تم بابا کے ساتھ زمین میں شریک ہو سکتے ہو تو اس کے گھر میں کیوں نہیں رہ سکتے؟‘‘ رابینہ نے بھی بیدار خان والی بات کی تو شارق چونک گیا۔

’’اچھا، تو یہ منصوبہ تم سب نے مل کر بنایا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ دوں اور گھر داماد بن جاؤں۔‘‘

’’اگر بنایا بھی ہے تو کیا بُرا کیا ہے؟‘‘ رابینہ جارحانہ انداز میں بولی۔ ’’یہاں کیا ہے؟ میں نے ناز و نعم میں پرورش پائی ہے۔ میں ان مشکلات کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔‘‘

’’تب تم شوق سے اپنے ماں باپ کے گھر جا کر رہو لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گا۔‘‘ شارق نے یہ بات غصے میں کہی تھی لیکن اس وقت وہ دم بہ خود رہ گیا جب اگلے روز رابینہ نے اپنا سامان سمیٹا اور گھر سے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ شارق نے اور زمرد شاہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ فیصلہ کر چکی تھی بلکہ شاید پہلے ہی فیصلہ کرلیا تھا اور عمل درآمد کا موقع اب ملا تھا۔ شارق دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد ثالثی کی کئی کوششیں کی گئیں جو بیدار خان نے چالاکی سے ناکام بنا دیں۔ رابینہ اس کے ہاتھوں میں کھیلی ہوئی تھی اور اب بھی اس کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔ چالاک بیدار خان اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ حالات اس نہج پر پہنچا دیے جہاں شارق کے پاس سوائے طلاق کے کوئی اور راستہ نہیں بچا مگر زمرد شاہ اور اس کی بیوی نے شارق کو طلاق سے روک دیا۔

’’بیٹا، آج تک ہمارے ہاں کسی مرد نے یہ ذلت نہیں اٹھائی ہے۔ تُو طلاق نہ دے، بس اسے ایسے ہی چھوڑ دے۔‘‘

شارق نے محسوس کیا کہ اگر وہ گاؤں میں رہا تو خود پر قابو نہیں رکھ سکے گا اور کسی دن رابینہ یا بیدار خان کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کر دے گا۔ اس کے جسم میں بھی گرم قبائلی خون تھا مگر تعلیم نے اس خون کی گرمی کو قابو میں کیا ہوا تھا، ختم نہیں کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور پنڈی چلا آیا۔ اس نے ماں باپ سے تو نہیں کہا لیکن اس کے اندر شرمندگی موجود تھی۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت فیصلہ کیا کہ وہ اب گھر اسی صورت میں آئے گا جب اس کے پاس اتنی رقم ہو کہ وہ اپنے باپ کی زمین منہ مانگے داموں دے کر واپس حاصل کر سکے۔ پنڈی میں وہ اپنے دور کے رشتے دار سلطان کے پاس آیا تھا جو مستقل پنڈی میں رہتا تھا اور گاؤں والوں کو علم نہیں تھا کہ اس کا ذریعۂ روزگار کیا ہے.... مگر وہ جب گاؤں آتا تو بڑی

فراخ دلی سے نوٹ خرچ کرتا۔ اس نے اپنا گھر بڑا شان دار بنوالیا تھا اور زمین کو پٹے پر دینے کے بجائے اس نے اس میں خوبانی، سیب اور آڑو کا باغ لگا لیا تھا۔ باغ کی دیکھ بھال اس کے ملازم کرتے تھے۔

سلطان ان دنوں گاؤں آیا ہوا تھا جب رابینہ اور اس میں ثالثی کا معاملہ چل رہا تھا۔ سلطان نے اس سے کہا۔ ’’تم کیا کر رہے ہو؟‘‘

شارق نے بتایا۔ ’’شہر جانے والی وین چلا رہا ہوں۔‘‘

سلطان نے منہ بنا کر کہا۔ ’’تم بھی اپنے باپ کی طرح سادہ ہو۔ آج کل دور ہی نوٹوں کا ہے۔ جس کے پاس نوٹ ہیں، اس کے پاس سب کچھ ہے اور جس کے پاس نوٹ نہیں ہیں، اس کے پاس سمجھو کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

’’میں صرف ڈرائیوری کر سکتا ہوں۔ اب تو ہمارے پاس زمین بھی نہیں رہی ہے۔‘‘

’’ضروری نہیں ہے کہ آدمی زمین سے کمائے۔ کمانے کے دس طریقے ہیں، بس آدمی میں ہمت ہونی چاہیے۔‘‘

’’ہمت میرے پاس ہے۔‘‘

’’تب میرے پاس آجاؤ۔‘‘

جب اس نے محسوس کیا کہ اسے گاؤں سے چلے جانا چاہیے تو اسے سلطان کی پیش کش کا خیال آیا۔ وہ ماں باپ سے اجازت لے کر شہر آگیا۔ سلطان اسے دیکھ کر خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ ’’بہت اچھے وقت پر آئے ہو، میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔ ایک کام آیا ہے۔‘‘

’’کام۔‘‘ شارق خوش ہو گیا۔ ’’میں کام کے لیے تو آیا ہوں... آپ نے کہا تھا کہ مجھے کام.....‘‘

’’مجھے یاد ہے۔‘‘ سلطان نے اس کی بات کاٹی۔ ’’کام ہے اور اس میں کمائی بھی بہت ہے، پر تمہیں دل مضبوط کرنا پڑے گا... اس لیے سوچ لو۔‘‘

’’آپ آزما لینا۔‘‘ شارق نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’دولت کمانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے ہر قیمت پر اپنے باپ کی زمین واپس حاصل کرنی ہے۔‘‘

’’میں نے سنا تھا اور مجھے افسوس ہوا۔ ایک غیر پہلی بار ہمارے علاقے میں زمین کا مالک بنا ہے مگر تم نے اس کی لڑکی سے شادی کر کے اچھا کیا۔ بڈھا پندرہ بیس سال اور جیے گا، اس کے بعد یہ زمین تمہیں اور تمہاری اولاد کو ملے گی۔‘‘

’’وہ معاملہ تقریباً ختم ہو گیا۔‘‘ شارق نے کہا اور پھر سلطان کو سب بتا دیا۔ چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ سلطان گاؤں کا ایک چکر لگاتا اور اسے سب پتا چل جاتا۔ وہاں جو بات گھر سے باہر ایک بندے کو معلوم ہو، وہ بالآخر سب کے علم میں آجاتی تھی۔ سلطان سنجیدہ ہو گیا۔

’’تب تمہیں واقعی منہ مانگی قیمت دینا ہو گی۔‘‘

’’اسی لیے میں بہت ساری دولت کمانا چاہتا ہوں۔‘‘

سلطان نے اسے بتایا نہیں کہ کام کیا ہے لیکن شارق ذہنی طور پر تیار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کل سیدھے اور صاف کاموں میں نوٹ نہیں ملتے۔ دولت ہمیشہ دو نمبر کاموں سے آتی ہے۔ گاؤں میں سلطان کے لیے مشہور تھا کہ وہ اسمگلنگ کرتا ہے۔ جب اس نے شارق کو پیش کش کی تو اسے خیال آیا کہ وہ اسے اپنے کام میں شامل کرنا چاہ رہا ہے۔ اس لیے جب سلطان نے اسے بتایا کہ انہیں ایک آرمرڈ وین لوٹنی ہے تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ ’’سلطان بھائی! یہ تو جرم ہے۔‘‘

’’تو دولت انہی کاموں میں تو ہے۔ تم کیا سوچ کر آئے تھے کہ کوئی بس یا ٹرک چلانا ہے؟‘‘ سلطان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’اس میں تمہیں کیا ملے گا، زیادہ سے زیادہ پچیس تیس ہزار روپے ماہوار۔ یہاں تمہیں صرف چند گھنٹے کے کام کے لاکھوں مل رہے ہیں۔‘‘

شارق اس کام کے لیے تیار نہیں تھا۔ سلطان نے اسے دھمکی دی کہ اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ دوسری صورت میں اس کا وجود دنیا سے یوں مٹ جائے گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ مجبوراً شارق کو اس کی بات ماننا پڑی۔ آرمرڈ وین کیش لے کر دارالحکومت سے آس پاس کے چھوٹے شہروں میں جاتی تھی۔ بختیار اور سلطان نے اس کے روٹ اور اوقات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ شارق سمیت وہ چھ افراد تھے جنہیں اس ڈکیتی میں حصہ لینا تھا۔ جب شارق نے اس منصوبے کے بارے میں سنا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی انگریزی فلم کے بارے میں سن رہا ہے جس میں ڈکیتی کا منصوبہ بنایا گیا ہو۔

انہوں نے راستے میں ایک سنسان مقام پر گھات لگائی اور آرمرڈ وین کو ایک چھوٹا سا دھوئیں کا بم بلاسٹ کر کے روک لیا۔ جیسے ہی آرمرڈ وین رکی، انہوں نے اس کے پہیوں میں وہ بریکر لگا دیے جو باہر ممالک میں پولیس غلط پارک ہونے والی گاڑیوں کو لگا دیتی ہے اور اس کے بعد گاڑی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک پمپ سے وین کے عقبی حصے میں موجود چھوٹے سے سوراخ کی جالی سے اندر پیٹرول ڈالا اور اندر موجود گارڈز کو

دھمکی دی کہ وہ باہر نہیں آئے تو وہ پیٹرول کو آگ دکھا دیں گے۔ ظاہر ہے، گارڈز یوں بے بسی سے جل کر مرنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں انہوں نے رقم کے بکس اپنی گاڑی میں منتقل کیے۔ ڈرائیور اور گارڈز کو بے بس کر کے گاڑی کے عقبی حصے میں بند کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ جب تک پولیس کو خبر ہوئی، وہ واپس شہر آ چکے تھے۔

اس واردات میں ان کے ہاتھ ایک کروڑ کی رقم لگی تھی لیکن فی الحال ان سب کو دو دو لاکھ روپے ہی دیے گئے۔ شارق وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جسے انہوں نے چرایا تھا اور اس کی نمبر پلیٹ بھی بدل دی تھی۔ شارق زندگی میں پہلی بار کوئی جرم کر رہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ پکڑے نہ جائیں لیکن کچھ نہیں ہوا اور وہ بہ حفاظت اپنے ٹھکانے تک پہنچ گئے۔ اس کامیابی کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا۔ موقع ملتے ہی اس نے تنہائی میں سلطان سے کہا۔ ”اب میں تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔“

سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بیٹے، اب تم ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ تم بختیار کو نہیں جانتے ہو۔ وہ نہ صرف تمہیں بلکہ گاؤں میں تمہارے گھر والوں کو بھی مار سکتا ہے۔“

شارق خوف زدہ ہو گیا۔ ”میرے گھر والوں کا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”دوسرے تم بھول رہے ہو، پولیس کو آرمرڈ وین لوٹنے والوں کی تلاش ہے۔ میں، بختیار اور دوسرے سب پولیس سے چھپ سکتے ہیں۔ ہمارا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے لیکن تم کہاں چھپو گے؟ اور اگر چھپ بھی گئے تو پولیس گاؤں سے تمہارے بوڑھے ماں باپ کو پکڑ لائے گی۔“

شارق اپنے ماں باپ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس نے پہلے ہی انہیں بڑے دکھ دیے تھے اور اب اس بڑھاپے میں انہیں یوں ذلت نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان اسے سمجھاتا اور دھمکاتا رہا۔ اس نے شارق کو لالچ دیا کہ پہلی واردات سے انہیں کچھ نہیں ملا ہے لیکن دوسری واردات سے اس کے حصے میں کم سے کم پچاس لاکھ روپے آئیں گے۔ اس رقم سے وہ اپنی آبائی زمین کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ زمین خرید سکتا تھا۔ بہرحال سلطان نے اسے راضی کر لیا اور وہ دوسری واردات کے لیے... ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو گیا۔ شارق کے لیے تو دو لاکھ کی رقم بھی بہت تھی۔ جب سلطان نے پچاس لاکھ کی بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔

”سچ مچ پچاس لاکھ روپے... ؟“

سلطان نے سر ہلایا۔ ”اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کرنی۔ تم میرے گاؤں سے تعلق رکھتے ہو اس لیے تمہیں بتا دی۔“

”کام کیا ہے؟“ شارق نے فکرمندی سے کہا۔

”ابھی اس بارے میں نہیں بتا سکتے، رازداری کی بات ہے۔ اگر کوئی غدار نکل آیا تو سب مارے جائیں گے اس لیے منصوبہ عین موقع پر بتایا جائے گا اور اس کے بعد کسی کو کہیں جانے یا کسی سے رابطے کی اجازت نہیں ہوگی۔ سب کے موبائل بھی نہ لے لیے جائیں گے۔“

شارق نے بظاہر کچھ نہیں کہا لیکن اندر سے وہ پریشان ہو گیا۔ آرمرڈ وین کو لوٹنا آسان کام ثابت ہوا تھا لیکن کوئی انہونی ہو جاتی تو وہ پکڑے بھی جا سکتے تھے۔ جیل جاتے یا پولیس مقابلے میں مارے جاتے۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے سلطان کے پاس آنے کا سوچا تھا۔ وہ پنڈی میں سلطان کے گھر میں مقیم تھا۔ گاؤں کے ٹھاٹ باٹ کے برعکس سلطان پنڈی کی ایک متوسط آبادی میں ایک چھوٹے سے تین کمروں کے لیکن صاف ستھرے مکان میں مقیم تھا۔ یہاں ضرورت کا ہر سامان تھا مگر سامان پُرتعیش نہیں تھا... آمد و رفت کے لیے سلطان نے مکان کی طرح گاڑی بھی پرانی اور سادہ رکھی تھی۔ کھانا وہ تینوں ٹائم ایک نزدیکی ہوٹل میں کھاتا تھا۔ صاف ظاہر تھا، یہ اس کا عارضی ٹھکانا ہے۔ جب اسے دو لاکھ ملے تو وہ شہر آنے کے بعد پہلی بار گاؤں واپس گیا اور اس نے یہ دو لاکھ کی رقم چپکے سے باپ کو دی۔

”بابا! اس کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلے۔“ زمرد شاہ حیران تھا کہ شارق نے صرف دو مہینے میں دو لاکھ روپے کہاں سے کما لیے تھے؟ مگر شارق نے اسے کسی طرح مطمئن کر دیا۔ زمرد شاہ سادہ آدمی تھا، آسانی سے اس کی باتوں میں آ گیا۔ شارق بھی مطمئن تھا، دو لاکھ خاصی بڑی رقم تھی اگر وہ واپس نہ آتا کیونکہ سلطان نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس میں خطرہ ہے اور وہ دیکھ بھی چکا تھا کہ خطرہ ہے، یہ دو لاکھ روپے اس کے بوڑھے ماں باپ کو کچھ عرصے سہارا دے سکتے تھے۔ اس نے رابینہ سے ملنے یا اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ گاؤں میں کسی کے گھر نہیں گیا۔ ایک دن گیا، سارا دن ماں باپ کے پاس رہا اور اس سے اگلے دن صبح سویرے واپس پنڈی آ گیا۔

سلطان اس کا رشتے دار تھا اور وہ بھی شارق کے لیے خاصا پُراسرار تھا لیکن بختیار کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ پُراسرار تھی۔ خود سلطان اس سے بہت قریب ہونے کے باوجود

بختیار کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بختیار بہت ذہین ہے۔ اس میں شیطانی ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ جرائم کے منصوبے یوں بناتا تھا کہ اس میں معمولی سے معمولی جزئیات کا بھی پورا خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے منصوبے کبھی ناکام نہیں ہوتے تھے۔ سلطان کی طرح وہ بھی اکیلا تھا اور سیٹلائٹ ٹاؤن پنڈی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے جرم کی دنیا سے بہت کمایا تھا لیکن بہ ظاہر وہ ایک کم حیثیت آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ آنکھوں کا رنگ ہلکا شربتی تھا اور تیکھی ناک اس کے مضبوط ارادوں کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کا چہرہ عام طور سے سپاٹ ہی رہتا تھا۔

شہر واپسی کے تیسرے دن سلطان اسے بختیار کے پاس لے گیا اور اس نے شارق کو ایک مائکرو بس دکھائی۔ یہ بالکل نئی تھی اور دس ہزار کلومیٹرز بھی نہیں چلی تھی۔ اندر سے یہ بہت آراستہ تھی۔ اس میں عام چھوٹی نشستوں کے بجائے لگژری نشستیں لگی تھیں۔ راہداری کے دونوں طرف بس ایک ایک نشست تھی۔ عقبی حصے میں سیٹ کے بجائے چھوٹا سا کچن تھا جس میں کھانا بنانے اور گرم کرنے کے تمام انتظامات تھے۔ سوائے ونڈ اسکرین کے بس کے تمام شیشے سیاہ تھے اور ان پر پردے بھی تھے جو ذرا سے اشارے پر سرک جاتے تھے۔ ونڈ اسکرین کا نچلا حصہ سیاہ تھا، اس میں سے ڈرائیور تو دیکھ سکتا تھا لیکن کوئی باہر سے دیکھتا تو اسے زیادہ سے زیادہ ڈرائیور ہی دکھائی دیتا۔ یہ سارا اہتمام اس لیے تھا کہ کوئی مائکرو بس کے اندر نہ دیکھ سکے۔

”کیسی ہے؟“ بختیار نے پوچھا۔

”شان دار۔“ شارق نے جواب دیا۔ اسے یہ گاڑی نظر میں بھا گئی تھی۔ ”آپ نے خریدی ہے؟“

”ہاں، ویسے تو اس کی قیمت پچاس لاکھ سے زیادہ ہے لیکن مجھے چالیس میں مل گئی۔“ بختیار نے سر ہلایا۔ ”اب تمہیں ایک ہفتے کے اندر اس کی ڈرائیونگ میں ایسی مہارت حاصل کرنی ہے کہ اسے پہاڑ پر چڑھانا پڑے تو وہاں بھی لے جاؤ۔“

”میرے لیے تو یہ کھلونا ہے جناب۔“ شارق بولا۔

”تم نے میری بات پر غور نہیں کیا۔“ بختیار نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اسے سڑک پر نہیں چلانا ہے، جنگلوں اور پہاڑوں سے گزارنا ہے۔“

”میں اسے سمجھا دوں گا۔“ سلطان نے مداخلت کی۔ ”میں اسے سائٹس پر بھی خود لے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر تم لوگ کل سے شروع کر دو۔“

مائکرو بس ایک احاطے میں کھڑی تھی۔ یہاں صرف ایک چوکیدار تھا جو ایک کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا اور وہ جس طرح بختیار کے آگے پیچھے گھوم رہا تھا، اس سے لگتا تھا کہ وہ اس کا زرخرید غلام ہے۔ شارق کو مائکرو بس یہیں ملتی۔ اگلے دن وہ سلطان کے ساتھ وہاں پہنچا اور وہ گاڑی لے کر نکل گئے۔ سلطان اسے دارالحکومت کے پاس پہاڑوں میں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں دور تک کوئی نہیں تھا اور شارق کچے ناہموار راستوں پر گاڑی چلانے کا تجربہ کرتا رہا۔ مائکرو وین نئی تھی اور اس میں خاص طور سے ایسے ٹائر لگوائے گئے تھے جو کچی اور پتھریلی زمین پر چلنے کے لیے موزوں ہوں۔ اس کا طاقتور ڈیزل انجن اسے مشکل ترین راستوں اور چالیس درجے زاویے کی چڑھائی پر بھی لے جاتا تھا۔

اس دن شارق نے جانا کہ اصل میں ڈرائیونگ کسے کہتے ہیں اور وہ اب تک جو کرتا آیا تھا، وہ تو بچوں کا کھیل تھا۔ شام کو جب وہ واپس آیا تو اسے لگا جیسے وہ ایک ہفتے سے مسلسل گاڑی چلا رہا ہو۔ ایک بڑی گاڑی کو اس طرح چلانا نہایت دشوار اور خطرے والا کام تھا لیکن کام تو کرنا تھا۔ ایک ہفتے تک وہ روزانہ سلطان کے ساتھ جاتا اور شام کو واپسی ہوتی۔ وہ روزانہ چھ گھنٹے ڈرائیونگ کرتا۔ اس ڈرائیو کے دوران میں گاڑی کی رفتار شاذ ہی بیس کلومیٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے اوپر جاتی۔ اس کے باوجود یہ حال تھا کہ گاڑی کا ٹینک پورا خالی ہو جاتا اور وہ جو اضافی ڈیزل کین میں لے کر جاتے، وہ بھی استعمال ہو جاتا۔

شارق، سلطان اور بختیار کے حکم پر یہ سب کر رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قسم کی تیاری کیوں کر رہے ہیں؟ کیا انہیں واردات کرنے کہیں دور جانا تھا؟ وہ مجبوراً اس کام میں شامل ہو گیا تھا لیکن اب اسے مکمل طور پر ان کا ساتھ دینا تھا کیونکہ ان کی ناکامی کا مطلب اس کی ناکامی بھی ہوتی۔ وہ پکڑے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جب وہ گاؤں سے واپس آیا تو اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا حلیہ تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے شیو کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس کے بال ویسے ہی لمبے ہو رہے تھے۔ گول ٹوپی اور سن گلاسز لگا کر وہ اپنے اصل حلیے سے پچاس فیصد مختلف نظر آنے لگا تھا۔ اس کا اپنا رنگ سرخ و سفید تھا لیکن داڑھی کے سیاہ بالوں کی وجہ سے وہ سانولا نظر آتا تھا۔ ایک

مہینے کے اندر وہ بالکل بدل گیا تھا۔ بالآخر بختیار نے بتایا کہ منصوبے پر عمل کا وقت آگیا ہے۔

☆☆☆

جمشید کی آوازیں اب رک گئی تھیں۔ وہ شاید بے ہوش ہوگیا تھا یا گولی نکل جانے کے بعد اسے آرام آگیا تھا۔ امیر خان کے اصرار پر بختیار نے راستے میں ایک جگہ رکنے کا خطرہ مول لیا تھا اور وہاں سے دواؤں اور مرہم پٹی کے سامان کی صورت میں جو مل سکتا تھا، وہ لے آئے تھے۔ ٹول پلازا عبور کرنے کے بعد انہوں نے ہائی وے سے ہٹ کر ایک ذیلی سڑک پر مائکرو بس روک دی تھی۔ امیر خان اور حمزہ، جمشید کے آپریشن میں لگ گئے۔ شارق نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر بعد سلطان اور بختیار بھی نیچے آگئے۔ واردات کے لیے ان سب کے پاس جدید ترین خودکار اسلحہ تھا۔ رائفلوں پر سائلنسر بھی لگے تھے لیکن جب وہ بس تک پہنچے تو بختیار نے سب سے... خودکار اسلحہ لے لیا۔ یہ اسلحہ بس کے اندر موجود سامان رکھنے والے خانے میں رکھ دیا گیا۔ اسی میں رقم سے بھرے سوٹ کیس بھی تھے اور خاص بات یہ تھی کہ اس خانے کے تالے کی چابی بختیار کے پاس تھی۔ ویسے سوائے شارق کو چھوڑ کر سب کے پاس پستول تھے۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔" بختیار نے بلند آواز سے کہا تو شارق چونکا۔ اس نے سگریٹ نیچے پھینک کر اسے جوتے کی ایڑی سے بجھایا اور بس کی طرف بڑھا۔ اندر وہ لوگ جمشید کے آپریشن سے فارغ ہوچکے تھے اور اب اس کے زخم پر پٹی کر رہے تھے۔ امیر خان کسی زمانے میں کمپاؤنڈر رہ چکا تھا۔ اس نے جمشید کو دو عدد انجکشن بھی دیے جن میں سے ایک پین کلر اور ایک سکون کا تھا اسی لیے وہ اب خاموش تھا۔ حمزہ نے اسے دودھ میں اوولٹین ملا کر دیا۔ بس کے پچھلے حصے میں دو نشستوں کی جگہ دو عدد برتھیں تھیں جن پر دو افراد آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ ایک پر جمشید کو لٹا دیا گیا۔ امیر خان نے خون صاف کیا اور اس دوران میں روئی اور جو دوسری چیزیں استعمال ہوئی تھیں، انہیں ایک شاپر میں کر کے بس سے باہر کھائی میں اچھال دیا۔ شارق نے انجن اسٹارٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ شارق کو بھوک لگ رہی تھی اور یقیناً باقی سب لوگوں کو بھی بھوک لگ رہی تھی مگر فی الحال وہ کہیں رک نہیں سکتے تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کے سامان کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ سلطان نے ایک دن پہلے ہی تمام خریداری کی تھی۔ زیادہ تر ٹن پیک اور سیلوفین میں بند تیار کھانے تھے جن کو بس گرم کرنا پڑتا ہے۔ سب نے اس میں سے اپنی اپنی پسند کی چیزیں نکال لیں۔ چلتی بس میں گرم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے سب ٹھنڈا ہی کھانے لگے۔ جب سلطان نے پیٹ بھر لیا تو اس نے شارق سے اسٹیئرنگ لے لیا۔ شارق نے تلے ہوئے آلوؤں اور فرائی مٹن کے ٹن کھولے اور پیٹ بھرنے لگا۔ امیر خان اور حمزہ پچھلی نشستوں پر بیٹھے سگریٹ نوشی کرتے ہوئے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ واردات کی کامیابی پر وہ خوش تھے۔ بختیار اور سلطان کو چھوڑ کر باقی سب کے حصے میں کل رقم کا دس فیصد فی کس آتے۔ بختیار اپنی سیٹ پر ایک نقشہ پھیلائے بیٹھا تھا۔ یہ شمالی علاقے کا نہایت تفصیلی نقشہ تھا۔

واردات سے صرف دو گھنٹے پہلے بختیار نے سب کو بتایا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں اور وہاں انہیں کیا کرنا ہے۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ واردات میں کامیابی کے بعد انہیں کیا کرنا ہے۔ جب وہ واپس آئے تو بختیار نے شارق کو مائکرو بس کا رخ شمال کی طرف کرنے کا حکم دیا جبکہ اس کا خیال تھا کہ وہ جنوب کی جانب میدانوں کی طرف جائیں گے جہاں ان کے چھپنے کی بے شمار جگہیں موجود تھیں۔ بہرحال، بختیار کا حکم تھا اور اسے تعمیل کرنا تھی۔

مئی کا پہلا ہفتہ ہونے کی وجہ سے شہروں کے میدان تپنے لگے تھے لیکن جیسے ہی بس پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر پہنچی، موسم خوشگوار ہوگیا۔ شارق نے اے سی بند کر کے سائڈوں کی کھڑکیاں کھول دیں جس سے باہر کی خنک اور خوشبودار ہوا اندر آنے لگی۔ یہ خوشبو پھولوں، جڑی بوٹیوں اور نباتات کی ملی جلی تھی۔ بختیار نقشہ تہ کر کے پیچھے چلا گیا اور برتھ پر لیٹ گیا۔ اس کا موڈ آرام کرنے کا تھا۔ جمشید پہلے ہی سو رہا تھا۔ امیر خان اور حمزہ بھی اب اونگھ رہے تھے۔ سلطان شارق کے پاس آبیٹھا۔ شارق نے آہستہ سے پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"شمال کی طرف۔" اس نے بھی آہستہ سے کہا۔ "اصل منزل کا علم صرف بختیار کو ہے۔"

اب شارق کے ذہن میں ایک خیال اور آرہا تھا۔ انہیں کامیاب واردات کے بعد کہیں چھپنا ہی تھا تو اس کے لیے شہر کے آس پاس جگہیں کم نہیں تھیں۔ شمال کی طرف جانے کا کیا مقصد تھا؟ کہیں بختیار اور سلطان سب کچھ اکیلے ہضم کرنے کے چکر میں تو نہیں تھے؟ وہ انہیں کسی ویرانے میں لے جا کر مار سکتے تھے۔ کسی کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ ان کی لاشیں اسی ویرانے میں چھپا سکتے تھے یا ایسے ہی چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ چند دنوں میں جنگلی جانور انہیں کھا جاتے ورنہ کیڑے مکوڑے ختم کر دیتے اور پھر وہاں ان کے ڈھانچے رہ جاتے... اور ڈھانچے کسی کو کچھ نہیں بتا سکتے۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ شارق اور باقی لوگ کہاں غائب ہوگئے۔

بختیار اسے شروع سے پُراسرار لگتا تھا۔ سنگ دلی اور سفاکی اس کی صورت سے ٹپکتی تھی اور شارق کا دل کہتا تھا کہ وہ اعتبار کے قابل بھی نہیں ہے۔ اگر سلطان درمیان میں نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اس کے ساتھ نہ آتا... اور اگر پہلی واردات کر کے پھنس جاتا تو کبھی کا واپس گاؤں جا چکا ہوتا۔ ان سب میں وہ واحد شخص تھا جس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ صرف واردات کے وقت بختیار نے اسے پستول دیا تھا تاکہ کوئی گڑبڑ ہوجائے تو وہ بھی ان کا ساتھ دے سکے مگر جیسے ہی وہ مائکرو بس تک پہنچے، بختیار نے اس سے پستول لے لیا۔ بختیار کسی پر اعتبار کرنے والا شخص نہیں تھا۔

امیر خان، حمزہ اور جمشید آپس میں دوست تھے اور وہ ہمیشہ سے جرائم پیشہ تھے۔ ان کے کھاتے میں قتل سمیت کئی جرائم درج تھے۔ ان کے پاس اپنے چھوٹے ہتھیار تھے جو بختیار ان سے نہیں لے سکتا تھا جبکہ بڑے ہتھیار یعنی خودکار سائلنسر لگی رائفلیں اس نے مہیا کی تھیں اور واردات کے بعد اس نے ان سے واپس لے لی تھیں۔ شارق کو نہیں معلوم تھا کہ ان سوٹ کیسوں میں کتنی دولت بھری ہے لیکن اس کا اندازہ تھا کہ یہ دولت بہت زیادہ تھی۔ جب وہ جنگل سے گزر کر مائکرو بس کی طرف جا رہے تھے تو شارق نے بھی ایک موقع پر سوٹ کیس اٹھایا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس کا وزن کم سے کم بھی بیس کلوگرام تھا...... یہ ساری دولت ڈالرز، یورو اور پاؤنڈز میں تھی۔ مقامی کرنسی میں ان کی مالیت کروڑوں میں بنتی تھی۔ شام سورج غروب ہونے تک وہ دارالحکومت سے دو سو میل سے بھی زیادہ دور نکل چکے تھے۔ بختیار نے اسے ایک شمالی شہر کا بتا دیا تھا، اسے وہاں تک جانا تھا۔ اس کے بعد آگے بختیار گائیڈ کرتا۔

رات ہونے تک وہ اس چھوٹے سے پہاڑی شہر پہنچ گئے جو گرمیوں میں سیاحوں کی آمد سے پُررونق ہوجاتا ہے ورنہ سردیوں میں یہاں مقامی باشندے بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ مگر بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں ابھی سیزن صحیح سے شروع نہیں ہوا تھا۔ ہوٹلوں کی پارکنگز میں اتنی گاڑیاں نظر نہیں آرہی تھیں اور رات ہوتے ہی درجۂ حرارت تقریباً منفی کے پاس پہنچ جاتا تھا اور سڑکیں اور گلیاں سنسان ہوجاتی تھیں۔ شارق کا خیال تھا کہ بختیار یہاں رکنے کو کہے گا لیکن خلافِ توقع اس نے حکم دیا۔ "بس کو شہر کے باہر سے آگے نکال کر لے جاؤ۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" شارق نے پوچھ لیا۔

"اپنے کام سے کام رکھو اور جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔" بختیار نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ سوال تو میں بھی کرنا چاہ رہا ہوں۔" امیر خان بولا۔ "آخر ہماری منزل کہاں ہے؟"

"میں سب کو ایک محفوظ جگہ لے جا رہا ہوں۔" اس بار بختیار نے نرمی سے کہا۔ وہ امیر خان یا اس کے ساتھیوں سے اس لہجے میں بات نہیں کرسکتا تھا۔ "ہم کچھ عرصے وہاں رہیں گے اور جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، تب ہم واپس آجائیں گے۔"

"چھپ کر رہنا کوئی مشکل نہیں ہے، ہمارے پاس شہر اور اس کے آس پاس بھی بہت جگہیں تھیں۔" حمزہ بولا۔ "تمہیں اتنی دور آنے کی کیا سوجھی؟"

"پہلے تو تم نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔" بختیار سرد لہجے میں بولا۔

"اس وقت ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمیں اتنی دور لے جایا جائے گا۔"

"تو اب معلوم ہوگیا۔ ویسے تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہمیں کہاں واردات کرنی ہے۔" بختیار نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "اب تمہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم کس شخص کی دولت لوٹ کر آئے ہیں اور ہماری تلاش کس پیمانے پر کی جائے گی۔"

"اس طرح تو ہم ملک میں کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔" حمزہ نے اعتراض کیا۔ "تو کیا ہم ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں؟"

"ایسا ہی سمجھو۔" بختیار نے سر ہلایا۔ "کم سے کم میں اور سلطان یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم وسط ایشیا جا رہے ہیں۔"

"اور ہم......؟" امیر خان اچھل پڑا۔ "ہم کیا کریں گے؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ میں تمہیں تمہارا حصہ دے دوں گا۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

"تب تم ہمارا حصہ وہیں دے کر ہمیں فارغ کر سکتے تھے۔" امیر خان برہم ہوگیا۔ "اتنی دور لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی دوست... وہاں تم زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹوں میں گرفتار ہوجاتے۔" بختیار نے کہا۔ "تمہیں

اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس بنگلے کی حفاظت اور نگرانی کے کیا انتظامات تھے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ یہ کروڑوں کی دولت صرف چار افراد کے رحم و کرم پر تھی؟ نہیں، ہم سب کی تصویریں اور شاید ویڈیو بھی بن چکی ہوگی۔ شہر میں ہونے کی صورت میں کوئی بھی ایک دن سے زیادہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔"

حمزہ کے منہ سے گالی نکلی۔ "یہ تم اب بتا رہے ہو؟"

"اگر پہلے بتا دیتا تو کیا تم انکار کر دیتے؟" بختیار بولا۔ "ایک بار اقرار کرنے کے بعد صرف موت ہی تمہیں انکار پر مجبور کر سکتی تھی۔ اور تم یہ کیوں بھول رہے ہو، جتنی بڑی کامیابی ہوتی ہے، اس کے لیے اتنا ہی بڑا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔"

"بختیار ٹھیک کہہ رہا ہے۔" جمشید کمزور لہجے میں بولا۔ اسے کئی گھنٹے پہلے ہوش آگیا تھا۔ "وہاں ہم پکڑے جاتے۔"

"اس کا خطرہ تو اب بھی ہے۔" امیر خان تلخ لہجے میں بولا۔ "باہر یہ دونوں جائیں گے، ہم سب نے تو یہیں رہنا ہے۔"

شارق ان کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا۔ کیا واقعی واپس جانے کا مطلب گرفتاری کے سوا کچھ نہیں تھا؟ خوش قسمتی سے واردات کے دوران وہ باہر گاڑی میں موجود رہا تھا۔ اس لیے اس کا امکان کم تھا کہ کسی خفیہ کیمرے نے اس کی تصویر یا ویڈیو بنائی ہوگی۔ اسے علم نہیں تھا کہ لوٹی جانے والی دولت کس کی تھی لیکن ان لوگوں کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ ملک کی کسی بہت بڑی شخصیت کی دولت تھی اور اس کے لیے پولیس اور جرائم کی تفتیش کرنے والے سارے ادارے حرکت میں آجاتے۔ بختیار نے کہا۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ باہر جانے سے تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے تو ہمارے ساتھ چلو۔ میں اور سلطان پہلے ہی وہاں اپنا سیٹ اپ بنا چکے ہیں۔ ہم تمہیں بھی سیٹل ہونے میں مدد دے سکتے ہیں۔"

"ہمارے بیوی بچے ہیں، گھر بار ہے۔" امیر خان بولا۔ "ہم انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

"تب تمہاری مرضی، واپس جاؤ اور جا کر گرفتاری دے دو۔" بختیار بولا۔

"اگر ہم یہیں سے واپس جانا چاہیں تو....؟" امیر خان نے پوچھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ رقم کی تقسیم اسی محفوظ مقام پر ہوگی جہاں ہم جا رہے ہیں۔" بختیار نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے۔"

"اگر ہم پھر بھی جانا چاہیں تو....؟" امیر خان نے اسی لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی جیب پر ہاتھ رکھا جس میں پستول تھا لیکن بختیار نے نہایت پھرتی سے اپنا پستول نکال لیا۔ اس نے سفاک انداز میں کہا۔

"اس صورت میں مجھے مجبوراً کچھ ناخوشگوار کام کرنا پڑیں گے۔"

بختیار کے پستول نکالتے ہی حمزہ نے بھی اپنا پستول نکال لیا تھا۔ صورت حال اچانک ہی گمبھیر ہو گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شارق پریشان ہو گیا مگر سلطان نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ اس نے درمیان میں آکر کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر آپس میں لڑ مرے تو پھر اس دولت کا کیا ہوگا؟"

"دولت تو اب بھی ہمیں ملتی نظر نہیں آرہی ہے۔" امیر خان تلخ لہجے میں بولا۔ "اس کی نیت خراب لگ رہی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" بختیار غرایا لیکن سلطان نے اسے چپ کرا دیا۔ اس نے سمجھایا۔

"دیکھو، یہ پلان میں نے اور بختیار نے مل کر بنایا ہے۔ اس کی جزئیات طے کی ہیں۔ اب تک ہم نے کامیابی سے اس پر عمل کیا ہے۔ تم لوگوں کو چاہیے کہ آگے کے لیے بھی ہم پر اعتبار کرو۔"

"اعتبار تو آدمی یوں کرے کہ آگے کا پتا ہو۔"

"آگے کا بتا دیا ہے۔ ہماری منزل شمال میں ایک ایسی وادی ہے جہاں کسی کی سوچ بھی نہیں جا سکتی۔ وہاں کوئی آبادی نہیں ہے اور وہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔ ہم وہاں مہینوں چھپے رہ سکتے ہیں۔ ابھی ہم خطرے کی حدود سے باہر نہیں گئے ہیں۔ ہمارے بارے میں سارے ملک کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو خبردار کر دیا گیا ہوگا اور ہماری تلاش زور و شور سے جاری ہوگی۔"

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اب تک کسی نے ہمیں روکا نہیں ہے۔" بختیار نے کہا۔ "یقیناً ان لوگوں کا زور جنوب کے میدانوں کی طرف ہوگا اور کسی کو خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ ہم شمال کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد امیر خان اور حمزہ خاموش ہو گئے لیکن ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔ رات کے وقت وہ کچھ دیر کے لیے ایک جگہ رکے۔ انہوں نے کھانا کھایا اور رفع حاجت کے لیے باہر گئے۔ اس کے بعد ڈرائیونگ سلطان نے سنبھال لی۔ وہ اس سے پہلے کچھ دیر سو لیا تھا۔ شارق کھانے اور روانگی کے بعد سونے کے لیے

نشست پر آگیا لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ رات بھر وہ اونگھتا رہا اور جب بس کوئی مشکل موڑ کاٹتے ہوئے لہراتی تو وہ چونک کر جاگ جاتا۔ رات کے وقت سلطان اور بختیار باری باری ڈرائیو کرتے رہے کیونکہ یہاں راستوں کا علم انہیں ہی تھا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جس سے آگے دور برف پوش پہاڑ دکھائی دے رہے تھے اور اس جگہ کی بلندی دس ہزار فٹ کے قریب تھی۔ برف پگھل گئی تھی لیکن سردی میں اب بھی شدت تھی۔

شارق اٹھا تو باہر روشنی پھیل رہی تھی اور بہت خوب صورت سرسبز ڈھلان دھیرے دھیرے سورج کی روشنی میں سنہری ہوتی جا رہی تھی۔ اسی سبزے کے درمیان میں ایک زرد لکیر بلند ہو رہی تھی اور یہ وہ کچا راستہ تھا جس پر انہیں آگے اسی بس میں سفر کرنا تھا۔ سلطان نے شارق سے کہا۔ "اب تمہیں اپنی تربیت کو استعمال کرنا ہے۔ ہمیں اس راستے پر یہ ڈھلان عبور کرنی ہے اور اس کے دوسری طرف وادی میں اترنا ہے۔"

شارق نے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ "یہ بہت مشکل ہے۔"

بختیار نے جواب دیا۔ "نہیں، دیکھنے میں لگ رہی ہے لیکن جب تم سفر کرو گے، تب آسان لگے گی۔"

صرف شارق ہی نہیں، امیر خان، حمزہ اور جمشید بھی اس راستے کو دیکھ کر پریشان تھے۔ جمشید کی حالت بہتر تھی۔ مسلسل اینٹی بایوٹک دواؤں اور طاقتور غذا سے اس کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہوئی تھی اور اب وہ پاؤں پر زور ڈالے بغیر چل بھی سکتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا جھگڑا ہوا۔ امیر خان اور حمزہ نے آگے جانے سے انکار کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان کی رقم دی جائے، وہ یہیں سے واپس جائیں گے۔ بختیار نے انکار کیا۔ "تم لوگ واپس نہیں جیل جاؤ گے اور پولیس آدھ گھنٹے سے پہلے تم سے اگلوا لے گی کہ رقم اور باقی لوگ کہاں ہیں۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" حمزہ کا صبر جواب دینے لگا۔ ان میں سب سے جذباتی وہی تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس وقت تک واپسی کا سفر نہ کرو جب تک میں سرحد نہ پار کر جاؤں۔"

"سرحد۔" وہ سب چونک اٹھے۔ شارق نے پوچھا۔ "کیا ہم سرحد سے اتنے قریب ہیں؟"

"ہاں، اس وادی کے اوپر جو برف پوش پہاڑ نظر آرہے ہیں، ان میں ہی کہیں سرحد ہے۔ جب ہم ان پہاڑوں کو عبور کریں گے تو سرحد بھی خود بہ خود عبور کر لیں گے۔"

شارق نے پُر تشکیک نظروں سے ان پہاڑوں کو دیکھا جو بہ ظاہر بہت بلند اور ناقابلِ عبور لگ رہے تھے۔ "کیا ان پہاڑوں کو عبور کیا جا سکتا ہے؟"

سلطان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا۔ ابھی تو ہمیں وادی تک جانا ہے۔"

امیر خان اور حمزہ جان گئے تھے کہ بختیار اور سلطان وہی کریں گے جو ان کا ارادہ تھا۔ امیر خان نے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم چلنے کے لیے تیار ہیں لیکن کیا جمشید کی حالت اس قابل ہے کہ یہ اس راستے پر سفر کر سکے؟"

"اسے خود سے نہیں جانا ہے۔" بختیار بولا۔ "بس میں سفر کرے گا۔ ہم اسے سیٹ بیلٹ سے باندھ سکتے ہیں۔"

انہوں نے یہی کیا۔ جمشید کو سیٹ بیلٹ سے باندھ دیا۔ امیر خان اسے ہر بارہ گھنٹے بعد اینٹی بایوٹک اور طاقت کا انجکشن دے رہا تھا۔ ابھی پہلی پٹی ہوئے چوبیس گھنٹے نہیں ہوئے تھے لیکن انہوں نے بہتر سمجھا کہ روانہ ہونے سے پہلے اس کی پٹی بدل دیں کیونکہ بہ ظاہر یہ سفر بھی کئی گھنٹے کا لگ رہا تھا۔ راستے میں آنے والے آخری پیٹرول پمپ سے انہوں نے ٹینک فل کرا لیا اور خالی ہو جانے والے جیری کین بھی بھروا لیے۔ شارق نے دھڑکتے دل کے ساتھ .... بس کو اس کچے راستے پر چڑھایا۔ شروع میں یہ آسان ہی لگ رہا تھا مگر نصف راستے کے بعد چڑھائی بہت ہی خطرناک اور مشکل ہو گئی۔ اس موقع پر سلطان اور حمزہ بھی اس کی مدد کے لیے آگئے۔ دشوار مقامات پر وہ بس سے اتر کر شارق کی راہنمائی کرتے تھے۔ بعض جگہوں پر راستہ بس اتنا رہ جاتا کہ بس کے پہیے کنارے سے لگے ہوتے، ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ ایک جگہ راستہ گرا ہوا تھا اس لیے انہوں نے پتھر اور مٹی ڈال کر راستہ بنایا۔

شارق اس سرد موسم میں بھی پسینے میں نہا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بس کا انجن نہیں، اس کا جسم اس بس کو اوپر کھینچ رہا ہے۔ اس کی توجہ راستے پر مرکوز تھی اور وہ اس وقت بس کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ جب پہیے راستے سے ذرا سلپ کرتے تو اسے محسوس ہوتا، اس کا پاؤں پھسل رہا ہے۔ تین گھنٹے کی مسلسل اور جاں گسل جدوجہد کے بعد وہ اس ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے جس کے دوسری طرف وادی تھی۔ شارق نے بس روکی اور سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ وہ تھکن سے چور ہو گیا تھا لیکن دوسرے منہ کھولے اس

خوب صورت ترین اور ناقابلِ بیان منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایک وادی جو پوری کی پوری درختوں اور سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس میں جنگل نیچے سے اٹھ کر اوپر برف پوش پہاڑوں تک یوں جا رہا تھا کہ نیچے یہ گہرا سبز تھا، اس سے اوپر ہلکا سبز اور بتدریج یہ رنگ ہلکا ہوتا ہوا سنہری ہو کر برف کی سفیدی میں مل رہا تھا۔ سلطان، شارق کے پاس آیا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔

''تم نے کمال کر دیا۔ میں نے آج تک اتنی اچھی ڈرائیونگ نہیں دیکھی ہے۔''

وہ سب اسے شاباش دینے لگے۔ شارق نے غیر معمولی کام کیا تھا۔ وہ خوش تھا لیکن فکرمند بھی تھا کہ اسی راستے سے اسے واپس بھی جانا ہوگا اور چڑھائی کی نسبت اترائی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے۔ خیر، یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی تو انہیں وادی میں اترنا تھا۔ یہاں راستہ نہیں تھا۔ یہ کچا راستہ بھی شاید یہاں سے گزرنے والے خانہ بدوشوں کے قافلوں سے بنا تھا جو جنوب کے میدانوں سے آکر پڑوسی ملک جاتے تھے۔ لیکن وادی تک وہ بھی نہیں آتے تھے۔ سلطان اور حمزہ، شارق کی راہنمائی کرنے لگے۔ وہ آگے جا کر راستہ دیکھتے اور پھر اسے اشارہ کرتے، تب وہ بس آگے بڑھاتا۔ اب راستہ نیچے وادی میں جا رہا تھا۔ تقریباً ایک کلومیٹر اندر آنے کے بعد وہ وادی کے سب سے نچلے حصے میں پہنچ گئے۔ اس سے آگے بس نہیں جا سکتی تھی کیونکہ پہاڑوں سے آنے والی ایک شوریدہ مچاتی ندی گزر رہی تھی۔ یہ آگے جا کر ایک جھیل میں گر رہی تھی۔

شارق نے بس روک کر پہلے اس کے پہیوں کے آگے پیچھے پتھر رکھے کہ وہ ڈھلان پر چل نہ پڑے۔ پھر وہ ندی تک گیا اور اس کے ٹھنڈے پانی سے خود کو تر و تازہ کرنے لگا۔ وہ سب بھی بکھر گئے تھے۔ شارق منہ ہاتھ دھونے کے بعد ندی کے کنارے موجود نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ اس کے ساتھ ننھے منے بے شمار رنگوں والے پھول کھلے ہوئے تھے اور قریب سے ان کی مہک بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہاں ہوا اتنی صاف شفاف تھی جیسے دنیا ابھی وجود میں آئی ہو۔ رفتہ رفتہ شارق کی تھکن دور ہو گئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ سلطان اور بختیار حسبِ معمول ساتھ تھے۔ یہاں آتے ہی بختیار نے شارق سے بس کی چابی لے لی تھی۔ وادی کی طرف آنے سے پہلے سب نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا اس لیے سب کا ہی بھوک سے برا حال تھا۔ انہوں نے پہلی بار کھانا گرم کر کے کھایا۔ یہ سب ٹن پیک یا تیار غذا پر مشتمل تھا۔ مختلف اقسام کے گوشت اور سالنوں کے ساتھ تیار پراٹھے اور نان بھی تھے جنہیں پیکٹ سے نکال کر بس گرم کرنا پڑتا۔ البتہ چائے کافی انہیں تیار کرنا پڑتی اور وہ بھی وافر مقدار میں موجود تھی۔

شارق نے اپنے لیے تیار نان نکالے اور انہیں گرم کر کے فرائی مچھلی کے ساتھ کھانے لگا۔ باقی سب بھی اپنی پسند کے کھانے کھا رہے تھے۔ شارق نے محسوس کیا کہ امیر خان اور حمزہ بہت چوکنا تھے۔ وہ خاص طور سے سلطان اور بختیار پر نظر رکھے ہوئے تھے مگر بختیار اور سلطان کو ان کی پروا نہیں تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ندی تک جا کر ہاتھ دھوئے۔ اب سب منتظر تھے کہ سوٹ کیسوں میں موجود رقم نکالی جائے اور پھر سب کو ان کا حصہ ملے۔ امیر خان نے بس میں آتے ہی مطالبہ کیا۔ ''بس... اب صبر نہیں ہو رہا ہے۔''

بختیار مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں۔ ابھی ہم رقم دیکھ لیتے ہیں لیکن اس کی تقسیم کل صبح ہوگی۔''

حمزہ نے چونک کر کہا۔ ''کل صبح کیوں؟''

''کل صبح ہم رقم کی تقسیم کے فوراً بعد اپنی اپنی راہ لیں گے۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے لیکن رقم ابھی تقسیم کرنے میں کیا حرج ہے؟'' حمزہ بولا۔

''حرج کوئی نہیں ہے۔'' بختیار نے سرد لہجے میں کہا۔ ''رقم تقسیم ہوتے ہی ہم ایک گروپ نہیں رہیں گے بلکہ ہر فرد اپنے چکر میں پڑ جائے گا اور وہ دوسروں کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے جب ہمارے الگ ہونے کا وقت آئے، تب ہی ہم رقم تقسیم کریں۔''

''مجھے اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔'' شارق نے کہا۔ ''رقم صبح بھی تقسیم ہو، تب بھی سب کو ملے گی۔''

امیر خان اور حمزہ نے دوبارہ اصرار نہیں کیا لیکن وہ پہلے سے زیادہ چوکنا نظر آنے لگے۔ خاص طور سے جب بختیار لاکر کھول کر سوٹ کیس نکال رہا تھا۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ بختیار اچانک ہی رائفل نکال کر ان پر برسٹ نہ مار دے۔ اس سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ چوکنا تھے۔ لیکن بختیار نے صرف سوٹ کیس نکالے اور لاکر دوبارہ بند کر دیا۔ وہ باری باری دونوں سوٹ کیس بس کے پچھلے کھلے حصے میں لایا۔ اس نے پہلا سوٹ کیس کھولا۔ اس میں ڈالرز، یورو اور پاؤنڈز کی گڈیاں سلیقے سے سجا کر رکھی گئی تھیں۔ ڈالرز سارے سو والے نوٹوں پر مشتمل تھے۔ یورو کی سو، پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں والی گڈیاں تھیں جبکہ پاؤنڈز بھی سو کے نوٹوں پر مشتمل تھے۔ بختیار نے سوٹ کیس فرش پر

الٹ دیا۔

''اب سب پہلے نوٹ الگ الگ کریں، اس کے بعد انہیں گنا جائے گا۔''

نوٹ دیکھتے ہی ان میں جوش و خروش پھیل گیا اور وہ سب، کچھ دیر پہلے والی کشیدگی بھول کر جلدی جلدی گڈیوں کو کرنسی کے حساب سے الگ کرنے لگے۔ اس کام میں سوائے جمشید کے سب شامل تھے۔ وہ بھی اپنی نشست سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اعداد و شمار لکھنے کی ذمے داری اسے سونپ دی گئی۔ جمشید نے ایک نوٹ پیڈ اور پین سنبھالا اور ان کی بتائی ہوئی رقوم لکھنے لگا۔ سب اسے گڈیوں کی تعداد اور ان میں نوٹوں کی مالیت بتا رہے تھے۔ یہ کام کرنے والے چھ افراد تھے لیکن پھر بھی اس کام میں بہت وقت لگ گیا۔ دونوں سوٹ کیسوں میں موجود رقم گنتے ہوئے اور پھر اسے واپس سوٹ کیسوں میں رکھتے ہوئے انہیں شام ہو گئی۔ جب وہ فارغ ہوئے تو دم بہ خود تھے۔ ان دو سوٹ کیسوں میں جتنی رقم تھی، وہ ان کے تمام اندازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ گویا ان دو سوٹ کیسوں میں اسّی کروڑ روپے موجود تھے۔ ان چاروں کے حصے میں کل رقم کا دس فیصدی کس یعنی تقریباً آٹھ کروڑ فی کس آ رہا تھا پھر بھی بختیار اور سلطان کے حصے میں اڑتالیس کروڑ کی بھاری رقم آتی۔ شارق کے لیے تو آٹھ لاکھ روپے بھی بہت بڑی رقم تھی۔ آٹھ کروڑ کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن امیر خان، حمزہ اور جمشید کا منہ بن گیا۔

''یہ کیا؟'' جمشید نے کہا۔ ''ہم چاروں کو ملا کر صرف بتیس کروڑ ملیں گے اور تم دونوں اڑتالیس کروڑ لے جاؤ گے؟''

''تمہارے لیے اتنا ہی طے ہوا تھا۔'' بختیار نے کہا۔

''لیکن ہم نے برابر کا خطرہ مول لیا ہے۔'' حمزہ بولا۔ ''ہم اب بھی خطرے میں ہیں۔''

''تم دونوں تو باہر چلے جاؤ گے۔'' امیر خان بھی تلخی سے بولا۔

''تو تم لوگ بھی چلو، کسی نے روکا تو نہیں ہے۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''لیکن تم لوگ بیوی بچوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہو۔''

''ہمارا حصہ ڈیڑھ گنا کر دو۔'' جمشید نے مطالبہ کیا۔

''بارہ کروڑ فی کس۔'' سلطان اچھل پڑا۔ ''یہ ناممکن ہے۔''

''ناممکن کچھ نہیں ہے، تم لوگ ایک کو بارہ کروڑ دے کر کنگال نہیں ہو جاؤ گے پھر بھی تم دونوں کے حصے میں بتیس کروڑ کی رقم آئے گی۔'' امیر خان نے کہا۔

بختیار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جو طے ہوا تھا، اس سے ایک روپیا بھی زیادہ نہیں ملے گا۔''

وہ پانچوں دو گروہوں میں بٹ کر آپس میں بحث کرنے لگے۔ صرف شارق غیر جانب دار تھا۔ تین مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کا حصہ بڑھایا جائے جبکہ باقی دو کسی صورت یہ مطالبہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ رفتہ رفتہ ماحول کی گرمی بڑھنے لگی۔ گفتگو میں سخت الفاظ بڑھ رہے تھے اور چہروں کے تناؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شارق نے ایک دو بار درمیان میں مداخلت کی کوشش کی لیکن اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔ اس سے پہلے کہ بات زبان سے بڑھ کر آتشیں ہتھیاروں تک پہنچتی، ایک عجیب واقعہ ہوا اور وہ سب بوکھلا گئے۔ کہیں سے ایک پتھر آ کر بس کے ایک طرف کے شیشے سے ٹکرایا۔ یہ خاصا بڑا پتھر تھا اور بہت زور سے پھینکا گیا تھا۔ بس کا بہت مضبوط شیشہ ٹوٹا تو نہیں لیکن اس میں ہلکا سا بال آ گیا۔ البتہ دھماکے نے ان سب کو چونکا دیا۔

''یہ... یہ کون... ذلیل ہے؟'' سلطان بولا۔

''سوال یہ ہے کہ یہاں کون ہے؟'' بختیار تشویش سے بولا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا۔

باہر اندھیرا چھا رہا تھا کیونکہ سورج پہاڑوں کے پیچھے جا چکا تھا۔ وہ اپنے ہتھیار اور ٹارچیں لے کر نیچے اتر آئے لیکن اس سے پہلے بختیار دونوں سوٹ کیس واپس لاکر میں رکھنا نہیں بھولا تھا۔ بختیار اور سلطان کے ساتھ امیر خان اور شارق نیچے آئے تھے۔ شارق نے وہ پتھر اٹھایا جو کھڑکی کے شیشے سے ٹکرایا تھا۔ یہ خاصا وزنی اور بڑا پتھر تھا۔ کسی بھی طرح خود بہ خود اڑ کر یہاں تک نہیں آ سکتا تھا۔ جس طرف سے یہ پتھر آیا تھا، اس طرف کوئی پچاس گز کی دوری پر گھنے درخت شروع ہو رہے تھے۔ اتنی دور سے اتنا وزنی پتھر مارنے والا یقیناً بہت طاقتور شخص تھا۔

''یہ خود نہیں آ سکتا۔'' شارق نے پتھر ان تینوں کو دکھایا۔ ''اسے کسی نے پھینکا ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' بختیار نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اتنی عقل ہمارے پاس بھی ہے۔''

یہاں آنے سے پہلے بختیار اس سے ذرا نرمی اور شرافت سے بات کرتا رہا تھا لیکن وادی میں آنے کے بعد وہ شارق سے یوں برتاؤ کر رہا تھا جیسے وہ اس کا ساتھی نہیں زرخرید غلام ہو۔ اس کے لہجے پر شارق نے اسے گھورا لیکن کچھ کہنے کے بجائے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی پُرتجسس نظریں اس

سمت میں دیکھ رہی تھیں جہاں سے ممکنہ طور پر یہ پتھر پھینکا گیا تھا...... بس اور نالے کی بائیں طرف یہ ڈھلان تھی جو بلند ہورہی تھی اور اس پر بہت اونچے اور گھنے درخت تھے۔ دن میں بھی ان کے نیچے تاریکی رہتی تھی، اس وقت تو وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ شارق کا اندازہ تھا کہ وہیں سے کسی نے یہ پتھر پھینکا تھا۔ وہ کون ہوسکتا تھا؟ کیونکہ بختیار کا کہنا تھا کہ یہ وادی مکمل طور پر ویران تھی اور یہاں کسی انسان کا گزر نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ پتھر بتارہا تھا کہ وہاں کوئی انسان ہے کوئی جانور اس قسم کی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔

بختیار اور امیر خان ٹارچیں لے کر اس ڈھلان کی طرف بھی گئے۔ وہاں شارق اور سلطان رہ گئے تھے۔ شارق نے اس سے شکایتی انداز میں کہا۔ ”سلطان بھائی! آپ نے بختیار کا انداز دیکھا ہے... وہ مجھ سے کس طرح بات کررہا ہے؟“

”کس طرح کررہا ہے؟“ سلطان نے سرد لہجے میں کہا تو شارق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے سلطان کا لہجہ بھی بدلا ہوا لگا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”بالکل اسی طرح جیسے تم کررہے ہو۔“

اس سے پہلے کہ سلطان اسے کچھ کہتا، وہ پلٹ کر واپس بس میں آگیا۔ اسے غصہ آرہا تھا لیکن اس نے بات بڑھانے سے گریز کیا۔ حمزہ اور جمشید آپس میں کچھ بات کررہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ چپ ہوگئے۔ شارق، جمشید کے پاس چلا آیا۔ ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے لڑکے۔“ جمشید نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تم ان کے چکر میں کیسے آگئے؟“

”جیسے تم آئے۔“

”ہماری بات اور ہے۔“ حمزہ نے گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہم پیشہ ور مجرم ہیں۔ جرم کرنا اور مرنا مارنا ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن تم ایک شریف آدمی ہو۔“

”میں شریف آدمی تھا۔“ شارق نے تصحیح کی۔ ”لیکن پہلی واردات میں شامل ہونے کے بعد میں بھی برابر کا مجرم بن گیا ہوں۔“

”سنو، اب بھی وقت ہے، تم واپس جاسکتے ہو۔“ حمزہ نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر سلطان اور بختیار اپنے منصوبے میں کامیاب رہے تو ہم میں سے کوئی یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکے گا۔“

شارق چونکا۔ ”کیا مطلب......؟“

”وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔ ان دونوں کا ارادہ سارا مال خود ہضم کرنے کا ہے اسی لیے یہ ہمیں یہاں لائے ہیں اور اب تک رقم کی تقسیم بھی نہیں کی ہے۔“ جمشید سرد لہجے میں بولا۔ ”اگر ہم مسلح نہ ہوتے تو یہاں پہنچتے ہی یہ ہمیں مار چکے ہوتے۔“

”لیکن اب بھی موقع کی تلاش میں ہوں گے۔“ حمزہ نے کہا۔ ”ممکن ہے یہ پہلے کسی طرح سے ہمیں بے بس کرکے اسلحہ حاصل کرلیں اور اس کے بعد ہمیں ماردیں۔“

شارق آج سے پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلطان اسے دھوکا دے سکتا ہے یا اس کے قتل کا سوچ سکتا ہے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد بختیار اور سلطان کے انداز میں اس کے لیے جو تبدیلی آئی تھی، اس سے اس کے دل میں بہت سارے خدشات پیدا ہوگئے تھے۔ واقعی بختیار اور سلطان کا انداز شک پیدا کرنے والا تھا۔ شارق نے تشویش سے کہا۔ ”اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

جمشید نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے وہ قصہ سنا ہوگا جس میں دیہاتی اپنے بیمار گھوڑے کو نلکی سے دوا پلانے کی کوشش کرتا ہے اور......“

”گھوڑا پہلے پھونک ماردیتا ہے۔“ شارق نے اس کی بات مکمل کی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ پہلے ہم انہیں ماردیں... تو میں پہلے تمہیں بتادوں کہ میں کسی کو نہیں مارسکتا۔“

”اگر تم کسی کو مار نہیں سکتے تو تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔“ جمشید نے کہا۔ ”دوسری صورت میں ہم تمہیں بھی ان کا ساتھی شمار کریں گے۔“

”میں ان کا ساتھی ہوتا تو میرے ساتھ ان کا یہ رویہ ہوتا؟“ شارق نے تلخی سے کہا۔ اسی اثنا میں باقی سب واپس آگئے تو وہ خاموش ہوگئے۔ باہر مکمل تاریکی چھا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد سب نے رات کے کھانے کی تیاری شروع کردی۔ یہاں کوئی کسی کے لیے کام نہیں کررہا تھا۔ سب اپنے لیے جو دل چاہے تیار کررہے تھے۔ شارق نے بھی اپنے لیے نکال کر پیٹ بھرلیا۔ ویسے اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے آنے والے کل کا خیال تھا۔ اگر جمشید اینڈ پارٹی کا خیال درست تھا تو شاید انہیں کل صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ شروع میں وہ پتھر مارنے والے کے بارے میں پریشان رہے لیکن پھر سلطان نے خیال پیش کیا کہ یہ کوئی بندر تھا۔ پہاڑوں پر بندر پائے جاتے ہیں۔ اس وضاحت نے انہیں تقریباً مطمئن کردیا مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بندر اتنی بلندی پر نہیں پائے

جاتے۔

سب کا تھکن سے بُرا حال تھا اور سب ہی آرام کرنا چاہتے تھے مگر سب ہی خوف زدہ تھے۔ طے ہوا کہ دو افراد جاگ کر پہرا دیں گے اور چار سوئیں گے۔ ہر چار گھنٹے بعد ڈیوٹی تبدیل کی جائے گی۔ سب سے پہلے بختیار اور جمشید کے نام نکلے۔ وہ رات بارہ بجے تک جاگتے۔ اس کے بعد شارق اور حمزہ کی باری آتی اور سب سے آخر میں امیر خان اور سلطان جاگتے۔ اس کے بعد تو صبح ہوجاتی۔ بختیار نے رات میں ہی اپنا اور سلطان کا سامان نکال لیا تھا۔ یہ دو عدد بڑے بیگ تھے جن کو پشت پر باندھ کر وہ پہاڑوں کی طرف جاسکتے تھے۔ راستے کے لیے مخصوص گرم ترین لباس، جوتے، دستانے، سن گلاسز، اسنیکس اور دوسرا سامان بھی تھا۔ امیر خان نے پوچھا تو بختیار نے بتایا کہ ان کا یہ سفر ایک ہفتے کا بھی ہوسکتا ہے مگر اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہوجائیں گے۔ کسی حد تک اس بات کا امکان بھی تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان پہاڑوں میں گم ہوجاتے۔ شارق ان چار گھنٹوں میں ایسا بے خبر سویا کہ اس نے کوئی خواب تک نہیں دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ بس سویا تھا اور اسے جگا دیا گیا۔ جگانے والا بختیار تھا۔ ”اٹھ جاؤ... اب تمہاری باری شروع ہوگئی ہے۔“

شارق آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ حمزہ بھی اٹھ گیا تھا۔ بختیار اور جمشید سونے کے لیے لیٹ گئے۔ شارق نے چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ اس نے حمزہ سے پوچھے بغیر اس کے لیے بھی چائے بنائی تھی۔ وہ دو کپ لے کر بس کے اگلے حصے میں آیا تو حمزہ نے شکر گزاری کے ساتھ چائے لے لی۔ ”کیا خیال ہے، تم کل بس واپس اسی راستے سے لے جاسکو گے؟“

شارق نے شانے اچکائے۔ ”میرا خیال ہے... ویسے تو یہاں تک آنا بھی ناممکن لگ رہا تھا۔“

”تم نے غضب کی ڈرائیونگ کی ہے۔“ حمزہ نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”میں نے زندگی میں کسی کو اتنی مہارت سے ڈرائیونگ کرتے نہیں دیکھا۔“

شارق جھینپ گیا۔ ”شکریہ... ویسے میں اتنا اچھا ڈرائیور بھی نہیں ہوں۔“

چائے پی کر حمزہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ”میں ذرا باہر سے آتا ہوں۔“

حمزہ نے وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ باہر کیوں جارہا ہے لیکن شارق سمجھ گیا کہ اسے کوئی حاجت محسوس ہورہی ہے ورنہ اس سرد ترین رات میں باہر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ شارق نے کہا۔ ”زیادہ دور مت جانا، یہ بالکل غیر آباد علاقہ ہے۔ ممکن ہے یہاں بڑے جانور ہوں۔“

حمزہ نے اسے پستول نکال کر دکھایا۔ ”اس کے ہوتے ہوئے کوئی جانور میرے پاس نہیں آسکتا۔“

حمزہ بس سے اتر کر چلا گیا۔ بس اندر سے بھی سرد ہورہی تھی لیکن جب دروازہ کھلا تو ایک لمحے کو یخ بستہ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ شارق سامنے ہونے کی وجہ سے کانپ گیا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ شارق نے بچی ہوئی چائے دوبارہ گرم کرکے نکالی۔ رات بہت ہی سرد تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بختیار اور سلطان اس سے کہیں زیادہ بلند اور سرد علاقوں میں جائیں گے۔ وہاں ان کا کیا حال ہوگا؟ وہ سوچوں میں گم تھا اور اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ حمزہ کو گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی ہے۔ وہ چونکا اور اس نے گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ حمزہ کو گئے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا اور اب تک اسے واپس آجانا چاہیے تھا۔ وہ پریشان ہوگیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ کسی کو جگائے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کرتے ہوئے خود باہر جاکر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جیکٹ پہنی اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

”حمزہ!“ اس نے آواز دی لیکن آواز دھیمی رکھی۔ اگر حمزہ تیس چالیس فٹ کے دائرے میں ہوتا تو لازمی اس کی آواز سن لیتا۔ یہاں رات بہت خاموش تھی مگر کسی طرف سے جواب نہیں آیا۔ شارق نے دوبارہ اور پھر بار بار آواز دی۔ آخری بار وہ چلا اٹھا اور اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر پوری وادی میں گونجنے لگی۔

”یہ کیا ہورہا ہے؟“ بختیار کی کرخت آواز آئی۔

شارق نے مڑ کر دیکھا۔ بختیار بس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ شارق نے بتایا۔ ”حمزہ تقریباً چالیس منٹ پہلے رفع حاجت کے لیے باہر گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ میری پکار کا جواب بھی نہیں دے رہا ہے۔“

”تمہیں اتنا چیخنے چلانے کی کیا ضرورت ہے؟“ بختیار کا لہجہ خراب ہوگیا۔ ”ہمیں اٹھا کر بتا نہیں سکتے تھے۔“

کل تک شارق، بختیار سے مرعوب تھا اور اس کے سامنے دب جاتا تھا لیکن اب اس کے اندر نوجوانی کی مخصوص سرکشی ابھر آئی اور وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا بختیار کے پاس پہنچا اور اس کے...... بالکل سامنے آکر کہا۔ ”میں سلطان کی وجہ سے تمہارا احترام کرتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہارا غلام یا نوکر ہوں۔ آئندہ مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرنا۔“

شارق کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ بختیار بے

ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا پھر اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ میں باس ہوں۔“

”تم باس تھے، اب تم کچھ نہیں ہو۔ یقین نہیں آ رہا تو سلطان کے سوا کسی سے پوچھ کر دیکھ لو۔“ شارق کے لہجے میں چیلنج آ گیا۔ بختیار کچھ دیر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا پھر اس نے ایک جھٹکے سے بس کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اس کے چلّانے کی آواز آ رہی تھی، وہ دوسروں کو جگا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ حمزہ باہر گیا تھا اور کہیں غائب ہو گیا ہے۔ امیر خان اور جمشید یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ امیر خان نے چیخ کر کہا۔

”وہ غائب ہوا ہے یا تم نے غائب کر دیا ہے؟“

”میں نے ؟“ بختیار بولا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں ایسا کیوں کرنے لگا؟ اور میں تو سو رہا تھا۔ شارق کی آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ یہ حمزہ کو آوازیں دے رہا تھا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ شارق نے کہا اور پھر انہیں بتایا کہ کس طرح حمزہ باہر گیا تھا جس کے بعد اس کی واپسی نہیں ہوئی۔ امیر خان اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ شارق پر بھی الزام لگا رہا تھا کہ وہ اصل میں بختیار اور سلطان کا آدمی ہے۔ یہ سن کر شارق آپے سے باہر ہو گیا اور قریب تھا کہ دونوں آپس میں الجھ جاتے کہ جمشید نے مداخلت کی۔

”شارق ٹھیک کہہ رہا ہے۔ حمزہ خود ہی باہر گیا ہو گا۔ اسے شوگر کی شکایت ہے اور جلدی جلدی پیشاب آتا ہے۔“

”ہاں، وہ چائے پیتے ہی باہر گیا تھا۔“ شارق نے کہا۔

جمشید نے آنکھوں میں امیر خان سے نہ جانے کیا کہا کہ وہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس وقت جھگڑا ان کے مفاد میں نہیں ہے۔ جمشید بولا۔ ”ممکن ہے اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے، یہاں قدم قدم پر خطرات موجود ہوں گے۔“

”ممکن ہے یہ کسی انسان یا جانور کی حرکت ہو۔“ شارق نے کہا۔

”تب ہم کیا کریں؟“ بختیار جھنجلایا۔

”ہم اسے تلاش کریں گے۔“ امیر خان تیز لہجے میں بولا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اسے تلاش کرنے کی۔ وہ اپنی کسی حماقت کا شکار ہوا ہے۔“ بختیار نے کہا۔

”ہم اسے تلاش کریں گے۔“ امیر خان زور دے کر بولا۔ ”ہم سب......“

”بختیار! ہمیں اسے تلاش کرنا ہو گا۔“ سلطان جو اس دوران میں کچھ سوچ رہا تھا، پہلی بار بولا۔ ”میری چھٹی حس کہہ رہی ہے باہر ہمارے لیے کوئی خطرہ ہے اور ہمیں مل کر اس کا مقابلہ کرنا ہو گا۔“

”ورنہ یہ بھی ممکن ہے ہم مارے جائیں۔“ امیر خان نے اس کی تائید کی۔ ”ہمیں باہر جا کر حمزہ کو دیکھنا چاہیے۔“

بختیار نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم بس کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتے۔“

”یہاں جمشید ہو گا۔“ شارق نے کہا۔ ”یہ ویسے بھی چل نہیں سکتا۔“

بختیار اس کے لیے تیار نہیں تھا مگر مجبوراً مان گیا۔ اس نے لاکر کھولا اور اس میں سے دو رائفلیں نکالیں۔ ایک اس نے سلطان کو دے دی اور دوسری شانے پر ٹانگ لی۔

”ہمیں بھی رائفلیں دو۔“ امیر خان نے مطالبہ کیا۔ ”اگر باہر کوئی مسلح آدمی موجود ہے تو ہم صرف پستولوں سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”مجھے بھی رائفل دے کر جاؤ۔“ جمشید بولا۔ ”اگر کوئی بس میں گھسنا چاہے گا تو صرف پستول سے اسے روکنا مشکل ہو گا۔“

بختیار اور سلطان کی آنکھوں میں شک ابھر آیا۔ انہیں خیال آیا کہ کہیں یہ امیر خان، حمزہ اور جمشید کی چال تو نہیں۔ اس طرح وہ انہیں منتشر کر رہے تھے اور ساتھ ہی خودکار اسلحہ بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار رائفلیں ان کے پاس آ جاتیں تو ان سے واپس کون حاصل کرتا؟ بختیار نے لاکر بند کر دیا اور بولا۔ ”نہیں، تم لوگوں کے پاس پستول ہی کافی ہیں۔“

”تم ہم پر اعتبار نہیں کر رہے، تمہاری نیت میں کھوٹ ہے۔“ جمشید برہم ہو گیا۔

”ممکن ہے یہ تم لوگوں کی چال ہو۔“ بختیار نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ ”اس طرح تم ہمیں بس سے نکال کر قابو کرنا چاہتے ہو۔“

”آپس میں لڑنے کا فائدہ صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جو باہر موجود ہے۔“ شارق نے مداخلت کی۔ ”میرے پاس پستول بھی نہیں ہے، مجھے کوئی پستول ہی دے دو۔“

سلطان نے بختیار سے کہا۔ ”اسے پستول دے دو۔ اس وقت سب کا مسلح ہونا لازمی ہے۔“

”باہر میں، شارق اور امیر خان جائیں گے۔“ بختیار نے لاکر سے ایک عدد پستول نکال کر شارق کو تھمایا اور سلطان سے کہا۔ ”تم یہیں رکو گے۔“

”ٹھیک ہے، بس میں بھی دو افراد کا موجود ہونا ضروری ہے۔“ جمشید نے بختیار کی تائید کی۔

وہ تینوں باہر نکل آئے۔ امیر خان نے شارق سے پوچھا۔ ”تم نے اسے کس طرف جاتے دیکھا تھا؟“

”اس ڈھلان کی طرف۔“ شارق نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

”وہ پتھر بھی اسی طرف سے آیا تھا۔“ امیر خان نے تشویش سے کہا۔

”جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ کوئی بندر ہو گا۔“ شارق نے طنز کیا۔ ”میں نے آج تک اتنی بلندی پر کہیں بندر نہیں دیکھے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ کوئی آدمی ہے؟“

”یہ تو تم بتا سکتے ہو...... ہمیں تم ہی یہاں لائے ہو۔“ امیر خان بولا۔ ”تمہارا دعویٰ تھا کہ یہ جگہ سب کی نظروں سے محفوظ ہے۔“

”میرا اب بھی یہی کہنا ہے۔“ بختیار جھنجلا گیا۔ ”لیکن جس طرح ہم آئے ہیں، اسی طرح کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔“

”کیا تم نے پوری وادی کا سروے کیا تھا؟“

شارق کے اس سوال پر بختیار چونکا۔ ”کیا مطلب...... ؟“

”مطلب یہ کہ ہو سکتا ہے کوئی پہلے سے یہاں موجود ہو۔“

”کوئی پہلے سے یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟“

”جیسے ہم ہو سکتے ہیں۔“ شارق بولا۔

”ہم فضول کی بحث میں الجھ رہے ہیں۔“ امیر خان بولا۔ ”ہمیں حمزہ کو تلاش کرنا چاہیے۔“

وہ تینوں کسی قدر پھیل کر ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ چاند نکل آنے کے بعد کھلی جگہوں پر تو روشنی تھی لیکن درختوں تلے اندھیرا ہی تھا۔ انہوں نے ٹارچیں روشن کر لی تھیں۔ وہ روشنیاں لہراتے ہوئے حمزہ کو آوازیں دے رہے تھے۔ اچانک شارق کو ٹارچ کی روشنی میں زمین پر کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھا اور پھر یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ زمین پر خون کا بڑا سا دھبا تھا اور روشنی پڑنے پر خون کی ہموار سطح چمکی تھی۔ اس نے ان دونوں کو آہستہ سے آواز دی۔ وہ لپک کر آئے اور خون دیکھ کر ان کا ردِعمل بھی ایسا ہی تھا۔ امیر خان نے چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”حمزہ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔“

”ٹارچیں بند کر دو۔“ بختیار نے کہا اور انہوں نے روشنی بجھا دی۔ صرف خون کا دھبا ہونا اور حمزہ کا غائب ہو[نا] اس بات کی دلیل تھی کہ اسے کوئی فطری حادثہ پیش نہیں آیا [تھا] بلکہ اس پر کسی جانور یا انسان نے حملہ کیا تھا اور پھر اسے وہا[ں] سے لے گیا تھا کیونکہ آس پاس وہ دیکھ چکے تھے کہ حمزہ کا نام [و] نشان تک نہیں۔ بختیار نے کہیں سے ایک چھوٹی پنسل ٹارچ برآمد کی اور اس کی روشنی میں زمین دیکھنے لگا۔ اس کی روشنی اتنی محدود تھی کہ دور سے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ اس خون کے دھبے سے کچھ آگے ایک دھبا اور بھی تھا لیکن یہ چھوٹا تھا۔ یہ دھبے ڈھلان کے اوپری حصے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ تینوں بہت چوکنے تھے۔ انہوں نے ہتھیار نکال لیے تھے اور ذرا سی آہٹ پر فائر کرنے کے لیے تیار تھے لیکن بختیار نے انہیں خبردار کیا۔

”میری اجازت کے بغیر کوئی فائر نہیں کرے گا۔ یہاں گولی کی آواز خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیسے...... یہ وادی تو ویران ہے۔“

”ہاں لیکن یہاں سے سرحد قریب ہے اور آج کل حالات ایسے چل رہے ہیں کہ ممکن ہے سرحدی محافظوں کا کوئی دستہ آس پاس ہو اور وہ تفتیش کے لیے آ جائیں۔“

قانون کے رکھوالے آتے یا ملک کے رکھوالے، دونوں صورتوں میں ان کے لیے مشکل ہو جاتی۔ امیر خان نے اعتراض کیا۔ ”تب ہمیں بھی سائلنسر والا ہتھیار دینا تھا۔“

وہ خون کے دھبوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی مقدار کم ہوتی جا رہی تھی۔ بختیار زمین پر دیکھ رہا تھا اور اس کی نظر سامنے نہیں تھی۔ شارق نے پہلے اس ہیولے کو محسوس کیا اور اس نے پستول بلند کیا تھا کہ بختیار اس ہیولے سے ٹکرا گیا اور اس نے بے ساختہ ٹریگر دبا دیا۔ ایک بے آواز برسٹ نے ہیولے کو چھلنی کر دیا لیکن وہ کوئی آواز نکالے بغیر آگے پیچھے جھولتا رہا۔ بختیار نے ہڑبڑا کر پیچھے ہوتے ہوئے ٹارچ بلند کی لیکن اس سے پہلے ہی شارق ٹارچ روشن کر چکا تھا اور ان کے سامنے ایک بھیانک منظر آ گیا۔ یہ حمزہ تھا جو ایک رسّی کے سہارے درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ بختیار کی چلائی ہوئی گولیاں اسے لگی تھیں لیکن وہ اس سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا اپنا خون پھیلا ہوا تھا۔ شارق بڑبڑایا۔ ”یہ کیا...... ؟“

”میرے خدا۔“ امیر خان بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ کیا ہوا؟“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ بختیار بھڑک کر بولا۔ ”یہ پہلے ہی مر چکا تھا۔“

”میں اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی بات کر رہا ہوں۔“ امیر خان بولا۔ ”کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا ہے۔“

”وہ ہم میں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔“ بختیار بولا۔

”یہ نہیں کر سکتا۔“ امیر خان نے اپنے پستول کا رخ شارق کی طرف کر دیا۔

”تمہارا دماغ درست ہے۔ میں ایسا کیوں کرنے لگا؟“ شارق بولا، وہ پیچھے ہٹنے لگا۔

”تم ان لوگوں کے ساتھی ہو اور ان کے کہنے پر ایسا کر سکتے ہو۔“ امیر خان بولا اور اب پستول کا رخ بختیار کی طرف کر دیا۔

”یہ پاگل ہو گیا ہے۔“ شارق بدستور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کوئی دوسرا انسان ہے جس نے حمزہ کو مارا ہے اور تم لوگ اسے تلاش کرنے کے بجائے آپس میں لڑ رہے ہو۔“

”دوسرا انسان۔“ امیر خان طنزیہ انداز میں ہنسا اور اس نے اچانک ہی شارق پر فائر کر دیا۔ وہ بال بال بچا۔ گولی اس کے بازو کے پاس سے گزری۔ ہڑبڑاہٹ میں اس کا توازن بگڑا اور وہ گر پڑا۔ بختیار اور امیر خان یہی سمجھے کہ اسے گولی لگ گئی ہے۔ فائر کی آواز پہاڑوں میں گونجی اور بختیار نے چلّا کر کہا۔ ”یہ کیا کیا تم نے....“

امیر خان بہت چالاک اور تیز انسان تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب بختیار کا کیا ردِعمل ہو گا۔ اس نے شارق پر فائر کرتے ہی ایک درخت کے پیچھے چھلانگ لگائی اور بختیار کا چلایا ہوا برسٹ زمین پر لگا۔ وہ بھی فوراً ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور اس نے ٹارچ بھی بجھا دی۔ ان میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ شارق رینگتا ہوا ایک اور درخت کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ فائر کی آواز بس تک پہنچی تھی اور کچھ دیر بعد سلطان کے چلّانے کی آواز آنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر بختیار کو آوازیں دے رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ بختیار نے چلّا کر کہا۔ ”امیر خان کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ اس نے شارق کو مار دیا ہے۔ تم یہاں مت آنا۔“

شارق نے تردید کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اسے خطرہ تھا کہ اسے زندہ پا کر امیر خان پھر اسے مارنے کی کوشش کرے گا۔ وہ آواز پیدا کیے بغیر اس جگہ سے دور جانے لگا۔ امیر خان نے بختیار سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ شارق ہی حمزہ کا قاتل ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو یقین کرو، میں نے یا سلطان نے اسے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔“

”میں اس بات پر یقین کر سکتا ہوں۔“ امیر خان نے کہا۔ ”لیکن اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ حمزہ کو یہاں کسی اور نے قتل کیا ہے۔“

”ممکن ہے اس کا حمزہ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو اور اس نے مشتعل ہو کر اسے قتل کر دیا ہو۔“ بختیار، امیر خان کو جیسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف امیر خان کو بھی اپنی اور جمشید کی فکر لگ گئی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ اسلحے کے زور پر بختیار اور سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس خودکار اور بڑے ہتھیار تھے اس لیے وہ مصالحت سے کام لے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں لیکن کیا ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتے ہیں؟“ امیر خان نے سوال کیا۔

”ہمیں کرنا پڑے گا۔“ بختیار نے کہا پھر اس نے روشنی اس طرف کی جہاں شارق گرا تھا۔ اسے غائب دیکھ کر وہ چونکا۔ ”ارے، یہ کہاں گیا؟“

”وہ... بچ گیا۔“ امیر خان نے گالی دی۔ ”اسی سے اندازہ لگا لو، وہ کس قدر مکار ہے۔ شاید سب کو مار کر اکیلے اس ساری دولت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔“

”ہمیں فوری طور پر بس کی طرف جانا ہو گا۔“ بختیار نے پریشان ہو کر کہا۔ ”کہیں وہ ہم سے پہلے وہاں نہ پہنچ جائے۔“

امیر خان اس پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ”ہم الگ الگ راستوں سے بس کی طرف جاتے ہیں۔“

شارق دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح محتاط ہو کر بس کی طرف جا رہے تھے۔ وہ درختوں اور پتھروں کی آڑ لے رہے تھے اور ایک دوسرے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

سلطان اور جمشید ایک دوسرے کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھے۔ سلطان کے پاس رائفل تھی تو جمشید نے بھی پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ بدگمانی دونوں طرف سے تھی لیکن دونوں ہی اسے ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ جمشید پچھلے حصے میں اپنی نشست پر بیٹھا تھا جبکہ سلطان سامنے والے حصے میں دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ اچانک باہر سے فائر

کی آواز آئی۔ سلطان نے جمشید کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’ہوشیار رہنا۔‘‘

’’تم کہاں جارہے ہو؟‘‘

’’میں دیکھ کر آتا ہوں کہ یہ فائر کس نے کیا ہے۔‘‘ سلطان بولا اور باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ پستول امیر خان اور شارق کے پاس ہیں۔ شارق سے اسے توقع نہیں تھی کہ وہ ایسی کوئی حرکت کرے گا لیکن امیر خان اور حمزہ پر اسے بالکل بھروسا نہیں تھا۔ اسے حمزہ کا غائب ہونا بھی ڈراما لگ رہا تھا۔ اس نے نیچے آتے ہی چلّا کر بختیار کو آواز دی اور جب تک اس کی طرف سے جواب نہیں آیا، اسے آوازیں دیتا رہا۔ بختیار نے چلّا کر بتایا کہ امیر خان نے شارق کو مار دیا ہے۔ سلطان کا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ کچھ بھی سہی شارق اس کا دور پرے کا رشتے دار تھا۔ سلطان واپس بس کی طرف جانے کے بجائے وہیں رک گیا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں تھا اور اوپر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے جنگل کی طرف سے بختیار اور امیر خان کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ نیچے آنے لگے۔ امیر خان اور بختیار الگ الگ آرہے تھے اور سلطان ان کے تاریک ہیولوں میں فرق کرنے سے قاصر تھا اس لیے اس نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ جب وہ سامنے آئے اور بختیار اپنی رائفل سے الگ پہچانا جانے لگا، تب سلطان نے ان کی واضح گفتگو سنی۔ وہ شارق کو گالیاں دے رہے تھے اور اسے اس صورتِ حال کا ذمے دار قرار دے رہے تھے۔ سلطان ان کے سامنے آگیا۔ ’’بختیار! کیا ہوا ہے؟‘‘

بختیار پہلے ہی بھڑکا ہوا تھا اور اس نے بروقت خود کو فائر کرنے سے روکا۔ وہ برہمی سے بولا۔ ’’تم اس طرح سامنے کیوں آئے؟ ابھی میں فائر کر دیتا تو۔ شارق عیار نکلا، اس نے حمزہ کو گلا کاٹ کر قتل کر دیا اور اس کی لاش ایک درخت سے الٹی لٹکا دی ہے۔‘‘

سلطان حیران رہ گیا۔ ’’نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔‘‘

’’اس نے ایسا ہی کیا ہے۔‘‘ امیر خان تند لہجے میں بولا۔ ’’میں نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اتنا چالاک ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کے لیے زمین پر گر گیا اور جب ہماری توجہ اس کی طرف نہیں رہی تو وہ خاموشی سے کہیں غائب ہوگیا۔‘‘

سلطان نے اوپری جنگل کی طرف دیکھا۔ ’’وہ کہاں جا سکتا ہے... اسی جنگل میں کہیں ہوگا۔‘‘

’’ہاں، اس کے پاس پستول ہے اور اس نے کتنی مہارت سے حمزہ پر خنجر کا استعمال کیا ہے۔‘‘ امیر خان نے تیز لہجے میں کہا۔ ’’وہ سب کو الگ الگ شکار کر سکتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے۔‘‘

رات کے ڈھائی بج رہے تھے بختیار نے کہا۔ ’’صبح میں کچھ ہی وقت ہے۔ ہم چل کر رقم بانٹ لیتے ہیں اور صبح کی روشنی ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔‘‘

امیر خان نے فوراً مطالبہ پیش کیا۔ ’’ٹھیک ہے لیکن شارق اور حمزہ کا حصہ بھی تم ہمیں دو گے۔‘‘

بختیار نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ ’’ٹھیک ہے۔‘‘

وہ واپس بس کی طرف آئے اور جیسے ہی سلطان بس میں داخل ہوا، اسے لاکر کا کھلا ہوا خانہ نظر آگیا۔ اس کے پیچھے بختیار تھا۔ وہ چلّایا۔ ’’یہ کیا...؟‘‘ وہ لاکر کی طرف جھپٹا لیکن دور سے نظر آرہا تھا کہ اس میں سوٹ کیس نہیں ہیں۔ نہ صرف سوٹ کیس بلکہ ان کا اضافی اسلحہ بھی غائب تھا۔ ان کی توجہ جمشید کی طرف نہیں گئی تھی۔ اسے امیر خان نے دیکھا، وہ اپنی نشست پر پڑا تھا اور اس کی بے نور آنکھیں چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کے گلے میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا تیر پیوست تھا۔ اس قسم کا تیر ایروشوٹر سے مارا جاتا ہے۔ امیر خان چلّایا۔ ’’جمشید.....‘‘ وہ گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھا اور پھر اس نے سلطان کی طرف دیکھا۔ ’’یہ تم نے کیا کیا؟‘‘

سلطان پہلے ہی حواس باختہ تھا۔ ’’میں نے... میں نے کب کیا کچھ؟‘‘

بختیار نے یک دم اٹھ کر بس کی اندرونی لائٹس بجھا دیں اور ان سے کہا۔ ’’سب خاموش اور نیچے ہوجاؤ۔ یہ ہم میں سے کسی کا کام نہیں ہے۔ شارق کا بھی نہیں ہے۔‘‘

وہ نیچے دبک گئے۔ امیر خان بولا۔ ’’پھر کس کا کام ہے؟‘‘

’’یہاں کوئی اور شخص ہے۔ اس نے حمزہ کا گلا کاٹا جبکہ ہم میں سے کسی کے پاس چاقو یا خنجر نہیں ہے، صرف کچن میں ایک دو چاقو ہیں یا ہمارے سامان میں پیک ہیں۔ پھر اس قسم کا ایروشوٹر کسی کے پاس نہیں ہے جس سے جمشید کو مارا گیا ہے۔ وہ جو بھی ہے، بہت چالاک ہے اور ہم پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے۔‘‘

سلطان فکرمند ہوگیا۔ ’’وہی ہمارے سوٹ کیس نکال کر لے گیا ہے اور اب وہ مسلح بھی ہے۔ اس کے پاس تین عدد خودکار رائفلیں اور ایک شاٹ گن ہے۔‘‘

’’تب اس نے حملہ کیوں نہیں کیا؟‘‘ امیر خان بولا۔ اسے بھی یقین آگیا تھا۔ شارق یہ سب نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی سلطان اور بختیار کر سکتے تھے۔ اگر یہ ان کا کام تھا تو انہیں ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آرام سے اس کا بھی کام تمام کر سکتے تھے۔

’’کیونکہ وہ بہرحال اکیلا ہے اور ہم تین ہیں۔‘‘ بختیار نے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ’’صبح ہونے دو پھر ہم اسے دیکھیں گے۔‘‘

☆☆☆

شارق اکیلا تھا اور اسے سردی بھی لگ رہی تھی لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے صورتِ حال کے تمام پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں اس وادی میں کوئی اور انسان بھی ہے اور اسی نے حمزہ کو مار کر اس طرح الٹا لٹکایا تھا۔ مگر اس نے یہ سلوک کیوں کیا؟ اس طرح تو بدترین دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے یا جس سے آدمی کو شدید نفرت ہو۔ حمزہ سے یہاں موجود شخص کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ پھر کسی تیز دھار چیز سے گلا کاٹنا ظاہر کرتا تھا کہ اس نے گھات لگا کر قتل کرنے کے ارادے سے حملہ کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ باقی لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ شارق ڈھلان کے اوپری حصے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ فی الحال امیر خان اور بختیار سے دور جانا چاہتا تھا جو اس کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ اس کے پاس ٹارچ موجود تھی لیکن اس نے اسے جلانے سے گریز کیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ آدمی روشنی دیکھ کر اس کے بارے میں نہ جان جائے۔ وہ حرکت بھی بہت احتیاط سے کر رہا تھا تاکہ چلنے کے دوران آواز پیدا نہ ہو۔ ایک مناسب جگہ سے اس نے ندی پار کی اور دوسری طرف آیا تو اسے اوپر درختوں کے درمیان ایک مکان کی ترچھی چھت دکھائی دی۔

شارق ٹھٹک گیا۔ وہ لوگ وادی کے جس حصے میں رکے تھے وہاں سے یہ چھوٹا سا مکان نظر نہیں آرہا تھا۔ ویسے بھی یہ گھنے درختوں کے درمیان اس طرح سے چھپا ہوا تھا کہ پاس سے بھی مشکل سے ہی نظر آتا۔ شارق اتفاق سے ایسے زاویے سے آیا تھا جب اسے رات میں اور ہلکی چاندنی میں بھی اس کی چھت دکھائی دے گئی۔ اسے خیال آیا کہ یہ اسی پراسرار آدمی کا مکان ہے جس نے حمزہ کو قتل کیا ہے۔ وہ ہچکچایا لیکن پھر مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے عام راستے کے بجائے درختوں کے درمیان سے گزرنے کو ترجیح دی۔ پانچ منٹ بعد وہ مکان کے سامنے تھا۔ یہ لکڑی سے بنا ہوا ایک بھونڈا سا لیکن بہت مضبوط کیبن تھا۔ سامنے کی طرف ایک دروازہ تھا۔ شارق نے آہستہ سے دروازہ کھولا لیکن پھر بھی اس سے خاصی آواز بلند ہوئی۔

کیبن کے اندر ایک طرف دیوار پر مشعل لگی تھی۔ فرش پر کھالیں اور ایسا سامان بکھرا ہوا تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ اس کیبن کے مالک کا انسانوں سے کوئی رابطہ نہیں اور وہ اپنے طور پر زندگی گزار رہا ہے۔ ایک طرف لوہے کا چولہا اور آتش دان تھا جو کھانا بنانے کے ساتھ کیبن کو گرم رکھنے کے کام بھی آتا تھا۔ کھالیں اور دیواروں کے ساتھ الگنی پر لٹکا ہوا خشک گوشت بتا رہا تھا کہ وہ شخص شکار پر گزارہ کرتا ہے۔ ایک طرف پرانی ساخت کی بندوق رکھی تھی۔ اس کا دستہ اور اگلا حصہ لکڑی پر مشتمل تھا مگر اس کی حالت بہت اچھی تھی۔ ان چیزوں کے سوا کیبن میں اور کچھ نہیں تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی دروازے کی طرف آرہا ہے۔ شارق چوکنا ہوگیا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ آواز دور سے آئی تھی۔ وہ بھاگ کر درختوں کے درمیان آیا جہاں اس کے دیکھ لیے جانے کا امکان کم ہی تھا۔ وہ درختوں میں دبکا ہوا کیبن کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن کوئی کیبن کی طرف نہیں آیا۔ خاصی دیر بعد شارق کھڑا ہوگیا۔ یہ اس کا وہم تھا۔ اسی لمحے اسے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا کہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

شارق کو ہوش آیا تو وہ کیبن میں اس طرح پڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا۔ سر کی چوٹ کاری تھی لیکن گہری نہیں تھی اسی لیے اسے جلدی ہوش آگیا۔ وہ شخص چولہے کے پاس بیٹھا ہوا کچھ گرم کر رہا تھا۔ شارق کو اس کی مہارت پر حیرت ہوئی۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کب اس کے پیچھے آگیا اور اس کے سر پر وار کر دیا۔ اس نے کھالوں سے بنا ہوا عجیب سا لباس پہن رکھا تھا اور یہ لباس بھی یقیناً اس نے خود ہی بنایا تھا۔ شارق کوشش کر کے اٹھ بیٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ وہ آدمی جان گیا تھا کہ وہ ہوش میں آگیا ہے مگر اس نے شارق کی طرف توجہ نہیں دی۔ شارق کو خود ہی پوچھنا پڑا۔ ’’کون ہو تم؟‘‘

اس نے کیتلی سے کپ میں کوئی بھاپ اڑاتی چیز نکالی اور اس کی طرف گھوما۔ وہ تقریباً پچاس برس کا صحت مند اور کسی قدر چینی نقوش والا شخص تھا۔ اس طرف پہاڑوں میں اس قسم کے نقوش عام تھے، گویا وہ کوئی مقامی تھا۔ اس کے براؤن بال کہیں کہیں سے سفید ہو رہے تھے۔ اس نے وہی بھاپ اڑاتی گرم چیز ایک اور مگ میں بھی نکالی اور شارق کے

پاس آیا۔ ”سوال تم نہیں، میں کروں گا... میں کروں گا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”میرا نام شارق ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اجنبی کے انداز میں کوئی ایسی چیز تھی کہ وہ اس سے جھوٹ نہیں بول سکا۔ پھر اس نے باقی لوگوں اور یہاں ان کی موجودگی کے بارے میں سوالات کیے۔ شارق سچ بولتا رہا۔ اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے ڈکیتی اور رقم کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اجنبی سر ہلاتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”تم نے سچ بولا اور بچ گئے ورنہ میں تمہیں ابھی قتل کر دیتا۔“

”تم کون ہو اور میرے ساتھی کو کیوں مارا؟“

اجنبی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ خود بھی گرم محلول پیتا رہا اور شارق کو بھی پلاتا رہا۔ شارق نے اندازہ لگایا کہ یہ چائے جیسی خاصیت رکھنے والی کوئی مقامی بوٹی تھی۔ اس کا ذائقہ اور خوشبو اچھی تھی۔ دونوں نے مگ خالی کر دیے۔ پھر اجنبی اٹھا اور کیبن کے دروازے کے پاس تک گیا۔ اس نے وہاں سے سوٹ کیس اٹھائے تو شارق چونک گیا۔ یہ رقم والے سوٹ کیس تھے اور یہ بس کے لاکر میں تھے۔ یہ اس آدمی کے پاس کہاں سے آگئے؟ صرف سوٹ کیس ہی نہیں، وہ لاکر میں موجود اسلحہ بھی اٹھا لایا تھا۔ اس نے کیبن کے آخری حصے میں فرش سے ایک تختہ الگ کیا، اس پر تالا لگا تھا۔ اس نے تالا کھول کر تختہ اوپر کر دیا۔ پھر اس نے رائفلیں اور شاٹ گن اس میں ڈالیں اور اندر سے ایک گول ڈبا نما چیز نکالی۔ اس کے ساتھ کچھ تاریں بھی تھیں۔ اس نے یہ ڈبا نما چیز لی اور دونوں سوٹ کیس اٹھا کر کیبن سے باہر چلا گیا لیکن ایک منٹ بعد ہی وہ واپس آگیا۔ اس نے شارق کو کھینچ کر دیوار کے ساتھ کیا اور اس کے ہاتھوں سے بندھی رسی کو ایک کیل سے بھی باندھ دیا۔ آخر میں اس نے شارق کے منہ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی بال ٹھونس کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا۔ اب وہ آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ یہ کام کر کے وہ آدمی باہر چلا گیا۔

شارق اس کی چالاکی پر حیران ہوا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس نے شارق کو اس طرح کیبن میں چھوڑا تو وہ خود کو آزاد کرانے کی یا کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا اس لیے اس نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ کوئی حرکت کر سکے۔ دروازہ بند تھا اور باہر سے کوئی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ کہیں دور گیا تھا۔ رقم سے بھرے سوٹ کیس دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی تھی اور وہ انہیں کہیں چھپانے گیا تھا۔ سوٹ کیس اور اسلحہ اس کے پاس دیکھ کر شارق کو اب باقیوں کی سلامتی بھی مشکوک نظر آنے لگی تھی۔ اگرچہ انہوں نے شارق کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور وہ خود بھی اچھے انسان نہیں تھے اس کے باوجود شارق نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس شخص کے ہاتھوں حمزہ کی طرح مارے جائیں۔ نہ جانے اس نے یہ چیزیں کس طرح حاصل کر لی تھیں۔ بختیار، امیر خان اور سلطان اسے اتنی شرافت سے تو رقم اور اسلحہ لے جانے نہیں دیتے۔

شارق نے کیبن کا جائزہ لیا۔ ایک طرف دیوار پر ایک بھورے رنگ کی پوری آستین کی موٹی اونی شرٹ اور اسی رنگ کی ٹوپی تھی۔ یہ پی کیپ کا چینی انداز تھا جو عام طور سے چینی فوجی پہنتے ہیں۔ شارق سخت اذیت میں تھا، وہ کوشش کر کے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس طرح اسے ذرا سکون ملا۔ شارق کا اندازہ تھا کہ صبح کے چار بج رہے ہیں اور ابھی سویرا ہونے میں کم سے کم دو گھنٹے تھے۔ وہ آدمی آدھ گھنٹے بعد لوٹ آیا۔ اس کے پاس سوٹ کیس اور وہ گول سی چیز نہیں تھی۔ وہ سیدھا چولھے کی طرف آیا اور اس پر رکھی کیتلی سے چائے مگ میں ڈال کے شارق کے پاس آیا اور اس کا منہ کھول دیا۔ شارق نے چند گہرے سانس لیے اور بولا۔

”تم کون ہو اور یہ سب کیا کر رہے ہو؟ کیا تم نے میرے باقی ساتھیوں کو بھی مار دیا ہے؟“

”وہ دونوں اپنی حماقت سے مارے گئے۔“ اس نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”پہلے نے گلے پر چاقو محسوس کرتے ہوئے بھی پستول نکال لیا تھا تو مجھے اس کی گردن کاٹنی پڑی۔ دوسرے نے میری وارننگ کے باوجود مجھ پر فائر کرنے کی کوشش کی اور مجبوراً اسے بھی مارنا پڑا۔“

وہ آدمی بہت صاف اردو بول رہا تھا۔ اگرچہ لہجہ مقامی تھا مگر وہ پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ شارق کو حیرت تھی کہ وہ ویرانے میں اکیلا کیا کر رہا ہے اور اس نے کتنی آسانی سے دو چھٹے ہوئے بدمعاشوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ”دوسرا کون ہے جسے تم نے مارا ہے؟“

”جو بس میں تھا، اس کی ٹانگ میں پٹی بندھی تھی۔“

”پہلے کا نام حمزہ ہے اور دوسرا جمشید ہے۔“ شارق نے بتایا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون ہیں، بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ ڈاکو اور جرائم پیشہ ہیں۔“

”اگر وہ ڈاکو اور مجرم ہیں تو تم نے بھی وہی رقم چرا لی ہے۔“ شارق نے کہا تو وہ مشتعل ہو گیا۔

”بکواس بند کرو۔ میں اس دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

”تم جانتے ہو، وہ مقامی کرنسی میں اسی کروڑ روپے بنتے ہیں۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تب تم سوٹ کیس کہاں لے گئے؟“

وہ مسکرایا۔ ”تم دیکھ لوگے، بس صبح ہونے دو۔ یہ بتاؤ کہ تم ان میں کیوں شامل ہو گئے؟“

”میں سب بتا چکا ہوں، مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ پیشہ ور مجرم ہیں۔ ایک بار واردات میں شامل ہو گیا تو اس کے بعد میں ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔“

”کوئی مجبور نہیں تھے، آدمی اگر چاہے تو اپنا ایمان ہر صورت میں بچا سکتا ہے۔ مجبوریاں اصل میں بہانے ہیں۔“

شارق خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم کون ہو اور اس ویرانے میں کیوں رہ رہے ہو؟“

”کیونکہ میں اس دنیا میں نہیں جانا چاہتا جہاں سوائے بے ایمانی اور دھوکے بازی کے کچھ نہیں ہے۔ جہاں لوگ فرشتوں کا حلیہ بناتے ہیں اور ان کے اعمال شیطان کو بھی شرماتے ہیں۔ جہاں لوگ باتوں سے ولی اللہ بنتے ہیں اور کام وہ شیطان کے چیلے والے کرتے ہیں۔ میں لعنت بھیج آیا ہوں اس دنیا پر۔“

”لیکن تم اکیلے تو نہیں ہو گے، تمہارے ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچے بھی ہوں گے؟“

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”کبھی تھے، اب نہیں ہیں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں اس لیے رہتا بھی اکیلا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تم اکیلے رہتے ہو لیکن اس طرح سے لوگوں کو مارنا ٹھیک ہے کیا؟“

”ایسے لوگوں کو مارنا ثواب کا کام ہے۔“

”تب تم مجھے بھی مار دو گے۔“ شارق نے کہا۔ ”ویسے اب تک زندہ کیوں رکھا ہے مجھے؟“

”پتا نہیں، شاید میں تمہیں ان لوگوں کا انجام دکھانا چاہتا ہوں جو میرے اس پُرسکون گھر میں گھس آئے ہیں اور اسے اپنے ناپاک قدموں سے گندا کیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد تمہیں بھی ان کے پیچھے روانہ کر دوں گا۔“

”تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کہ تم اس سے پہلے بھی یہاں آنے والوں کو قتل کرتے رہے ہو۔“

”سب کو نہیں۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”صرف ان لوگوں کو جن کے بارے میں میں جان جاتا تھا کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور وہ انسان کے لبادے میں شیطان ہیں۔“

”یہ تم کیسے جانتے ہو کہ انسان کے لبادے میں کون شیطان ہے؟“

”جیسے تم لوگوں کے بارے میں جان گیا۔“

شارق سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”تم میرے ساتھیوں کے بارے میں جانتے نہیں ہو۔ وہ بہت خطرناک اور قاتل لوگ ہیں۔ انہوں نے اس دولت کو لوٹنے کے دوران چار افراد کو قتل کیا ہے۔“

”کیا تم مجھے ان سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”میرا نہیں خیال کہ تم کسی سے ڈرتے ہو۔ میں صرف تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔“

”تم پڑھے لکھے ہو؟“

”ہاں، میں نے گریجویشن کیا ہے۔ ویسے تعلیم یافتہ تو تم بھی لگ رہے ہو؟“

اجنبی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تب تو تمہیں یقیناً کوئی اچھی نوکری ملی ہو گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں، بیس سال پہلے میں شمالی علاقے میں بننے والی ہائی وے کی تعمیر میں شامل تھا۔“

”پھر تم نے ملازمت چھوڑ دی؟“

”میں نے بتایا نا یہ دنیا میرے لیے اور میں اس دنیا کے لیے نہیں ہوں۔“ وہ غرایا اور مگ رکھ کر ایک طرف بچھی کھالوں پر لیٹ گیا۔

”مجھے کم سے کم اس کیل سے کھول دو۔ اس طرح میں بہت تکلیف میں ہوں۔“ شارق نے التجا کی۔ نہ جانے کیوں اسے اس شخص سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے دو ساتھیوں کو قتل کر چکا تھا اور اس کے بارے میں بھی اس کے عزائم اچھے نہیں تھے۔ شارق کی التجا سن کر وہ کچھ دیر لیٹا رہا پھر اس نے اٹھ کر اس کے ہاتھ کی رسی کیل سے نکال دی۔ شارق فرش پر لڑھک گیا۔ باہر یقیناً اچھی خاصی سردی تھی لیکن کیبن میں اس کا اثر بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ اجنبی نے لیٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ میں تمہیں اتنی جلدی نہیں مارنا چاہتا۔“

شارق کو اس کی بے فکری پر تعجب تھا۔ وہ اسے پکڑ کر لے آیا تھا۔ بے شک وہ بندھا ہوا تھا مگر اس کے ساتھی تو باہر آزاد تھے۔ اسے ڈر نہیں تھا کہ اس کے سونے کے دوران وہ یہاں تک آگئے تو اسے فوراً قتل کر دیں گے۔ اس نے اجنبی سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”وہ صبح سے پہلے بس سے نکلنے کی جرأت نہیں کریں گے... اور اب اپنا منہ بند کر لو، اس سے پہلے کہ میں تمہارا منہ بند کر دوں۔“

شارق لکڑی کی گیند اب منہ میں نہیں لینا چاہتا تھا اس

لیے خاموش ہو گیا اور اجنبی کچھ دیر بعد خراٹے لینے لگا۔ شارق دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ چار گھنٹے سو لیا تھا اور پھر ان حالات میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ایک بار پھر اس شخص کے اطمینان پر تعجب ہوا۔ وقت گزرتا گیا۔ کیبن میں آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ کوئی سوراخ، بس کونے کھانچے تھے جن سے تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ باہر روشنی ہو گئی ہے یا نہیں۔ شارق کی گھڑی ہاتھ میں تھی اور ہاتھ پشت پر تھے اس لیے وہ وقت بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اجنبی بیدار ہو گیا۔ اس نے شارق کی طرف دیکھا۔ "تم سوئے نہیں.....؟"

"سزائے موت کے قیدی کو نیند کہاں آتی ہے۔" شارق نے سرد آہ بھری تو وہ مسکرایا۔ مسکرانے سے اس کی باریک آنکھیں بالکل لکیر بن گئی تھیں۔

"ویسے تم باہمت آدمی ہو ورنہ موت کا خدشہ محسوس کر کے میں نے اچھے اچھوں کو کانپتے دیکھا ہے۔"

"میرے لیے اب زندگی میں اتنی کشش نہیں رہی ہے۔" شارق نے مرجھائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ایسا تم اس لڑکی کی وجہ سے کہہ رہے ہو جو اب بھی تمہاری بیوی ہے؟"

"ہاں، میں نے اس سے محبت کی تھی اور اس نے مجھے دھوکا دیا۔ اس نے مجھ سے میرے باپ کی زمین ہتھیانے کے لیے محبت کا ڈھونگ رچایا تھا۔" شارق کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ وہ اپنے باپ کے بہکاوے میں آ گئی ہو لیکن تم سے سچ مچ محبت کرتی ہو۔"

"اگر وہ مجھ سے محبت کرتی تو میرے چھوٹے سے گھر میں میرے ساتھ خوش رہتی لیکن وہ اپنے باپ کے پُر آسائش گھر چلی گئی۔"

"پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ اپنے باپ کے بہکاوے میں آئی ہے اور تم سے اب بھی محبت کرتی ہے۔"

"اب ان باتوں کا فائدہ۔" شارق نے مایوسی سے کہا۔ "اگر وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے، تب بھی تم مجھے چھوڑنے والے نہیں ہو۔"

وہ چونکا۔ "تم نے اچھا یاد دلایا۔"

اس نے چولہے پر سے کیتلی ہٹا کر ایک توا رکھا اور خشک گوشت کے پارچے اس پر پکنے کے لیے رکھ دیے۔ یہ بالکل سادہ گوشت تھا۔ ظاہر ہے یہاں نمک مرچ اور مسالوں کے لوازمات کہاں سے میسر آتے۔ چند منٹ میں پارچے نیم کچے پکے انداز میں بھن گئے۔ اس نے پارچے اٹھا کر ایک لکڑی کی ٹرے میں رکھے اور ٹرے اس کے پاس لے آیا پھر اس نے ایک خنجر نما چاقو نکالا تو شارق ایک لمحے کو خوف زدہ ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ شاید وہ اسے بھی ذبح کرنے والا ہے لیکن اس نے خنجر سے شارق کے ہاتھ کی رسّی کاٹ دی اور ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ "کھاؤ۔"

شارق اس کے ساتھ اس ناشتے میں شریک ہو گیا۔ ناشتے کے بعد اس نے وہی چائے نما قہوہ پیش کیا۔ اس کے بعد اس نے کھونٹی سے ٹنگی براؤن شرٹ اور ٹوپی پہنی، لکڑی کے دستے والی بندوق اٹھا کر شانے پر ٹانگی۔ اپنا خنجر اس نے موزے میں اڑس لیا تھا اور ہاتھ میں شارق کا پستول لیا۔ اس نے اشارے سے اٹھنے کو کہا تو شارق کھڑا ہو گیا۔ "کہاں لے جا رہے ہو؟"

"میں نے رات کو کہا تھا نا کہ تمہیں ایک مزے کا تماشا دکھاؤں گا۔ تم شبہ کر رہے تھے کہ میں نے رقم چرا لی ہے، تم وہ بھی دیکھ لو گے اور اپنے ساتھیوں کا حشر بھی۔"

شارق اس کے ساتھ کیبن سے باہر آیا تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور درختوں تلے ابھی اندھیرا تھا۔ شارق کا خیال تھا کہ صبح اچھی خاصی ہو گئی ہے لیکن چاروں طرف بلند پہاڑ ہونے کی وجہ سے نیچے تک روشنی دیر میں آتی تھی۔ وہ شارق کو لے کیبن کے جنوب کی طرف واقع ڈھلان کی طرف جانے لگا۔ کیبن کے عقب میں مغرب تھا اور سامنے مشرق جہاں سے سورج طلوع ہو رہا تھا تو لازمی طور پر اس سمت جنوب پڑتا تھا۔ یہاں جنگل کسی قدر چھدرا تھا اور جابجا خالی زمین بھی تھی۔ وہ چلتے چلتے ایک جگہ پہنچے تو شارق ٹھٹک گیا۔ ایک ایسی کھلی جگہ جو تقریباً سو گز لمبی اور تقریباً پچاس گز چوڑی تھی، اس کے عین وسط میں رقم والے دونوں سوٹ کیس ساتھ ساتھ رکھے تھے۔

"یہ رقم تم نے یہاں کیوں رکھی ہے؟"

"ابھی تماشا دیکھو برخوردار۔" اس نے کہا اور شارق کو آگے کی طرف دھکیلا۔ اس کھلی جگہ سے ذرا اوپر چند گھنے درختوں تلے تنے ملنے سے ایک غار سا بن گیا تھا۔ اجنبی شارق کو اس غار میں لے آیا۔ یہاں سے وہ نیچے میدان میں بخوبی دیکھ سکتے تھے لیکن کوئی انہیں پاس آ کر بھی اس جگہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے شارق کو دھکیل کر ایک طرف بٹھا دیا۔ "مجھے امید ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جو تمہاری مہلت کو قبل از وقت ختم کر دے۔"

"میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔" شارق نے

ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی میں صرف ڈرائیور ہوں، لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"تم اچھے ڈرائیور ہو، میں بس یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا کیونکہ یہاں تو جیپ بھی بڑی مشکل سے آتی ہے۔"

شارق چونکا۔ "یہاں جیپ آتی ہے؟"

"میں نے بتایا نا تم آنے والے پہلے لوگ نہیں ہو۔ تم سے پہلے بھی یہاں لوگ آتے رہے ہیں۔"

"تم نے انہیں مار دیا اور ان کی گاڑیاں شاید جھیل میں غرق کر دیں۔"

"ہاں، یہ جھیل بہت بڑی ہے۔ اس میں یہ بس بھی آسانی سے چھپ جائے گی۔" اس نے سر ہلایا اور پھر ایک چھوٹی سی نلکی نما دوربین نکالی اور اسے بائیں آنکھ سے لگائی۔ اس کی دائیں آنکھ شارق کی طرف تھی اور وہ اس پر بھی پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا بلکہ جب وہ اسے نہیں دیکھ رہا ہوتا تھا، تب بھی شارق کو محسوس ہوتا کہ اس کی حسیات شارق کی طرف متوجہ ہیں۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"تمہارے ساتھیوں کا انتظار۔" اس نے جواب دیا۔ "جلد یا بدیر وہ یہیں آئیں گے۔"

"وہ رقم کی تلاش میں پوری وادی چھان سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ یہاں آئیں۔"

"نہیں، وہ یہیں آئیں گے۔" اجنبی نے یقین سے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے۔" اس نے کہا اور اچانک پستول نکالتے ہوئے شارق پر فائر کیا۔ گولی کی آواز کے ساتھ شارق کی بے ساختہ چیخ بھی گونجی۔

☆☆☆

وہ تینوں صرف باہر سے نہیں بلکہ اندر بھی ایک دوسرے سے چوکنا تھے۔ امیر خان کو خدشہ تھا کہ کہیں وہ اچانک اسے گولی نہ مار دیں اور شاید یہی خدشہ سلطان اور بختیار کو بھی اس کی طرف سے تھا۔ انہوں نے بس کے دروازے والے حصے میں ایک چھوٹی لائٹ روشن کر لی تھی۔ اس کی روشنی پچھلے حصے تک مشکل سے آ رہی تھی جہاں وہ تینوں موجود تھے۔ سلطان اور امیر خان بات کر رہے تھے جبکہ بختیار کسی سوچ میں گم تھا۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر سیٹوں کے درمیان ٹہلنے لگتا تھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے اور ظاہر ہے نیند کسی کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ انہوں نے جمشید کی لاش کو پیچھے فرش پر لٹا کر ایک چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ اگر باہر اس نامعلوم شخص کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ اسے اب تک جھیل کی نذر کر چکے ہوتے مگر فی الحال وہ لاش کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ سلطان امیر خان سے کہہ رہا تھا۔

"سنو، اب ہم تین رہ گئے ہیں، اگر تم بھی ہمارے ساتھ چلو....."

"یہ کس طرح ممکن ہے؟ گرم لباس، جوتوں اور دستانوں کے بغیر میں تمہارے ساتھ یہ بلند پہاڑ کس طرح عبور کر سکتا ہوں؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے پاس ایسی چیزیں نہیں ہیں لیکن تم ہمت تو کر سکتے ہو۔ دوسری طرف پہنچ گئے تو ہر خطرے سے محفوظ ہو جاؤ گے۔"

مگر امیر خان کے نزدیک سب سے بڑا خطرہ تو وہ خود دونوں تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس سے بار برداری کا کام لیں گے اور جب ان کا مطلب نکل جائے گا تو وہ اسے انہی پہاڑوں میں دفن کر کے چلے جائیں گے۔ جمشید کے مارے جانے کے بعد اب وہ اس کی دولت کا دعوے دار بھی بننے کا سوچ رہا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ دولت کہاں تھی؟ بختیار کو یقین تھا کہ سوٹ کیس لے جانے والا اسے وادی سے باہر نہیں لے جا سکا ہو گا۔ وہ اسی وادی میں موجود تھا اور صبح روشنی ہوتے ہی وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ جاگتے رہنے اور چوکنا رہنے کے لیے وہ وقفے وقفے سے چائے کافی بنا کر پی رہے تھے۔ پانچ بجے سلطان نے ناشتا بنا لیا تاکہ اس کے بعد رقم کی تلاش میں انہیں نہ جانے کب تک مارا مارا پھرنا پڑے اور انہیں کھانے کا موقع بھی نہ ملے۔ اس کے ساتھ ہی سلطان اور بختیار نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ امیر خان نے حیرت سے کہا۔

"کیا تم لوگ ایسے ہی نکل جاؤ گے؟"

"نہیں، ہم رقم لے کر ہی جائیں گے۔" سلطان غصے سے بولا۔

"لیکن ہم تیاری پوری رکھیں گے۔ جیسے ہی رقم ملے گی، ہم روانہ ہو جائیں گے۔"

"اور یہ سامان اپنے ساتھ رکھو گے؟" امیر خان نے بھاری بھرکم بیگوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں کیونکہ ہم ان سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے۔" بختیار بولا۔ "ہم رقم کے بغیر تو پہاڑوں کے پار جا سکتے ہیں لیکن اس سامان کے بغیر نہیں۔"

رقم اور سوٹ کیس غائب ہونے کے بعد انہیں اپنے اس سامان کی فکر بھی لاحق ہوگئی تھی۔ امیر خان نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ ”تم اس سامان کے ساتھ اس شخص کو تلاش کرو گے جو ہمارے دو ساتھیوں کو قتل کر چکا ہے؟“

”یہ ہمارا مسئلہ ہے۔“ بختیار کا لہجہ سرد ہو گیا۔ وہ بس سے باہر نکل آئے اور بیگ اپنی اپنی پشتوں سے باندھے۔ ان کا وزن یقیناً اچھا خاصا تھا۔ امیر خان دیکھ رہا تھا کہ انہیں اسے اٹھانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس وزن کے ساتھ وہ اس وادی میں چھپے ایک ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے جس نے ان کے دو ساتھیوں کو قتل کیا تھا اور ان کی رقم اور اسلحہ لے گیا تھا۔ باہر ابھی ہلکی سی تاریکی اور دھند تھی۔ خلافِ توقع بختیار اور سلطان نے مشرقی سمت کا رخ کیا۔ انہوں نے امیر خان کو بس کے پاس ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ متجسس تھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں۔ مجبوراً وہ بس کے پاس رک گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئے تو ان کے بیگ ان کی پشتوں پر نہیں تھے۔ گویا وہ انہیں کہیں چھپانے گئے تھے۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اوپری چوٹیوں پر دھوپ آگئی تھی۔

”تم نے اپنے بیگ چھپا دیے ہیں؟“

”اب ہم اس کتے کے بچے کو تلاش کریں گے اور یہاں سے جانے سے پہلے اس کے ٹکڑے وادی میں بکھیر کر جائیں گے۔“ بختیار نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ وسطی ڈھلان میں کہیں ہوگا۔“ سلطان نے اوپر کی طرف دیکھا۔

”ہمیں پھیل کر اوپر کی طرف بڑھنا چاہیے۔“ بختیار نے کہا۔ ”ایک دوسرے سے کم سے کم پچاس گز کا فاصلہ رکھنا ہوگا اور درختوں کی آڑ میں اوپر جانا ہوگا۔“

یہ احتیاط لازمی تھی کیونکہ اس شخص کے پاس کم سے کم ان کا اسلحہ موجود تھا۔ وہ پھیل کر ایک دوسرے سے ذرا فاصلے سے اوپر کی طرف جانے لگے لیکن ندی کراس کرنے کے لیے انہیں ایک ہی جگہ سے گزرنا پڑا۔ سلطان کی توجہ ندی کی تہ میں موجود ایک نیلے رنگ کی چیز کی طرف گئی۔ یہ رومال تھا جو ایک پتھر سے اٹک گیا تھا اور اسی وجہ سے پانی اسے بہا کر نہیں لے جا سکا تھا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”یہ شارق کا ہے۔“

”یعنی وہ بھی اس طرف گیا ہے۔“

امیر خان نے دائیں طرف موجود چھوٹے سے جنگل کو دیکھا۔ ”ظاہر ہے وہ یہاں ہماری نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے عافیت اسی میں سمجھی ہوگی کہ اوپر چلا جائے۔“

”شارق بے گناہ ہے۔“ سلطان نے اسے خبردار کیا۔ ”اب اگر تم نے اسے......“

”تم فکر مت کرو۔“ امیر خان نے مکاری سے کہا۔ ”میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

سلطان نے اس کے لہجے میں چھپی مکاری محسوس کر لی تھی۔ اسے لگا کہ امیر خان کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ شارق کو مار کر اس کے حصے پر بھی قابض ہو جائے گا۔ ندی سے نکلنے کے بعد وہ دوبارہ پھیل گئے۔ اب روشنی وادی کے نچلے حصے تک آرہی تھی۔ وہ خاصے فاصلے سے بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ اچانک انہیں فائر کی آواز سنائی دی اور پھر شارق کی چیخ گونجی۔ سلطان نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور اشارے سے فائر اور چیخ کی سمت بتائی۔ وہ سب اس طرف بڑھنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر اسرار شخص نے شارق کو بھی مار دیا تھا۔ وہ سب بہت محتاط تھے اور فوری طور پر فائر کرنے کے لیے تیار تھے۔ اوپر جاتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے پاس آگئے تھے اور پھر جیسے ہی ایک جگہ درختوں سے باہر آئے، سامنے پھیلے کوئی سو گز چوڑے اور پچاس گز لمبے میدان کے وسط میں ان کو رقم والے سوٹ کیس نظر آگئے۔ وہ آپس میں ملا کر یوں رکھے گئے تھے کہ دور سے نظر آرہے تھے۔

”ہمارے سوٹ کیس۔“ سلطان نے جوش سے کہا۔

”رقم۔“ امیر خان نے اس سے بھی زیادہ جوش سے کہا۔

بختیار نے سوٹ کیس دیکھ لیے تھے لیکن اس کی نظریں آس پاس بھٹک رہی تھیں۔ اس نے سلطان سے کہا۔ ”وہ یقیناً آس پاس موجود ہے۔“

سلطان نے اس کی بات سنی ہی نہیں، وہ یک دم دوڑا۔ اس کے ساتھ ہی امیر خان بھی دوڑ پڑا۔ بختیار چلایا۔ ”سلطان رک جاؤ، یہ ٹریپ ہے۔“

لیکن رقم سامنے دیکھ کر ان دونوں کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی اور انہوں نے اتنا سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ جو رقم دو آدمی قتل کرنے کے بعد اس شخص نے حاصل کی تھی، وہ اسے یوں میدان میں سجا کر کیوں رکھ گیا تھا؟ بختیار چیخ چیخ کر انہیں روک رہا تھا مگر وہ اس کی سن ہی نہیں رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے سوٹ کیسوں کے پاس پہنچ

گئے اور پھر سلطان کا پاؤں گھاس میں چھپے اور تنے ہوئے فولادی تار سے ٹکرایا۔ ایک کلک جیسی آواز آئی۔

☆☆☆

شارق نے خود کو زندہ سلامت پا کر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ جس وقت اجنبی نے اچانک اس پر گولی چلائی تھی، وہ مرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا مگر اس نے گولی اس کے سر سے ذرا اوپر چلائی تھی۔ شارق نے برہمی سے کہا۔ ”یہ کیا حرکت تھی؟“

وہ مسکرایا۔ ”اگر میں بتا کر فائر کرتا تو تم کبھی اتنی اچھی چیخ نہ مارتے۔ اب وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔“

شارق کے ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ پُرسکون ہو گیا۔ اجنبی نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگالی۔ شارق نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ضروری نہیں ہے کہ وہ میری چیخ سن کر دوڑے چلے آئیں۔“

”وہ آئیں گے، تمہاری چیخ سن کر نہیں تو یہ سوچ کر آئیں گے کہ رقم میرے پاس ہے۔ لو وہ آگئے۔“ وہ بولا۔ اسے دوربین سے تینوں دکھائی دے رہے تھے۔ ”آگے آؤ... شاباش... تمہاری رقم رکھی ہے... آ کر لے لو۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی چیز تھی کہ شارق کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ”سنو، تم کیا کرو گے؟ میرے ساتھیوں کو گولی مار دو گے؟“

”نہیں، ان کے ساتھ اس سے بھی شاندار ہوگا۔ یہ مجھے قتل کر کے رقم واپس لینے آئے ہیں لیکن افسوس یہاں موت ان کا انتظار کر رہی ہے۔“

شارق نے ان تینوں کو میدان کے پار نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر اس نے سلطان اور امیر خان کو دوڑ کر سوٹ کیسوں کی طرف آتے دیکھا۔ لیکن بختیار اپنی جگہ کھڑا تھا اور چیخ چیخ کر انہیں رکنے کو کہہ رہا تھا۔ اجنبی یک دم تشویش زدہ ہو گیا۔ اس نے رائفل شانے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھر بختیار کا نشانہ لینے لگا۔ ساتھ ہی وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ کیوں آگے نہیں آیا؟“

شارق پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطان اور امیر خان کو پاس آتے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ سوٹ کیسوں کے پاس پہنچے، اچانک سلطان لڑکھڑایا جیسے اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا ہو اور پھر شارق نے سوٹ کیسوں سے آگ نمودار ہوتے دیکھی۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ وہ پیچھے گرا لیکن اجنبی اپنی جگہ جما رہا۔ دھماکا ہوتے ہی اس نے فائر کر دیا اور بختیار ایک جھٹکے سے پیچھے درختوں کے درمیان جا گرا۔ شارق فوراً ہی اٹھا اور اس نے جلتے نوٹوں کے ٹکڑے دھوئیں کے درمیان اڑتے دیکھے۔ دھوئیں کے پاس سلطان اور امیر خان نظر نہیں آرہے تھے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اجنبی سوٹ کیسوں کے ساتھ وہ گول ڈبا نما چیز کیوں لے کر گیا تھا۔ وہ یقیناً بارودی سرنگ تھی۔ شارق نے اجنبی کا شانہ جھنجوڑا۔

”یہ... یہ کیا کیا تم نے؟“

مگر اس نے شارق کو پیچھے دھکیل دیا اور درختوں سے نکل گیا۔ شارق اس کے پیچھے دوڑا۔ اجنبی کا رخ دھماکے والی جگہ تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو وہاں سوائے جلے ہوئے نوٹوں اور دو بُری طرح خراب ہو جانے والی لاشوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ جلتے ہوئے نوٹ اب بھی گر رہے تھے یا ہوا کے زور سے اڑ کر دور جا رہے تھے۔ سلطان اور امیر خان دونوں مر چکے تھے یا مرنے والے تھے۔ ان کے زخمی جسموں سے خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اجنبی اب درختوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ شارق وہیں رک گیا۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح کبھی لاشوں کو دیکھتا اور کبھی ان اڑتے جلتے نوٹوں کو جنہوں نے اب تک دس افراد کی جان لی تھی اور ہاتھ کسی کے بھی نہیں آئے تھے، بالآخر خود بھی جل کر زمین کی خاک میں شامل ہو رہے تھے۔

☆☆☆

بختیار گولی کے جھٹکے سے پیچھے گرا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سلطان اور امیر خان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ وہ جیسے ہی سوٹ کیسوں کے پاس پہنچے، وہ ایک دھماکے سے پھٹ گئے تھے۔ اس نے سلطان اور امیر خان کو اچھل کر پیچھے گرتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں جلے ہوئے نوٹ ہوا میں اڑنے لگے تھے۔ جب تک وہ سمجھتا کہ یہ کسی بارودی سرنگ کا دھماکا تھا، ایک گولی جھٹکے سے اس کے دائیں طرف سینے میں لگی اور وہ پیچھے جا گرا۔ اسے لگا جیسے کوئی دہکتا ہوا انگارہ اس کے سینے میں اتر گیا ہے۔ لیکن اس کے حواس برقرار تھے۔ اسے احساس تھا کہ پر اسرار شخص نے کامیاب ٹریپ لگا کر اس کے دورہ جانے والے ساتھیوں کو بھی شکار کر لیا تھا اور اب وہی بچا تھا۔ نوٹ اس کے سامنے جل کر خاک ہو رہے تھے اور اب اسے اپنی زندگی بچانا تھی۔ وہ زمین پر لیٹے لیٹے پیچھے ہٹا اور درختوں کی آڑ لیتے ہی کھڑا ہو گیا۔

اس نے ایک ہاتھ سے زخم دبا رکھا تھا جس سے مسلسل خون ابل رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے رائفل تھام رکھی تھی۔ لیکن رائفل کا بوجھ زیادہ تھا۔ اس نے رائفل پھینک دی اور پستول نکال لیا پھر لڑکھڑاتے قدموں سے بس کی طرف

جانے لگا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ اس پر گولی چلانے والا اس کے پیچھے آئے گا تاکہ اپنا ادھورا کام مکمل کر سکے۔ بختیار نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ ان میں سے کسی کو بھی اس وادی سے زندہ جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اسے دولت کی ضرورت بھی نہیں تھی ورنہ وہ اتنی بڑی رقم کو یوں ضائع نہ کرتا۔ بختیار ڈولتے قدموں سے گھنے درختوں کے درمیان داخل ہوا اور پھر وہیں گر گیا۔ گولی اس کے سینے میں سوراخ کرتی ہوئی گزر گئی تھی اور شاید پھیپھڑا زخمی ہوا تھا کیونکہ اس کے منہ سے بھی خون آرہا تھا۔ وہ بار بار کھانس رہا تھا اور ہر بار اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑتے تھے۔ اچانک کسی آہٹ نے اسے ساکت ہو جانے پر مجبور کیا۔ وہ اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے دو درختوں کے درمیان والی جگہ دبک گیا۔

چند لمحے بعد دوسری طرف سے ایک رائفل بردار شخص نمودار ہوا۔ اس نے بھورے رنگ کی قمیص اور اسی رنگ کی کیپ لگا رکھی تھی۔ وہ بہت محتاط تھا۔ بختیار کی نظریں دھندلا رہی تھیں۔ اس نے بہت آہستگی اور مشکل سے پستول والا ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے آنے والے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے بہت پھرتی سی بندوق کا رخ بختیار کی طرف کیا تھا کہ اس نے گولی چلا دی۔ اسی لمحے بندوق سے شعلہ نکلا اور بختیار کے سینے میں اتر گیا۔ اسے جھٹکا لگا۔ اس کی نظر اپنے سینے پر گئی۔ گولی بائیں طرف دل سے ذرا اوپر لگی تھی۔ بختیار جان گیا کہ اب بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس نے خونی نظروں سے اپنے قاتل کی طرف دیکھا جو پیٹ پر ہاتھ رکھے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر بختیار کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

☆☆☆

شارق میدان میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ اب کیا کرے کہ اسے درختوں کی جانب سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ ان میں سے ایک فائر پستول کا تھا اور ایک اس اجنبی کی رائفل کا۔ ایک منٹ بعد وہ اجنبی لڑکھڑاتا ہوا درختوں سے نکلا۔ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور دور سے اس کی قمیص پر خون کا پھیلتا دھبا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شارق بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ ”یہ... کیا ہوا؟“

اجنبی تکلیف سے مسکرایا۔ ”اس بار تمہارے ایک ساتھی کا داؤ بھی چل گیا۔ لیکن مجھے مرتا دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہیں ہے۔“

شارق سمجھ گیا کہ اس نے بختیار کو بھی مار دیا ہے۔ اجنبی لڑکھڑایا اور گرنے لگا تو شارق نے اسے سہارا دیا۔ اس کے پیٹ سے خون پانی... کی طرح بہہ رہا تھا۔ شارق نے اسے زمین پر لٹا دیا اور قمیص اوپر کر کے اس کا زخم دیکھا۔ شارق کو لگا کہ وہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ پھر بھی اس نے اپنی قمیص اور بنیان اتاری، قمیص کا دامن پھاڑا اور پھر بنیان کو گولے کی طرح بنا کر اس کے زخم پر رکھ کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ وہ اسے خاموشی سے یہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ جب شارق نے اپنا کام کر لیا تو اس نے کراہ کر کہا۔ ”تمہارا شکریہ لڑکے... لیکن لگ رہا ہے میں بچوں گا نہیں... پانی... کیا تم مجھے پانی پلا سکتے ہو؟“

شارق جا کر کیبن سے اس کے لیے پانی لے آیا۔ پانی پی کر اسے ذرا سکون ملا۔ شارق نے پوچھا۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”یہ سب جرائم پیشہ... تھے۔ مجھے مار دیتے اس... لیے میں نے پہلے انہیں مار دیا۔“ اس نے رک رک کر کہا۔ ”مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے جو پیسے کی خاطر... جرم کرتے ہیں۔“

”تب تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟“ شارق نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے نہیں مارتے۔ اگر تمہیں گولی نہ لگتی، تب بھی تم مجھے جانے دیتے۔ اگر مارنا ہوتا تو شروع میں مار دیتے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ابتدائی تکلیف کے بعد اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ ”مجھے یقین آگیا تھا کہ تم صرف پیسے کی خاطر اس کام میں شامل نہیں ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی مجبوری ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا اس لیے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔“

”تم نے کہا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے، کوئی خاندان نہیں ہے؟“

”ہاں، میرا خاندان اور میرا گھر سب ختم ہو گیا۔ ایک ساتھ ختم ہو گیا۔ جرم دوسروں نے کیا تھا لیکن عجیب بات ہے سزا مجھے ملی۔ وہ سب تو ایک ساتھ ہی ختم ہو گئے تھے۔“

”کیسے؟“

☆☆☆

کرم حسن شمال کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا باسی تھا۔ یہاں زندگی بہت آسان اور سادہ تھی۔ لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے، ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے تھے۔ کمانے کے غلط طریقوں کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ دور دراز ہونے کی وجہ سے ابھی اس چھوٹے سے گاؤں میں دنیا کے مکر و فریب نہیں پہنچے

تھے۔ پھر حالات بدلے اور اچانک ہی ان کے علاقے کو، اس بڑی شاہراہ گزارنے کے لیے منتخب کر لیا گیا جو پڑوسی ملک تک جا رہی تھی۔ کچے راستے کی تیاری شروع ہوتے ہی گاؤں کا ماحول بدلنا شروع ہو گیا۔ یہاں باہر سے روشنی آئی۔ گاؤں کو بجلی فراہم کی گئی اور سرکار کی جانب سے یہاں ایک اسکول کھولا گیا۔ اس سے پہلے یہاں کے بچے اسکول کے نام سے بھی ناآشنا تھے۔ جدید دنیا کی جدید آسائشیں آنے لگیں اور ان کے ساتھ ہی طور طریقے بھی آنے لگے۔

کرم حسن اسکول میں داخل ہونے والا اولین بچہ تھا۔ جب تک وہ اسکول سے پڑھ کر فارغ ہوا، سڑک تعمیر ہو چکی تھی لیکن یہ علاقہ ایسا نہیں تھا کہ یہاں سڑک تعمیر کر کے چھوڑ دی جاتی۔ یہاں تو پورا سال سڑک کی تعمیر اور مرمت کا کام جاری رہتا تھا۔ موسمی حالات اتنے شدید تھے کہ ماہرین نے اس منصوبے کو ناممکن قرار دے دیا تھا لیکن دو ملکوں کے جانباز کارکنوں نے دن رات ایک کر کے اور سیکڑوں جانوں کی قربانیاں دے کر اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ کرم حسن نے بچپن سے اس سڑک کو بنتے دیکھا تھا اور اسے بنانے والے اس کے ہیرو تھے اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی سڑک بنانے والا کارکن بنے گا۔ اتفاق سے ایک انجینئر صاحب سے اس کی دوستی بھی ہو گئی اور ان کی مدد سے اسے ایک ٹیکنیکل کالج میں داخلہ مل گیا جہاں اس نے سول ڈرافٹسمین کا کورس کیا۔

کورس کرنے کے بعد بھی کرم حسن خاصے عرصے فارغ رہا کیونکہ سڑک کی تعمیر اور مرمت کے ذمے دار محکمے کے پاس اسامیاں خالی نہیں تھیں۔ دراصل اسامیوں پر باہر سے لوگوں کو لا کر رکھا جا رہا تھا اور مقامی لوگ جن کا حق بھی بنتا تھا، انہیں ملازم نہیں رکھا جاتا تھا۔ کرم حسن نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کر لیا اور پورٹر بن گیا۔ خاصے عرصے بعد اس کی ملاقات اسی انجینئر سے ہوئی اور جب اسے پتا چلا کہ وہ تعلیم حاصل کر کے بھی پورٹر بنا ہوا ہے تو اسے افسوس ہوا۔ اس انجینئر کی کوشش سے کرم حسن کو تعمیراتی محکمے میں سپروائزر کی ملازمت مل گئی۔

جیسا کہ بتایا... کرم حسن ایک سادہ سے گاؤں کا باسی تھا جہاں ذاتی سطح پر کسی کو دھوکا دینا اور نقصان پہنچانا گناہِ کبیرہ سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اجتماعی دھوکے بازی اور قومی نقصان کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا اس لیے ملازمت میں آنے کے بعد جب کرم حسن کو پتا چلا کہ یہاں کیا کیا کھیلے ہوتے ہیں اور لوگ دولت کی خاطر ملک و قوم کے سالوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے سے ذرا نہیں چوکتے ہیں تو اس کی عقل دم بخود رہ گئی۔ سپلائرز سے لے کر سڑک بنانے کے ذمے داروں تک سب چور تھے اور لوٹ مار میں لگے تھے۔ سپلائرز ایک کی چیز دس میں لاتے تھے تو کام کرنے والے دس کی جگہ ایک ہی چیز لگاتے تھے۔ کرم حسن یہ سب دیکھتا اور اس کا خون کھولتا تھا۔

مگر وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ یہاں تو سب کالی بھیڑیں تھیں اور ان میں وہ واحد تھا جو سفید تھا اس لیے سب سے الگ نظر آتا تھا۔ وہ حرام کی کمائی سے دور رہتا تھا اس لیے اس کے ساتھی اس سے دور رہتے تھے۔ وہ بھی ان سے میل جول پسند نہیں کرتا تھا ورنہ اسے ان کے ساتھ کھانا پینا تو پڑتا مگر اسے یہ بھی پسند نہیں تھا۔ سڑک کا نیا تعمیراتی منصوبہ شروع ہوا۔ اتفاق سے یہ اس کے گاؤں کے پاس ہی تھا۔ ممانعت کے باوجود شاہراہ کے ساتھ جنگل کی کٹائی کا سلسلہ جاری تھا جس سے آئے دن لینڈ سلائڈنگ ہونے لگی تھی۔ سڑک بار بار گر جاتی یا اس پر پہاڑ آگرتا تھا۔ یہاں بھی سڑک نیچے دریا میں جا گری تھی اور تقریباً نصف کلومیٹر کا ٹکڑا دوبارہ سے تعمیر کرنا تھا۔

کرم حسن کا یونٹ اس ٹکڑے کی تعمیر کا ذمے دار تھا۔ انہوں نے کام شروع کیا اور کرم حسن یہ دیکھ کر کڑھنے لگا کہ اس بین الاقوامی اہمیت کی شاہراہ کی تعمیر کسی گلی محلے کی سڑک کے انداز میں کی جا رہی تھی۔ بیس بنائے بغیر بس بلڈوزر سے راستہ ہموار کیا گیا۔ اس پر معمولی سی روڑی بچھا کر ڈامر ڈال دیا گیا۔ کرم حسن نے سائٹ انجینئر سے احتجاج کیا کہ یہ سڑک چلنے والی نہیں ہے۔ معمولی سی بارش اسے بہا کر لے جائے گی، اسے جواب دیا گیا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے ورنہ استعفا دے کر گھر چلا جائے۔ کرم حسن نے یہی کیا، اس نے استعفا دے دیا اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی لکھ کر اوپر محکمے کو ارسال کر دی۔

کرم حسن نے دوبارہ پورٹر کا کام شروع کر دیا۔ خاصی کم عمری میں اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس کے چار بچے بھی تھے۔ اس کا خاندان ویسے بھی خاصا بڑا تھا۔ وہ ایک ٹیم کے ساتھ ایک ٹریک پر گیا ہوا تھا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ اس کا خاندان ایک شادی میں جاتے ہوئے بس دریا میں گرنے سے جاں بحق ہو گیا ہے۔ کرم حسن واپس آیا تو اس کے خاندان کے افراد میں سے نصف کی لاشیں ہی دریا سے نکالی جا سکی تھیں۔ باقی کو شوریدہ سر دریا بہا کر لے گیا تھا۔ کرم حسن کے صدمے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس صدمے کا اندازہ لگانا مشکل ہے جو اسے یہ دیکھ کر ہوا کہ حادثہ ٹھیک اسی مقام پر پیش آیا تھا جہاں سڑک ناقص بنانے پر اس نے احتجاجاً استعفا دے دیا تھا۔ دو ہفتے کی جدوجہد کے بعد بھی اس کے

صرف دو بچوں کی لاشیں ملیں۔ اس کی ماں، اس کے دو بھائی ان کے بیوی بچے، اس کی دو چھوٹی بہنیں سب اس حادثے کی نذر ہوگئے تھے۔

لیکن کرم حسن کے خیال میں یہ حادثہ نہیں قتلِ عام تھا اور اس کے ذمے دار اس کے یونٹ کے لوگ تھے۔ وہ قاتل تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔ کرم حسن ملک کے مغربی حصے میں گیا جہاں اسلحہ اور گولہ بارود یوں فروخت ہوتا ہے جیسے شہروں میں دکانوں پر گروسری کا سامان بکتا ہے۔ وہ اپنی ساری جمع پونجی لے گیا تھا اور اسے وہاں سے اس کے مطلب کا سامان مل گیا۔ واپس آنے کے بعد اس نے سائٹ انجینئر سمیت ان پانچ افراد کو چن چن کر نشانہ بنایا جو اس کے خیال میں اس کے گھر والوں کی موت کے براہِ راست ذمے دار تھے۔ چار افراد کو اس نے اتنی مہارت سے ٹھکانے لگایا کہ کوئی نہیں جان سکا کہ ان کا قاتل کون ہے لیکن آخری فرد کو مارتے ہوئے اس سے چوک ہوئی اور پولیس اس کے پیچھے لگ گئی۔

کرم حسن وہاں سے بھاگا اور چھپتا چھپاتا اس وادی تک آن پہنچا۔ جب اس نے یہاں کسی انسان کو نہیں پایا تو اس نے یہاں اپنا گھر بنانے کا فیصلہ کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے یہ کیبن بنا لیا اور اپنی ضرورت کا سامان بھی جمع کر لیا۔ مگر اسے اطمینان سے رہنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس ویران جگہ پر بھی لوگ آتے رہے۔ ان میں سے بیشتر جرائم پیشہ تھے یا کچھ غلط کر کے یہاں آتے تھے۔ کرم حسن نے انصاف کرتے ہوئے انہیں بھی ٹھکانے لگا دیا۔ آنے والوں میں دو روسی فوجی بھی تھے جو برابر ملک میں ہونے والی جنگ سے بھاگ کر آئے تھے۔ انہیں ٹھکانے لگانے کے بعد کرم حسن کو ان کے پاس سے چند بارودی سرنگیں اور ایروشوٹر جیسے ہتھیار ملے۔ وہ ان سے شکار کا کام لیتا تھا۔ ویسے وہ بیشتر چیزوں کو جھیل میں غرق کر دیتا تھا لیکن اس نے ان بارودی سرنگوں کو سنبھال کر رکھ لیا۔ یہ بعد میں اس کے کام آئیں۔ یہاں آنے کے بعد اس کا واسطہ ایک درجن سے زیادہ انسانوں سے پڑا اور اس نے انہیں ٹھکانے لگا کر ان کی لاشیں بھی جھیل میں ڈال دیں۔ اسے اپنے کسی فعل پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اس کے خیال میں اس نے جو کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ قدرت نے ان لوگوں کو اس کے پاس بھیجا ہی اس لیے تھا کہ وہ انصاف کر دے۔

☆☆☆

''میں نے جو کیا وہ اپنے کسی مفاد کے لیے نہیں کیا اس لیے میرا ضمیر مطمئن ہے۔'' کرم حسن نے آخری سانسوں کے درمیان کہا۔ ''بیٹے، تم نے دیکھ لیا جو اس حرام کی دولت سے آئندہ کی عیاش زندگی کے منصوبے بنا رہے تھے، وہ اپنے گناہوں کا حساب دینے اللہ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ حرام دولت کسی کو راس نہیں آتی۔ تم واپس چلے جاؤ۔ بے شک تھوڑا کماؤ لیکن حلال کماؤ۔ کسی مشکل سے گھبرا کر غلط راستے پر قدم مت رکھو ورنہ وہ راستہ تمہیں دنیا ہی میں جہنم میں لے جائے گا۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' شارق نے اسے یقین دلایا۔

''اب میں سکون سے مر سکوں گا کہ میں نے تمہیں چھوڑ کر کوئی غلطی نہیں کی ہے۔'' وہ بولا۔ ''میری بات غور سے سنو، یہ سب چیزیں اور لاشیں جھیل میں ڈال دینا۔ اس کی تہ بہت گہری ہے اور قیامت سے پہلے کچھ باہر نہیں آئے گا۔ پھر یہاں سے ایسے جانا جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔''

شارق نے ایک بار پھر اسے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ اسے کرم حسن کے مرنے کا افسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ کرم حسن نے آخری خواہش یہ ظاہر کی کہ اس کو اس کے کیبن کے ساتھ دفنایا جائے۔ اگر شارق آسانی سے یہ کام کر سکے ورنہ اسے بھی دوسری لاشوں کے ساتھ جھیل میں ڈال دیا جائے۔

''میں وعدہ کرتا ہوں... تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

کرم حسن نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ شارق کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ اس نے دوبارہ سانس ہی نہیں لی، یہ اس کی آخری سانس تھی۔ اس کے آنسو جو کب سے رکے تھے، بہہ نکلے۔ چند گھنٹوں میں اسے اس شخص سے ایسی انسیت ہوگئی تھی جیسے اس سے شارق کا کوئی خونی رشتہ ہو۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ اس نے کرم حسن کی لاش اٹھائی اور اس کے کیبن میں لے آیا۔ لاش وہاں رکھ کر وہ باہر آیا اور اس نے کرم حسن کی وصیت پر عمل شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے لاشیں جھیل کے کنارے جمع کیں۔ ان کے لباسوں میں پتھر بھرے اور انہیں جھیل میں اتر کر کنارے سے دور لے جا کر ڈبونے لگا۔ اس کے بعد اس نے سارا اسلحہ اور دوسرا سامان ڈبو دیا۔

سب سے مشکل کام بس کو جھیل میں ڈبونا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ بس کو جھیل کے کنارے ایسی پوزیشن میں لایا کہ ایک بار اسٹارٹ ہونے کے بعد یہ سیدھی جھیل کی تہ میں پہنچ کر ہی

رکتی۔ شارق نے انجن اسٹارٹ کیا لیکن ہینڈ بریک لگا دیے۔ ایکسلریٹر پر ایک بھاری پتھر رکھا اور پھر ہینڈ بریک ریلیز کرتے ہی بس سے کود گیا۔ یہ بہت رسکی کام تھا۔ کودنے میں ذرا دیر ہوتی تو بس اسے بھی جھیل میں لے جاتی اور نیچے کودتے ہوئے پہیوں میں آنے کا امکان بھی تھا۔ مگر خیریت رہی اور وہ بچ گیا۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے پانی میں گئی اور پھر اس وقت تک آگے بڑھتی رہی جب تک اس کے پہیے زمین سے لگے رہے پھر وہ پانی میں تیرنے لگی اور رفتہ رفتہ پانی بھرنے سے بالآخر ڈوب گئی۔ عین اس وقت سورج بھی ان پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا جہاں بختیار اور سلطان کے جانے کا ارادہ تھا اور وہ بھول گئے تھے کہ جو مغرب کی طرف جاتا ہے، وہ ڈوب جاتا ہے۔ شارق کیبن میں آیا تو تھکن سے اس کا جسم چور تھا لیکن ابھی اسے کرم حسن کی وصیت پر عمل بھی کرنا تھا۔

دو گھنٹے آرام کے بعد اس نے کیبن کے پاس نرم زمین میں ایک چار فٹ گہری قبر کھودی۔ بیلچہ اور پھاوڑا اسے کیبن میں مل گیا تھا۔ اس کا کام آسان ہو گیا، دو گھنٹے بعد قبر تیار تھی۔ اس نے کرم حسن کو اسی کے کپڑوں سمیت قبر میں دفنا دیا۔ مٹی کی ذرا اونچی ڈھیری بنا کر اس نے سرہانے کی طرف ایک لمبا اور چپٹا پتھر کسی کتبے کی طرح گاڑ دیا۔ اس کے لیے دعائے مغفرت کر کے شارق اندر آیا اور خشک گوشت صبح کی طرح توے پر بھون کر پیٹ بھرا۔ اس کے بعد وہ بے خبر سویا تو اس کی آنکھ اگلے دن دوپہر میں کھلی۔ وہ باہر آیا، اس نے کرم حسن کی قبر پر آخری بار فاتحہ پڑھی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میدان میں جلے ہوئے نوٹ بدستور موجود تھے۔ شارق نے ایسے ہی سوٹ کیسوں کی باقیات کو الٹا تو خلافِ توقع اسے زمین میں دبی نوٹوں کی کئی گڈیاں صحیح سالم مل گئیں۔ یہ پاؤنڈز اور یورو کی تین گڈیاں تھیں اور ان کی مالیت بھی لاکھوں میں بنتی تھی۔ شارق کچھ دیر ان گڈیوں کو ہاتھ میں لیے سوچتا رہا پھر اس کے ذہن میں کرم حسن کی آواز گونجی۔

''یہ سب حرام کی دولت ہے جو آدمی کو زندگی میں ہی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔''

اس نے گھبرا کر گڈیاں وہیں پھینک دیں اور تیز تیز قدموں سے وادی سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑوں پر جہاں جہاں خون یا مٹی کے داغ لگ گئے تھے، انہیں صاف کیا۔ اس کی جیب میں ذاتی چند ہزار روپے تھے اور اسے امید تھی کہ وہ ان کے سہارے آسانی سے واپس گھر پہنچ جائے گا۔ راستے میں دو مقامات پر پولیس نے بس کو روک کر مسافروں کی مکمل تلاشی لی۔ شارق نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ آخر وقت میں لالچ اس پر غالب نہیں آیا اور اس نے نوٹوں کی گڈیاں وہیں پھینک دیں ورنہ وہی نوٹ اس وقت اسے پکڑوا دیتے۔

پبلک بسوں میں دو دن سفر کے بعد وہ گاؤں پہنچا۔ اس کا باپ باہر ہی مل گیا۔ شارق اس کے سینے سے لگ گیا۔ یہ اس کے باپ کی نیک نیتی تھی جو اللہ نے اسے اس آزمائش سے بچا لیا تھا۔ شارق کا ایک مہینے سے گھر والوں سے رابطہ نہیں تھا اس لیے ماں باپ دونوں فکر مند تھے۔ اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر زمردشاہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو سینے میں بھینچتے ہوئے پوچھا۔ ''پتر کہاں تھا تو؟''

''بس بابا مشکل میں تھا... پر اللہ نے کرم کیا، اب میں واپس آگیا ہوں اور دوبارہ کبھی نہیں جاؤں گا۔''

زمردشاہ نے گھر کی طرف جاتے ہوئے بتایا۔ ''تجھے تو پتا بھی نہیں ہوگا بیدار خان کے ساتھ کیا ہوا؟''

''کیا ہوا بابا؟''

''ٹریکٹر چلاتے ہوئے ٹریکٹر الٹ جانے سے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بے چارہ ابھی بستر پر پڑا ہے۔ مجھے بلوایا تھا اور معافی مانگی۔''

شارق بھڑک گیا۔ ''بابا! میں اسے یا رابینہ کو معاف نہیں کروں گا۔''

''نہ بیٹا، ایسا مت کہہ۔ ہم کون ہوتے ہیں کسی کو معاف کرنے یا نہ کرنے والے۔ اب تو وہ خود معافی مانگ رہا ہے۔''

''اور رابینہ؟'' شارق نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''وہ تو گھر آگئی ہے۔ تیری ماں اور میری ایسی خدمت کرتی ہے کہ کیا سگی بیٹی کرتی ہوگی۔ اس نے منہ سے بھی معافی مانگی ہے، پر اپنے سلوک سے ہمارا دل جیت لیا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں سب بھلانے کے لیے تیار ہوں۔'' شارق بولا۔

وہ گھر میں داخل ہوئے تو صحن میں ترکاری کاٹتی رابینہ نے شارق کو دیکھا اور اسے ایک نظر میں سب کہہ دیا۔ شارق مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دی۔ اس کا گھر بچ گیا تھا اور شارق کو اس کی محبت واپس مل گئی تھی۔ آگے یقیناً اس کے لیے اور بھی انعام تھے کیونکہ اس نے دنیا کا سب سے مشکل کام کیا تھا اور حرام دولت کو ٹھکرا دیا تھا۔